ناول
حیدر گوٹھ کا بخشن
محمد حفیظ خان

حیدر گوٹھ کا بخشن

محمد حفیظ خان

محمد حفیظ خان ایک معتبر محقق، مورخ، نقاد، ناول نگار، افسانہ نگار، ڈراما نگار، شاعر، کالم نویس اور صحافی کے طور پر منفرد شناخت کے حامل ہیں۔ گذشتہ 51 برسوں سے علم و ادب کی مختلف اصناف میں گراں قدر اضافہ کا باعث ہوتے ہوئے بھی انھوں نے پیشہ ورانہ لحاظ سے مختلف جہتوں میں ناموری حاصل کی۔ 1980ء میں وکالت سے آغاز کے بعد انھوں نے ریڈیو پاکستان کو بطور پروڈیوسر جائن کیا، بعدازاں جامعاتی سطح پر قانون کے مدرس رہے۔ کچھ بعد دیگرے وفاقی اور صوبائی سول سروس کا حصہ رہنے کے بعد ضلعی عدلیہ میں شمولیت حاصل کی جہاں سول جج سے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج تک کے مناصب پر فائز رہنے کے علاوہ حکومتِ پنجاب میں ایڈیشنل سیکریٹری محکمہ قانون و پارلیمانی امور اور پنجاب سروس ٹریبونل کے ممبر اور چیئرمین بھی رہے۔ ملک کے مایہ ناز تربیتی اداروں میں قانون اور ادب کی تدریس بھی اُن کی ذمہ داریوں میں شامل ہیں۔ محمد حفیظ خان اب تک تین مرتبہ اکادمی ادبیات کے ایوارڈ، پاکستان ٹیلی وژن سے بہترین ڈراما نگار کا ایوارڈ اور قومی سول ایوارڈ ''تمغۂ امتیاز'' حاصل کر چکے ہیں۔ اکادمی ادبیات کے بورڈ آف گورنرز کی رکنیت، ''کمالِ فن'' ایوارڈ کی جیوری میں کئی بار کی شمولیت، اکادمی کی اشاعتی کمیٹی، ترجمہ کمیٹی اور وظائف کمیٹی کی رکنیت بھی اُن کے اعزازات میں شامل ہیں۔ ''پلاک'' کی جانب سے گذشتہ برس اُن کی کتاب ''پٹھانے خان'' پر شفقت تنویر مرزا ایوارڈ اور نیشنل بک فاؤنڈیشن کی جانب سے انھیں تین مرتبہ ''کتاب کا سفیر'' بھی مقرر کیا گیا ہے۔ گذشتہ تین برسوں میں اُن کے چار ناولوں ''ادھ ادھورے لوگ''، ''انواسی''، ''کرک ناتھ'' اور ''ممتارا'' نے قومی سطح پر پذیرائی حاصل کی ہے۔ پندرہ برس تک روزنامہ نوائے وقت، جنگ، نئی بات اور خبریں میں کالم نگاری کے ساتھ ساتھ حالاتِ حاضرہ کے انگریزی ماہنامہ "The Competitor" کے ایک سو بیس سے زائد شماروں کی اجرائی اور سرائیکی ٹی وی چینلز وسیب اور روہی کے لیے ڈراما سیریلز لکھ چکے ہیں۔ نمائندہ ادیب کی حیثیت سے پاکستانی اہلِ قلم کی نمائندگی کرتے ہوئے انھوں نے دو بار چین کا دورہ بھی کیا ہے۔ محمد حفیظ خان کی تحریریں جہاں کلیات اور جامعات کے ادبی نصاب کا حصہ ہیں وہاں اُن کی ادبی خدمات کی مختلف جہتوں پر ایم اے اور ایم فل کے کئی مقالے بھی لکھے جا چکے ہیں۔

محمد حفیظ خان

ناول:

ادھ ادھورے لوگ

انواسی

کرک ناتھ

مختارا

حیدر گوٹھ کا بخشن

کہانیاں:

تن من سیس سریر

یہ جو عورت ہے

لاہور جان

ڈراما:

کچ دیاں ماڑیاں

کوئی شہر یں جنگل کوکدا

تحقیق و تنقید:

نوآبادیاتی خطوں کا نیا مکالمہ

سرائیکی ادب: افکار و جہات

کافی: سندھ وادی کی شعوری تاریخ

رت جگوں کی مراد

متفرق:

اس شہر خرابی میں (کالم)

مآثرِ ملتان (تاریخ)

پٹھانے خان (سرگزشت)

خرم بہاولپوری (شخصیت و فن)

حیدر گوٹھ کا بخشن

ناول

محمد حفیظ خان

بُک کارنر

جہلم، پاکستان

Haider Goth ka Bakhshan
by Muhammad Hafeez Khan
Jhelum: Book Corner, 2022
359p.
1. Novel - Fiction
ISBN: 978-969-662-457-8

بانی مہتمم اعلیٰ: شاہد حمید

ناشرین: گگن شاہد * اَمر شاہد

اشاعت: اکتوبر ۲۰۲۲ء

کتاب: حیدر گوٹھ کا بخشن (ناول)

مصنف: محمد حفیظ خان

لفظ خواں: محمد اقبال پارس

سرورق ڈیزائن: محمد شکیل طلعت

تزئین و زیبائش: ابوامامہ

کمپوزنگ و صفحہ سازی: محمد عمر فاروقی

کتابت: نوری نستعلیق، علوی نستعلیق

مطبع: فائن پرنٹرز، لاہور

ناشر: بک کارنر

ویب سائٹ: www.bookcorner.com.pk

بک سٹور: بک کارنر شوروم، بالمقابل اقبال لائبریری، اقبال لائبریری روڈ، جہلم، پاکستان 49600
00 92 544 278051, 00 92 544 614977 | 00 92 314 4440882, 00 92 321 5440882
bookcornerjlm | /bookcornershowroom | /bookcorner
bookcornerjhelum | info@bookcorner.com.pk

معاشی حبس، جنسی بے توقیری اور سماجی دراندازیوں
میں پھڑپھڑاتی زندگی کے نام

۱

صوبائی دارالحکومت سے تقریباً تین سو کلومیٹر دور جنوب مغرب میں واقع تحصیل حیدر گوٹھ کے احاطہ کچہری میں آج صبح ہی سے غیر معمولی دکھائی دینے والا رش بتدریج بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ہر کسی کی کوشش تھی کہ وہ علاقہ مجسٹریٹ کے کمرہ عدالت میں کم از کم تا کا جھانکی جتنی جگہ تو لے سکے۔ اکثر لوگوں نے اُس راستے پر نگاہیں جما رکھی تھیں کہ جس جانب سے پولیس کی گاڑی نے تھانے کی حوالات سے زیر حراست ملزمان کو لے کر کچہری میں مزید جسمانی ریمانڈ کے لیے لے کر آنا تھا۔ یہ سب لوگ منتظر تھے اُن گیارہ ملزموں کے جنھیں گزشتہ شام حیدر گوٹھ سے فتح گڑھ جانے والی قومی شاہراہ پر حاجی بخشن کے ٹرک ہوٹل سے مبینہ طور پر زنا کاری کے جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا۔ اِن ملزموں میں دو جوان لڑکیاں، دو خواجہ سرا اور سات کم عمر لڑکے تھے جو ہوٹل کے عقب میں بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں میں لمبے روٹ کے ڈرائیوروں کو پھر سے تازہ دم کر کے رات بھر کے سفر کے قابل بنا دیتے تھے۔

کچہری میں اُس وقت موضوع گفتگو حاجی بخشن کے ٹرک ہوٹل سے اتنی بڑی گرفتاریاں نہیں تھیں بلکہ لوگ اس بات پر حیران تھے کہ پولیس کا ریڈ آخر وہاں ہوا ہی کیوں۔ بخشن کے ہوٹل میں تو ٹرک ڈرائیوروں کی یہ مدارت گزشتہ پینتیس چھتیس برسوں سے ہوتی چلی آ رہی تھی لیکن پولیس

کا چھاپہ پہلی بار پڑا تھا۔ حیرت اس بات کی بھی تھی کہ نہ تو علاقے کا نو تعینات شدہ تھانیدار طبیعت کا اُتاولا تھا اور نہ ہی تحصیل کا ڈی ایس پی اور ضلع کا کپتان حاجی بخشن کی حیثیت سے ناواقف واقع ہوئے تھے۔ کون نہیں جانتا تھا کہ بخشن کا ٹرک ہوٹل اپنے طور طریقوں سے کراچی سے پشاور تک کے ڈرائیوروں کا من چاہا ٹھکانا تھا۔ اگرچہ اس قسم کی خدمات اور سہولتیں تو جی ٹی روڈ کے بے شمار ٹرک ہوٹلوں میں مہیا کی جاتی تھیں مگر حاجی بخشن کی خاطر داری کا سواد سب سے نرالا تھا۔ سرگودھا سے منگوائے گئے ناچے بکروں کی کڑاہی اور قورمہ، دیسی گھی کے تڑکے میں بھنی ہوئی ماش کی دال، پانی سے چھنڈ کر تندور میں لگائی گئی کڑک روٹی اور ملائی ماری ہوئی دودھ پتی کا تو خیر جواب ہی کیا ہوتا، تھکن سے چور ڈرائیوروں کی خاطر سیوا کے لوازمات بھی اپنی مثال آپ تھے۔ کراچی سے آنے والے ڈرائیور جونہی ملحقہ تحصیل فتح گڑھ سے گزرتے تو اُن کا بدن اینٹھنے لگتا اور یہی حال اُن ڈرائیوروں کا ہوتا جو پشاور سے آتے ہوئے ضلع شمس پور کی سرحدوں کو چھونے کی تیاریوں میں ہوتے۔ حاجی بخشن کے ٹرک ہوٹل کی شہرت اُن کم عمر کسبی لڑکوں، چلتر خواجہ سراؤں اور کسے ہوئے جسموں والی خانہ بدوش دوشیزاؤں کی مرہونِ منت تھی کہ جو اپنے فن میں مہارت کے سبب ڈرائیوروں کو درجۂ کمال کی ذہنی اور جسمانی آسودگی مہیا کرتے۔ لیکن اصل بات ایسے ہنرمند پیشہ وروں کی بخشن کے ہاں وافر تعداد میں سہولت سے دستیابی تھی جس کے لیے اُسے کچھ خاص تردد بھی نہ کرنا پڑتا کہ اُس کی شہرت ہی اُس کی ساکھ تھی۔ نہ تو کسی کا حق رکھتا اور نہ ہی لین دین میں کسی قسم کی کوئی ہیرا پھیری۔ مزدوری کی ادائیگی پسینہ خشک ہونے سے پہلے اور کوشش یہی ہوتی کہ طے شدہ سے کچھ سوا دے دیا جائے جب کہ باقی ہوٹلوں والے تو گاہک کی دی ہوئی بخشیش میں سے بھی ڈنڈی مار لیا کرتے۔

حاجی بخشن اگرچہ چٹا اَن پڑھ اور لگ بھگ ساٹھ کے پیٹے میں تھا مگر باہر کو لٹکتی توند، گنجے سر اور عیار آنکھوں کے سبب اپنی الگ پہچان رکھتا تھا۔ اُس کا گٹھا ہوا جسم، ہاتھ پاؤں کی موٹی موٹی بھدی اُنگلیاں اور گالوں پر دونوں طرف گہری عمودی چُنٹیں صاف بتا رہی ہوتیں کہ بچپن کہاں گزرا اور جوانی کیسی کیسی مشقتوں میں کٹی۔ لیکن تقریباً چالیس برس پہلے ایک تندور اور دال کے پتیلے سے

شروع ہونے والا سفر ٹرک ہوٹل تک آتے آتے اُسے روپے پیسے کی اُن منزلوں تک پہنچا گیا جہاں دن رات، مقامی تھانے کی موبائل گاڑیاں عملے کے ہمراہ اُس کے کاروبار کی حفاظت کے واسطے موجود رہا کرتیں۔ علاقے کا کون سا افسر تھا جس کے ہاں آئے روز اُس کے ہوٹل سے خصی بکروں کا دم پخت اور المونیئم فائل میں لپیٹ کر دہکتے ہوئے کوئلوں سے خستہ کیا ہوا گوشت نہیں بھجوایا جاتا تھا وگرنہ کڑاہی قورمہ تو روز کا معمول تھا۔

حاجی بخشن کی کمائی اُن دنوں عروج پر پہنچی کہ جب نائن الیون کے بعد کراچی سے افغانستان جانے والے نیٹو کے کنٹینر حیدر گوٹھ کے ملحقہ ضلع سے گزرتے ہوئے ولایتی شراب کی سینکڑوں پیٹیاں مخصوص ٹھکانوں پر اُتار کر جاتے۔ یوں اِس علاقے میں شراب کی ریل پیل ہوئی تو اُپر پنجاب کو سپلائی کی غرض سے حاجی بخشن کا ہوٹل غیر ملکی شراب کا ٹرانزٹ ڈپو بن کر رہ گیا۔ مزدا ٹرکوں میں چھپا کر لائی گئی شراب یہاں سے دوسری گاڑیوں میں لوڈ کیے جانے کے بعد اگلی منزلوں کو اندرون ملک روانہ کر دی جاتی۔ ایسے میں جہاں پولیس اور انتظامی افسروں کو دیئے جانے والے بھتے میں کئی گنا اضافہ ہوا وہاں کچھ ایسے محکمے بھی اِس کاروبار میں شراکت دار بن بیٹھے جن کا حاجی بخشن کے باقی دھندوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ نائن الیون کی دین تھی کہ حاجی بخشن تحصیل اور ضلع کے افسروں سے ہوتا ہوا، وزیروں، مشیروں اور صوبائی افسروں کے ساتھ ساتھ مرکز کے معاملات میں دیہاڑی لگانے والوں کا تعلق دار بن گیا۔ عام حالات میں جن کی چوکھٹ تک رسائی بھی ممکن نہیں تھی حاجی بخشن اب اُن کے دسترخوان سجانے لگا تھا کہیں ہم نوالہ بن کر اور کہیں ہم پیالا۔ لیکن ایک بات تھی وہ اِس قدر عروج کے باوجود اُن سپاہیوں اور حوالداروں کی بھی اُسی طرح خاطر سیوا کیا کرتا، اُسی طرح خیال رکھا کرتا کہ جس طرح کاروباری زندگی کے اولین دنوں میں رکھا کرتا تھا۔

اِسی سبب تو دوست دشمن، حاسد اور بدخواہ سبھی حیرت زدہ تھے کہ کیسی اُفتاد پڑی، نہ صرف حاجی بخشن کے ہوٹل پر پولیس کا ریڈ ہوا بلکہ خود اُسے گرفتار کرنے کے لیے تھانہ صدر حیدر گوٹھ کی پولیس رات بھر اِدھر اُدھر چھاپے مارتی رہی۔ یہ وہ تھانہ تھا جس کے ایس ایچ اُو اور باقی عملے کی آنتڑیوں میں ابھی اُس کے ہوٹل سے مفت میں بھجوایا گیا کھانا ہضم بھی نہیں ہوا تھا۔ چھاپوں کی خبر

پہلی تو حاجی بخشن کی گرفتاری کی خبر بھی اُڑا دی گئی لیکن اکثریت کے نزدیک یہ محض افواہ تھی کہ جس کے گھڑنے والے بھی اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھے۔

جوں جوں دن چڑھتا جا رہا تھا توں توں کچہری میں لگنے والی بھیڑ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ سول کورٹس کے وکلا بھی اپنی اپنی پیشیوں سے جلدی جلدی فراغت کے بعد مجسٹریٹ صاحب کی عدالت کے باہر جمع ہونے لگے تھے۔ برآمدہ تو پہلے سے بھرا ہوا تھا اس لیے بعد میں اس ہجوم کا حصہ بننے والے اِس طرح اِدھر اُدھر سایہ دار جگہ ڈھونڈتے پھر رہے تھے کہ کورٹ میں پیش ہونے والے حراستی کسی بھی وقت نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائیں۔ کچہری کی اِس دھکم پیل میں کچھ شرفا ایسے بھی تھے جو نگاہیں بچا کر راستے پر صرف اس لیے نگاہ رکھے ہوئے تھے کہ کہیں زیرِ حراست ملزمان میں سے کوئی اُن کی جان پہچان والا نہ نکل آئے کیونکہ ضروری تو نہیں تھا کہ بخشن کے ہوٹل میں دیہاڑی لگانے والے کہیں اور نہ منہ مارتے ہوں۔ اُنھیں بے چینی اِس اندیشے کے سبب تھی کہ کہیں کسبیوں نے پولیس کی حراست میں اُن کا نام نہ بک دیا ہو۔ اب اگر ایسے میں اُن کی بہت سی دیدہ اور نادیدہ جگہوں سے پسینہ بہہ نکلنا شروع ہو چکا تھا تو کچھ ایسا غیر فطری بھی نہیں تھا۔

اِس کے برعکس ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی جو ہر قسم کی شوقینی کرنے کا ماضی رکھتے ہوئے بھی اندر سے مطمئن ہو کر تماشا دیکھنے پہنچے ہوئے تھے۔ اُنھیں معلوم تھا کہ حاجی بخشن اپنے ہوٹل پر خفیہ سہولتیں صرف لمبے روٹ کے ڈرائیوروں کو مہیا کرتا تھا، مقامی شوقین صرف زبانی چسکوں اور پیٹ پوجا کی حد تک پھیری لگا سکتے تھے، اِس سے زیادہ نہیں۔ افواہ تو یہ بھی تھی کہ کسی مقامی دل جلے نے بہت اوپر سے پھونک نہ مرا دی ہو۔ لیکن جہاں ضلع تو کیا پورے صوبے کی پولیس حاجی بخشن کی اُڑتل میں ہو وہاں کسی دل جلے ٹوربے کی پھونک نے کون سا آسمان گرا دینا تھا۔

یکا یک کیا ہوا کہ خواجہ سراؤں کی ایک ٹولی بھی سر پیٹتی، دُہائیاں دیتی وہاں آن نکلی۔ اتنے بڑے ہجوم کے ہوتے ہوئے بھی کچہری میں چھایا ہوا عجیب سا سناٹا ہر طرف سے اُٹھنے والے قہقہوں نے اُجاڑ کر رکھ دیا۔ صورت یہ بنی کہ چمکیلے کپڑوں میں بھڑکیلا میک اپ کیے پچیس تیس خواجہ سرا بال بکھیرے، روتے پیٹتے ایک دائرے کی شکل میں پولیس کے مبینہ ظلم کے خلاف ہلکے

ہلکے ٹھمکوں میں احتجاج کر رہے تھے جب کہ کچہری میں اِدھر اُدھر بکھرا ہوا ہجوم اُن کے گرد جمع ہو کر اُن کی وضع قطع اور ماتم کے انداز پر قہقہے لگا رہا تھا۔ مجسٹریٹ کی عدالت اور برآمدے میں موجود وکلا اور مُنشیوں نے بھی باہر نکل کر تو لگانا چاہی کہ اتنے بڑے ہجوم کے وسط میں آخر اتنے زیادہ خواجہ سرا کہاں سے اور کیسے آ گئے۔ مجسٹریٹ صاحب جو چائے کے وقفے کے لیے کورٹ روم سے اُٹھ کر ملحقہ چیمبر میں چلے گئے تھے گھنٹیوں پہ گھنٹیاں بجانے لگے کہ نائب قاصد سے اِس شور شرابے اور دھا چوکڑی کا احوال جان سکیں مگر نائب قاصد ایسے میں کہاں کسی سے پیچھے رہنے والا تھا۔ وہ بھی کب کا بھیڑ کا حصہ بن چکا تھا۔ کئی بار گھنٹی بجانے کے بعد بھی جب کوئی بھی چیمبر میں نہ گیا تو مجسٹریٹ خود ہی غصے کے عالم میں درمیانی دروازہ کھول کر کورٹ روم میں آ گیا مگر وہاں بھی ہو کا عالم کہ نہ تو ریڈر موجود، نہ ہی پیش کار، نائب کورٹ اور نائب قاصد۔ مجسٹریٹ کا غصہ پریشانی میں بدل گیا۔ ایسا پہلے کب ہوا تھا کہ عدالت کا سبھی عملہ یوں ایک ساتھ کمرہ عدالت سے غائب پایا جائے۔ مجسٹریٹ نے عدالتی کمرے کے کھلے دروازے سے باہر کی طرف جھانکا تو محض بے معنی شور و غوغا کے اور کچھ سنائی نہ دیا۔ ایک وکیل کے مُنشی نے مجسٹریٹ کو یوں کمرۂ عدالت سے باہر جھانکتا ہوا دیکھ لیا تو بھیڑ میں گھستا گھساتا ہوا اپنے سے کئی ہاتھ آگے کھڑے ہوئے پیش کار تک جا پہنچا اور اُس کے کان میں چیخ کر بتایا کہ مجسٹریٹ صاحب کمرۂ عدالت سے باہر جھانک رہے ہیں۔ پیش کار گھبرا کر واپس مڑا اور بھیڑ میں سے اپنا راستہ بناتا ہوا کمرۂ عدالت میں پہنچا، تب تک مجسٹریٹ صاحب واپس اپنے چیمبر میں جا چکا تھا۔

ایک ہی ساعت میں وہ تمام گالیاں مکمل ترتیب کے ساتھ پیش کار کی سماعت میں گونج گئیں جو صاحب کا سامنا ہونے کے بعد اُسے پڑنے والی تھیں۔ پیش کار کو تیزی سے واپس جاتا دیکھ کر باقی عملہ بھی ایک دوسرے کے آگے پیچھے اپنے اپنے بہانے گھڑتا ہوا واپس ہو لیا جہاں باہر کے ماحول کے برعکس ہو کا عالم تھا۔ اِس سے پہلے کہ مجسٹریٹ اپنے چیمبر سے نکل کر عملے کی ماں بہن سے یکساں سلوک کرتا باہر کچہری میں ایک دم پہلے تو خاموشی چھا گئی لیکن چند سیکنڈز کے بعد پہلے سے کئی گنا زیادہ شور ایک دم کمرۂ عدالت کے دروازے پہنچا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑ کی

صورت اندر داخل ہوگیا۔ کمرہ لوگوں سے کھچا کھچ بھر گیا تو نائب کورٹ نے کچھ پولیس والوں کی مدد سے کورٹ کے دروازے کو اندر سے چٹخنی لگا دی۔ دروازہ بند ہوتے ہی شور تو کہیں باہر رہ گیا، اندر صرف موجود لوگوں کی بھنبھناہٹ گونجنے لگی۔

لوگوں کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی مجسٹریٹ نے چیمبر چھوڑا اور کورٹ روم میں اونچے چبوترے پر رکھی کراؤن چیئر پر براجمان ہوتے ہی سرسری نگاہ سے کورٹ روم میں موجود لوگوں اور اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ کمرۂ عدالت میں تل دھرنے کی جگہ بھی نہیں رہی تھی۔ حراستی ملزمان پولیس نفری کی نگرانی میں ایک کونے میں دبکے ہوئے تھے جب کہ کچھ وکیل پچھلی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے ہاتھ ہلا ہلا کر مجسٹریٹ صاحب کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش میں تھے کیونکہ نہ صرف روسٹم بلکہ وکیلوں کے کھڑے ہونے کی باقی جگہوں پر بھی غیر ضروری لوگ قبضہ جمائے ہوئے تھے۔ چند منٹوں کے بعد مجسٹریٹ اپنی کرسی سے کھڑا ہوا اور چیمبر میں واپس جاتے جاتے پولیس نفری میں موجود سب انسپکٹر سے ایس ایچ او کے بارے میں پوچھا۔ جواب ملا کہ وہ ایک اہم کیس کی تفتیش میں مصروف ہے۔

''تو اس کیس کا تفتیشی کون ہے؟''

''میں ہوں جناب'' سب انسپکٹر کی آواز میں ہلکی سی غراہٹ تھی۔

''ریڈ کس نے کیا تھا؟'' مجسٹریٹ صاحب پھر سے کرسی پر بیٹھ گئے۔

''ریڈ تو ایس ایچ او صاحب نے کیا تھا۔'' اب کے اُس کی آواز میں منمناہٹ تھی۔

''تو پھر بلاؤ ایس ایچ او کو، میں پانچ منٹ کی بریک کرتا ہوں، اور ہاں تم بھی مِن لورِیڈر صاحب! اس دوران یہ کمرہ غیر ضروری لوگوں سے خالی ہونا چاہیے..... یہاں صرف، وکیل، ملزمان، پولیس اور عدالتی عملہ، اس سے زیادہ کوئی نہیں۔''

۲

وہ گزشتہ دس دنوں سے اپنے گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ فریج میں رکھی باسی روٹیوں کو پانی میں

ہلکا سا ڈبونے کے بعد گرم گرم توے پر تھوڑے سے کوکنگ آئل میں چپڑ کر اوپر نیچے خستہ بنانے کے بعد چائے کے کپ کے ساتھ بسکٹ کی طرح کھانا اُس کے لیے اُن تمام ناشتوں پر بھاری تھا کہ جو وہ آدھی دنیا سے بھی زیادہ گھومتے ہوئے تہذیبی ترقی کے عروج پر پہنچے ہوئے ملکوں کے سیون اسٹار ہوٹلوں میں کیا کرتا تھا۔ یہ بھی نہیں کہ اُس کے پاس روپے پیسے کی کمی تھی یا گھر گھاٹ، بیوی بچے اور حلقۂ احباب نہیں تھا۔ سبھی کچھ اپنی جگہ موجود مگر وہ اِن سب سے لاتعلق ہو چکا تھا۔

لاتعلقی کا بھی بظاہر کوئی خاص سبب نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ وہ سبھی کچھ ہو رہا تھا جو کسی بھی ریٹائر ہو چکے شخص کے پیروں تلے سے کنبے کی عملی سربراہی کھسکا کر محض علامتی تاجوری کی ملامت چہرے پر مل کر کیا جاتا ہے۔ کوئی بھی سربرآوردہ یا ذی حشم و مقتدر جو عالم جوانی میں ایک دنیا کو اپنی دانش اور فہم و فراست سے مغلوب کیے رکھتا ہے، ریٹائرمنٹ یا کسی بھی صورت میں منصب سے علیحدگی کے بعد چشم زدن میں اُسے زمانے بھر کا چغد سمجھ لیا جاتا ہے کہ جس نے گوبر تھاپنے اور چولیں مارنے کے سوا کوئی کام ہی نہیں کیا۔ وہی اہل خانہ، زوجہ اور بچے جو اُس کے کہے سُنے کو بھی حکم کا درجہ دیا کرتے تھے اب مشورے کے نام پر بار بار اُسے اُس کی اوقات یاد دلاتے ہیں کہ وہ گھر داری اور دنیا داری دونوں محاذوں پر وقت اور زمانے کی روندی ہوئی گوشت پوست کی ڈھیری کے سوا کچھ بھی نہیں کہ جس کا زمانہ خود تو گزر گیا مگر جاتے جاتے اُسے گھر داری کے ڈسٹ بن میں پھینک گیا۔ وہ یہ بھی سمجھتا تھا اُس کا یہ حال اُس کے اپنے کیے دھرے کا نتیجہ تھا وگرنہ جتنی تیزی کے ساتھ اُسے نامعتبر کیا گیا اُس کے ہونے میں چند برسوں کی تاخیر بھی کی جاسکتی تھی۔ لیکن ہوا کیا کہ وفاقی حکومت کی اسٹیبلشمنٹ میں سب سے بالا عہدے پر تین سو تین سال متعین رہنے کے بعد جب وہ بائیسویں گریڈ میں ریٹائر ہوا تو کنٹریکٹ پر کوئی اور بڑا عہدہ لینے کی بجائے اُس نے زندگی کے اس دور کو اپنی مرضی اور اپنے ڈھب سے گزارنے کا ارادہ کر لیا اور یوں ایک بہت بڑے نیم سرکاری ادارے کی سربراہی کو لات ماری دی کہ جس کے پانچ برس اُس کی دولت اور اثر رسوخ میں کئی گنا اضافہ کر سکتے تھے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد یہ اُس کا یہ پہلا فیصلہ تھا کہ جس نے اُسے بیوی بچوں کے مفادات کی

لغت سے کھرچ ڈالا۔ اُنھیں اِس بات کی پروا نہیں تھی کہ اُس کی زندگی کے کتنے سانس باقی ہیں مگر وہ اُسے زندگی کے آخری سانس تک کمائی، اقتدار اور اختیار کے کولہو میں جتا دیکھنا چاہتے تھے۔ اُس کا عہدہ چاہے زندگی کے اِس آخری حصے سے جڑی اُس کی ذاتی خواہشات کے لیے پھانسی گھاٹ ہی کیوں نہ ثابت ہو مگر اہل وعیال، دوست احباب اور قرابت داروں کے لیے محض ایک کڑک دار تعارف ہی نہیں بلکہ اپنے اپنے کام نکلوانے اور ہر قسم کے سماجی جوکھم کی گنجلک پرتیں کھول دینے والی ذتی اثر چابی ضرور ہونی چاہیے۔

دوسرا قدم جس نے اُسے گھریلو سربراہی کے سنگھاسن سے سرکا کر دیوار کے ساتھ لگا دیا وہ اُس کا گھرداری کے معاملات میں فیصلہ صادر کرنے سے اجتناب کرنا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ بچے، اب بچے نہیں رہے لہٰذا اُن سے متعلق معاملات انہی کے سپرد ہوں تاکہ اُن میں اعتماد آئے۔ اِسی طرح گھرداری سے متعلق فیصلہ سازی بھی بیگم صاحبہ کے سپرد ہو تا کہ وہ خود اِن بکھیڑوں سے جان چھڑا کر مزے سے من پسند ممالک کے من چاہے مقامات پر حسبِ منشا بسرام کرے، گھومے پھرے اور وہ سب کچھ کرے کہ جن کے آڑے اب تک سرکار کی نوکری آتی رہی تھی۔ وہ جوں جوں پیچھے سرکتا گیا توں توں اُس کے دونوں بیٹے اور بیگم صاحبہ پیش قدمی کرتے کرتے اتنے آگے چلے آئے کہ اُسے دیوار کے ساتھ لگا دیئے جانے کے باوجود اُن کے رویوں میں مزید اور مزید کا تقاضا صاف محسوس ہوتا تھا۔ لہٰذا اب اُس کے پاس اپنی مرضی سے کھانے پینے، آنے جانے یا یوں کہیں کہ زندہ رہنے تک کے ارادے اور فیصلے بھی اُس کی منشا میں نہ رہے بلکہ اُس کے مفاد کے نام پر اُسی کے مفادات کی بلی کا بندوبست کر دیا گیا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد کی زندگی کو کسی بھی قسم کے اعصابی تناؤ اور ذہنی کھینچا تانی سے بچا کر رکھنے کے واسطے اُس نے ایک اور تجویز بھی اہل خانہ کے سامنے رکھ دی۔ اپنے ہوتے ہوئے یا اپنے بعد ورثا میں جائیداد کی تقسیم کے تنازعات سے بچ رہنے کے لیے مختلف جائیدادیں شرعی حصہ کے مطابق ورثا کے نام منتقل تو نہ کیں مگر انھیں نامزد ضرور کر دیا کہ اُس کے بعد فلاں جائیداد فلاں کے حصے میں آئے گی اور فلاں، فلاں کے حصے میں۔ جائیداد کی اِس طور زبانی تقسیم کے بعد اُس میں

سے کچھ اُس نے اپنے لیے بھی رکھ لی کہ اگر کل کلاں کسی انہونی کے نتیجے میں پنشن اور پس انداز رقم کم پڑ جائے تو اُسے کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانے پڑیں۔ لیکن اس کے باوجود انتہائی نیک نیتی سے پیش کی گئی اِس تجویز کا بھی اُلٹا اثر ہوا اور اُس کی موت کے بعد مالک بننے والے شرعی ورثا اُس کی موت سے قبل ہی محض نامزدگی کو تبدیلی ملکیت سمجھ بیٹھے اور اپنے مورث سے اس طرح کا فاصلہ کر لیا کہ جیسے اُس کا وجود تک نہ تھا۔ یہ فاصلہ ایک دم پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس کی پہل بیگم صاحبہ کی طرف سے ہوئی کہ جس نے اُس کا وجود مسترد کرنے کے لیے زندگی بھر کے کھانے کے معمولات اور اوقات بدل ڈالے۔ صبح آٹھ بجے ملنے والا ناشتہ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک جا پہنچا اور وہ بھی گھر کے سبھی افراد کے لیے یکجا کی بجائے الگ الگ، مختلف اوقات میں۔

اِس کا سبب بظاہر تو بیگم کی مستقل ناسازی طبع اور دن چڑھے نیند سے بیدار ہونا تھا مگر کچن میں کام کرنے والے ملازم کو اِس سارے عمل سے دور رکھنے کا حکم کہاں سے آیا تھا، وہ راز ہوتے ہوئے بھی راز نہیں تھا۔ ملازم لوگ بھی بیوروکریسی کی طرح علامتی حاکم کا طواف نہیں کرتے، یہ بھی وہیں سجدہ ریز ہوتے ہیں کہ جہاں سے حقیقی اقتدار کے سوتے پھوٹتے ہوں۔ لہٰذا باورچی بھی اُسی وقت کچن میں جھانکتا کہ جب بیگم صاحبہ بستر سے برآمد ہو رہی ہوتیں۔ کئی دن تو اُس نے پھڑ پھڑانے اور چیخ چیخ کرنے کی کوشش کی، باورچی کو سرونٹ کوارٹر سے بلوایا جاتا رہا مگر جب تان اِس بات پر ٹوٹی کہ اب کونسا دفتر ہے کہ جہاں وقت پر پہنچنا ہے، ریٹائرمنٹ ہوئی ہے تو اُسے ریٹائر لوگوں کی طرح قبول کرنا چاہیے ناکہ سورج نکلتے ہی کھانے پینے کی طلب، تو اُس نے زہر کے گھونٹ بھر لیے۔ وہ حیران تھا کہ اگر ملازمت سے ریٹائرمنٹ ہوئی ہے تو اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دن کا نصف اول صرف ناشتے کے انتظار میں گزار دینا چاہیے۔ اُن امور، اُن خواہشات کا کیا ہوگا کہ جن کے واسطے اُس نے مزید ملازمت کی پیشکش کو تیاگ دیا تھا۔ اِس دوران ایک آدھ دن اُس نے خود ہی ناشتہ بنانے کی کوشش کی لیکن لوازمات تک رسائی سے آشنائی نہ ہونے کے سبب ناکامی ہوئی تو اُس نے غصے اور جھنجلاہٹ میں بازاری ریستورانوں کا رُخ کیا۔ ناشتہ تو بروقت مل گیا مگر سلطان احمد تونگر ایک عجیب سے احساس کے بوجھ تلے واپس پلٹا کہ جیسے اپنا سب کچھ کھو چکا ہو۔

بیوی، بچے، گھر اور گھر سے جڑی ہوئی وہ سبھی خواہشات کہ جن کو پالتے پالتے اُس نے باقی زندگی، زندگی کے طور پر بسر کرنے کی تمنا کی تھی مگر آج اُس کے گھر سے جڑے ہوئے سبھی اُس کے اپنے، اُس کی باقی ماندہ زندگی کو، زندگی کی حیثیت سے قبول کرنے کو بھی تیار نہیں تھے۔

دن کا باقی حصہ وہ منہ پھلائے گھر میں موجود رہا مگر نہ تو کسی نے اِس کا سبب پوچھا اور نہ ہی یہ اُس نے صبح ناشتہ کیا بھی تھا یا نہیں۔ طبیعت بوجھل ہوئی تو دوپہر کا کھانا کھانے کو جی ہی نہ چاہا کہ جو کئی دنوں سے اب ڈائننگ ٹیبل کی بجائے اُس کے کمرے میں بھجوایا جانے لگا تھا کیونکہ اُس کے کھانے کے اوقات میں شاید ہی کوئی ڈائننگ ٹیبل پر آنے کی زحمت کرتا ہو۔ وہ گھر جو اُس کی سربراہی کے دنوں میں کبھی یکسو اور مجتمع ہوا کرتا تھا اب گھر کے ہر فرد کی انفرادی ترجیحات کے خانوں میں بکھرا ہوا تھا۔

شروع شروع میں اُس نے خود کو عمداً وہیں بٹھانے کی کوشش کی کہ جہاں گھر کے دیگر افراد کبھی کبھار ایک ساتھ بیٹھے ہوئے پائے جاتے تھے مگر ہوتا یوں کہ اُس کے بیٹھتے ہی سبھی ایک ایک کر کے اِدھر اُدھر کھسک جاتے۔ یوں کھسکنے والوں میں بیگم صاحبہ کا نمبر اگرچہ آخری ہوتا مگر بہانہ عموماً ہی ایک سا گھسا پٹا، ہر بار دہرایا جانے والا۔ جب یہی صورتِ حال اکثر پیش آنے لگی تو بیگم نے جہاں اپنے اُٹھنے کا جواز دینا ترک کر دیا وہاں جوان اولاد نے بھی اُن جگہوں پر اُن مخصوص لمحات میں اکٹھے ہونا چھوڑ دیا کہ جہاں، جس وقت والد کے آنے کا امکان ہوتا۔ شاید یہی وہ مرحلہ تھا کہ جب اُسے یقین ہو گیا کہ وہ اپنی غلطیوں کے سبب اپنے کنبے میں اپنا وجود کھو چکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اِن حقائق کو اپنی غلطی سمجھنے کو تیار نہیں تھا۔

اُس کے مطابق ریٹائر وہ اپنی عمر اور تاریخ پیدائش کی بنیاد پر ہوا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کی ملازمت کی پیشکش اگر اُس نے زندگی کو اپنے ڈھب سے گزارنے کی خواہش کے تحت قبول نہیں کی تو اِس میں غلطی کہاں سے آ گئی۔ اِسی طرح تمام عمر اپنے آپ کو، اپنے آپ سے محروم رکھ کر کچھ جائیداد بنائی تو کیا غلط کیا۔ اگر اُسی جائیداد کے سلسلے میں بعد از مرگ پیدا ہونے والے فسادات کے امکان کو قبل از وقت نامزدگی کے ذریعے کم سے کم کر دیا تو کیا یہ کم عقلی تھی کہ دانش مندی۔ لیکن

بہت جلد اُسے احساس ہو گیا کہ کہیں نہ کہیں کچھ غلط ضرور ہو گیا ہے۔ وہ جس نے سرکاری ملازمت کے دوران بڑے سے بڑا فیصلہ کرنے یا کوئی حکومتی پالیسی بنا کر نافذ کرنے کے بعد کبھی بھی کسی پچھتاوے کو اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیا تھا، اب پچھتاووں کی آماجگاہ بنتا چلا جارہا تھا۔ گھر کے محض تین افراد کے رویوں نے اُسے اِس طرح یکا و تنہا کیا کہ وہ اپنی اعصابی بُنت میں جگہ جگہ سے چٹختا چلا گیا۔ رہی سہی کسر اُس وقت پوری ہو جاتی کہ جب وہ کسی معاملے پر اپنی رائے دیتا تو صاف الفاظ میں رد کر دی جاتی، وہ کچھ بھی تجویز کرتا تو اُسے سُنے بغیر ہی فرسودہ اور گئے زمانوں کی بات کہہ کر اَن سنا کر دیا جاتا اور جب کبھی وہ اپنی عملی زندگی میں کی گئی جدوجہد اور کامیابیوں کا ذکر کرتا تو اُسے یہ کہہ کر چپ کرا دیا جاتا کہ اُس کا زمانہ اِس قدر سخت مقابلے کا زمانہ نہیں تھا، ہر للو پنجو سی ایس ایس کر لیا کرتا تھا۔ اُس کے زمانے کے جگاڑ آج کے دور میں نہیں چلتے۔

اپنے بیٹوں کی زبانی یہ سب کچھ سُن کر کھسیانے انداز میں وہ بیگم کی طرف تائید کے لیے دیکھتا کہ جو اُس کی جدوجہد کے زمانے کی شاہد رہی تھی لیکن اُس کے چہرے پر تائید تو کیا آشنائی تک کی بھی جھلک نہ ہوتی۔ کامل لاتعلقی۔ ایسے میں اُس کا ذہن ماؤف اور دل ڈوبنے لگتا مگر پھر یہ سوچ کر دھیرے سے مسکرا دیتا کہ کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے، زمانہ بدلنے سے قابلیت کا معیار نہیں بدلتا، مقابلے کے تقاضے نہیں بدلتے اور نہ ہی مقصد کے حصول کی لگن کا گراف اوپر نیچے ہوتا ہے۔ منزل ہر دور میں انھیں ملتی رہی ہے کہ جو دوسروں کی نسبت قطعی منفرد، مقصدیت میں زیادہ مرتکز اور چوکھی لڑنے کا ہنر جانتے تھے۔

اُس کے دن کا بیشتر وقت اب تنہائی کی نذر ہونے لگا تھا۔ زندگی کے ابتدائی دور کے دوست اور رشتے دار عملی زندگی کی دوڑ میں اتنے پیچھے رہ گئے تھے کہ یاد کرنے پر چہروں کے نقوش بھی وقت کی دھول میں اَٹے ہوئے اور ناقابلِ شناخت ہو چکے تھے جب کہ افسری کی زندگی میں بننے والے تعلق اور دوستیاں چاہے ہم پیشہ افسروں سے ہوں یا جاہ و منصب کے حوالے سے ٹاؤٹ قسم کے لوگوں سے، عموماً افسری تک ہی باقی رہتی ہیں، ریٹائرمنٹ کی سرخ لائن عبور نہیں کر پاتیں۔ اب ایسے میں اُن سے تعلق باقی رکھنے کی خواہش یا تنہائی بانٹے جانے کی تمنا کا کیسا سودا اور کیا

سواد۔ گھر کے اندر اور گھر سے باہر لاتعلقی کی فضا سے اُس کا اپنے اوپر اعتماد بھی متزلزل ہونے لگا تھا۔ اب اُسے ہر کسی سے حتیٰ کہ گھریلو ملازموں سے بات کرتے ہوئے بھی جھجک ہونے لگی تھی کہ جنھیں تنخواہ کی ادائیگی اُس کی جیب سے ہوتی تھی۔ اُسے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے ہی وہ اُن سے کوئی بات کرے گا وہ اُس کی کم عقلی اور چغدپن پر اگر روبرو نہیں تو کم از کم دل میں ضرور ٹھٹھا اُڑائیں گے۔ وہ حیران تھا کہ ساٹھ برس کی عمر میں بھی وہ پہلے سے زیادہ سیانا، توانا اور فہیم تھا لیکن نجانے کیوں ساٹھویں سالگرہ سے محض ایک شب پہلے اُسے وہ کچھ سمجھ لیا گیا کہ جو خلاف حقیقت اور خلاف واقعہ تھا۔ لیکن اِس کے برعکس اب تو نہ صرف اُس کے اپنوں نے طے کر دیا کہ وہ اپنے ہی گھر کے لیے ایک بے مصرف کاٹھ کباڑ سے زیادہ کچھ بھی نہیں بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُسے گھر سے باہر بھی ایسی فائل سمجھ لیا گیا کہ جس پر جلی حروف میں ''داخل دفتر'' لکھا جا چکا ہو۔ نتیجتاً اُس نے گھر کی اوپری منزل پر بنائی جانے والی لائبریری کو اپنا مسکن بنا لیا اور اُن کتب کی ورق گردانی میں وقت گزارنے لگا کہ جنھیں شیلف سے نکالنے کی فرصت بھی نہیں ہوا کرتی تھی۔

کچھ دنوں سے اُس نے اپنے اندر ایک اور تبدیلی کو محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے پسندیدہ موضوعات پر مبنی کتب کی محض ورق گردانی پر ہانپنے لگتا تھا، انتہائی چاؤ سے دیکھے جانے والی ٹی وی پروگرامز اور ناسٹلجیا میں ہر دم تازہ رہنے والی موویز اور سدا بہار گیت دیکھنے سُننے سے بھی اُکتانے لگا تھا۔ ایسے میں وہ کتاب اوندھی اپنے سینے پر رکھ کر یا یوٹیوب پر دیکھ رہے پروگراموں کو ساکت کر کے آرمز کرسی پر آنکھیں موند لیتا۔ نیند کا ہلکا سا جھونکا اپنے ساتھ خراٹوں کی بارات لے کر آدھمکتا تو وہ اپنے ہی کسی بلند آہنگ خراٹے سے بیدار ہو کر پھر کتاب کے صفحات پلٹنے لگتا کہ کہاں تک مطالعہ با قائم ہوش و حواس رہا تھا۔ اگر کتاب نہیں تو ٹی وی کی ساکت سکرین کو حرکت میں لے آتا کہ کہاں تک کوئی پروگرام دیکھ رکھا تھا یا کوئی گیت سنا تھا۔ ایسے ہی ایک روز وہ عالم سکوت میں تھا کہ موبائل فون پر مدھم سی گھنٹی ہوئی۔ ایک دو تین۔ اِس پر بھی وہ چونکا نہیں، بس آنکھیں کھولے بغیر ہی موبائل فون کو کان سے لگا لیا۔

دوسری جانب سے کسی نے نام پوچھا تھا۔

"جی میں ہوں تونگر۔"

دوسری جانب سے شاید دوبارہ استفسار ہوا۔

"جی.... صاحبزادہ سلطان احمد تونگر۔" اُس کا لہجہ غنودگی، لاتعلقی، بے حسی اور بے نیازی کی تجریدی تصویر بنا ہوا تھا۔

۳

علاقہ مجسٹریٹ دوبارہ کمرۂ عدالت میں آ چکا تھ۔ ماحول اگرچہ اب بھی اُس کے حسبِ حکم نہیں تھا مگر وکلا کی ایک کثیر تعداد کو اب کمرے سے باہر نکالنا بھی ممکن نہیں رہا تھا کہ جب مقامی بار ایسوسی ایشن کا صدر بھی اپنے تمام عہدیداران کے ساتھ روسٹم کے قریب پہنچ چکا تھا۔ مجسٹریٹ نے کچھ بولنا چاہا مگر پھر کچھ سوچ کر صبر کا گھونٹ بھرا اور ریڈر کو خفی سا اشارہ کیا کہ حراستی ملزمان کو پیش کیا جائے۔ ریڈر نے تفتیشی کو دیکھا تو اُس نے آگے بڑھ کر ریڈ، گرفتاری اور ابتدائی تفتیش کی فائل عدالت کے سامنے رکھ دی۔

مجسٹریٹ نے فائل پر نگاہ ڈالنے کی بجائے قہر آلود نگاہوں سے تفتیشی سب انسپکٹر کو دیکھا۔

"ایس ایچ او کہاں ہے؟"

"رابطہ نہیں ہو سکا، فون بند جا رہا ہے۔" تفتیشی سب انسپکٹر کے لہجے میں غراہٹ پھر سے در آئی تھی۔

"ٹھیک ہے! میں کرتا ہوں تم لوگوں کا بندوبست اور پھر دیکھتا ہوں تمھارے رابطے کس طرح بحال نہیں ہوتے۔" غصے سے مجسٹریٹ کے کان سُرخ ہو چلے تھے۔ اُس نے دادطلب نگاہوں سے صدر بار کی طرف دیکھا کہ پولیس کی کیسی کھنچائی کی جا رہی تھی۔ لیکن صدر بار خلافِ توقع صرف خاموش ہی نہیں تھا بلکہ عجیب سی لاتعلق نگاہوں سے اُسے گھورے جا رہا تھا۔ مجسٹریٹ نے دل ہی دل میں گڑبڑا کر روسٹم کے دائیں جانب نگاہ کی جہاں سرکاری وکیل یا پبلک پراسیکیوٹر کھڑا ہوتا ہے۔ صدر بار کی نگاہوں نے اُسے سمجھا دیا تھا کہ معاملہ اُس طرح نہیں ہے کہ جیسا وہ سمجھ

رہا تھا۔ سرکاری وکیل نے بھی کوئی جواب دیے بغیر اپنی نظریں مجسٹریٹ کے چہرے پر اِس طرح گاڑی ہوئی تھیں کہ جسے عام حالات میں عدالتی بے ادبی کے زمرے میں گردانا جاتا ہے۔

"ہاں جی پراسیکیوٹر صاحب! اب آپ ہی کچھ بتائیں کہ ایس ایچ اُو کے خلاف کیا کارروائی کی جائے؟"

"کیا کارروائی ہو سکتی ہے! سو عذاب ہوتے ہیں ایس ایچ اُو کی جان کو.... اُس پر بھی عدالتیں یہ توقع رکھیں کہ وہ دن بھر اُن کی کورٹ میں بلاوجہ کھڑا رہے تو علاقے میں اَمن امان کے معاملات کیسے بہتر ہوں گے؟"

پراسیکیوٹر کے بھنائے ہوئے لہجے نے نہ صرف مجسٹریٹ کے چہرے کا رنگ متغیر کر دیا بلکہ چند ساعتوں کے لیے اُس کا دماغ بھی ماؤف کر دیا۔ اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب وہ ایس ایچ اُو کے خلاف حکم عدولی کی کارروائی کرے یا پراسیکیوٹر کے خلاف کوئی قانونی قدم اُٹھائے کہ جس نے اپنے الفاظ اور لہجے سے عدالت کے روایتی وقار اور ماحول کو مکدر کر کے رکھ دیا تھا۔ مجسٹریٹ نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے آواز کی پوری گھمبیرتا سے پراسیکیوٹر کو درشت لہجے میں مخاطب کیا۔

"لگتا ہے آپ کو عدالت میں پیروی کے آداب سکھانے پڑیں گے۔" اِس سے پہلے کہ پراسیکیوٹر کوئی جواب دیتا صدر بار ایسوسی ایشن بلند آواز میں گرجا۔

"جناب آپ پراسیکیوٹر صاحب کو عدالتی پیروی کے آداب بعد میں سکھایئے گا پہلے خود اِس کرسی پر بیٹھنے کے آداب سیکھ لیں۔"

مجسٹریٹ نے حیرت سے صدر بار کی طرف دیکھا کہ جو آج صبح ہی ڈکیتی کے مقدمے میں ضمانت کی دو درخواستوں پر اُس سے غیر معمولی دادرسی کا طلب گار تھا۔ باچھیں اُس کی کھلی جا رہی تھیں اور بار بار اُس کی انصاف پسندی اور قابلیت کی تعریفیں کیے جا رہا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اِن ضمانتوں کے منظور ہونے کے لیے اُس نے لمبا مال کھینچا ہوگا مگر پھر بھی ممکنہ شر انگیزی، ہڑتالوں اور اُس کے بعد کہیں راجن پور یا کلور کوٹ جیسی دور افتادہ جگہوں پر تبادلے سے بچ رہنے کے واسطے

ضروری تھا کہ ضمانتیں لے لی جائیں، سو لے لی گئیں۔لیکن محض چند گھنٹے بعد ہی صدر بار کا یہ رویہ کہ جیسی کبھی شناسائی ہی نہ رہی ہو، مجسٹریٹ کو ہلا گیا۔ اُس نے صدر بار کے ارادوں کا اندازہ لگانے اور آج صبح سویرے کی مہربانیاں یاد دلانے کے انداز میں صدر بار کی طرف تمام تر ملائمت سے دیکھا مگر وہ اور اُس کے ساتھی وکیل اُسے اِس طرح سے گھور رہے تھے کہ جیسے وہی اُن کا مجرم ہو۔ان سے مایوس ہو کر مجسٹریٹ نے کمرہ عدالت میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک سرسری نگاہ کی تو اُسے گرفتار شدہ ملزمان سمیت وہاں موجود ہر شخص آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس کی بھد اُڑاتا دکھائی دیا۔ وہ سبھی عدالت کی بے بسی پر خاموشی کی زبان میں قہقہہ زن تھے، تمسخر پیا ہو رہے تھے۔

مجسٹریٹ نے حالات کا رخ دیکھتے ہوئے بھانپ لیا کہ اگر اُس نے اِس سے زیادہ قانون کی عمل داری کو یقینی بنانے کی کوشش کی تو ردعمل کی صورت میں اُس کی نہیں سُنی جائے گی بلکہ اُنہی کی سُنی جائے گی کہ جو قانون کے بخیے اُدھیڑیں گے اور اُس کا انجام بلاشنوائی انکوائری اور معطلی یا پھر کسی دور دراز تحصیل میں تبادلے سے کم نہیں ہوگا۔ اِس کے باوجود وہ ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ مقامی بار کے سبھی عہدیدار پیش کس کی طرف سے ہو رہے ہیں، ملزمان کی جانب سے وکالت کے لیے یا ایس ایچ اُو کو طلبی سے بچانے کے لیے محض پریشر گروپ کے طور پر۔ معاملہ جو بھی تھا لیکن ایک خوف زدہ عدالتی افسر کے طور پر اُس نے ایس ایچ اُو جیسی دیوار سے سر ٹکرانے کی بجائے پینترا بدلنے کا فیصلہ کیا کہ جس کے دفاع میں پولیس کے ساتھ ساتھ سرکاری اور غیر سرکاری وکیل سبھی ایک ہو چکے تھے۔

''جی بتائیں مقدمہ کیا ہے؟'' مجسٹریٹ نے قدرے نرم لہجے میں پراسیکیوٹر سے پوچھا اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی بجائے تفتیشی افسر کی فائل اُٹھا کر پولیس ریکارڈ کے ورق پلٹنے لگا۔ کمرہ عدالت میں خاموشی شاید اِس بات کی منتظر تھی کہ مجسٹریٹ پولیس کے خلاف کوئی تو ایسی بات کرے کہ جس کے بعد وہ طوفان میں بدل جائے۔ یہ خاموشی طوفان میں تو بدلی مگر مجسٹریٹ کے بولنے سے نہیں بلکہ کورٹ روم کا دروازہ کھلنے سے کہ جو اندر پولیس گارڈ موجود ہونے

کے باوجود باہر سے لگائی جانے والی پوری طاقت سے کھلا اور حاجی بخشن دو ایسے وکیلوں کے جلو میں اندر داخل ہوا کہ جو سیشن کورٹ اور ہائی کورٹ میں پیش ہونے کے علاوہ کسی بھی دیگر کورٹ میں پیش ہونا کسرِ شان سمجھنے سے بھی کہیں زیادہ ذلالت پر محمول کرتے تھے۔

حاجی بخشن جس شان سے کمرۂ عدالت میں داخل ہوا اُس نے لحاتی ہلچل کے بعد ایک بار تو مکمل سکوت طاری کر دیا۔ مجسٹریٹ کو لگا کہ صورت حال بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی ہے وگرنہ حاجی بخشن کا دو سینئر ترین وکلا رضوان ہاشمی اور مہر نور محمد کے ساتھ یوں دندناتے ہوئے اندر چلے آنا کیا معنی رکھتا تھا کہ جب ریڈ کے زمرے میں وہ خود بھی پولیس کو مطلوب تھا۔ بدلی ہوئی صورت حال میں سراسیمہ ہو چکا تفتیشی سب انسپکٹر پہلے تو خواب کی سی کیفیت میں رہا مگر پھر فوراً ہی حاجی بخشن کی طرف لپکا اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی بائیں کلائی کو اپنے دائیں ہاتھ کی گرفت میں لے لیا۔ یہ سب کچھ اتنی سرعت سے ہوا کہ کوئی بھی نہ جان سکا کہ یکا یک ہوا کیا ہے۔ کمرے کے ایک کونے میں ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے ملزمان کے چہروں پر آیا ہوا سکون کا رنگ بھی ایک بار پھر زرد پڑ گیا۔ چھاپے کے وقت مبینہ طور پر فرار ہو جانے والے ملزم حاجی بخشن کو واقعاتی طور پر گرفتار کر چکا تھا۔

لیکن سب کچھ ورتعاتی سے زیادہ لحاتی ثابت ہوا۔ جتنی تیزی سے حاجی بخشن کو گرفتار کیا گیا تھا اُس سے زیادہ برق رفتاری سے رضوان ہاشمی ایڈووکیٹ نے تفتیشی سب انسپکٹر کے گال پر زنانے دار تھپڑ کچھ اِس طرح رسید کیا کہ اُس کے ہاتھ سے حاجی بخشن کی کلائی چھوٹ گئی۔ غصے کی شدت سے ادھیڑ عمر رضوان ہاشمی کا پورا وجود کپکپا رہا تھا۔ ماں بہن کے ساتھ ناجائز روابط پر مبنی گالیاں بھی اُس کے منہ سے تھرتھرا کر نکل رہی تھیں۔

''حرامزادہ کتا ایک معزز آدمی کو کمرہ عدالت سے گرفتار کر رہا ہے، اس ٹلیے چوتیے کو یہ نہیں معلوم کہ وہ اپنی ماں کے اِس یار کو سپریم کورٹ کے اندر سے بھی گرفتار نہیں کر سکتا اور یہ چلا ہے مجسٹریٹ کی عدالت سے گرفتار کرنے.... ذرا دیکھیں تو سہی مہر صاحب! اِس مجسٹریٹ کو! کیسے بُت بن کر بیٹھا ہے کرسی پر۔''

''چھوڑیں ہاشمی صاحب! یہ نکمے اور نااہل مجسٹریٹ کیا جانیں اپنی عدالت کے ڈیکورم کو ، جب رشوت خور اور زانی لوگوں کو اس کرسی پر بٹھائیں گے تو پھر ایسا ہی ہوگا۔'' مہر منظور ایڈووکیٹ نے بھی منمنا کر اپنا حصہ ڈالنے کی اِس طرح کوشش کی کہ مجسٹریٹ سمیت کمرے موجود سبھی لوگوں نے سُن لیا۔ اندر سے کھسیانے ہو کر بھی کے ٹوٹ چکے مجسٹریٹ کے لیے رہی سہی عزت بچانے سے زیادہ نوکری بچانا اہم تھا کہ اِس عمر میں بچے کہاں سے پالتا، سو سُنی اَن سُنی کر دی۔ اِس کے برعکس تھپڑ کھانے کے بعد بظاہر سہم چکے تفتیشی سب انسپکٹر نے ایک دم اُچھل کر رضوان ہاشمی ایڈووکیٹ پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن اُس کے ارادوں کو بھانپ چکے کچھ نوجوان وکیلوں نے اُسے وہیں سے جھپٹ کر نیچے گرا دیا اور اُس کی قمیص پھاڑنے کے ساتھ ساتھ اُسے پاؤں کی ٹھوکروں میں رکھ لیا۔

اِس سے پہلے کہ تفتیشی لہولہان ہو کر جان سے جاتا صدر بار نے اپنے ساتھی وکلا کے ساتھ اُسے حملہ آور وکلا سے چھڑایا، رضوان ہاشمی ایڈووکیٹ سے معافی منگوائی اور جاں بخشی کا احسان کرتے ہوئے ایک حوالدار کے ساتھ کمرہ عدالت سے باہر نکال دیا تاکہ مرہم پٹی کرا سکے۔ ایسے میں سینئر وکلاء صاحبان حاجی بخشن سمیت روسٹم پر مجسٹریٹ کے روبرو آ گئے۔ ان کے چہروں پر پھیلی ہوئی نخوت کچھ اِس طرح کی ہیبت کے ساتھ متشرح تھی کہ علاقہ مجسٹریٹ کسی انہونی کے خوف سے دہل کر رہ گیا لیکن پھر بھی چہرے پر ایک شرمندہ شرمندہ سی مسکراہٹ لانے کی کوشش اِس لیے کی کہ مہر نور محمد ایڈووکیٹ کے لا کالج کے کلاس فیلو اِن دنوں عدلیہ میں ایک بڑی پوزیشن پر ہوتے ہوئے اُسے بغیر کسی انکوائری کے گھر بھجوا سکتے تھے۔

''جناب ہمیں بتایا جائے کہ یہ کیا تماشہ ہو رہا عدالتوں میں؟ کیا کوئی اپنے وقار کا بھی خوف ہے آپ لوگوں کو، یہ آخر سب ہے کیا؟ کیوں پکڑ رکھا ہے اتنے معصوم اور بے گناہ لوگوں کو؟'' اب کے رضوان ہاشمی ایڈووکیٹ نے مجسٹریٹ پر چڑھائی کر دی۔ اُس کے تیور کچھ اِس طرح کے تھے کہ جیسے کورٹ روم سے ہی نہیں بلکہ مجسٹریٹ کے وجود سے بھی اُسے سخت ناگوار بُو آ رہی ہو۔ مجسٹریٹ وکیلوں کا یہ لہجہ خوب سمجھتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اگر بڑی عدالتوں میں پیش ہونے

والے دو سینئر وکیل اگر شور در عدالت میں چلے آئے ہیں تو فیس بھی تگڑی لی ہوگی اور ''مثبت نتائج'' کا ٹھیکہ بھی الگ سے ہو چکا ہوگا۔

''ہاں جی بتائیں پراسیکیوٹر صاحب! کیس کیا ہے؟'' اس سے پہلے کہ مجسٹریٹ کے استفسار پر سرکاری وکیل کچھ بولتا، رضوان ہاشمی ایڈووکیٹ ایک بار پھر مجسٹریٹ پر چڑھ دوڑا۔

''اللہ کی شان ہے! کیسے کیسے اُلو کے پٹھے بیٹھ جاتے ہیں اس کرسی پر..... عدالت میں نہ تفتیشی موجود ہے اور نہ ہی ریڈنگ پارٹی کا انچارج ایس ایچ اُو تو ایسے میں یہ مسکین سرکاری وکیل کیا بتائے گا آپ کو میں بتاتا ہوں کہ حقیقت کیا ہے؟'' رضوان ہاشمی کا موڈ دیکھ کر پراسیکیوٹر بھی دانت نکوسنے لگا تھا۔

''آپ اگر ملزمان کی طرف سے پیش ہو رہے ہیں تو پہلے اُن کی طرف سے وکالت نامہ جمع کرا دیجیے۔'' مجسٹریٹ نے اپنے طور مسل کی کارروائی پوری کرنے کی کوشش کی۔ رضوان ہاشمی نے پہلے تو طیش کے عالم میں مجسٹریٹ کو گھورا مگر دوسرے ہی لمحے اپنے ساتھ کھڑے ہوئے وکیل مہر نور محمد کی طرف دیکھ کر زہر خند لہجے میں مسکرا دیا۔

''مہر صاحب یہ دن بھی دیکھنے تھے کچہریوں میں..... جس کی اپنی ایل ایل بی کی ڈگری جعلی ہے، وہ ہم سے وکالت نامہ پوچھ رہا ہے، آپ لگائیں ناں شکایت اوپر اِس کی نااہلی، کرپشن اور برے رویے کی پھر دیکھتے ہیں کیسے وکالت نامہ مانگتا ہے سینئر موسٹ وکیلوں سے! اِس ملک کا تو جوڈیشل سسٹم ہی برباد کر کے رکھ دیا ہے لوئر جوڈیشری کے اِن نالائق ججوں نے..... کیوں جی پراسیکیوٹر صاحب وکالت نامہ ہوتا ہے کبھی ملزموں کی پہلی پیشی پر؟''

''کہاں ہوتا ہے وکالت نامہ پہلی پیشی پر جناب..... اور اگر ہو بھی تو آپ جیسی سینئر موسٹ ہستیوں سے اِس کا طلب کرنا بھی میرے نزدیک جچتا نہیں، توہین کے زمرے میں آتا ہے۔'' پراسیکیوٹر نے مجسٹریٹ سے آنکھیں چرا کر رضوان ہاشمی کے سامنے ایک بار پھر دانت نکوس دیے۔

''دیکھو مجسٹریٹ صاحب! یہ کیس سراسر ذاتیات اور بدنیتی پر مبنی ہے۔ ایس ایچ او نے ریڈ کرنے سے پہلے علاقہ مجسٹریٹ یعنی جناب سے سرچ وارنٹ نہیں لیے اور نہ ہی کوئی اُن الزامات

کا گواہ ہے کہ جو ایف آئی آر میں لگائے گئے ہیں، جتنے بھی گواہ ہیں سارے پلیسیے ہیں جن کی گواہی قانوناً قابلِ قبول اور لائقِ اعتبار نہیں اور ہاں جن کے ساتھ بدفعلی یا زنا کا الزام ہے یعنی ڈرائیور اُن میں سے تو کسی کو پکڑا نہیں گیا اور نہ ہی اُن میں سے کسی کا نام یا حلیہ ایف آئی آر میں درج ہے تو پھر کہاں سے بن گیا یہ کیس! اِن غریبوں میں سے کسی کو راہ چلتے بازار سے پکڑا اور کسی کو لاری اڈے سے اور محض ایک معزز شخصیت حاجی بخشن خان کو بدنام کرنے اور اُس کے کاروبار کو برباد کرنے کے لیے قحبہ گیری کا پرچہ کاٹ دیا ہے۔ غضب خدا کا اِن ذو بیبیوں کو تو بس سے اُترتے ہوئے پکڑ لیا ہے اور رات بھر انہیں تھانے میں رکھ کر قانون کی دھجیاں اُڑا دی ہیں، اِسی جواب دہی کے خوف سے آج وہ حرامزادہ ایس ایچ اُو کورٹ میں پیش نہیں ہو رہا، آپ کریں اِن سب کو ڈسچارج اِس جھوٹے پرچے سے حاجی صاحب سمیت..... اور ہاں اگر حکم لکھوانا نہیں آتا تو میرا منشی لکھوا دے گا، جناب صرف مکھی مار دینا۔“

”کیوں جی پراسیکیوٹر صاحب! آپ کیا کہتے ہیں؟“ مجسٹریٹ نے اپنا چہرہ سرکاری وکیل کی طرف کر لیا تھا۔ مگر اُس کے جواب میں اُس نے آنکھیں نیچے کر لیں۔

”یوں کرتے ہیں ہاشمی صاحب کہ ابھی اِن کا جسمانی ریمانڈ دینے کی بجائے انھیں جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھجوا دیتے ہیں، اِس دوران آپ ضمانت کی درخواست دائر کر دیں اُس میں یہ سارے دلائل دیکھ لیتے ہیں۔“ وکیل رضوان ہاشمی سے بات کرتے ہوئے مجسٹریٹ صاحب نے آنکھیں نیچی اور چہرہ پراسیکیوٹر کی طرف کر رکھا تھا۔

مجسٹریٹ صاحب کی تجویز نے رضوان ہاشمی اور مہر نور محمد کے عزائم کے تیل پر جلتی کا کام کیا۔ دونوں ایک دم بھڑک اُٹھے اور مجسٹریٹ کی ماں بہن کی شان میں ہر ممکن ”خوش کلامی“ کے بعد وہاں موجود اپنے جونیئرز کو حکم دیا کہ کورٹ روم کو تالا لگا کر وہاں موجود ہر چیز کو آگ لگا دی جائے۔ اُس کے بعد سب بار روم میں جمع ہوں تا کہ آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دیا جائے۔

اِس سے پہلے کہ مجسٹریٹ کوئی حاکم سنا پاتا اُس کی آواز کمرۂ عدالت میں برپا ہونے والے بے پناہ شور میں کہیں ذب کر رہ گئی۔ پھر بھی اُس نے کھڑے ہو کر کچھ بولنا چاہا مگر ایک نوجوان وکیل

کا پھینکا ہوا جوتا تڑاخ سے اُس کے چہرے پر لگا اور اُس کی عینک ٹوٹ کر کہیں دور جا گری۔ مجسٹریٹ نے اپنے عملے خاص طور پر نائب کورٹ اور سیکورٹی گارڈ کی طرف دیکھا مگر وہ پہلے ہی تتر بتر ہو چکے تھے۔ باہر سے کچھ وکلا اندر موجود وکیلوں کو جلدی سے باہر نکلنے کا کہہ رہے تھے تاکہ کورٹ روم کو تالا لگایا جا سکے مگر اُن میں سے کچھ بپھرے ہوئے وکیل روسٹم پھلانگ کر مجسٹریٹ کی طرف لپکے کہ اُسے سینئر وکیل صاحب کا حکم نہ ماننے کی پاداش میں پھینٹی لگائی جا سکے مگر وہ عینک نہ ہونے کے باوجود دوڑ کر ملحقہ چیمبر میں گھس گیا اور دروازے کو اندر سے بولٹ کر لیا۔ اُسی سُرعت سے مجسٹریٹ نے چیمبر کے باہر کی طرف کھلنے والے دروازے سے نکلنا چاہا مگر اُسے پہلے ہی باہر سے بند کیا جا چکا تھا۔ اب وہ اپنے چیمبر ہی میں بری طرح محبوس ہو چکا تھا جب کہ باہر نعرہ نما گالیوں کی صورت اُس کے خاندان کی خواتین سے عمر کا لحاظ کیے بغیر ہر قسم کا ناجائز تعلق اجتماعی طور پر جوڑا جا رہا تھا۔

۴

فون پر قدرے طویل گفتگو کے باوجود صاحبزادہ سلطان احمد تونگر کو کچھ یاد نہیں آ رہا تھا کہ اُس نے اللہ ڈنو عبید سے کہاں ملاقات کی ہے۔ جب کہ وہ مصر تھا کہ تونگر صاحب سے دو مواقع پر اُس کی ملاقات ہو چکی ہے۔ پہلی بار کہ جب وہ وفاقی سیکریٹری پیٹرولیم تھے اور دوسری بار کہ جب وفاقی سیکریٹری کامرس۔ اللہ ڈنو عبید نے مزید یاد دلانے کے لیے کچھ ایسے بیوروکریٹ دوستوں کے نام بھی لیے کہ جو تونگر صاحب سے سینئر تھے لیکن اُن میں سے اکثر وفات پا چکے تھے۔ اللہ ڈنو عبید نے تونگر صاحب کی یادداشت کو مزید مہمیز کرنے کے واسطے اُن مرحومین کی کچھ ایسی ذاتی باتیں بھی بتائیں کہ جو اُن کے قریبی دوستوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

اللہ ڈنو عبید کی گفتگو تونگر صاحب کو بہت مہذب اور بھلی لگنے لگی تھی کہ کوئی تو تھا جو ریٹائرمنٹ کے کئی مہینوں کے بعد بھی اُسے اِس قدر عزت اور احترام سے مخاطب کر رہا تھا لیکن حیرت اِس بات کی تھی آخر وہ اُس سے ملاقات کیوں کرنا چاہتا ہے۔ اب وہ اِس حیثیت میں بھی نہیں کہ اُس کے

کام آسکے اور نہ ہی اُن کی دلچسپیاں بظاہر مشترک تھیں کہ جن کے سبب ایک دوسرے سے ملاقات کا ڈول ڈالا جاسکے۔ مسئلہ یہ بھی تھا کہ اللہ ڈنو عبید خود تونگر صاحب کے گھر ملاقات کے لیے آنے کا خواہش مند تھا لیکن وہ کوئی ایسا موقع پیدا کرنے کو تیار نہیں تھا کہ جو اہل خانہ کے رویے کے سبب اس کی سبکی کا باعث بن جائے۔ سردست اُس نے نجی مصروفیت کے زمرے میں شہر سے باہر ہونے کا جواز تراشا اور اُسے اگلے ہفتے فون کرنے کا کہہ دیا۔ لیکن فون بند کرنے کے کئی گھنٹوں بعد وہ اِسی مخمصے میں رہا کہ آخر اُس کا ذاتی فون نمبر اللہ ڈنو عبید کے پاس پہنچا کیسے۔ یہ معاملہ تو یونہی لا ینحل رہا لیکن اِس دوران ایک ہفتہ مزید گزر گیا جس کا علم اُسے اللہ ڈنو عبید کے دوسری بار کے فون سے ہوا۔ پہلے کی طرح بعد سہ پہر کا وقت اور گھر کی لائبریری کے ٹیک شیلفوں میں وہ خود سوئی ہوئی کتابوں کے درمیان آرم چیئر پر کچھ کچھ دراز حالت میں نیم دراز، نیم غنودگی کے عالم میں اونگھتا ہوا موجود تھا۔

موبائل فون کی اسکرین پر عبید کا نام دیکھنے اور اُس کا فون سُننے کی مختصر ترین درمیانی ساعتوں میں صاحبزادہ تونگر کو ایک اور احساس لرزا کر گزر گیا کہ اُس کے مزاج اور فطرت سے جڑا ہوا وہ تجسس کیا ہوا جو اُسے اِس موقع پر مضطرب کیے رکھتا تھا۔ وہ اپنی ذات میں نہاں اُتاولی و اضطراب سے عاری کب سے ہوا کہ ایک اجنبی شخص کا اُس کے معمولات میں یوں گھسے چلے آنا بھی اُسے چونکا نہیں پا رہا خاص طور پر اُس وقت کہ جب اُس کی حیثیت سماج میں تو کیا گھر میں بھی ٹکے کی نہیں رہی تھی۔ ہاں مگر عبید کے پہلے فون کے بعد ایک لمحے کو اتنا سا خیال ضرور آیا تھا کہ اُسے اتنی لمبی مدت کا وقت کیوں دیا۔ کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ اللہ ڈنو عبید کے نام سے جڑی ہوئی تمام نامعلوم پریشانیاں ایک ساتھ جلدی جلدی ختم کر دی جائیں لیکن اِس دوران بھی اپنی بیگم کی اجنبی بے رُخی اور بچوں کی لاتعلقی اعصاب پر اِس قدر سوار رہی کہ گھر کی چار دیواری سے باہر کا خیال تک رسائی نہ پاسکا۔

”صاحبزادہ صاحب لگتا ہے آپ فون آن کرنے کے بعد کہیں کھو گئے، اللہ ڈنو عبید بول رہا ہوں۔“

"جی جی عبید صاحب بس کچھ کچھ نیند کا غلبہ تھا.... آپ سنائیں کیا حال ہیں! ہاں یہ ضرور ہے کہ میں ابھی تک یاد نہیں کر پایا کہ آپ سے اس سے پہلے ملاقات کہاں ہوئی تھی۔"

"آپ چھوڑیں تونگر صاحب! بھول جائیں اُن ملاقاتوں کو.... بس ذہن پر زیادہ زور نہ دیا کریں، ملاقات تو وہ ہوگی جو اَب ہوگی۔" عبید کے لہجے سے سمجھ میں آنے والی معنویت عیاں تھی لیکن صاحبزادہ تونگر نے پھر بھی پوچھ لیا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"میرا مطلب اَب آپ سے کیا ہونا ہے، نہ آپ مجھے کچھ دینے کی پوزیشن میں ہیں اور نہ ہی میں آپ کو کچھ دیتا ہوا اچھا لگتا ہوں کہ آپ کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے، آپ شریف آدمی ہیں مجھے بھلے لگتے تھے تو سوچا کیوں نہ کبھی کبھار مل بیٹھیں، زندگی کو چابک مار کر گھسیٹنے کی بجائے کچھ تو ایسا ہو کہ اِس کا دہی کھویا ہوا احترام واپس ہو، ہڈیوں میں گودا بنے اور رگوں میں بلڈ پریشر اور شوگر کی گولیوں کی بجائے زندگی دوڑے۔"

صاحبزادہ سلطان احمد تونگر سے کوئی جواب نہیں بن پا رہا تھا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا کہ سنٹرل سپیریئر سروس کے زبانی امتحان سے پہلے وہ کسی کھچڑی بالوں والی کھوسٹ ماہر نفسیات کے روبرو ہے جو اپنی برے جیسی آواز اور آتشی نگاہوں سے اُس کا اندر کھنگال لینا چاہتی ہے۔

"صاحبزادہ صاحب! عجیب ہے یہ آپ کی خاموشی بھی.... اِس کے بارے میں پھر کبھی آپ کو حکایت سناؤں گا فی الحال اتنا کہتا ہوں کہ آپ اِکسٹھ برس کے اور میں پینسٹھ کا ہوں، آپ مجھ سے کم عمر ہوتے ہوئے بھی ریٹائر ہو چکے ہیں اور میں اب بھی کام پر ہوں، آپ کو زمانے نے چلے ہوئے کارتوس کی حیثیت دے رکھی ہے اور میں اب بھی فائر کرنے کی پوزیشن میں ہوں، فرق اتنا ہے کہ آپ کے دل میں خوف اور گردن میں سریا ہونے کا احساس اب بھی ہے جب کہ میں نے ان دونوں چیزوں کو اپنے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیا۔"

"میں کیوں کسی سے خوف کھاؤں؟" صاحبزادہ تونگر نے اپنے تئیں گرج کر بات کرنے کی کوشش کی مگر اُس کی آواز میں منمناہٹ تھی۔ اللہ ڈلو عبید نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"میں شاید کچھ غلط بول گیا، پہلے آپ خوف کھاتے تھے مگر اب خوف آپ کو کھا رہا ہے، پہلے ہر قدم پر پکڑے جانے اور ہزار پا پڑتال کر ملنے والی نوکری چلے جانے کا خوف ہوا کرتا تھا مگر اب نوکری چلے جانے کے بعد وہی خوف آپ کو عام آدمی نہیں بننے دے رہا، ہر قدم پر تلوار سونت کر آگے آجاتا ہے کہ خبردار اگر عام آدمی بنے یا عام آدمی جیسی زندگی گزارنے کی کوشش کی تو اس تلوار سے سر قلم.... یہ وہی خوف ہے کہ جو آپ کو مسلسل تنہا کیے جا رہا ہے، گھسیٹے جا رہا ہے زندگی سے دور اور قبر کے نزدیک، جب کہ میں آپ کو اس خوف سے نکال کر عام آدمی کی زندگی دکھانا چاہتا ہوں، عام آدمی کی خوشیاں، عام آدمی کے دُکھ جو اُسے مرتے دم تک تنہا نہیں ہونے دیتے۔"

صاحبزادہ تونگر نے ایک لمبی مگر ٹھنڈی سانس لی۔

"اب تو عبید صاحب مجھے آپ سے بھی خوف آنے لگا ہے۔"

دوسری جانب ایک بلند اور زندگی سے بھرپور قہقہہ گونجتا ہی چلا گیا جس میں تمسخر کی جائے ترحم تھا۔ تونگر کھسیانا ہو گیا۔ "صاحبزادہ صاحب! یہ آپ کا خوف ہی ہے جو آپ کی مجھ سے ملاقات کے بعد آپ کے بے خوف ہو جانے سے خوفزدہ ہے۔"

"عبید صاحب! میں کیوں ہوں گا خوفزدہ اور کس نے کہہ دیا آپ سے کہ میں تنہا ہوں، میں ریٹائرڈ ضرور ہوا ہوں مگر ابھی بے مصرف نہیں ہوا۔ میں حیران ہوں کہ جب آپ سے کبھی میرا ملنا جلنا ہی نہیں رہا، آپ میری یادداشت ہی میں نہیں تو کیوں خوامخواہ میری خود ساختہ فکر کیے جا رہے ہیں، میں جانتا ہوں ایسے حربوں کو اور ہاں کان کھول کر سُن لیں اگر کوئی کام ہے آپ کو مجھ سے تو میں آپ کے کسی کام نہیں آنے والا۔" صاحبزادہ تونگر ایک دم ہی بھتے سے اس طرح اُکھڑا کہ چند ثانیے پہلے کی منمناہٹ، غراہٹ میں بدل گئی۔

"کیا ہو گیا تونگر صاحب آپ کو! اگر آپ کا خوف یہ سمجھتا ہے کہ اس طرح وہ مجھے بھی خوفزدہ کر دے گا یا مجھے آپ سے ملنے نہیں دے گا تو میں ہار مان لوں گا، ہر گز نہیں اور ہاں میں کون ہوں کیا کرتا ہوں یہ سب کچھ آپ کو یاد آجائے گا جب آمنا سامنا ہو گا لیکن یقین رکھیں نہ تو مجھے آپ سے کوئی کام ہے اور نہ ہی آپ کے ذریعے کوئی کام نکلوانے کا ارادہ ہے، میرے کام خود بخود ہوتے

رہتے ہیں کسی سے کہے سنے بغیر۔"

صاحبزادہ سلطان احمد تونگر کو چپ سی لگ گئی۔ اللہ ڈنو عبید کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ سے سچائی جھلک رہی تھی۔ بظاہر اُس کے پاس خواجہ پر اعتماد نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی لیکن اگر کوئی پھانس تونگر کو متذبذب کیے جا رہی تھی تو وہ عبید کا بلا سبب اُس سے ملاقات پر اصرار کرنا تھا۔ "تو کیوں ناں اِس پھانس کو ایک ہی بار باہر نکال پھینکا جائے؟" صاحبزادہ کے ذہن میں گونجنے والے اِس خیال کے علاوہ کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا کہ جس سے اللہ ڈنو عبید کو ٹالا جا سکے۔

"ٹھیک ہے کب اور کہاں ملنا ہے؟" صاحبزادہ کا لہجہ جھکے ہوئے لشکری جیسا تھا۔

"آج شام ہی کو میرے فارم ہاؤس پر..... میں آپ کو خود لینے آ جاؤں گا۔" توقع کے برعکس اگرچہ عبید کا لہجہ کسی بھی قسم کی فاتحانہ مسرت سے عاری تھا مگر اُس میں خلوص کی تشنگی کہیں سے بھی عیاں نہیں ہو رہی تھی۔

"آج نہیں کل....." صاحبزادہ پھر سے تشکیک کا شکار ہو رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں کل ہی سہی لیکن کتنے بجے؟" عبید بدستور نارمل تھا۔

"چار بجے لیکن عبید صاحب آپ نے تکلیف نہیں کرنی، بس ڈرائیور بھیج دیجیے گا جو میری گاڑی کو اسکارٹ کرے گا۔" تونگر صاحب کا لہجہ بھی نارمل ہو رہا تھا کہ جیسے بہت سا ناخوشگوار بوجھ سر سے اتر گیا ہو۔

"میری بات مانیں صاحبزادہ صاحب لیکن آپ نے ماننی کہاں ہے بس اب ڈرائیونگ نہ کیا کریں۔"

"میں کہاں کروں گا ڈرائیونگ؟ میرا ڈرائیور ساتھ ہو گا۔"

"تو میرے ڈرائیور میں کیا حرج ہے؟"

جہاں بھی جائیں، اپنی گاڑی اور ہو سکے تو اپنا ڈرائیور، یہی زندگی بھر میرا اصول رہا ہے۔" صاحبزادہ سلطان احمد کے لہجے میں مزید لچک کی گنجائش نہیں تھی۔

"بہتر آپ آئیں تو سہی، آپ کی ہر بات سر آنکھوں پر۔" اللہ ڈنو عبید نے فون بند کر

دیا لیکن صاحبزادہ سلطان احمد کافی دیر تک سوچتا رہا کہ اُس نے ملاقات کو کل تک تو ٹال دیا ہے لیکن کیا واقعی یہ ملاقات کرنی چاہیے؟ اُسے کسی صورت اللہ ڈنو عبید پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ اُس نے اپنی ملازمت میں نجانے کتنے کاروباری لوگوں سے دھوکے کھائے اور پھر یہی اصول بنا لیا کہ اُن پر کبھی اعتماد نہیں کرنا۔ تونگر کے نزدیک اگر کہیں سے خواجہ کے حق میں کوئی گنجائش نکلتی تھی تو بس اتنی کہ اب وہ ریٹائر ہو چکا تھا لیکن پھر بھی عبید ایک ریٹائر سول سرونٹ سے کیوں اتنا چپکو ہو رہا تھا، اِس کا جواب ابھی اُس کے پاس نہیں تھا۔ اگر کچھ تھا تو بس اتنا کہ اِس مخمصے اور اضطراب نے جہاں اُس کے ذہن میں خلفشار برپا کیا ہوا تھا وہاں دورانِ خون کو بھی اِس قدر مہمیز کر دیا کہ نجانے کون کون سے بِلا نالیوں کے غدودوں (ductless glands) کے منہ اُس کی رگوں میں اِس طرح کھلے کہ زندگی کے احساس سے سرشار کر گئے۔ اُس کا جی چاہا کہ لائبریری کے بیوست زدہ ماحول سے باہر نکل کر زور زور سے چلائے کہ وہ ریٹائر ہونے کے باوجود ابھی تک اتنا کارآمد ضرور ہے کہ عبید جیسا کامیاب اور دولت مند انسان اُس سے ملاقات کا خواہاں ہے۔ اُس ایک لمحے میں اُسے اپنی بیوی اور بچوں کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اب وہ پچھتا رہا تھا کہ اس نے آج ہی اللہ ڈنو عبید سے مل کر یہ ٹنٹا ابھی کے ابھی کیوں نہ مُکا لیا۔

۵

اِس سے پہلے کہ پولیس کی اضافی نفری موقع پر پہنچ پاتی مجسٹریٹ صاحب کی کورٹ کے مرکزی دروازے کے سامنے فائلوں کے ایک ڈھیر کو آگ لگا دی گئی۔ رضوان ہاشمی ایڈووکیٹ کی قیادت میں نوجوان وکلا کی ایک بہت بڑی تعداد نے کمرۂ عدالت اور مجسٹریٹ کے چیمبر کو باہر سے تالا لگا کر وہیں دروازوں کے سامنے برآمدے میں اِس طرح دھرنا دے رکھا تھا کہ پوری کچہری اُن کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ وہ اپنے پرجوش نعروں کے ذریعے وکلا برادری کے اتحاد، عدلیہ کی آزادی اور کرپٹ مجسٹریٹ کی ملازمت سے فوری برطرفی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ لیکن جونہی برآمدے میں عدالتی فائلوں کو آگ لگی رضوان ہاشمی، مہر نور محمد اور صدر بار سمیت دیگر سینئر وکلا وہاں

سے اِس طرح ایک ایک کر کے کھسکے کہ نعرہ زن نوجوانوں کو اس کی خبر ہی نہ ہو سکی۔ فائلوں سے اُٹھنے والے شعلوں کے ساتھ ساتھ اُن کا جوش بھی بدستور بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

اُدھر اپنے چیمبر میں محبوس مجسٹریٹ اندر سے پوری قوت سے دروازے کو تھپتھپائے جا رہا تھا۔ جلتی ہوئی فائلوں سے اُٹھتا ہوا دھواں بند چیمبر کے اندر پہنچا تو مجسٹریٹ پر وحشت طاری ہو گئی۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے ہر حربہ آزما رہا تھا لیکن باہر دھرنا دیے کر بیٹھے ہوئے وکلا کی موجودگی میں کس کی جرات تھی کہ وہ مجسٹریٹ صاحب کے چیمبر کا تالا توڑ کر اُسے باہر نکالتا۔ بے چارہ مجسٹریٹ گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنے اسٹاف اور ذاتی اسکیورٹی کے واسطے تعینات کیے گئے گن مین کو آوازیں دیئے چلا جا رہا تھا مگر اُن میں سے کوئی وہاں ہوتا تو پلٹ کر جواب دیتا۔ وہ تو اُسے محبوس بنائے جانے سے قبل ہی اپنی جان بچانے کے لیے غائب ہو چکے تھے۔ صورت حال انتہائی گھمبیر ہو چلی تھی۔ کچہری میں سکیورٹی پر مامور پولیس کے اہلکار کوئی بھی ایسا قدم اُٹھانے کو تیار نہیں تھے کہ جو مشتعل وکلا کو مزید اشتعال دلانے کا باعث ہوتا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ایسی کسی بھی کارروائی کے نتیجے میں کسی اور کا تو کچھ نہیں ہونا اُلٹا مار بھی اُنھیں پڑے گی اور شاید نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں۔ ایسے میں کچھ ایسے وکلا نے پہل کی کہ جن کا بار کی سیاست سے تو کچھ لینا دینا نہیں تھا لیکن اپنی پیشہ ورانہ سیادت کے سبب نہایت تکریم کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اِن پانچ سات وکلا میں دو تین ایسے بھی تھے کہ جن کا شمار اِس بار کے سینئر ترین وکلا کے بھی اساتذہ میں ہوتا تھا۔ پہلے تو وہ سبھی مجموعی طور پر اِس معاملے میں دخل اندازی سے ہچکچاتے رہے مگر جب دیکھا کہ مجسٹریٹ کی زندگی کو لاحق خطرات کسی بھی لمحے کوئی بدترین شکل اختیار کر سکتے ہیں تو وہ بہت سے دیگر وکلا کے جلو میں آگے بڑھے۔

نعرہ زن وکلا کے جتھے نے یہی سمجھا کہ وہ اُن کے پاس یکجہتی کے واسطے آ رہے ہیں لہٰذا ابھی اُن کی تکریم میں دھرنے سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور ''وکلا اتحاد'' کے نعرے زیادہ شدت سے گونجنے لگے۔ لیکن جیسے ہی اُن سینئرز کے ساتھی وکلا نے آگے بڑھ کر راستہ بناتے ہوئے مجسٹریٹ کے چیمبر کا تالا توڑنے کی کوشش کی تو دھرنا دیئے ہوئے وکلا اُن پر پل پڑے۔ ایسے میں اس سے پہلے

کہ صلح صفائی کے لیے آنے والے سینئر ترین وکلا اپنے فہم سے کوئی بہتر راہ نکالتے۔ کالے کوٹ میں ملبوس کچھ دوسرے لوگوں نے برآمدے میں بنے ہوئے عدالتی اہلکاروں کے کمروں سے چوبی کرسیاں اور بنچیں باہر نکال کر توڑنا شروع کر دیں۔ اس توڑ پھوڑ سے اگر کوئی سالم لکڑی ہاتھ آتی تو اُسے بطور ہتھیار تالا کھولنے والے وکلا پر استعمال کیا جانے لگا جب کہ باقی ماندہ لکڑیوں کی بڑی مقدار کو راکھ ہو چکی فائلوں میں دم توڑتی آگ کو بھڑکائے رکھنے کے لیے اُس کے اوپر ڈال دیا گیا۔

وکلا کی آپس میں سر پھٹول کی نوبت نے اس قدر بگاڑ پیدا کیا کہ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ ایک جتھا مجسٹریٹ کے چیمبر کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسرا اُنھیں روکنے کی سعی میں مصروف تھا۔ ٹوٹے ہوئے فرنیچر کی آگ سے اُٹھنے والا دھواں بھی اپنی پوری کثافت کے ساتھ ہوا کے رُخ کے سبب دروازے کی درزوں سے ہوتا ہوا چیمبر میں جمع ہو رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مجسٹریٹ کے چیخنے چلانے کی آوازیں چیمبر میں بتدریج بھرتے ہوئے دھوئیں کے کارن مسلسل کھانسی میں بدلتی چلی جا رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ صورتِ حال مزید بدتری کی طرف جاتی نجانے کس طرف سے پولیس کی بہت بڑی تعداد لاٹھیاں اور شیلڈز اُٹھائے ایک دم وہاں پہنچی اور وکلا سمیت اُن سبھی لوگوں پر ٹوٹ پڑی جو مجسٹریٹ کے کمرۂ عدالت اور چیمبر کے داخلی دروازوں پر آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے یا دھرنا دیئے بیٹھے تھے۔ سر پر اچانک پڑنے والی اس اُفتاد نے وکیلوں کے دونوں جتھوں کو ایک ہی انداز میں حواس باختہ کر دیا۔ ابھی وہ کچھ سمجھنے بھی نہ پائے تھے کہ کچھ کے سر لہولہان اور کئی کی وہ تمام جگہیں دردناک حساسیت کے ساتھ سوجنا شروع ہو گئیں کہ جہاں جہاں لاٹھیوں کے وار پڑے تھے۔

اس عجب صورتِ حال کا غضب پہلو پولیس کی اس حقیقت سے بے خبری تھی کہ کس جتھے نے مجسٹریٹ صاحب کو یرغمال بنا کر چیمبر میں بند کیا ہوا تھا اور کون سے وکیل اُسے چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ نتیجتاً ایک طرف پولیس ہر دو جتھوں کے وکیلوں سے ایک جیسا سلوک کر رہی تھی اور دوسری جانب مجسٹریٹ کو چھڑانے والے وکلا بھی پولیس کے تشدد کی زد میں تھے۔ یہ کارروائی کچھ

تھے

دیر اور رہی تو وکلا کے دونوں دھڑے برآمدے سے نکل کر عدالتوں کے سامنے بنے ہوئے وکیلوں کے چیمبرز میں گھس گئے تا کہ پولیس کے تشدد سے بچ سکیں۔ وکیلوں کو یوں تتر بتر ہوتے دیکھ کر پولیس کے کچھ سپاہیوں نے مجسٹریٹ کے چیمبر کا تالا توڑا اور دروازے کے قریب فرش پر نیم بے ہوش پڑے ہوئے مجسٹریٹ کو باہر اُٹھا لائے۔ اِس دوران پولیس کی کمان کرنے والے آفیسر نے شاید پہلے سے بندوبست کر رکھا تھا لہٰذا مجسٹریٹ صاحب کے باہر لائے جاتے ہی مقامی ہسپتال کی ایمبولینس بغیر سائرن بجائے ایک دم وہاں پہنچ گئی۔ پولیس کے سپاہیوں نے اگرچہ نہایت سرعت سے مجسٹریٹ صاحب کو اُس میں منتقل کرنے کی کوشش کی مگر پھر بھی قریبی چیمبرز میں چھپے ہوئے کچھ وکیلوں نے باہر نکل کر پہلے تو ایمبولینس کا گھیراؤ کرنا چاہا تا کہ مجسٹریٹ کو وہاں سے نہ لے جایا جا سکے لیکن جب اِس میں ناکامی ہوئی تو انھوں نے ایمبولینس کے ساتھ ساتھ پولیس پر بھی پتھراؤ شروع کر دیا۔

پولیس کو شاید وکلا سے اِس قسم کے ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ پتھراؤ شروع ہوتے ہی ڈنڈا بردار سپاہی اپنی پوزیشنز پر نہ ٹھہر سکے اُلٹا ایمبولینس کے عقب میں پناہ لینے کے لیے لیکن ایمبولینس کا ڈرائیور اُن سے زیادہ تیزی کے ساتھ گاڑی باہر نکال کر لے گیا مگر پھر بھی پیچھے سے پڑنے والے ایک پتھر کے نتیجے میں عقبی اسکرین ایک دھماکے کے ساتھ اُسی لمحے بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ کر کچھ ایمبولینس کے اندر اور کچھ باہر گر گئی۔ یوں ایمبولینس کی آڑ میں چھپنے کی ناکام کوشش کرنے والے لاٹھی بردار سپاہی اور پتھر بردار وکلا ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ گئے۔ جہاں لاٹھی ہاتھ میں با آسانی اور نہایت قریب سے گھمائی جا سکتی ہو وہاں پتھروں کی تواتر کے ساتھ سپلائی اور بازو گھما کر نشانہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔ عدالتی احاطہ میں بھی یہی ہوا۔ بھاگتی لاٹھیوں نے پتھروں کی بوچھاڑ میں ذرا سا وقفہ پاتے ہی ننگے سروں پر یوں جم کر برسات کی کہ کالا کوٹ پہننے والوں کی اکثریت اپنے ہی لہو سے تر بتر دکھائی دینے لگی۔

صورتِ حال جونہی پولیس کے بنیادی پلان کے برعکس ہوئی، آپریشن کی قیادت کرنے والے ڈی ایس پی نے نفری کی فوری واپسی کا حکم دیا اور خود سب سے پہلے موقع سے غائب۔ اُدھر

اِس جگہ سے چند گز کے فاصلے پر تحصیل بار ایسوسی ایشن کے کمرۂ اجلاس میں سینئر وکیل رضوان ہاشمی صدر بار کو دی جانے والی درخواست کے ذریعے بار کی مجلس عاملہ کا ہنگامی اجلاس طلب کرا چکا تھا جس میں ماتحت عدلیہ میں بڑھتی ہوئی کرپشن، بداخلاقی اور وکلا صاحبان کی قصداً تذلیل کے خلاف موثر لائحہ عمل اور راست ایکشن اختیار کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اجلاس کے فوری طور پر شروع کرائے جانے کے لیے حکمت عملی یہ اختیار کی گئی کہ ممبران کو تحریری اطلاع یابی کی بجائے اُنھیں جونیئر وکلا اور سینئر منشیوں کے ذریعے انفرادی طور پر بلایا گیا جس کے نتیجے میں اُن کی اکثریت بار روم میں پہنچ چکی تھی۔

لیکن اِس سے پہلے کہ یہ اجلاس شروع ہو پاتا ایک نوجوان وکیل اپنے زخمی سر سے بہتے خون کو روکنے کی کوشش میں حواس باختہ ہو کر تقریباً دوڑتا ہوا بار روم میں داخل ہوا اور وہاں موجود سینئر وکلا کو دیکھتے ہی چیخ چیخ کر پولیس آپریشن اور اُس کی جانب سے روا رکھے گئے ظلم و تشدد کی داستان سنانے لگا۔ جونیئر وکیل کے ماتھے سے بہتے لہو اور چہرے پر پھیلے ہوئے کرب نے بار روم میں موجود وکیلوں کو مشتعل کر دیا۔ اُنھوں نے سینئرز کو واضح طور پر کہہ دیا کہ اب نہ تو کوئی اجلاس ہو گا اور نہ ہی کسی سے مطالبہ یا مذاکرات بلکہ جو بھی ہو گا وہ دمادم مست قلندر ہو گا، نہ صرف عدالتوں میں بلکہ سڑکوں پر بھی۔ وہاں موجود کچھ سینئرز نے انھیں سوچ بچار کے بعد کوئی متبادل احتجاج تجویز کرنے کو کہا مگر وہ اُنھیں ایک طرف دھکے دیتے ہوئے بار روم سے باہر نکل آئے۔ ایسے میں باہر کی صورت حال نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

دس بارہ کے قریب نوجوان وکیل اپنے پھٹے ہوئے سروں اور پھٹی ہوئی یونیفارم میں لڑکھڑاتے ہوئے ایک جلوس کی صورت بار روم کی طرف چلے آ رہے تھے۔ اُن کے ساتھ اور پیچھے پیچھے تقریباً ستر اسی وکلا کا جتھا پولیس اور عدلیہ کے گٹھ جوڑ کو ناپاک قرار دیتے ہوئے اُن کے خلاف ہر ممکن ساخت کے نعرے لگاتا ہوا آ رہا تھا جن سے فہم کی بجائے اشتعال اور ایذا کا پہلو نمایاں تھا۔ حیران کن بات یہ بھی تھی کہ اِس جتھے میں وہ وکلا بھی شامل تھے کہ جو کچھ دیر پہلے مجسٹریٹ کو بچانے کی کوششوں میں دوسرے فریق کے ساتھ گتھم گتھا رہے تھے۔ لیکن پولیس کے نظریاتی مساوات

کے تحت کیے گئے اندھا دھند لاٹھی چارج نے اُن کے سیاسی تفرقے مٹا کر کم از کم آج کے دن کے لیے اُنھیں ایک مقصد کے تحت اکٹھا کر دیا تھا۔

بار روم سے باہر نکلنے والے پرجوش وکلا نے اپنے ہم پیشہ دوستوں کو یوں لہولہان دیکھا تو آپے سے باہر ہو گئے۔ اشتعال، اشتعال سے ملا تو جذبات کا بند ٹوٹ گیا اور تشدد کا در آنا فطری امر بن کر رہ گیا۔ دونوں جلوس آمنے سامنے آئے تو کچھ جذباتی نوجوان زخمی وکلا سے بغل گیر ہوتے ہوئے بلک بلک کر رونے لگے۔ رضوان ہاشمی نے صورتِ حال کو اپنے ہاتھوں سے نکلتے دیکھا تو ایک طرف ہو کر زخمیوں کو فوری طور پر ہسپتال پہنچانے کی آوازیں دینے لگا لیکن ایسے میں کون اُس کی طرف متوجہ ہوتا لہٰذا وہ خود ہی اپنے آپ کو ہجوم کی پچھلی صفوں میں گنجائش کے مطابق دھکیلتا چلا گیا۔ کچھ ہی لمحوں میں دونوں مشتعل جلوس آپس میں مدغم ہوئے تو سینئر جونیئر کی تفریق جاتی رہی۔ معاملہ اب صلح جو اور پیشہ ور وکلا کے ہاتھ سے نکل کر انتہا پسندوں کے ہاتھ میں آ چکا تھا جو ہر قیمت پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ روا رکھی گئی خونریزی کا انتقام پولیس اور انتظامیہ سے لینا چاہتے تھے۔ مجسٹریٹ کی عدالت سے شروع ہونے والا قضیہ اب کہیں پس منظر میں جا چکا تھا اور زخمیوں کی کسی کو پروا نہیں رہی تھی۔ اتنے میں رضوان ہاشمی کو اطلاع ہوئی کہ دو مہینے بعد ہونے والے بار کے الیکشن نے پہلے اپنی دھاک بٹھانے کا خواہاں صدارتی امیدوار خوشحال خان عرف خوشی خان ایڈووکیٹ بھاگم بھاگ اِس موقع کو کیش کرانے کے لیے جلوس کی پہلی صف میں پہنچ چکا تھا لہٰذا وہ اور اُس کے حواری اب ہر قیمت پر کسی زخمی وکیل کو لاش کی صورت دیکھنا چاہیں گے تا کہ ایک ہی ہلے میں پولیس، عدلیہ اور انتظامیہ کو اُبھرتی ہوئی وکلا قیادت اور سیاست کے سامنے سرنگوں کیا جا سکے۔ صوبائی بار کونسل کا پانچویں بار ممبر بننے کے لیے رضوان ہاشمی کی بچھائی گئی بساط اُلٹ چکی تھی۔ بہتر یہی تھا کہ ہزیمت کی اِس گھڑی میں وہ اپنا آپ اور اپنی سیاست بچا کر موقع سے نکل لیتا۔ اُسے اس موقع کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جونہی خوشی خان نے جلوس کو ڈی ایس پی اور اسسٹنٹ کمشنر کے دفاتر پر حملہ کرنے کی شہ دینے کے واسطے اشک بار آنکھوں اور اپنی گرجدار مگر بھرائی ہوئی آواز میں تقریر شروع کی تو رضوان ہاشمی نے سر چکرانے کو جواز بنا کر پہلے بیٹھنے کے لیے اِدھر

اُدھر کوئی جگہ دیکھی اور پھر سر کو تھامے ہوئے دبے پاؤں قریبی دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ جب کہ جلوس خوشحال خان کی قیادت میں پولیس اور انتظامیہ کے خلاف ہر قسم کے نعرے لگاتا ہوا ڈی ایس پی کے دفتر کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا تھا۔ زخمی وکلا میں سے چند ایک کو تو جلوس کی پہلی قطار میں کندھوں پر اُٹھا لیا گیا تھا مگر کچھ ایسے بھی تھے کہ جو بار روم کے سامنے کے اِس میدان میں بدستور لہولہان چہرے اور پھٹی ہوئی آنکھیں لیے اپنی ہی برادری کے جتھے کو حملے کے واسطے جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ شاید اُن میں سے کچھ جان بھی چکے ہوں کہ آج کے واقعہ کی قیادت اَب اُن کے گروپ کے ہاتھ میں نہیں رہی تھی۔

۹

اللہ ڈنو عبید کا ڈرائیور چار بجنے سے کچھ منٹ پہلے پہنچا تو صاحبزادہ سلطان احمد تونگر بھی تیار ہو کر گھر سے باہر آیا ہی چاہتا تھا۔ جونہی عبید کے ڈرائیور کے آنے کی اطلاع ہوئی تو وہ بھی برآمدے کی سیڑھیاں اُتر کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ دو گاڑیاں ایک دوسرے کے پیچھے قافلے کی صورت اُس کے بنگلے سے نکل کر اپنی منزل کی جانب روانہ ہو چکیں تو اُس کی بیگم کے بیڈ روم کے ایک کونے میں رکھے ہوئے کنسول پر نصب ایل ای ڈی مانیٹر بھی خود بخود آف ہو گیا کہ جس کے ساتھ گھر کے تمام کلوز سرکٹ کیمرے رابطے میں تھے۔

بظاہر کوئی بات نہ ہوتے ہوئے بھی صاحبزادہ تونگر کے ذہن میں کوئی تو ایسی بات تھی کہ اُس نے ایک عرصے کے بعد دن کا زیادہ تر حصہ اپنے آج کے لباس کے انتخاب میں گزار دیا تھا۔ بیگم سے کچھ کہے سُنے بغیر کئی بار لباس پر بلاوجہ کی نظر ثانی اور معمول سے ہٹ کر کافی دیر تک باتھ روم میں اُس کی موجودگی اور نہانے دھونے کے بعد کی مصروفیت نے بھی تکان کی بجائے اُس کے چہرے کو تتمار رکھا تھا۔ بے توقیری اور بے کاری کے دنوں میں بھی اپنے کارآمد اور بااثر ہونے کے احساس نے مزاج کو کچھ ایسا تڑکا لگایا کہ وہ ساری جولانیاں جو قصہ ماضی ہو چکی تھیں، اِدھر اُدھر کونے کھدروں سے نکل کر پھر سے پوری کی پوری شخصیت پر حاوی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہی

دبدبہ، وہی طنطنہ اور اُسی طرح گردن میں ہلکا سا اکڑاؤ۔ دیکھنے کی حد تک اگرچہ یہ بدلاؤ تونگر صاحب کے معمولات میں آیا تھا لیکن اضطراب اُن کی بیگم کو لاحق ہو چکا تھا۔ کئی بار سوچا کہ جا کر پوچھے کوئی کنٹریکٹ جاب مل گئی یا کسی بزنس کا ارادہ ہے لیکن پھر خیال آتا کہ کنٹریکٹ جاب اگر ملی ہوتی تو اب تک میڈیا پر ایک ہنگام نہ بپا ہوتا کیونکہ بائیسویں گریڈ کے ریٹائرڈ آفیسر کو کوئی ایسی ویسی جاب تو ملنے سے رہی، کم سے کم کسی بڑے سرکاری ادارے کی سربراہی ہی ہوتی۔ جہاں تک تعلق تھا کاروبار کا تو وہ سرمایے کے بغیر کہاں سے ہوتا کہ جو کچھ تھا وہ تو اُس کے اور اُس کے بیٹوں کے نام منتقل ہو چکا تھا۔ اِس کے باوجود آج بیگم تونگر کا یوں استفسار کرنے کی خواہش کرنا کچھ زیادہ ہی انا کے آڑے آ رہا تھا سو معاملے کو تغافل پر یوں رکھا کہ نظر انداز کیے جانے کے باوجود نگاہ پھر بھی تونگر صاحب کی مصروفیت پر رہے۔ لیکن یہ سب کچھ پھر بھی بیگم تونگر کے واسطے سوہانِ روح ہی بنا رہا کہ اپنی طبع کے برعکس تونگر صاحب کچھ کہے سُنے بنا ٹھیک چار بجے ڈرائیور کے ساتھ گھر سے یوں نکل گئے کہ جیسے کبھی شناسائی ہی نہ رہی ہو۔ اِس غیر متوقع اور ناپسندیدہ صورت حال کے باوجود بیگم تونگر پریشان اِس لیے نہیں ہو رہی تھی کہ ساٹھ برس سے متجاوز یہ کھوسٹ تونگر کسی اور عورت کے حلقۂ دام کا اسیر ہو کر بھی کسی جائیداد کی بربادی کا سبب ہو ہی نہیں سکتا۔ جسمانی اور مالی طور پر اَب اُس کے پلے رہا ہی کیا تھا، پریشانی تھی تو بس اتنی کہ اُس کا تونگر سے نجات کا کم مدتی منصوبہ شاید ناکام ہونے جا رہا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ ایک بہت بڑے ریٹائرڈ بیوروکریٹ کی بیوی بن کر زندہ رہنے سے کہیں زیادہ بہتر تھا کہ اُس کی بیوہ بن کر باقی ماندہ زندگی کسی چڑ چڑے ساس نما شوہر کی اذیت ناک صحبت کے بغیر پرسکون طریقے سے گزاری جائے۔ اُسے مالدار بیواؤں کی آزاد زندگی پر رشک آتا تھا۔ اُس نے عرصے سے سوچ رکھا تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد تونگر کو اِس طرح مسلسل تنہائی اور ڈیپریشن میں رکھے گی کہ زیادہ نہیں تو ایک سال کے اندر ہی اُس کے کریہہ وجود سے نجات حاصل ہو سکے۔ مگر یہ کون تھا کہ جو تونگر کو نئی زندگی دے کر اُسے یقینی موت سے دور کیے جا رہا تھا۔ انتہائی محنت سے پیدا کیے ہوئے ڈیپریشن اور روا رکھے گئے تضحیک آمیز رویے سے اُس نے تونگر کو گھر کی

لائبریری تک تو پہنچا دیا تھا مگر نجانے کس کی اُس تک رسائی ہوئی کہ اُسے پھر سے زندہ ہونا پڑا، تمام تر زندگی کے ساتھ۔ ایسے میں بیگم تونگر کے ذہن میں دبا ہوا شبہ پھر سے سر اُٹھانے لگا تھا کہ اِس شاطر بیوروکریٹ نے کہیں کوئی خفیہ زرِ کثیر یا جائیداد بے نامی طور پر کہیں الگ نہ رکھی ہوئی ہو گرنہ ہر قسم کی جائیداد سے محروم کر دیا گیا، پنشنر کس طرح اتنے تیقن سے زندگی کی گاڑی کو بیس برس پیچھے کی طرف موڑ سکتا تھا۔

اللہ ڈنو عبید کا فارم ہاؤس اگرچہ شہر سے کافی ہٹ کر تھا مگر شہر کے انٹرنیشنل ایئرپورٹ سے ملحقہ بہت بڑی نجی ہاؤسنگ سوسائٹی میں واقع ہونے کے سبب دوری کا احساس راستے میں پڑنے والی دو رویہ بلند و بالا عمارتوں کے جھرمٹ میں کہیں کھو کر رہ جاتا تھا۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے دونوں گاڑیاں معروف نجی ہاؤسنگ سوسائٹی کی رن وے نما شاہراہوں سے ہوتی ہوئی ایک ایسے علاقے میں داخل ہو گئیں جہاں دور دور تک صرف چار فارم ہاؤسز کی طویل و عریض فصیل نما چاردیواریوں کے سوا اگر کچھ تھا تو سڑک کے دونوں جانب سبزے کی بہتات اور اُس کے درمیان برابر برابر فاصلوں پر پھولدار پودوں کے تختے جن کے درمیان میں پام کے ایک ہی قامت کے تنومند ایستادہ درختوں کی حدِ نظر تک قطار جو سامنے کی وسیع مگر کسی بھی قسم کی تعمیرات سے پاک گرین بیلٹ میں قطار اندر قطار ہو رہی تھی۔ اگرچہ یہ منظر کسی عام آدمی کو مرعوب کر دینے کے لیے کافی تھا لیکن صاحبزادہ سلطان احمد تونگر کے چہرے پر نہ تو کسی قسم کی مرعوبیت تھی اور نہ ہی ناگواری کے تاثرات۔ بس ایک سپاٹ انداز میں اُس کی نگاہیں عقبی آئینے میں اپنے ڈرائیور کی نگاہوں سے ہوتی ہوئی ونڈ اسکرین کے اُس پار جمی ہوئی تھیں بالکل اُسی انداز میں کہ جب وہ صوبائی چیف سیکریٹری کی حیثیت سے ڈویژنل ہیڈ کوارٹرز کے دورے کیا کرتا تھا۔ گو کہ کوئی بھی صوبائی چیف سیکریٹری، وفاقی سیکریٹری کے عہدے پر تعیناتی ہونا پسند نہیں کرتا لیکن تونگر صاحب کی رعونت پہلے وفاقی سیکریٹری داخلہ اور پھر سیکریٹری کامرس تعیناتی کے بعد پہلے سے سوا ہو گئی تھی۔ آج پھر کئی مہینوں کے بعد اُس کی آنکھوں میں وہی زندگی، چہرے پر وہی رعونت اور نشست و برخواست میں نیم مردنی کی جگہ پہلی سی بشاشت آ چکی تھی۔

جونہی دونوں گاڑیاں سب سے آخری فارم ہاؤس کے خودکار آہنی گیٹ کے سامنے آئیں وہ ایک لمحے کی بھی تاخیر کیے بغیر خود بخود استقبالیہ انداز میں کھلتا چلا گیا۔ صاحبزادہ تونگر کے لیے اگر کوئی بات چونکا دینے والی تھی تو وہاں کسی سیکورٹی گارڈ کا نہ ہونا تھا۔ یقیناً گیٹ سمیت سیکورٹی کے تمام معاملات کو کسی نامعلوم جگہ پر واقع مرکزی کنٹرول روم سے آپریٹ کیا جا رہا تھا۔ صاحبزادہ تونگر کو ماحول میں بھی عجیب سی پراسراریت محسوس ہونے لگی تھی۔

''کیا اللہ ڈنو عبید ویسا ہی ہو گا کہ جیسا اپنی گفتگو سے ظاہر ہوتا رہا ہے؟'' اُس کی گاڑی جوں جوں اگلی گاڑی کے تعاقب میں آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی توں توں تونگر کی ذہنی حساسیت کا گراف بھی اوپری سمت مائل ہو رہا تھا۔ گاڑی کافی دور تک رواں رہنے کے بعد دو موڑ مزید مُڑی تو فارم ہاؤس کی وسعت کا احساس ماحول پر چھائے ہوئے بوجھل پن کو اور بھی بوجھل کرنے لگا۔ گاڑیوں نے یکے بعد دیگرے کئی اور موڑ لیے اور پھر ایک دم کسی وسیع پورچ میں رُک گئیں جہاں سیاہ رنگ کے پینٹ کوٹ میں ملبوس ایک خوبرو نوجوان خوشگوار تمکنت کے ساتھ حالتِ انتظار میں تھا۔ اگلی گاڑی دوسرے ہی لمحے پھر سے آگے بڑھی اور کسی موڑ کی اوٹ میں چلی گئی۔

اگرچہ نوجوان نے تونگر صاحب کی گاڑی کا دروازہ کھول کر اُسے باہر آنے میں تعظیم کا احساس دلانے کی پوری کوشش کی لیکن تونگر کے رویے سے قطعی محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اِس نوعیت کے غیر متوقع استقبال سے ذرہ برابر بھی مرعوب یا مطمئن ہوا ہو۔ اُس کا رویہ سرد سے بھی کہیں بڑھ کر درشت ہو چلا تھا۔ اُسے کچھ کچھ یاد تھا کہ نوجوان نے آگے بڑھ کر اُس سے مصافحہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اللہ ڈنو عبید کی عدم موجودگی کے سبب اُس نے خود ہی اُس کی جانب ہاتھ بڑھانا ضروری نہیں سمجھا۔ بیوروکریسی کے اعلیٰ ترین مناصب پر تعیناتی کے شخصی اثرات کے پس منظر میں اُس کا ردعمل فطری تھا۔ اُسے آج کی ملاقات کے لیے آمادہ کرنے کے واسطے جس طرح اللہ ڈنو عبید نے خوشامد اور چاپلوسی سے کام لیا تھا اُس کے بعد بھی استقبال کے لیے اُس کی عدم موجودگی اُسے ایک باوقار انسان کی بجائے پرلے درجے کا گھٹیا اور بے توقیر متکبر ثابت کر رہی تھی۔ صاحبزادہ تونگر زہر کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

خوبرو نوجوان اُسے ڈرائنگ روم کے اندر لے جانے کے لیے اپنے بازو پھیلائے ہوئے تھا لیکن تونگر اپنے آپ کو پرسکون رکھنے کے لیے وہیں پورچ اور برآمدے کی پانچ چھ سیڑھیوں کے درمیان میں کھڑے ہو کر اُس راستے کو دیکھنے لگا کہ جس راستے سے اُس کی گاڑی یہاں تک پہنچی تھی۔ اب کے تونگر صاحب کو اچھا خاصا جھٹکا لگا کہ یہاں تک پہنچنے والا راستہ سیدھا ہونے کی بجائے کسی جلیبی کی مانند تھا۔ خوبرو نوجوان نے تونگر صاحب کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھے تو کچھ بولے بنا محض مسکرانے پر اکتفا کیا۔ اس دوران وہ اُسے اندر چلے جانے کے لیے مسلسل اور ہر ممکن تعظیم کے ساتھ اپنے بازوؤں پھیلائے کھڑا رہا۔ تونگر صاحب کی نگاہ اپنے ڈرائیور کے چہرے پر پڑی۔ اُس کے چہرے پر بھی اطمینان کی بجائے بدگمانی ہی تھی کہ جیسے آنکھوں آنکھوں میں اُسے اندر جانے سے منع کر رہا ہو۔ ڈرائیور کا یوں دیکھنا گومگو میں پھنسے ہوئے تونگر صاحب کے لیے فیصلے کا پروانہ ثابت ہوا کہ اُس نے ہمیشہ ڈرائیور کی رائے کے برعکس فیصلوں کو ترجیح دی تھی۔ قیمتی لکڑی کا بلند دروازہ کوئی بھی آواز پیدا کیے بغیر کھلا اور تونگر نپے تلے قدموں سے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔

ڈرائنگ روم بھی اُس کی توقعات سے زیادہ وسیع و عریض تھا۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کس صوفے پر کس طرف چہرہ کر کے بیٹھے، خوبرو نوجوان نے ایک بغلی دروازے کی جانب اشارہ کیا کہ جہاں عام طور پر کچن بنائے جاتے ہیں۔ لیکن وہاں کچھ بھی کچن نما نہیں تھا بلکہ ایک اور نشست گاہ تھی کہ جہاں صوفوں کی ترتیب غیر رسمی سی تھی لیکن کمرے کی وسعت اور فرنیچر کے معیار میں سرمو فرق بھی نہیں تھا۔

''تشریف رکھیں''۔ خوبرو نوجوان نے تونگر صاحب کو ایک عمدہ نشست پر بیٹھنے کی دعوت دی کہ جو سب سے زیادہ آرام دہ زاویے سے ترتیب دی گئی تھی۔ لیکن تونگر وہاں بیٹھنے سے ہچکچا رہا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ عبید اگر گھر سے باہر اُس کے استقبال کو نہیں آسکا تو اُسے اس نشست گاہ میں ضرور اُس کی آمد سے پہلے موجود ہونا چاہیے تھا۔ اُس کے نزدیک یہ بداخلاقی اور بدمزاجی کی انتہا تھی۔

''اگر آپ کو یہ نشست پسند نہیں آئی تو جہاں چاہیں وہاں تشریف رکھیں''۔ خوبرو نوجوان نے اپنے بازو کمرے کی وسعت کے زاویے پر پھیلا دیے۔

''میں یہاں بیٹھنے سے پہلے عبید صاحب سے ملنا چاہوں گا''۔ تونگر صاحب کے لہجے میں درشتی کے ساتھ چڑچڑاپن بھی دخیل ہو چکا تھا۔ خوبرو نوجوان ایک لمحے کے لیے جھجکا، گُم سُم ہوا اور پھر بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔

''تونگر صاحب! حیرت ہے، میں ہی تو ہوں اللہ ڈنو عبید، آپ کا خادم، آپ کا میزبان''۔

''لیکن آپ تو آپ تو، نوجوان ہیں؟'' تونگر کا چہرہ شرمندگی، خجالت اور اُلجھاؤ کی آماجگاہ بن چکا تھا۔

''آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں بوڑھا ہوں! بس آپ سے بڑا ہوں لیکن بوڑھا نہیں، خیر آپ تشریف رکھیں اور یوں سمجھ لیں کہ یہ ایک راز ہے، گپ شپ چلے گی تو اس کے سمیت کئی اور راز بھی کھلیں گے''۔

۷

دن بھر میدانِ جنگ بنی رہنے والی تحصیل کچہری سے تقریباً تین سو کلومیٹر دور لاہور کے مہنگے ترین رہائشی علاقے میں واقع چار کنال پر پھیلے ہوئے جدید طرز کے بنگلے کے بیڈروم میں فوم کے گدے سے مزین ڈبل بیڈ کی جگہ منقش رنگلے پایوں والی بھاری بھرکم چارپائی بچھی تھی۔ سنہری رنگت کے سچے بان سے بنی اور خوب کھنچائی کے بعد تن تناتی ہوئی اِس چارپائی کی پائنتی کی جانب سیاہ اور سفید سُوت سے دستی کھڈی پر بُنا ہوا چارخانوں والا کھیس بچھا تھا اور سرہاندی کی طرف روئی سے بھرے ہوئے تین گُپلے گُپلے سرہانے کہ جیسے ابھی تازہ دھنکی ہوئی روئی سے بھر کر رکھے گئے ہوں۔ کمرے میں صوفہ یا بیڈروم چیئرز کی جگہ دو دو کا سیٹ بنا کر سنہری سرکنڈوں اور سچے بان کے بنے ہوئے ٹیک دار موڑھے رکھے ہوئے تھے جو پہلی نظر میں غیر ملکی ٹائلوں والے چمک دار فرش پر اپنی موزونیت کے جواز کی جستجو میں حیران حیران دکھائی دیتے تھے۔

کمرے میں اگرچہ روشنی کم اور اندھیرا زیادہ تھا مگر پھر بھی آمنے سامنے رکھے موڑھوں میں سے ایک پر ٹانگیں پسارے اور دوسرے پر آنکھیں موندے ٹیک لگائے تقریباً نیم دراز حاجی بخشن اپنے چہرے کے کرخت نقوش سے اپنی پہچان آپ کرا رہا تھا۔ بند کمرے میں حقّے کی گڑگڑاہٹ اور گُڑ ملے تمباکو کی بو کے ساتھ ساتھ ہلکا ہلکا دھواں ماحول کو مزید کثیف اور بوجھل کیے جا رہا تھا۔ لیکن اِس کے باوجود حاجی بخشن کے پیروں کی جانب فرش پر بیٹھ کر اُس کے پاؤں اور پنڈلیوں کی مالش کرتی ہوئی سولہ سترہ برس کی لڑکی اپنی پوری آنکھیں کھولے اِس طرح کھانسی روکنے کی کوشش میں تھی کہ نہ تو اُس کی آواز گلے سے باہر نکلنے پائے اور نہ ہی اُس کے ہاتھوں کی جنبش میں کمی واقع ہو۔ کھانسی روکنے کی کوشش میں اُس کی لمبی گردن، جبڑوں سے ملاپ کے مقام پر بار بار پھول رہی تھی لیکن حاجی بخشن کے آنکھیں کھول لینے کا خوف اُسے دہشت زدہ کیے ہوئے تھا کہ ہر بار ایسی کیفیت سے باہر آنے کے بعد وہ اُسے بہت بری طرح جسمانی تشدد کا نشانہ بناتا تھا۔

حاجی بخشن لڑکی کی اِس کیفیت سے بظاہر بے خبر بدستور آنکھیں موند کر حقّے کے طویل کیسلے کش لیتے ہوئے دن بھر کی تھکن سرسوں کے تیل کی چکناہٹ اور لڑکی کی نرم نرم انگلیوں کے لمس کی گرمائش سے اُتار پھینکنا چاہتا تھا۔ کل شام سے مسلسل نہ صرف اُس کا ذہن بلکہ جسم شدید تھکاوٹ کا شکار تھا۔ اُس کے لیے یہ بات قطعی ناقابلِ فہم تھی کہ اُس کے ہوٹل نما قحبہ خانہ پر مقامی ایس ایچ اُو ریڈ کرے کہ جس کے تھانے کی دو دو گاڑیاں ہر وقت اُس کے کاروبار کی حفاظت کے لیے موجود رہا کرتی تھیں۔ محض ایک دن پہلے ہی اُسے منتھلی کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اُس کی فرمائش پر اِس حرام زادی شہزادی کو اتنی دور سے منگوا کر اُس کے ساتھ شب بسری کے لیے بھیجا تھا۔ حالانکہ وہ حرامی جانتا تھا کہ شہزادی صرف اور صرف بخشن کے لیے اور اُسی کے روز ینے میں ہے۔ مگر پھر بھی فرمائش اپنے لیے کی مگر اُسے حوالے اپنے مہمانوں کے کر دیا جنھوں نے رات سے دوپہر تک ہر طرف سے اُس کی بوٹی بوٹی اُدھیڑ کر رکھ دی۔ نہیں معلوم کہ اِس کے باوجود اُس بھڑوے نے کس ولدالحیض کی اُنگشت پر ریڈ کیا اور اُسے ذلیل کر کے رکھ دیا۔ حاجی بخشن کو غصہ ریڈ کا نہیں تھا بلکہ اِس بات کا تھا کہ اُس کے بہترین ورکر خوامخواہ رسوا ہو کر رہ گئے۔ شاید ایس ایچ اُو نہیں جانتا تھا کہ

حاجی بخشن میں اتنی طاقت ہے کہ مجسٹریٹ کو جوتے پڑوا دے، ریکارڈ کو آگ لگوا دے اور وکیلوں کے ذریعے نہ صرف اسسٹنٹ کمشنر بلکہ مجسٹریٹ اور ڈی ایس پی کے دفاتر کو بھی تہس نہس کرا دے۔

حاجی بخشن نے حقے کا ایک بہت ہی طویل کش اِس طرح لیا کہ پورے کے پورے تمباکو کو ساڑ کے سُوا کرتے ہوئے چلم کی جان ہی نکال لی۔ چلم کی جان تو نکلی سو نکلی اُس کی آنکھوں سے بھی پانی بہنا شروع ہو گیا۔ یوں آنکھیں کھلیں تو سیدھی شہزادی پر جا ٹکیں۔ سر جھکائے اُس کے پاؤں پنڈلیوں کی مالش کرتا دیکھ کر حاجی بخشن ایکدم پسیج سا گیا۔ "کیا سوچتی ہو گی شہزادی کہ کمال کا غیرتی راکھا ہے، اپنے روز ینے میں بٹھا کر راتیں گزارنے تھانیدار کے پاس بھجوا دیتا ہے کہ وہ اُسے خود وَرتے یا پُٹھا سِدھا کرنے جانگلیوں کے پاس بھجوا دے"۔ حقے کی گُڑ گُڑ بند ہوئی تو شہزادی نے کنکھیوں سے بخشن کی طرف دیکھا۔ اُسے کھلی آنکھوں سے اپنی طرف دیکھتا دیکھ کر اُس کی کافی دیر سے گلے میں پھنسی ہوئی کھانسی بھی ایک دم کسی گولے کی طرح پھٹ پڑی۔ بخشن گھبرا گیا۔ اُس نے سمجھا کہ شہزادی نے شاید رونا دھونا شروع کر دیا ہے۔

"روتی کیوں ہے! کیا ہو گیا جو تھانیدار کے جانگلی یاروں نے نشہ کچھ زیادہ کر لیا، تو تو میری شیرنی ہے شیرنی، یہ آج کل کے مُشٹنڈے تیرا کیا بگاڑ سکتے ہیں، اِدھر آ جا میرے پاس۔" بخشن نے شہزادی کو بازو سے پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا لیکن اُس کی دبی دبی کھانسی اب بھی جاری تھی۔ بخشن کے سینے سے لگتے ہی اُس کے منہ سے نکلنے والی تمباکو کی بُو نے شہزادی کو کچھ اور بھی چکرا کر رکھ دیا۔ اُس کا جی متلانے لگا تو چہرے کو بازوؤں کے اندر چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ بخشن کے کلف لگے کرتے سے اُٹھنے والی پسینے کی بدبو سے اُسے کراہت ہونا بھی شروع ہو گئی، لیکن حاجی بخشن اُسے سینے سے لگاتے ہی مست ہو گیا تھا۔

"کیا بھرا بھرا پنڈا ہے تیرا شہزادیئے! جیسے شیرے میں بھریا تریا رس گلا ہوتا ہے۔ تو تو بندے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں مجنوں بنا دیتی ہے تو پھر کیوں ناں مُشٹنڈے تیری بوٹی بوٹی اُدھیڑ کر تیرے مزے لیں۔"

شہزادی گھبرا گئی۔ ”ابھی یہ کہے گا کہ جا کر الماری میں سے حکیم والی گولی اُٹھالاؤ، شراب کی بوتل لاؤ، گلاس بناؤ اور پھر جب اُس سے بھی کچھ نہیں بنے گا تو پھر پورے کمرے میں بڑکیں لگاتا پھرے گا، چونڈیاں کاٹے گا، دانتوں سے بھنبوڑے گا یوں اگلے کئی دن اذیت سے گرلاتے گزریں گے۔ اِس سے تو وہ جانگلی بھلے تھے، جتنے بھی تھے، کم از کم کاٹا پیٹا تو نہیں، بس اپنا کام مُکایا اور یہ جا وہ جا“۔ شہزادی آنے والے لمحات کے خوف سے کپکپا کر رہ گئی۔ اُس نے دوپٹے کی اوٹ سے بخشن کی طرف دیکھا۔ اُس کا ہاتھ پھر سے اُس کے پنڈے پر اور آنکھوں میں شہوت اُترنا شروع ہو چکی تھی۔ شہزادی کے جسم میں پُرانی پیڑیں بھی پھر سے جاگنا شروع ہو چکی تھیں۔ اُس نے دل ہی دل میں اپنی ماں کو کوسنا شروع کر دیا کہ جس نے اپنے بعد اُسے اِس قصائی کے حوالے کر کے اپنی جان چھڑالی تھی۔

شہزادی رہنے والی تو شاہدرہ کی تھی لیکن اب اپنی ماں کے سبب کہیں کی نہیں رہی تھی۔ اُس کا باپ رجب علی فیصل آباد کی تحصیل تاندلیانوالا میں بس ڈرائیوری کرتا تھا اور اُس کی ماں حمیداں ملحقہ تحصیل سمندری کی رہنے والی تھی۔ رجب علی مست آنکھوں اور بل کھائی ہوئی گھنگریالی مونچھوں والا کڑک گبھرو اور حمیداں اپنی رنگت اور قد بت کے اعتبار سے ہیر رانجھا فلم کی ہیرادا کارہ فردوس جیسی تھی۔ تقدیر نے ایک روز دونوں کی جنم پتری نکالی اور دیوار پر اُن کا سنجوگ لکھ دیا۔ یوں چلتی بس میں آنکھوں کا ملنا تو ایک بہانہ بنا، بات شادی پر جا کر رُکی مگر جب دونوں نے محسوس کر لیا کہ خاندان والے یہ شادی نہیں ہونے دیں گے تو دونوں بھاگ کر شاہدرہ آ گئے اور شادی کر لی۔ حمیداں کے خاندان والے تو کئی مہینوں تک اُنھیں قتل کرنے کے واسطے جنونیوں کی طرح ڈھونڈتے رہے مگر جب کوئی اتا پتا نہ چلا تو اِس امید پر ہاتھ جھاڑ کر بیٹھ گئے کہ کبھی تو ہاتھ آئیں گے۔ اُدھر تایا کی بیٹی سے شادی نہ کرنے کی پاداش میں رجب علی کے ماں باپ بہن بھائیوں سمیت پورے خاندان نے اُس کا حقہ پانی بند کرتے ہوئے سماجی لاتعلقی اختیار کر لی۔ قتل کے خوف اور اپنوں کی لاتعلقی نے اُسے اِس طرح مایوسی کے گرداب میں گھیرا کہ وہ ڈرائیوری تو کیا گھر سے باہر نکلنے تک کا حوصلہ ہار بیٹھا۔ نتیجہ تنگ دستی اور ہر وقت کی چخ چخ کی صورت نکلا تو عشق ہوا ہو گیا۔ ایک دوسرے کی

صورت دیکھنے کے روادار نہ رہے۔ لیکن اس کے باوجود یکے بعد دیگرے تین بیٹیاں پیدا ہوتی چلی گئیں جو محبت کی سیراب کیفیت کی بجائے اُن دونوں کی جسمانی بھوک کی پیداوار تھیں اور یہی بھوک اُن کی جسمانی بڑھوتری کے ساتھ ساتھ اُن کے جسم میں بھی پھیلتی چلی گئی۔ وہ اِتنی تیزی سے قد بڑھاتی چلی جا رہی تھیں کہ جیسے ریگستان میں معمولی سی بارش کے بعد ہی ریت کے پیاسے ٹیلوں سے کھمبیاں راتوں رات سر نکال کر پورے قد کے ساتھ تن کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ جسمانی بھوک کی حب و تاب کا اشتہار بن کر۔

بیٹیاں جتنی تیزی سے بڑی ہو رہی تھیں رجب علی اُتنی ہی سرعت سے بیماریوں اور گھٹیا نشے کے پاتال میں اُترتا چلا جا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کی جوان بیوی صبح سویرے گھر سے نکلتی ہے اور شام ڈھلے گھر کا راستہ دیکھتی ہے مگر وہ اُسے کیسے کچھ کہتا کہ آتے ہوئے نہ صرف وہ کھانے پینے کا وافر سامان گھر میں لے آتی تھی بلکہ اُس کی دوائیاں اور چرس کے دو چار ٹوٹے بھی لے کر آتی کہ جس سے اُس کے دو تین دن یاروں کی صحبت میں عزت آبرو سے گزر جاتے۔ گھر کا چولہا جلنا شروع ہوا تو آئے روز کی چڑ چڑ بھی ختم ہوتی چلی گئی۔ ہاں کبھی کبھار واپسی پر حمیداں کا مزاج برہم ہوتا تو وہ اُسے اِس قسم کی گالیوں کا نذرانہ پیش کرتی کہ بھڑووں کا خون بھی کھول اُٹھے۔ پہلے پہل تو وہ اُسے حیرت سے تکتا رہا کہ یہ وہی حمیداں ہے کہ جس سے توڑ نبھانے کو اُس نے زندگی برباد کر لی لیکن بعد میں جب یہ معمول ہوا تو وہ بھی عادی ہوتا چلا گیا۔ رجب علی ڈھیٹ ہوا تو حمیداں بھی ہتھ چھٹ ہو گئی۔ اکثر اُسے دو چار جڑ دیا کرتی کہ یوں اپنے مقدر سے گلے شکوے کا وہ امکان بھی جاتا رہا کہ جس کا اظہار پہلے زبان سے مغلظات کی صورت ہوا کرتا تھا۔

محلے کی بیرونی نکڑ پر بیٹھا طالب دکاندار اور کبھی کبھار کوئی گلی کا لونڈا لپاڑا باتوں ہی باتوں میں اشارہ کر جاتا کہ اُس کی بیوی حمیداں رونق علی کی بیوہ کے ساتھ شاہدرہ شیخوپورہ روڈ پر ٹرک ڈرائیوروں کے ساتھ چلتی ہے تو وہ خاموش ہو جاتا کہ پہلے تو لڑکے ڈرائیوروں کے ساتھ چلا کرتے تھے اب یہ عورتیں کب سے اور کیسے چلنا شروع ہو گئیں۔ ضرور اِن حرام زادوں کی اپنی حرام زدگی ہے۔ لیکن جب اُن دو عورتوں کی دیکھا دیکھی محلے کی کچھ اور جوان جہان عورتیں بھی اُسی روڈ پر چلنا

شروع ہوئیں تو معاملہ ہاتھوں سے نکل گیا۔ باقی سب تو وہاں کے مقامی تھے لہٰذا اُن کی بات رہ گئی لیکن کرائے کے گھر میں رہنے والے رجب اور حمیداں کو گھر خالی کرنا پڑا سو کر دیا گیا۔

حمیداں کو نیا ٹھکانا بھی رونق علی کی بیوہ گلشن کی کوششوں سے قریب ہی شیخوپورہ روڈ پر ایک کچی بستی میں مل گیا۔ دو کچے کمروں پر مشتمل یہ گھر گلشن کے ستر سالہ جیٹھ شوق علی کا تھا جس کی بیوی کے مرنے کے بعد اُس کا اکلوتا بیٹا عرصہ قبل مجاہدوں کی ٹولی میں شامل ہو کر کشمیر آزاد کرانے چلا گیا تھا مگر وہاں سے واپسی نہ ہو سکی۔ رونق علی کے مرنے کے بعد شوق علی نے اُس کی تیس برس کی بیوہ گلشن سے اُس نے اپنا گلشن آباد کرنے کی کوشش کی تو اس دو بچوں کی ماں نے شادی کرنے سے تو انکار کر دیا مگر اُس کے فتنوں سے بچ رہنے کے واسطے ہفتے میں ایک آدھ بار اُس کی خیریت اچھے سے دریافت کرنے آ جاتی مگر اب یہ ذمہ داری حمیداں کو سونپ دی گئی کہ جس کے بدلے میں نہ تو کوئی کرایہ تھا اور نہ ہی کوئی پوچھ گچھ۔ جب ہر طرف سے سکون ہو گیا تو رجب علی، حمیداں کو چھچھوندر کی طرح جان کا عذاب دکھنے لگا۔ اُس کی مست آنکھیں مسلسل چرس پینے کے سبب اُسی طرح بے جان، ست اور پیلاہٹ آمیز میلی ہو گئی تھیں کہ جیسے ہاتھ کی انگلیوں میں ہر وقت دھواں دیتے ہوئے سگریٹ کی وجہ سے اُس کے ناخن ہو چلے تھے۔ اُس کی بل دار مونچھیں جن میں حمیداں کا دل اٹک اٹک جاتا تھا، گدلے بالوں کے گچھوں کی صورت نیچے لٹک چکی تھیں۔ چرس کے دھوئیں نے اِن میں در آنے والی سفیدی کو بھی پیلاہٹ میں بدل دیا تھا۔ کبھی کبھار اگر وہ حمیداں کو گزرے وقت کا واسطہ دے کر اپنے پاسے سے لگ کر بیٹھنے کو کہتا تو وہ اُس سے یوں دور بھاگتی کہ جیسے گندگی پر پاؤں پڑ گیا ہو۔ ''پہلے اپنے پیلے دانتوں کی میل اُتار مر جانیاں، اُلٹی آتی ہے تیرے نزدیک آنے سے، تیری اِس نحوست ماری طبیعت کا پتہ ہوتا تو تیرے منہ پر بھی پیشاب نہ کرتی، رُول کر رکھ دیا ہے میرے جیسی کڑی کو''۔

''دانتوں کا کیا کام اُس کام میں، یہ کیوں نہیں کہتی کہ دل بھر گیا ہے اب اِس رجبے سے، کبھی وہ وقت تھا کہ میرے پاؤں چومتی تھی، اب یہ وقت کہ میرے دانت بھی برے لگتے ہیں گشتی عورت کو''۔ رجب نے اُس روز غصے میں آ کر حمیداں کو وہ طعنہ دے تو دیا کہ جو اُس نے ایک

عرصے سے دل میں جکڑ کے رکھا ہوا تھا لیکن وہ خود کو حمیداں کے ردِعمل کا متحمل اب بھی نہیں سمجھتا تھا تبھی کھسیانا ہو کر سر کو دونوں گھٹنوں کے بیچ اِس طرح چھپایا کہ کنکھیوں سے نگاہ بدستور اُسی کے چہرے پر جمی رہی۔

حمیداں اُسے گالیاں دیتے دیتے رُک گئی۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ رجبے نے اُسے گشتی کہا ہے۔ اُسے یقین تھا کہ تمام دنیا اُسے اس نام سے پکارے تو پکارے مگر رجبا اُسے گشتی ہونے کا طعنہ نہیں دے سکتا کہ جسے پالنے اور اُسی کا گھر چلانے کے لیے وہ کسبی بنی ہے۔ یہ قدم اُٹھانے سے پہلے نہ تو اُس نے رجبے کو کچھ بتایا تھا اور نہ ہی رجبے نے سب کچھ جانتے بوجھتے کبھی اُس سے پوچھ گچھ کی تھی۔ بڑھتے ہوئے فاصلے کے بیچوں بیچ ایک خاموش معاہدہ نجانے کب اُن دونوں کے درمیان لکھا گیا اور کب اُنھوں نے ایک دوسرے سے آنکھ ملائے بغیر اُس پر اپنے اپنے انگوٹھے لگا دیئے۔ دونوں طرف سے تمام تر دوری اور کھنچاؤ کے باوجود حمیداں کو مان تھا کہ رجبا اِس معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا لیکن اب یہ معاہدہ ٹوٹ چکا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ رجبا اَب بھی بہت سے مردوں کی نسبت جسمانی طور پر کچھ زیادہ ہی مرد تھا مگر پھر بھی اُس سے قربت کے تصور سے ہی اُسے کراہت ہونے لگی تھی۔ شوہر کے واسطے عورت کو ہمیشہ جسمانی طور پر تگڑا مرد تو نہیں چاہیے ہوتا بلکہ وہ اُس میں ایسا اور بھی بہت کچھ دیکھنا چاہتی ہے کہ جو اَب رجبے میں نہیں رہا تھا۔ اب جو کچھ باقی رہا تھا وہ صرف ایک دوسرے پر توقع نما اعتماد تھا لیکن آج وہ بھی نہ رہا۔ اگر آج اُس نے رجبے کو انکار کیا تو اپنا کیا غلط کر لیا کہ جس کے سبب اعتماد کا یوں قتل کر دیا جاتا۔ طیش کو نکاس کی کوئی صورت نہ ملی تو حمیداں نے چیخنا چلانا چاہا مگر اُس کا گلا بیٹھ گیا۔ اُس نے رجبے کا منہ نوچ لینے کے لیے اُس کی طرف لپکنے کی کوشش کی مگر ذہن کے ساتھ ساتھ پاؤں بھی شل ہو چکے تھے۔ بس کچھ دیر وہ اُس کی طرف عجیب سی نگاہوں سے تکتی رہی، دو بوندیں آنسوؤں کی آنکھوں سے نکلیں اور اُس کے گالوں پر بہتی ہوئیں کہیں اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ جب کچھ نہ سوجھا تو وہ سر جھٹک کر پچھواڑے میں شوق علی کے ڈیرے کی جانب نکل گئی کہ جو کئی دنوں سے اُس سے اگلے مہینے کا کرایہ ایڈوانس وصول کرنے کا تقاضا کر رہا تھا۔

حمیداں کے یوں چُپ ہو جانے سے رجبے کا دل ہول گیا۔ وہ آج بھی اُس سے دوریوں کا کوئی شکوہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس کے پاس رہا ہی کیا تھا کہ کوئی عورت اُس کی جانب ملتفت ہو۔ ذمہ داریاں نبھانے کی بجائے وہ تو خود ایک ذمہ داری بن چکا تھا۔ اوائل جوانی میں اُس نے اپنے اُستاد ڈرائیور سے سُن رکھا تھا کہ عورت چاہے جتنی امیر، جتنی کماؤ ہو جائے، اپنی طبیعت کے لحاظ سے ضرور کسی نہ کسی مرد کے گلے لگ کر رہنا چاہتی ہے۔ جو مرد خالی جیب ہوتے ہوئے بھی عورت کو گلے لگا لے وہی اُس کا عشق، وہی اُس کا دارو۔ عورت لاکھ ذمہ داریاں نبھالے مگر سوئے گی اُسی مرد کے ساتھ کہ جو اُسے ذمہ داری سمجھ کر اُس کے پنڈے پر ہاتھ رکھے، خود ذمہ داری نہ بن جائے۔ وہ اکثر سوچتا کہ بس یہیں اُس سے بھول ہو گئی کہ وہ موت کے خوف سے ذمہ داری بن بیٹھا۔ اِس سے تو بہتر تھا کہ وہ حمیداں کے لیے قتل ہو جاتا۔ کم از کم اُس نے اُس کی قبر کا دیا نہیں بجھنے دینا تھا۔ لیکن اُس کے بھائیوں سے قتل نہ ہو کر جس طریقے سے اب وہ روز حمیداں کے ہاتھوں قتل ہو رہا تھا اُس میں نہ تو اُس کی کہیں قبر بن سکی اور نہ ہی اُس پر کوئی چراغ جلانے والا باقی رہا۔ موت سے پہلے ہی اپنی زندگی میں ہی اپنوں کے لیے مرا ہوا ہو جانا کیا معنی رکھتا ہے اِس کا احساس اُسے اب تک اِس طور ہوا ہی نہیں تھا کہ یہ ذلت کچھ ایسی آہستگی سے اُس کے وجود پر اُتری کہ اِس کی خواری کا اُسے اندازہ ہی نہ ہو سکا۔ حمیداں نے بھی گُجھی واردات کی۔ رجب علی کو لاتعلقی کے پاتال میں دھکیل کر اپنی برتری کا مینار یوں دھیرے دھیرے بلند کرتی چلی گئی کہ اُسے اپنی کمتری کی خبر ہی نہ ہو سکی۔ یقین تو کیا آتا محسوس ہی نہ ہوا کہ اُن دونوں کے درمیان دوریوں کی یہ دراڑ کب بنی اور کیسے بنی؟۔

کمرے میں اچانک موبائل فون کی گھنٹی انتہائی بلند آواز میں بج اُٹھی۔ ''ہَت! تیری بہن بھانجی کی....'' حاجی بخشن بے وقت کی اِس مداخلت سے بھڑکتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ اُس کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو شہزادی بھی ایک طرف ہو کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ بدبو اور ناگواریت اُس کے سانس کے راستے پورے جسم میں سرایت کر چکی تھی۔ بخشن یہ سمجھا کہ وہ اِس ناگہانی علیحدگی کے سبب اپنی جذباتی حدت کم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ غصے کی شدت میں اُس نے اپنی گالیوں کو مزید غیر ملبوس کیا اور قریب ہی پڑا ہوا فون اُٹھا کر اُس کی اسکرین پر لکھا ہوا نام پڑھنے کی کوشش کرنے

لگا۔ اُس کا غصے سے تمتماتا ہوا چہرہ ایک دم بجھ کر رہ گیا۔ بس ایک لمحے میں کمرے کا ماحول ہی بدل کر رہ گیا۔

"یہ کیسے؟ اور اس وقت خود ہی؟"۔ اُس لمحے اگر کوئی کیفیت بخشن کی آنکھوں اور چہرے سے ظاہر تھی تو وہ غیر یقینی اور صرف غیر یقینی کی تھی۔

۸

صاحبزادہ سلطان احمد تونگر اگرچہ اپنی حیرت پر قابو پانے کی پوری کوشش کر رہا تھا مگر کامیابی ہو نہیں رہی تھی۔ اُسے پتہ ہی نہ چلا کہ باتوں باتوں میں اللہ ڈنو عبید اُسے ڈرائنگ روم سے گھماتا ہوا ایک ایسے کمرے میں لے آیا کہ جو کسی بھی اعلیٰ درجے کی بار سے کم نہیں تھا۔ دنیا کی کون سی شراب تھی کہ جس کا مہنگا سے مہنگا برانڈ وہاں موجود نہیں تھا۔ شراب کا ہونا تو ایک طرف رہا، ہر برانڈ کے ساتھ اُسی برانڈ کے خوبصورت تراش کے پیمانے بھی نہایت دیدہ زیب انداز میں اس طرح سجائے گئے تھے کہ دیکھنے والا اپنی خواہش پر قابو نہ رکھ سکے، بے ساختہ لپکے اور ساقی کا انتظار کیے بغیر ہونٹوں سے لگا لے۔

اللہ ڈنو عبید کے چہرے پر عجیب سے ہمہ معنی تاثرات تھے، عاجزی میں نخوت اور کسرِ نفسی میں رعونت جس پر ہلکی سی فاتحانہ مسکراہٹ کا تڑکا الگ سے تھا۔ اُس نے ایک بار پھر آگے بڑھ کر باہیں پھیلائیں اور ایک ایسی گھومنے والی میز کے ایک کنارے پر رکھی آرام دہ کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دی کہ جس پر مہنگی ترین شراب کے چنیدہ برانڈز کی بوتلیں الگ سے رکھی تھیں۔ صاحبزادہ تونگر اپنے مزاج کے برعکس اطراف کی طرف دھیان دیئے بغیر کرسی پر بیٹھ تو گیا مگر وہ عبید کے بارے میں لگائے گئے اپنے تمام تر اندازوں اور پیش آمدہ حقیقت میں اس قدر زیادہ تفاوت کو کسی بھی طور پاٹ نہیں پا رہا تھا۔

وہ دونوں کافی دیر تک آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو اس طرح دیکھتے رہے کہ جیسے باطن میں جھانک رہے ہوں، سکین کر رہے ہوں سامنے براجمان شخصیت کا اور آنے

والے وقت میں رویوں اور ارادوں کا۔ فرق تھا تو بس اتنا کہ صاحبزادہ تونگر کے ہاں در آنے والی حیرت کوشش کے باوجود جا نہیں رہی تھی اور عبید کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ چھپائے چھپ نہیں رہی تھی۔

''مجھے نہیں آنا چاہیے تھا یہاں اِس شاطر شخص کے پاس.... ضرور اُس کو مجھ سے کوئی بڑا کام نکلوانا ہے''۔ تونگر کے ذہن میں مچلتا ہوا اضطراب کم ہونے کی بجائے کہیں بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

''یہ ریٹائرڈ بیوروکریٹ ابھی تک اپنی افسری کے نشے میں ہے کہ جیسے کسی صوبے کا چیف سیکریٹری لگا ہو، ارے حرام خور! زندگی بھر تو نوکری چلے جانے کے خوف میں مر مر کر جیا ہے، اب جب تم پر کوئی تھوکتا بھی نہیں تو نخرے دکھا رہے ہو محض اس لیے کہ میں نے تمھیں غیر ضروری عزت احترام سے اپنے ہاں مدعو کر لیا ہے۔'' اللہ ڈنو عبید مسکراتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دل ہی دل میں دانت کچکچا رہا تھا۔

''جھوٹ بولتا ہے کہ مجھ سے بڑا ہے، اگر یہ میری عمر کا دِکھتا تو پھر بھی کوئی بات تھی، اب میں اِس نو دولتیے لونڈے لپاڑے کے ساتھ کیا بات کروں؟'' صاحبزادہ تونگر کا ذہن چڑچڑا ہونے لگا تھا۔

''تو نہیں آنا تھا.... یہ کیا کہ یوں اکڑ کر بیٹھ گئے کہ جیسے کوئی ناراض حاکم بدبودار رعیت کے سامنے دربار لگا کر بیٹھا ہو، انسان بنو اور اوقات میں آؤ اپنی۔'' عبید کا ذہن مختلف محور پر ہوتے ہوئے بھی صاحبزادہ تونگر کی سوچ سے مطابقت کی راہیں تلاش کر چکا تھا۔ یوں کئی لمحوں کی معنی خیز خاموشی کے بعد اُس نے تونگر کے سامنے تکلم کی بساط بچھا دی۔

''صاحبزادہ صاحب! آپ نجانے کہاں کھو گئے؟ یقین کیجیے میں ہی ہوں اللہ ڈنو عبید اور فرمائیے کون سا برانڈ نوشِ جاں کریں گے اِس ٹیبل پر سبھی برانڈ آپ ہی کے پسند کے ہیں۔'' اللہ ڈنو عبید نے جونہی ریوالونگ ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صاحبزادہ تونگر سے اُس کی پسندیدہ شراب کے بارے میں پوچھا اتنے میں نجانے کہاں سے ایک تراشیدہ بالوں والی دراز قد لڑکی سیاہ پینٹ کوٹ اور کھلے گلے کی آف وائٹ شرٹ میں ملبوس اپنے دودھیا چہرے پر مسکان سجائے ٹیبل

کے قریب پہنچ کر صاحبزادہ تونگر کی جانب یوں سیاہ آنکھوں سے گویا ہوئی کہ اُس کے لباس سے اُٹھنے والی خوشبو اُسے اپنی سانسوں میں اترتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

انتہائی مشکل صورتِ حال میں بھی اپنے ذہن کو یکسو رکھنے والا صاحبزادہ سلطان احمد تونگر اب کے اِس قدر گھبراہٹ کا شکار ہوا کہ بدحواسی چہرے سے عیاں ہونے لگی۔ ''کس نے کہہ دیا تم سے کہ میں اِن خرافات کا رسیا ہوں۔'' اللہ ڈنو کے ردِعمل میں تونگر کا لہجہ تو بلند تھا مگر الفاظ لڑکھڑا رہے تھے۔

حیران کن طور پر نہ تو لڑکی گھبرائی اور نہ ہی اللہ ڈنو عبید کا رویہ معذرت خواہانہ ہوا۔ اِس کے برعکس عبید نے قدرے بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ ''جناب غور سے دیکھیے یہ سبھی آپ کے انتہائی پسندیدہ برانڈ ہیں اور اگر اِن سے دل بھر چکا ہے تو وہ دیکھیے اُدھر شیلف میں وہاں بھی خاصی ورائٹی ہے۔''

''مسٹر عبید! لگتا ہے تم خوابوں کی دنیا میں رہتے ہو، میں بھلا اِس حرام شے کو منہ کیوں لگانے لگا؟'' صاحبزادہ تونگر نے اُچٹتی ہوئی نگاہ اُس پر ڈالی۔ اُس کی آنکھوں میں تونگر کے لیے استہزائیہ ہنسی تھی۔ صاحبزادہ تونگر گڑبڑا گیا۔

''چھوڑو اِس واہیات موضوع کو اور کام کی بات کرو کہ مجھے یہاں بلایا کیوں تھا؟''
صاحبزادہ تونگر اللہ ڈنو عبید کے لیے مسلسل ''تو'' کا صیغہ استعمال کرنے لگا تھا۔

''کام کی بات کے واسطے پہلے ماحول بنایا جاتا ہے تونگر صاحب، یونہی اُتاولی میں سرپھٹول نہیں کی جاتی، دو دو پیگ ہو جاتے تو آپ مجھے سمجھ پاتے، میری باتوں کو سمجھ پاتے، میری پیشکش کو سمجھ پاتے۔'' عبید اب بھی چڑچڑے پن کو ظاہر نہیں ہونے دے رہا تھا لیکن لہجے میں ذرا اثر پڑنے لگی تھی۔ ''آیئے آپ کی پسندیدہ جگہ چلتے ہیں۔'' خواجہ اپنی نشست سے اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک بار پھر تعظیماً گردن جھکا کر ایک سمت میں بازو پھیلا دیئے۔ صاحبزادہ تونگر بھی صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا مگر اُس کے رویے میں نمایاں تشکیک کے ساتھ ساتھ جھجک بھی محسوس ہونے لگی تھی۔

اللہ ڈنو عبید آگے چلتا ہوا صاحبزادہ تونگر کو ایک اور کمرے میں لے کر جانے لگا مگر جاتے جاتے مڑا اور لڑکی کی طرف دیکھا جو پہلے ہی سوالیہ انداز میں اُسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ عبید کے

اِس طرح پلٹ کر دیکھنے میں نجانے کون سا پیغام مضمر تھا کہ لڑکی کے چہرے پر لکھا ہوا سوال پل بھر میں جاتا رہا۔ یوں اگلا حکم بجا لانے کے لیے اُس نے مسکرا کر گردن کو ہلکا سا خم کیا اور ایک طرف ہو گئی۔

اب کے وہ دونوں جس کمرے میں داخل ہوئے وہ ایک خوبصورت نشست گاہ ہونے کے علاوہ سینکڑوں کتابوں سے مزین لائبریری بھی تھی۔ کمرے کے داخلی راستے ہی سے دیوار کے ساتھ ساتھ آغاز ہونے والے شیلف وسیع کمرے کے چاروں طرف گھومتے چلے گئے تھے۔ کمرے کے درمیان میں نشست گاہ اِس طرح ترتیب دی گئی کہ مطالعے کی میز اور آرام دہ کرسیوں کے ساتھ ساتھ آرم چیئرز بھی تھیں کہ جن پر نیم دراز ہو کر کتابوں کی دنیا میں اُترنا سہل ہو کر رہ گیا تھا۔ صاحبزادہ تونگر کے لیے یہ سب کچھ غیر متوقع تھا۔ اللہ ڈنو عبید جیسے شخص کا کتاب دوست ہونا بظاہر بعید از قیاس تھا مگر جو کچھ کہ صاحبزادہ تونگر نے دیکھا وہ اُس کے تنے ہوئے اعصاب کو ایک دم نرم کر دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ عبید کی موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے کتابوں میں کھو جانا چاہتا تھا لیکن اسے نا مناسب گردان کر اُس نے ایک ایک شیلف کے اندر جھانکنا شروع کر دیا۔ ابھی پہلے شیلف میں رکھی کتب کی پہلی رو پر ہی اُس کی نظر پڑی تھی کہ وہ وہیں تھم گئی۔ یہ وہ کتابیں تھیں کہ جنھیں وہ ایک عرصے سے تلاش کر رہا تھا۔ تاریخ عالم پر نایاب کتابیں۔ صاحبزادہ تونگر کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اللہ ڈنو عبید اِس قدر نفیس طبع اور صاحبِ مطالعہ بھی ہو سکتا ہے۔ اُس نے پلٹ کر عبید کو دیکھا کہ جو ایک دوسرے شیلف سے کچھ کتابیں نکال کر وسطی میز پر رکھ رہا تھا۔ تونگر کا اضطراب قدرے سکون میں منقلب ہونے لگا تھا۔ عبید نے کنکھیوں سے صاحبزادہ تونگر کو یوں مہربان نگاہوں سے اپنی جانب دیکھتے دیکھا تو اُس کے چہرے پر بھی طمانیت طلوع ہونے لگی۔

''تونگر صاحب! ادھر تشریف لایئے میں نے کچھ کتابیں آپ کے ذوق کے مطابق نکال رکھی ہیں۔'' عبید نے اب کے تُرپ کا پتا پھینکا تھا۔

صاحبزادہ کچھ بولے بِنا اِدھر اُدھر شیلف میں رکھی کتابوں کو حریصانہ نگاہوں سے دیکھتا ہوا وسطی میز کی جانب بڑھا جہاں بہت سی کتابیں اِس طرح بے ترتیب رکھی گئی تھیں کہ ایک ہی نظر میں

سب کا سرورق دیکھا جاسکے۔ کتابیں دیکھتے ہی صاحبزادہ کی آنکھوں میں چمک سی نمودار ہوئی جو ہر ایک کتاب کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہی کتاب بہ کتاب بڑھتی چلی جارہی تھی۔

''عبید صاحب! آپ کو میرے ذوق کا علم کیسے ہوا؟'' صاحبزادہ پھر ''تو'' سے ''آپ'' پر آچکا تھا۔

''اب جانے بھی دیجیے صاحبزادہ صاحب! ہم یونہی آپ سے عقیدت نہیں رکھتے، کچھ تو مشترک ہوتا ہے دو لوگوں میں جو اُنھیں قریب لے آتا ہے، یہ دیکھیے اجپشن متھالوجی (Egyptian Mythology) پر اِس سے بہتر کتاب کیا کہیں اور ملے گی؟ ایمزون کی بیسٹ سیلر ہے یہ۔'' عبید نے مسکراتے ہوئے کتاب صاحبزادہ تونگر کے ہاتھ میں تھما دی۔ اُس نے پہلے تو کتاب کو اُلٹ پلٹ کر اُس کا سرسری جائزہ لیا اور پھر نظریں اُٹھا کر بے یقینی سے اللہ ڈنو عبید کی طرف اِس طرح دیکھا کہ جیسے پوچھ رہا ہو کیا وہ واقعی تاریخ کا ذوق رکھتا ہے یا پھر کوئی چکر دَکر ہے۔ عبید جان گیا کہ صاحبزادہ اُس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہوئے کیا سوچ رہا ہے۔ اُس کا ردِعمل پہلے پہل تو ایک دھیمی سی معنی خیز مسکراہٹ تھا لیکن اگلے ہی لمحے اُس نے وہ جملہ ادا کر ہی دیا کہ جسے کافی دیر سے روک رکھا تھا۔

''صاحبزادہ صاحب! ہم جتنی بلندیوں پر پہنچ جائیں، جتنے ہی تجربہ کار ہو جائیں لیکن ملنے ملانے اور سماجی رابطوں کے عمل میں ہم ہمیشہ منفی تاثر سے شروعات کرتے ہیں خاص طور پر کہ جب ہمیں کسی سے نہیں بلکہ کسی کو ہم سے واسطہ پڑ رہا ہو، اب جیسا کہ ہمارے تعلق میں ہے، رابطہ آپ نے مجھ سے نہیں کیا بلکہ میں نے آپ سے رابطہ کیا، آپ سے ملاقات کے لیے آپ کی منت کی، آپ کو اہمیت دی خاص طور پر اُس وقت کہ جب آپ کے گھر کا مالی بھی آپ کو اہمیت دینے سے گریزاں ہو چکا ہے۔'' عبید نے اگرچہ یہ باتیں دھیمے لہجے اور منکسرانہ مسکراہٹ کے سے انداز میں کیں مگر صاحبزادہ تونگر وہیں جامد ہو کر رہ گیا۔ ہاتھ میں تھمی کتاب کے صفحات تو کیا پلٹنے تھے، اُس کی نگاہیں بھی عبید پر ہی مرتکز رہیں، ہاں البتہ اُس میں اب تحسین آمیز تشکیک کی بجائے حیرت کا سکوت دَر آیا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اُس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ اللہ ڈنو عبید نام کا یہ شخص

اُس سے چاہتا کیا ہے اور کیوں اُسے یوں جھٹکے پہ جھٹکے دیئے جا رہا ہے؟

اِس سے پہلے اُن کے درمیان کوئی اور بات ہوتی وہی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ اب کے اُس کے ساتھ مگر چند قدم کا فاصلہ رکھتے ہوئے ملتے جلتے لباس میں ایک اور خوبرو لڑکی بھی تھی جو آہستگی سے ٹرالی دھکیلتی ہوئی چلی آ رہی تھی جس پر کافی اور کھانے کے دیگر لوازمات چنے ہوئے تھے۔ اللہ ڈنو عبید نے ایک بار پھر انتہائی احترام سے صاحبزادہ تونگر کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ صاحبزادہ بدستور اُس کی جانب دیکھتا ہوا مگر کچھ بھی بولے بغیر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس کے بیٹھنے کے بعد عبید بھی میز کی دوسری جانب اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ ٹرالی والی لڑکی نے کراکری، سنیکس اور کافی پاٹ کو میز پر رکھا اور پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ جب کہ دوسری لڑکی نے احتراماً مگر ایک ادائے خاص اور دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کھانے کی پلیٹیں کٹلری سمیت صاحبزادہ تونگر اور پھر اللہ ڈنو عبید کے سامنے رکھیں اور باری باری مختلف رکابیوں سے انھیں سنیکس پیش کرنے لگی۔ اِس دوران کمرے میں مکمل خاموشی رہی۔ لڑکی نے کافی بناتے ہوئے چینی اور دودھ کی مقدار پوچھی تو سناٹا گنگنا اُٹھا۔ صاحبزادہ تونگر نے پہلی بار نگاہیں بھر کر ستائش کے سے انداز میں لڑکی کو دیکھا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کسی خوبصورت لڑکی کی آواز اُس کی صورت کو یوں بھی ثانوی درجے پر دھکیل سکتی ہے۔ لیکن اپنے حسن کی بلاخیزی سے بخوبی آشنا اُس دوشیزہ کے لیے اِس طرح کا دیکھا جانا کچھ اجنبی نہیں تھا، ہاں مگر یہ بات اور کہ اُس کے لبوں پر کھیلنے والی مسکان کچھ اور بھی طرح دار ہو چلی تھی۔

اِس کے برعکس اللہ ڈنو عبید کی مسکراہٹ میں خفی سی کمینگی جھلکنے لگی تھی۔ وہ بھی جان چکا تھا کہ دراڑ کہاں در آئی ہے۔ ”یہ جانان ہیں، میری معاون بلکہ یوں کہیں کہ معاونِ خاص! میری زندگی میں بہت سی آسانیاں جانان کے سبب ہیں۔“

صاحبزادہ سلطان احمد جھینپ گیا لیکن اسے چھپانے کے واسطے یوں سنجیدہ ہوا کہ جیسے کچھ دیکھا ہی نہیں، کچھ سنا ہی نہیں۔ اُسے جانان کا دودھ اور شکر پوچھنا بھی یاد نہیں رہا تھا۔ چند ثانیے یونہی گزرے تو پھر یاد آیا کہ اُس سے کیا پوچھا گیا تھا۔

''نہیں! نہ ہی دودھ اور نہ ہی شکر، بس بلیک کافی!'' اب کے سر اُٹھا کر وہ یوں جانان سے مخاطب ہوا کہ جیسے اُس کی فسوں نگاہی اُس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ کمرے میں پھر سے وہی سکوت طاری ہو چکا تھا۔ کافی پیتے ہوئے صاحبزادہ تونگر پھر سے اُسی کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا جب کہ عبید پہلے سے ہی اُسے یوں ماحول سے گریزاں رہنے کا تردد کرتے ہوئے دیکھنے کا مزہ لے رہا تھا، فراواں ہوتی کمینگی سے۔ کافی سرو کر چکنے کے بعد جانان نے عبید کی طرف دیکھا اور اُس کی جنبشِ ابرو کا اشارہ پا کر دوسری لڑکی سمیت کمرے سے باہر چلی گئی۔

''صاحبزادہ صاحب! اب تو آپ کو یاد آجانا چاہیے کہ ہماری پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟'' عبید کافی کا کپ بن پیئے ایک طرف رکھ چکا تھا۔

''ہزاروں لوگ مجھے زندگی میں ملے ہوں گے جن کی اکثریت میرے لیے غیر اہم تھی تو بھلا وہ مجھے یاد کیوں رہیں! یاد تو وہی رہتا ہے کہ جو آپ کے لیے اہم ہو۔'' تلخی صرف تونگر کے بولے گئے لفظوں میں نہیں تھی، اس کی ایک لہر عبید کے چہرے سے بھی ہو کر گزر گئی۔

''جب ہم پہلی بار ملے تو آپ بھی میرے لیے غیر اہم تھے تونگر صاحب لیکن وہ ملاقات میں کبھی نہیں بھلا سکا۔'' عبید کا لہجہ غیر متوقع طور پر سرد ہو چلا تھا۔ صاحبزادہ تونگر نے بھی کافی کا کپ ایک طرف رکھ دیا۔ اُس کا چہرہ سوالیہ نشان کا سائن بورڈ دکھنے لگا۔

''کچھ زیادہ پرانی بات نہیں، آپ اُن دنوں صوبائی سیکریٹری تھے محکمہ معدنیات کے اور آؤٹ آف ٹرن چیف سیکریٹری بننا چاہتے تھے، اِس واسطے ایک انتہائی با اثر وفاقی وزیر کو جس کا ہاتھ سیدھا وزیر اعظم کی گردن پر پڑتا تھا، اُس کے کزن کے ذریعے ٹریپ کیا گیا تھا، وزیر صاحب کی خاص فرمائش پر دوبئی کے پوش علاقے جمیرا میں واقع ایک وِلا میں شاندار پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں مراکش کی دو ماڈلز کے علاوہ انڈیا سے آئی ہوئی ایک فلمی ہیروئن نے ایسا رنگ جمایا کہ دو ماہ کے بعد اکیسویں گریڈ میں ہوتے ہوئے بھی آپ کو بائیسویں گریڈ کی پوسٹ پر چیف سیکریٹری لگا دیا گیا تھا۔'' اللہ ڈِتو عبید کے سرد لہجے میں بولے گئے ایک ایک لفظ کے ساتھ صاحبزادہ سلطان احمد تونگر کا چہرہ زرد پڑتا جا رہا تھا۔

"شاید آپ کو یہ بھی یاد نہ ہو کہ اُس پارٹی میں آپ نے اس قدر شراب چڑھا لی کہ پہلے تو ننگی رقاصاؤں کے ساتھ اُٹھ کر ننگا ناچنا شروع کر دیا اور پھر باتھ روم میں جا کر وہیں کموڈ پر سو رہے۔"

"کیا فضول بکواس ہے یہ....." صاحبزادہ تونگر غصے کے عالم میں کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

"بکواس نہیں حقیقت ہے یہ اس لیے کہ نہ صرف دوبئی کا وہ گھر بھی میرا تھا بلکہ پارٹی کا تمام تر خرچہ بھی آپ کے ناؤٹ نما دوست الیاس نے نہیں بلکہ اس خاکسار نے کیا تھا، لگ بھگ کوئی تین کروڑ۔" عبید کے سرد لہجے میں اب کے ضرورت سے زیادہ طنز در آیا تھا۔

"میں تمھیں جانتا تک نہیں اور تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو، پارٹی تو میرے دوست الیاس ملک نے کی تھی۔" صاحبزادہ نے غصے کی شدت سے کرسی کو پیچھے کی طرف دھکیلا اور ادھر اُدھر باہر نکلنے کا راستہ دیکھنے لگا کہ جو کہیں بک شیلف اور الماریوں کے بیچوں بیچ گم ہو چکا تھا۔ عبید نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "بیٹھیے حضور بیٹھیے! پوری بات تو سُن لیں، وہ پارٹی میں نے ارینج کی تھی اور آپ نے چیف سیکریٹری بننے کے بعد اُسی الیاس ملک کو نایاب منرلز کی جو پہاڑیاں کنٹریکٹ پر محض ایک کروڑ کی بولی پر دی تھیں، وہی پہاڑیاں میں نے اُس پارٹی کے بدلے الیاس ملک سے تین کروڑ میں خرید کر اُسی روز بارہ کروڑ میں آگے بیچ دی تھیں اور یہ سب کچھ پہلے سے طے تھا۔"

صاحبزادہ سلطان احمد تونگر میز تھام کر پھر سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بار بار اپنا کھلا ہوا منہ بند کرنے کی کوشش میں ناکام ہو رہا تھا۔

"اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو، ایک ریٹائرڈ سول سرونٹ سے؟" صاحبزادہ کا غصہ ایک دم جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا۔

"اب میں کیا چاہوں گا آپ یعنی ایک ناکارہ سول سرونٹ سے، میں تو بس آپ کو نوازنا چاہتا ہوں تاکہ آپ کی یہ چند بچی کھچی سانسیں اپنا واپسی کا راستہ آسانی سے ڈھونڈ سکیں۔" اللہ ڈنو عبید کے چہرے کی شاطرانہ مسکراہٹ مستقل طور پر وہیں جم چکی تھی۔

"کس نے کہا ہے تمھیں مجھ پر ترس کھانے کو بہت کچھ ہے میرے پاس۔" صاحبزادہ ایک بار پھر ہتھے سے اُکھڑ چکا تھا۔

"جانتا ہوں، بہت کچھ ہے نہیں..... تھا لیکن اگر ہو بھی تو آپ کی زندگی قابلِ رحم ہے، ایک ایسا بیوروکریٹ جس نے ایک عمر شراب اور عورت میں غرق کیے رکھی ہو اب اُس کا گھر کی لائبریری میں تنہا سڑتا ہوا وجود مجھ سے نہیں دیکھا جاتا اور ہاں مجھ سے یوں پریٹینڈ (pretend) کرنا چھوڑ دیجیے، آپ کے بارے میں جتنا میں جانتا ہوں اُتنا شاید آپ بھی نہ جانتے ہوں، میری بات سمجھ چکے ہوں تو کچھ عرض کروں؟"

صاحبزادہ تونگر خاموشی سے اُس کی طرف تکے جا رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ مزاحمت کے پاس سوائے دم توڑنے کے اور کوئی چارہ نہیں رہا۔

۹

گزشتہ تین دنوں سے نہ صرف تحصیل حیدر گوٹھ کی تمام عدالتیں بند تھیں بلکہ وکلا نے ضلع شمس پور کی سیشن، سول اور ریونیو کورٹس کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ حیدر گوٹھ کے دونوں سول جج صاحبان کو ضلع کے سیشن جج نے اپنے گھروں پر رہنے کا حکم دے کر اُن کے گھروں کے باہر شمس پور سے بھجوائی گئی پولیس کی ایلیٹ فورس کو تعینات کر دیا گیا تھا۔ علاقہ مجسٹریٹ اگرچہ بیرونی لحاظ سے زخمی نہیں تھا لیکن کمرہ عدالت اور اُس کے باہر ہونے والی مارا ماری اور دھوئیں سے بھرے ہوئے کمرے میں محبوس کر دیئے جانے کے سبب جہاں پھیپھڑوں میں سوزش کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا وہیں خوف اور صدمے نے اُس کے عارضۂ قلب کو غیر مستحکم کر دیا تھا۔ چنانچہ اُس کو شمس پور کے ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر ہسپتال میں منتقل کرنے کے بعد اُس کی فیملی کو بھی عارضی طور پر شمس پور کے ضلعی سرکٹ ہاؤس میں منتقل کر دیا گیا۔

وکلا کے مشتعل جتھوں نے سول کورٹس کی عمارت کے اندر توڑ پھوڑ اور فرنیچر کو نذرِ آتش کرنے کے ساتھ ساتھ اسسٹنٹ کمشنرز اور ڈی ایس پی کے دفاتر کو بھی تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔ فرنیچر، عدالتی ریکارڈ اور کمپیوٹر سسٹم کے علاوہ اسی قسم کے دیگر سامان سے بھی کچھ ثابت و سالم نہیں بچا تھا۔ وفاقی سپیریئر سروس سے تعلق رکھنے والے اسسٹنٹ کمشنر کی ٹریننگ کے بعد حیدر گوٹھ میں

پہلی پوسٹنگ تھی۔ ڈپٹی کمشنر نے ہنگامی طور پر اُس کا کیمپ آفس شمس پور کے سرکٹ ہاؤس میں قائم کرتے ہوئے اُسے ضلعی صدر مقام پر کام کرنے اور رہائش رکھنے کی تاکید کر دی۔ جبکہ ڈی آئی جی نے ڈی ایس پی کو حکم دیا گیا کہ وہ بہر صورت حیدر گوٹھ ہی مقیم رہے۔ مزید کہا گیا کہ بوقت ضرورت اگر زیادہ نفری کی ضرورت ہو تو ضلع کی پولیس لائن سے فورس منگوانے کی بجائے ایک مذہبی سیاسی جماعت حزب استقلال کی مقامی قیادت سے رابطہ رکھا جائے جن کے ہاں کشمیر اور افغانستان میں بھجوائے جانے والے مجاہدین اپنی تربیت مکمل کرنے کے واسطے نہ صرف ہر وقت دستیاب رہتے ہیں بلکہ رضا کاروں کی یونیفارم پہننے کے بعد یہ لوگ باقاعدہ پولیس فورس سے زیادہ بہتر کام کرتے ہیں۔

اِس واقعہ کے اگلے دن ہی صوبائی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے ایک انتظامی حکم کے تحت تحصیل حیدر گوٹھ کے ایڈیشنل سیشن جج اور دونوں سول ججوں کو ضلعی صدر مقام شمس پور تعینات کرتے ہوئے تحصیل کی سیشن اور سول عدالتوں کو عملی طور پر غیر فعال کر دیا۔ جب کہ علاقہ مجسٹریٹ کو ٹرانسفر کرنے کی بجائے اُسے ایک مہینے کی رخصت پر بھجوا کر تحصیل حیدر گوٹھ کے تمام تھانوں سے متعلقہ مقدمات بھی شمس پور کے مجسٹریٹ کو منتقل کر دیئے۔ یوں حیدر گوٹھ جیسی بڑی تحصیل نہ صرف دیوانی اور فوجداری عدالتوں سے محروم ہوئی بلکہ نائب تحصیل دار سے اسسٹنٹ کمشنر تک تمام ریونیو کورٹس میں بھی کام ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ اُدھر تھانہ سول لائن حیدر گوٹھ میں 180 وکلا کے خلاف ایف آئی آر درج کرنے کے بعد سربمہر کر دی گئی۔

صوبائی بار کونسل کے وائس چیئر مین نے اگرچہ اُسی روز پریس اور الیکٹرانک میڈیا میں حیدر گوٹھ کے وکلا کی حمایت میں بیان جاری کرتے ہوئے عدلیہ، پولیس اور انتظامیہ کے اُن افسروں کے خلاف سخت کارروائی کرنے کا مطالبہ کر دیا تھا کہ جو اِس سانحہ کا سبب بنے لیکن ملک کی سب سے بڑی وفاقی بار کونسل اور بار ایسوسی ایشن نے تین دن گزرنے کے بعد بھی کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ اگرچہ تحصیل حیدر گوٹھ کے ڈویژنل ہیڈ کوارٹر جلال آباد کی بار ایسوسی ایشن نے بھی واقعہ کے اگلے روز پولیس تشدد اور مجسٹریٹ کے رویے کے خلاف ہڑتال کی تھی لیکن صوبے کے باقی اضلاع

اور تحصیلوں سے ابھی تک کسی ردعمل کا نہ آنا وکلا تحریک کے لیڈر خوشحال خان کے لیے پریشانی کا باعث تھا۔ اُس نے ملحقہ اضلاع کی وکلا قیادت سے نہ صرف بار بار رابطہ کیا ہوا تھا بلکہ تین دنوں سے اِسی کوشش میں تھا کہ کم از کم صوبائی سطح پر تو غیر معینہ مدت کے لیے ہڑتال کا اعلان ہو جائے مگر وہ لوگ محض مذمتی بیانات کی حد تک اپنے آپ کو محدود کیے ہوئے تھے۔

خوشحال خان جانتا تھا کہ صوبائی وکلا قیادت کی اس سرد مہری کے پس منظر میں رضوان ہاشمی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ رضوان ہاشمی نہ صرف چوتھی بار مسلسل صوبائی بار کونسل کا ممبر منتخب ہوتا چلا آ رہا تھا بلکہ دو مرتبہ اس کا وائس چیئرمین بھی رہ چکا تھا۔ لہٰذا ایک انتہائی بااثر وکیل رہنما کی آشیرباد کے بغیر خوشحال خان کے لیے حیدر گوٹھ واقعہ کے اثرات سے بچ نکلنا تو ایک طرف رہا، الیکشن کی اُس منزل کو حاصل کرنا بھی ناممکن لگ رہا تھا کہ جسے پانے کی خاطر اتنا بڑا واقعہ کیا اور ایک متشدد تحریک کی بنیاد رکھی۔ خوشحال خان کو یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ اگر صوبائی سطح پر وکلا تنظیموں نے اُس کا ساتھ نہ دیا اور پورے صوبے میں عدالتی اور انتظامی سسٹم کو مفلوج نہ کیا گیا تو سربمہر کر دی گئی ایف آئی آر کے کھلنے میں کچھ دیر نہیں لگے گی کہ جس میں اُس کا نام جلاؤ گھیراؤ اور دیگر جرائم کے ارتکاب کے سلسلے میں سرفہرست تھا۔

اُدھر رضوان ہاشمی اس لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اُسے صوبائی بار کونسل کے الیکشن میں اب کے گیم اپنے ہاتھ سے نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اُسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ علاقہ مجسٹریٹ کے حوالے سے نہایت احتیاط سے ترتیب دیا ہوا الیکشن سٹنٹ یوں خوشحال خان اُچک لے جائے گا۔ رضوان ہاشمی اگرچہ خوشحال خان کا زخم خوردہ تھا لیکن اُس کے نزدیک خوشحال خان پھر بھی اپنی ناتجربہ کاری سے مار کھا گیا تھا۔ اُس نے جلد بازی میں موقع سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش میں بار کے سینئر ممبران کے علاوہ ملحقہ اضلاع اور صوبائی بار کونسل کے وکلا رہنماؤں کو اعتماد میں لیے بنا اتنا بڑا اور پُر تشدد احتجاج کر ڈالا اور اب اکیلا ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک جانب حیدر گوٹھ کی مقامی بار کا مخالف دھڑا تھا جس کے صدارتی امیدوار باسط انصاری کی سرپرستی رضوان ہاشمی ایڈووکیٹ اور دیگر سینئر وکلا کر رہے تھے تو دوسری جانب عدلیہ، انتظامیہ اور پولیس تھی جو اُسے دبوچنے کے واسطے

مناسب وقت کے انتظار میں تھی۔ جن ساتھی وکلا کے ساتھ مل کر اُس نے احتجاج کیا تھا اُن کی اکثریت تو جوانوں پر مشتمل تھی جو اپنے خلاف پرچہ درج ہوتے ہی روپوش ہو گئے، جو باقی بچ رہے وہ اتنے بااثر نہیں تھے کہ سرکاری املاک پر حملے، تشدد اور توڑ پھوڑ جیسے الزامات کے ہوتے ہوئے نجات دہندگان کو قائل کر سکتے۔ چونکہ میڈیا کے کیمروں نے سب کچھ ریکارڈ کر لیا تھا اس لیے سول سوسائٹی اور عوامی حلقے بھی اُن کے خلاف ہو چکے تھے۔ رہی سہی کسر سوشل میڈیا نے پوری کر دی اور اُن کے احتجاج کو "وکلا گردی" جیسا نام دے کر ہر طرف نفرت پھیلا دی۔

رضوان ہاشمی کو پورا یقین تھا کہ بار کونسل اور بار ایسوسی ایشنز کے وکلا رہنماؤں کی عدم توجہی اور صوبہ بھر میں عدالتوں کا بائیکاٹ نہ ہونے کی وجہ سے خوشحال خان کا سٹنٹ زیادہ دیر تک نہیں چلنے والا۔ بار کے پیشہ ور وکلا اور زیرِ سماعت مقدمات کے فریقین کا دباؤ الگ سے تھا کہ جو حیدر گوٹھ میں عدالتیں ختم ہونے کے باعث ذہنی خلجان کا شکار ہو چلے تھے۔ جونہی خوشحال خان باہر سے چھپ چھپا کر بار روم میں پہنچتا تو وہ وکیل اُسے گھیر لیتے کہ جن کے فوری نوعیت کے مقدمات، خاص طور پر ضمانت کی درخواستیں غیر معینہ مدت کی ہڑتال کی نذر ہو رہی تھیں۔ اگرچہ یہ صورت حال رضوان ہاشمی کے لیے باعث طمانیت ہونی چاہیے تھی لیکن وہ پھر بھی کوئی ایسی چال چلنے کے لیے مضطرب تھا کہ جس کے سبب خوشحال خان کی بے وقوفی سے پیدا شدہ ثمرات اب بھی اُس کی جھولی میں آن گریں۔ کچھ تو ایسا ہو کہ لعنت ملامت خوشحال خان کا نصیب رہے لیکن صلح کل ہوتے ہوئے حقیقی وکیل رہنما کی دستار اُس کے سر پر سجے۔ لیکن ایسا ہوتا ہوا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وکلا سیاست سے بے نیاز کچھ سینئر وکیلوں نے آج شام خوشحال خان سمیت دیگر تمام وکلا رہنماؤں کو متنبہ کر دیا تھا کہ اگر کل تک وہ اِس مسئلے کا کوئی حل نہیں نکالتے تو وہ عدالتی بائیکاٹ ختم کرتے ہوئے پرسوں سے شمس پور جا کر اپنا کام شروع کر دیں گے۔ اِس انتباہ کی وجہ سے خوشحال خان کو اپنا مستقبل تاریک دکھائی دینے لگا تھا جب کہ رضوان ہاشمی کو اپنے کیے کرائے پر پانی پھرتا اور بار کونسل کی ممبر شپ ڈوبتی دکھائی دے رہی تھی۔ بار بار بس ایک ہی چابک سا اُس کے ذہن پر برس رہا تھا کہ کچھ تو ایسا ہو، بساط پھر سے بچھے اور وہ اپنی چال وہیں سے شروع کر سکے جہاں سے

اُسے خوشحال خان کے اناڑی ہاتھوں نے اُچکا تھا۔

اور پھر کچھ ایسا ہو ہی گیا۔ بساط تو ابھی نہیں بچھی تھی مگر مہرہ حرکت میں آ گیا۔ مہرہ بھی کون ! نہ اُسپ نہ فیل بلکہ خود شاہ۔ رات گیارہ بجے کے قریب جب رضوان ہاشمی سونے کی تیاریوں میں تھا اُسے اطلاع ہوئی کہ خوشحال خان باہر اُس کے دروازے پر موجود ہے۔ ایک لمحے کے لیے تو اُس کا دماغ گھوم گیا کہ ملنے سے انکار کر دے۔ موبائل فون کے زمانے میں یہ بھی بھلا کوئی طریقہ ہے بنا پوچھے رات کے اِس وقت کسی کے گھر آنے کا مگر پھر خیال آیا کہ جس قسم کی صورت حال کے وہ دونوں شکار ہو چکے ہیں اُس میں اِس قسم کی حواس باختگی کچھ زیادہ معنی نہیں رکھتی۔ پھر بھی رضوان ہاشمی نے اپنا ردِ عمل دکھانے اور بالا دست رہنے کے واسطے اُسے ڈرائنگ روم کی بجائے لائبریری میں بٹھانے کو کہا کہ جسے وہ اپنے دفتر کے طور پر بھی استعمال کر لیا کرتا تھا۔

خوشحال خان جو کبھی رضوان ہاشمی کا جونیئر ایسوسی ایٹ رہا تھا، اُسے دیکھتے ہی اُس کے قدموں کو چھونے کے لیے جھک گیا۔ رضوان ہاشمی نے اُسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر کھڑا کیا اور سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کو کہا کہ جس پر وہ اپرینٹس شپ کے زمانے میں بیٹھ کر اُس سے ڈرافٹنگ کی ڈکٹیشن لیا کرتا تھا۔ کافی دیر تک کمرے میں خاموشی رہی۔ خوشحال خان سر جھکائے سامنے بیٹھا تھا مگر آنکھ نہیں ملا رہا تھا۔ جب کہ رضوان ہاشمی سفید مونچھوں تلے دبی فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا کہ کب وہ اُس سے آنکھ ملائے اور بات کرے۔ بات آغاز نہ ہونے کے اِن چند لمحات میں بیتا ہوا ایک زمانہ دونوں کے ذہنوں میں گھومے جا رہا تھا مگر مختلف انداز اور معکوس زاویوں میں۔ محض ایک لاء گریجوایٹ سے نوجوان مگر قابل اور کامیاب وکیل بننے کے سات برس خوشحال خان نے رضوان ہاشمی کی شاگردی میں گزارے تھے۔ وکالت کے داؤ پیچ، کلائنٹ کی جیب سے زیادہ سے زیدہ فیس نکلوانا اور پھر وکلا سیاست کے رموز اور اِس کی کرشمہ سازی، یہ سبھی کچھ اُس کے اُستاد رضوان ہاشمی کی تربیت کا فیض تھا لیکن سات برس کے بعد اچانک ایک روز جب اُسے رضوان ہاشمی نے علیحدہ چیمبر بنا کر وکالت شروع کرنے کا حکم دیا تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ دور دور تک یادداشت میں کچھ بھی ایسا نہیں تھا کہ جو مہربان اُستاد کی برگشتگی کا موجب ہو سکتا خاص طور

پر ایسے حالات میں کہ جب اُس سے بھی پہلے کے جونیئرز ابھی تک ہاشمی صاحب کے ایسوسی ایٹ چلے آ رہے تھے۔

خوشحال خان نے اُستاد کی نادیدہ برہمی کو اپنے علیحدہ چیمبر کی بنیادوں میں نہیں بلکہ اپنی میز پر اپنے مقابل رکھا، پیشہ ورانہ توانائی اور مسابقت کا منبع سمجھ کر کہ جس سے اُس کا ہر نیا دن طلوع ہونے لگا۔ جلد ہی وکالت بھی چلی اور سیاست بھی۔ اُس نے رضوان ہاشمی سے علیحدگی کے بعد نہایت آہستگی سے اُس کے مخالف دھڑے میں اپنی موجودی محسوس کرانی شروع کر دی اور یوں محض دو برس کے بعد اُسی دھڑے کا امیدوار بن کر تحصیل بار کے الیکشن میں اُستاد کے اُمیدوار کو دھول چٹادی۔

''کیوں خوشی خان کیسے آنا ہوا؟'' رضوان ہاشمی نے اپنے مخصوص استہزائیہ انداز میں خاموشی کی دیوار کو توڑنے کی کوشش کی مگر دوسری جانب خوشحال خان نے صرف ایک بار اُستاد کو آنکھ بھر کر دیکھا اور پھر سے نگاہیں جھکا لیں۔

''یار بہت بڑے لیڈر بن گئے ہو! ہم جیسے غریب غربا کو ٹکریں مار مار کر اب یہ کیا کہ مارا ماری.... جلاؤ گھیراؤ.... اور ججوں کے ساتھ ساتھ پولیس اور انتظامیہ سے بھی ٹکر لے لی؟'' ہاشمی کے ہونٹوں پر بدستور وہی مسکراہٹ تھی، مذاق اُڑانے والی۔ خوشحال خان نے اب کے سر نہیں اُٹھایا، خود اُٹھا اور آ کر رضوان ہاشمی کے قدموں میں اکڑوں بیٹھ کر دونوں ہاتھ اُس کے پاؤں پر رکھ دیئے۔ رضوان ہاشمی نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ایک بار اُسے دونوں کندھوں سے پکڑا اور اُٹھاتے ہوئے سامنے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ خوشحال خان دوبارہ کرسی پر اس طرح آگے سُرک کر بیٹھا کہ توازن قائم رکھنے کو میز کا سہارا لینا پڑا۔

''کیا چاہتے ہو؟'' ہاشمی کی آواز میں نرمی کی جگہ غراہٹ در آئی تھی۔

''آپ جانتے ہیں کہ ایسے میں مجھے کیا چاہیے۔'' خوشحال خان کے گلے سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

''مجھے کیا ملے گا؟'' ایک بار پھر وہی غراہٹ اُبھری۔

''جو آپ حکم کریں گے۔'' خوشحال خان منمنایا۔

''ضامن کون ہوگا؟''

''جس کا آپ کہیں گے۔'' خوشحال خان بظاہر مکمل سرنڈر کر چکا تھا۔

''کل ایک بجے دن مجھ سے فون پر رابطہ کرنا۔'' غراہٹ ایک لیول اور اونچی ہو چکی تھی۔

''لیکن کل تک تو بہت دیر ہو جائے گی؟'' خوشحال کے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا تھا۔

''تو پہلے آنے سے کس نے روکا تھا؟'' غراہٹ بے رحمی میں منقلب ہو چکی تھی۔

۱۰

حاجی بخشن نے انتہائی برا سا منہ بناتے ہوئے شہزادی کو جلدی جلدی کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ جونہی وہ حیرت زدہ آنکھوں کے ساتھ باہر کو لپکی اور دروازہ بند ہوا تو بخشن نے فون کو اس طرح سے آن کیا کہ جیسے کسی عذاب کا سامنا کرنے جا رہا ہو۔

''حاجی! یہ کیا حال کر کے رکھ دیا ہے حیدر گوٹھ کا! نہ کوئی عدالت بچی ہے اور نہ ہی دفتر، وکیل الگ جان کھا رہے ہیں اور حکومت الگ، ابھی ہائی کورٹ کا بلاوا بھی آنے والا ہے، خدا جانے نوکری اور وردی بھی بچتی ہے کہ نہیں۔''

''حضور! میں نے کیا کیا ہے، ظلم تو اُلٹا مجھ پر ہوا ہے، خاطر داریاں بھی میں کروں، ناز نخرے بھی میں برداشت کروں، چھوٹے بڑے کی پھٹکیں بھی میں جھیلوں اور چھاپے بھی مجھ پر پڑیں، آپ کو اندازہ ہی نہیں کہ میں حیدر گوٹھ تو کیا پورے پچاس ضلعوں میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا اور خرچہ کتنا ہو گیا ہے، اُس کا تو حد حساب ہی نہیں اور آپ نے دو دن سے میرا فون ہی نہیں سنا، نمبر ہی بند رہا اور دوسرے نمبر پر آپریٹر فون ہی نہیں ملاتا تھا۔'' حاجی بخشن شدتِ جذبات سے کھانسنے لگا تھا۔

''حاجی! اس چھاپے کا تو مجھے بھی علم نہیں تھا، ڈی آئی جی الگ قسمیں اُٹھاتا ہے، ایس ایس پی اور ڈی ایس پی دونوں بے خبر، میں خود حیران ہوں کہ ایس ایچ اُو نے اتنا بڑا قدم اپنے آپ اُٹھایا

تو اُٹھایا کیسے، وہ تو جیب تراشی کے پرچے کے لیے بھی ایس ایس پی اور پھر ڈی آئی جی کی اجازت لیتا ہے لیکن سمجھ نہیں آتی کہ تمھارے ہوٹل پر چھاپہ مارنے کی اُس نے جرات کیسے کی۔" دوسری جانب سے بولنے والے آفیسر کا رویہ بتدریج مدافعانہ ہوتا چلا جارہا تھا۔

"اب تو ہوگئی ناں جناب! ایک ایس ایچ اُو اپنے آئی جی کو بھی وہاں لگتا ہے کہ جہاں کسی کو کوئی لگتا بھی نہیں، اب سوچیں میری عزت کیسے بحال ہوگی! ہم جیسے غریبوں کے پاس تو عزت کے سو کچھ ہوتا ہی نہیں، یاد رکھیں آئی جی صاحب! اب میں تو بے عزت ہوگیا ہوں لیکن اب میں کسی کو عزت دار بن کر کرسی پر بیٹھنے نہیں دوں گا۔" بخشن نے کوشش کی کہ تمام بھڑاس نکال دے۔

"حاجی صاحب! اُس بھڑوے ایس ایچ اُو کو سسپنڈ کر کے لائن حاضر ہی نہیں کیا اُس کی انکوائری بھی لگا دی ہے، تم کہو گے تو ڈسمس بھی کر دیں گے۔" آئی جی کے لہجے میں لجاجت آمیز آکڑ تھی۔

"جاؤ کسی اور کو چراؤ صاحب! اُس حرامی کو لائن حاضر تو حیدر گوٹھ میں امن امان کی ناکامی پر کیا گیا اور پھر اگلے ہی دن بحال کرنے کے بعد پھر سے تھانہ صدر لگا کر احسان مجھ پر کیا جارہا ہے کہ میرے ہوٹل پر چھاپہ مارنے کی وجہ سے اُس کو ٹھوکا گیا تھا۔"

دوسری جانب خاموشی کا وقفہ کچھ طویل ہوا تو حاجی بخشن بھی ایک درجہ عاجزی میں اُتر آیا۔

"شنو صاحب! ہم جو ہوتے ہیں ناں! ہم سب ایک دوسرے کے دلے ہوتے ہیں، بھڑوے ہوتے ہیں، میں پولیس کے سامنے ننگا اور پولیس کی دھوتی میرے سامنے اُوپر اُٹھی ہوئی اور وہ بھی پچھواڑے سے، ہمارا کام پولیس کے بغیر نہیں چلتا اور پولیس ہم جیسوں کے بغیر ٹھس ہوئی رہتی ہے، میرا کہنا بس اتنا تھا کہ تکڑی کے تول کو برابر کے تول میں رکھو، دونوں طرف بھار ایک جیسا ہو، ورنہ ہوگا کیا! آپ بھی جانتے ہو اور میں بھی جانتا ہوں۔"

فون کے دوسری جانب آئی جی نے ایک بے وجہ لحاتی خاموشی کے بعد ہلکا سا کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "ٹھیک ہے حاجی! تمھاری عزت بھی بحال ہو جائے گی لیکن پہلے ایک کام کر دو یہ وکیلوں کے جھنجٹ سے جان چھڑا دو۔"

''میں کیسے چھڑاؤں جان ! میری تو انھوں نے پہلے ہی سٹی ماری ہے، محض ضمانتوں کے لیے دس لاکھ کا تقاضا ہے اور پانچ لاکھ ایڈوانس میں دے چکا ہوں۔'' بخشن کا لہجہ پھر سے تلخ ہونے لگا تھا۔

''او حاجی ! بندہ بن بندہ، تیرا نقصان کسی اور کھاتے سے پورا کرا دیں گے، تو کسی طور اِن کو راضی کر اور ختم کرا یہ ہڑتال شڑتال۔'' آئی جی کا لہجہ بھی کچھ کچھ کھردرا ہونے لگا تھا۔

''نہ صاحب جی ! میں یہ ذمہ داری نہیں لے سکتا، جس بندے کو پولیس نے بھرے شہر میں ننگا کر کے اُس کے پلے کچھ نہ چھوڑا ہو تو بھلا وکیل اُس کی بات کیوں مانیں گے۔ آپ لوگوں کا اپنا شریکا ہے، کبھی وہ آپ کی وردی پھاڑتے ہیں تو کبھی آپ اُن کے سر پھاڑتے ہو، ایسے میں مجھ جیسی چڑی کا کیا کام کہ دو شہبازوں کے بیچ آ کر اپنی ٹھیتی ٹھیتی کرالے، ناں جناب ! مجھے ایک طرف رکھیں۔'' حاجی بخشن نے ہاتھ تو کھڑے کر دیئے مگر انتہائی نخوت بھرے انداز میں۔

''چلو ! پھر بھی دیکھ لینا، ویسے بھی اُس وکیل خوشحال خان کا ساتھ کوئی نہیں دے رہا، پرچہ ہوتے ہی سب تتر بتر ہو گئے ہیں، ہو سکتا ہے ہڑتال ایک آدھ دن میں اپنے آپ ہی ختم ہو جائے، اور حاجی ! تو سنا تیرا شراب کا کنٹینر کب آ رہا ہے، رپورٹ ملی ہے کہ اِس بار تو مال کروڑوں میں ہے؟'' آئی جی کے لہجے میں ایک چھوٹی سی مگر پراسرار دھمکی بھی مضمر ہو چلی تھی۔

آئی جی کا آخری جملہ سنتے ہی حاجی بخشن کو چپ سی لگ گئی اور دوسری جانب سے رابطہ بھی کٹ گیا۔ اُدھر سے فون بند ہو جانے کے بعد بھی وہ اپنا فون ہاتھ میں لیے کافی دیر تک اُس کی بجھی ہوئی اسکرین کو خاموش نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ کئی سوال تھے جن کے جواب اُلجھے ہوئے تانے کی صورت ذہن میں آنے لگے تھے، کہیں ڈور کا سرا دکھائی تو دے رہا تھا مگر ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن جو تازہ سوال آئی جی کے آخری جملے نے ذہن میں پیدا کرنے شروع کر دیئے تھے اُن کی اذیت کسی طور بھی درد زہ سے کم نہیں تھی۔ گرداب تھا کہ جس کے اندر کئی بھنور جنم لے رہے تھے۔

آئی جی حمید الرحمٰن کے آخری جملے نے جہاں اُس کی زبان گنگ کر دی تھی وہاں ذہن بھی سُن سا ہو کر رہ گیا۔ حاجی بخشن کی نگاہوں میں وہ سارا زمانہ گھوم گیا کہ جب اِس آئی جی حمید الرحمٰن

کی پہلی تعیناتی بطور اے ایس پی تحصیل حیدر گوٹھ میں ہوئی تھی۔ اولین دنوں کی اکڑفوں کے بعد جب بخشن نے اُس کی طبیعت اُس وقت کے ڈی آئی جی شمس پور سے صاف کرادی تو پھر اُن کے درمیان دوستی کا وہ تعلق بنا جو ابھی تک چلا آرہا تھا۔ حمید الرحمٰن نے پوری تحصیل کی پولیس کو عملاً بخشن کے زیرِ تصرف کر دیا اور بخشن نے بھی اُس کی مدارت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ حمید الرحمٰن اُن دنوں غیر شادی شدہ تھا سو اُس کے واسطے ایک مستقل حجلۂ عروسی سجا دیا گیا کہ جس میں صرف دلہنیں بدلتی رہتی تھیں۔ اُس نے خواہش کی کہ صوبائی دارالحکومت کے پوش علاقے میں اُس کی ایک کنال کی کوٹھی ہونی چاہیے تو اُس کی پسند کے مطابق بنگلہ بنوا کر اُس کے حوالے ہوا۔ اُس کی شادی ہوئی تو شادی کا خرچہ ایک طرف رہا باورچی اور مرچ مسالے تک حیدر گوٹھ سے گئے۔ پینے پلانے والوں کے لیے ولایتی شراب اور رقص و سرود کی محفلیں کئی دنوں تک اِس اہتمام سے چلیں کہ دوستوں کو عیش و عشرت کی تعریف نئے سرے سے متعین کرنا پڑی۔ حمید الرحمٰن بھی جہاں رہا بخشن کے معاملات کو اپنے معاملات سمجھتا رہا۔ کوشش کی کہ احسان چکتے کیے جاتے رہیں حتیٰ کہ جب وہ کئی برسوں کے بعد ڈی آئی جی بن کر شمس پور میں تعینات ہوا تو بخشن کے ساتھ خصوصی مہربانیاں بدستور جاری رہیں مگر وہ خود فاصلہ پہ رہا۔ بخشن خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ آمنے سامنے کی ملاقاتوں سے اُس کی افسری پر حرف آئے لہٰذا عقل مند دوست ہونے کے ناتے کنارے پر رہ کر وہ دریائی مچھلیوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ حمید الرحمٰن کی اِس تعیناتی میں بخشن کا کاروبار خوب چلا۔ پہلی بار اُسے افغانستان جانے والے نیٹو کے کنٹینروں سے نکالی گئی ولایتی شراب کے دھندے سے ہونے والی بے اندازہ آمدنی کا چسکا لگا تو لڑکیوں اور خواجہ سراؤں کی ہوٹل سے بالا بالا رسد نے بھی کرشماتی کام کیا۔

دھندے جائز ہوں یا ناجائز اِن کی بڑھوتری میں دھندے سے زیادہ دھندہ کرنے والے کا پہلے اثر و رسوخ اور پھر نام چلتا ہے۔ پولیس کے وہ لوگ جو حمید الرحمٰن کے اے ایس پی کے دور میں کانسٹیبل، ہیڈ کانسٹیبل یا اسسٹنٹ سب انسپکٹر تھے، اُس کی ڈی آئی جی کی تعیناتی کے وقت سب انسپکٹر، ایس ایچ او اور ڈی ایس پی ہو چکے تھے۔ وہ حاجی بخشن کا اپنے ڈی آئی جی سے تعلق جانتے

تھے لہٰذا اُسی کے دھندے کے نگہبان بن کر اُسی کے قدموں میں لوٹتے رہتے۔ چھوٹے موٹے تبادلے، چھٹیاں، پروموشن یا سزا جزا وہ دفتر کے کلرک بابو سے اشاروں اشاروں میں کرا لیتا۔ بدلے میں وہ کانسٹیبل سے لے کر بہت اوپر تک ہر کسی کو ہر طرح سے بن کہے نوازتا رہتا۔ یہی وجہ تھی کہ افسر کوئی بھی حیدر گوٹھ میں تعینات ہو وہ حاجی بخشن کے زیرِ بار رہتا۔ کسی سے ویسے بھول چوک میں کچھ کمی بیشی ہو بھی جاتی تو وہ درگزر کرتا۔ ڈی آئی جی حمید الرحمٰن کا بھی جب شمس پور سے تبادلہ ہوا تو بخشن نے اُسے وفاقی دارالحکومت میں ایک فارم ہاؤس کا تحفہ پیش کیا۔

یہی نہیں بلکہ آئی جی بننے سے پہلے حمید الرحمٰن ایک کھڈے لائن پوسٹنگ پر تھا۔ ایک بار پھر بخشن سے آئی جی لگنے کی فرمائش ہوئی کہ صوبے کا وزیرِ اعلیٰ رئیس جمال بخش، حیدر گوٹھ کے ملحقہ حلقے کا ایم پی اے ہوتے ہوئے اُس کی دسترس میں تھا۔ وزیرِ اعلیٰ بھی حمید الرحمٰن کو نہ صرف اچھی طرح سے جانتا تھا بلکہ اُس سے برگشتہ بھی تھا۔ اِس لیے جب بخشن نے اپنے ڈھب سے اُس کی خوب تواضع کرنے کے بعد حمید الرحمٰن کا ذکر کیا تو وہ بھڑک اُٹھا کہ اُس نے شمس پور کی پوسٹنگ میں اُس کا ایک چھوٹا سا کام بھی نہیں کیا تھا لیکن نہ تو بخشن مایوس ہوا اور نہ ہی حمید الرحمٰن بلکہ سوشل میڈیا، الیکٹرانک میڈیا اور پریس میں سابقہ آئی جی کی بری کارکردگی کا دن رات خوب ڈھونڈرا پٹوایا حمید الرحمٰن نے لیکن خرچہ حاجی بخشن کا ہوا۔ پھر بھی کام نہ بنا تو دو تین اشتہاری ملزمان سے ایک ہی ہفتے میں موٹر وے اور نیشنل ہائی وے پر ڈکیتی اور گینگ ریپ کی اندھی وارداتیں کرا دی گئیں۔ ہر طرف شور تو مچا لیکن جب پولیس نے اِدھر اُدھر سے گرفتاریاں کر کے کچھ لوگوں سے اقبالِ جرم کرا لیا تو معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ لیکن اُسی ہفتے صوبائی دارالحکومت کی ملحقہ تحصیل میں یکے بعد دیگر چار بچیاں اغوا ہوئیں اور پھر وحشیانہ جنسی تشدد کے بعد اُن کی مسخ شدہ لاشیں کوڑے کے ڈھیر سے ملنا شروع ہوئیں تو پورے صوبے میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی جو کسی سے بھی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ ہر طرف سے آئی جی کے تبادلے کا شور اُٹھا مگر پھر ایک مشکوک ڈی این اے رپورٹ کو بنیاد بنا کر وزیرِ اعلیٰ کی موجودگی میں ایک لاوارث لڑکے کو پریس کے سامنے لا کر اقبالِ جرم کرایا گیا اور یوں مبینہ قاتل کی گرفتاری کے بعد عوام کے مشتعل جذبات بھی لحہ بہ لحہ سرد ہوتے چلے

گئے۔آئی جی ایک بار پھر بچ گیا۔

ہر طرف سے ناکام ہو کر حاجی بخشن نے دیہاتی انداز میں پلاننگ کی اور حکومت کی ایک اتحادی جماعت کے ایم پی اے کو منہ مانگی رقم دینے کے بعد اُس کو آئی جی آفس میں آئی جی سے لڑا دیا گیا۔ایم پی اے کا استحقاق مجروح ہوا تو اسمبلی میں تحریک ایک طرف، دوسری جانب اتحادی پارٹی نے حکومت سے علیحدگی کی دھمکی دے دی۔مطالبہ ایک ہی تھا ''آئی جی کی تبدیلی اور معطلی۔'' اب کے وزیر اعلیٰ کی ضد بھی کسی کام نہ آئی اور یوں حمید الرحمٰن صوبے کے آئی جی کی کرسی پر براجمان ہو بیٹھا۔آئی جی بننے کے بعد اُس نے سب سے پہلا فون حاجی بخشن کو کیا کہ آج کے بعد نہ تو وہ آئی جی آفس میں آئے گا اور نہ ہی اُسے فون کیا کرے گا۔جب بھی ضروری ہوا وہ خود اُسے فون کر لیا کرے گا۔

''لیکن مجھے اگر کسی مشکل میں اپنے بھائی کی ضرورت پڑی تو؟'' بخشن حمید الرحمٰن کے فون سے سٹپٹا گیا تھا۔

''حاجی! اب میں صوبے کا آئی جی ہوں کسی حیدر گوٹھ یا شمس پور کا افسر نہیں، پورا صوبہ میرے سامنے ہے، کس میں اتنی جرات ہے کہ تمہیں مشکل میں ڈالے! تم کھل کر اپنا کام کرو، مجھ سے رابطے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی ہاں لیکن دیکھنا میری عزت پر، میرے نام پر کوئی حرف نہ آئے۔''

فون تو بند ہو گیا لیکن حاجی کو اُس کے لہجے میں اجنبیت محسوس ہونے لگی تھی۔حاجی بخشن کو اُس وقت حمید الرحمٰن کی نیت پر شبہ کرنا کسی گناہ کا کیا جانا لگا تھا۔ایک طویل عرصے کا تعلق اور پھر اب اُسے آئی جی لگوانے کے لیے اُس نے دن رات تو ایک کیے سو کیے دھن لٹانے میں بھی کوئی پرواہ نہیں کی تھی تو حمید الرحمٰن کیسے اُس سے یوں منہ پھیر سکتا تھا۔یقیناً کوئی دفتری مجبوری رہی ہو گی۔لیکن آج اُس کے فون کے آخری جملے نے حاجی بخشن کی سال بھر پہلے کی غلط فہمی دور کر دی تھی۔الجھی ہوئی ڈور کا سرا ہاتھ میں آ گیا تھا۔

اُس نے کچھ سوچ کر موبائل سے کی جانے والی کالز میں سے ایک نمبر ڈھونڈا اور ڈائل کے

بٹن کو دبا دیا۔ دوسری جانب بیل ہونے لگی تھی۔

"جی ہاشمی صاحب! کیا پوزیشن ہے وکیلوں کی ہڑتال کی؟"

رضوان ہاشمی نے زوردار جماہی کو درمیان میں روک لیا۔ "کل سب ٹھیک ہو جائے گا، میں نے سب کو روک رکھا ہے۔ خوشی خان کی صدارت چڑھ گئی کِلّے پے اور وہ اکیلا رہ گیا ہے، کل جیسے ہڑتال ختم ہو گی تو پولیس اُس کے پیچھے ہو گی، باقی رہا ہمارا کیس اُس کے تو ریمانڈ پیپرز پولیس دیکھیے فائل سمیت جل چکے ہیں، جو لوگ پکڑے گئے تھے وہ بھی ہنگامے میں اِدھر اُدھر ہو گئے، اصل لڑکی آپ کے پاس پہنچ چکی ہو گی، اب ہمیں کیا فکر۔"

"لیکن اب یہ ہڑتال ختم نہیں ہونی چاہیے جب تک میں نہ کہوں، پورے ملک میں نہیں تو پورے صوبے کی عدالتیں بند ہونی چاہئیں، وکیل سڑکوں پر ہوں اور نشانہ پولیس ہو، دھن دھیلے کی فکر نہیں کرنی، کھانے پینے کی فکر بھی نہیں کرنی، صوبے کے ہر ضلع، ہر تحصیل کی کچہری میں ہر روز مرغ قورمہ اور بریانی چلا کرے گی۔"

"لیکن حاجی صاحب! اس طرح تو خوشی خان لیڈر بن جائے گا اور میری بار کونسل کی ممبری تو گئی بھاڑ میں۔" رضوان ہاشمی حواس باختہ ہو گیا تھا۔

"ہاشمی صاحب! فکر نہ کرو، کچھ نہیں ہوتا، کل سے اِس احتجاج کی کمان تم سنبھالو گے، ابھی سونا نہیں اور کام شروع کر دینا ہے، میرا منشی پچاس لاکھ کا پیکٹ لے کر ابھی پہنچنے والا ہو گا، اور ہاں پریشان نہیں ہونا، اِس پیکٹ کو پہلی قسط سمجھنا۔" حاجی بخشن نے فون بند کیا اور دھوتی میں ہاتھ ڈال کر خصیہ خراشی کرنے لگا۔ طمانیت کے اِس عالمِ عروج میں اُس کی آنکھیں خود بخود بند ہو چلی تھیں۔

11

اللہ ڈنو عبید کا اسٹڈی روم صاحبزادہ سلطان احمد تونگر کے واسطے کسی گھٹیا درجے کے تھانیدار کا ٹارچر سیل بن چکا تھا۔ اپنے عرصۂ ملازمت میں مشکل بیوروکریٹ کے نام سے جانا جانے والا صاحبزادہ تونگر ایک سے بڑھ کر ایک ذہنی جھٹکوں کے بعد عبید کے سامنے ہتھیار ڈال چکا تھا۔ سانپ

کو کچوا بنا دیکھ کر عبید کے خبثِ باطن کو عجیب سی تسکین مل رہی تھی اور صاحبزادہ تونگر ابھی تک یاد نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ کب، کہاں اور کس وقت عبید جیسے شخص سے بالواسطہ یا بلاواسطہ رابطے میں رہا تھا۔ لیکن وہ جو کچھ بھی بتا رہا تھا وہ سب سچ تھا۔ ''تو کیا ملک الیاس اُسے دھوکا دیتا چلا آ رہا ہے اب تک۔'' لیکن اس کا تصور کیا جانا بھی اُس کے لیے محال تھا۔ ایک طرف وہ اُس کی بیگم کا خالہ زاد اور دوسری جانب اُس کے تمام عیوب کا شاہد اور حصہ دار رہا تھا۔ لیکن جتنی سانجھ کی ساجھے داری عبید بتا رہا تھا، اِس کا تو عشرِ عشیر بھی اُسے کبھی نہیں ملا تھا۔ کبھی کسی قتالہ دوشیزہ کو صحبت میں لے آیا اور کبھی ملک کی معروف ترین ماڈلز اور ٹی وی اداکاراؤں کی محفل میں راجہ اندر بنا کر بٹھا دیا۔ اگر کہیں معاملہ نقدی کی صورت ہوتا تو اُس کی وصولی وہ اپنی خالہ زاد کے حوالے کرتا، صاحبزادہ کے نہیں۔ اُس تک تو محض بیگم صاحبہ کا حکم پہنچتا کہ سیاہ کرنا ہے یا سفید۔

''تونگر صاحب! آپ کن سوچوں میں پڑ گئے؟ حکم ہو تو کچھ عرض کروں!'' اللہ ڈنو عبید اب اُس کی ملفوف تذلیل پر اُتر آیا تھا۔

''میں نے تمھارے پاس آ کر زندگی کی پہلی بڑی غلطی کی۔'' صاحبزادہ تونگر بے بسی کا اشتہار بنتا چلا جا رہا تھا۔

''پہلی بڑی غلطی؟'' عبید استہزائیہ انداز میں حیران ہو رہا تھا۔ ''صاحبزادہ صاحب! آپ نے تو غلطیوں کے انبار لگا رکھے ہیں، میرے پاس آ کر تو آپ حفاظتی حصار میں آ گئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے! تم نے جس چنگل میں بھی پھانسنا ہے مجھے، پھانس لو اور ختم کرو یہ سسپنس تاکہ ہمارا تعلق آج یہیں پر ختم ہو جائے، مزید برداشت نہیں ہوتا مجھ سے۔'' صاحبزادہ تونگر اُکتاہٹ کا شکار ہو چکا تھا۔

''تعلق ختم؟'' اللہ ڈنو عبید عجیب سی مضحکہ خیز ہنسی ہنسا۔ ''تعلق تو تونگر صاحب آج سے شروع ہو رہا ہے، اور یہ آپ نے اچھا نام دیا ہماری دوستی کو ''چنگل''، واقعی ہماری دوستی چنگل کی طرح ہوتی ہے جو ایک بار ہمارے حلقۂ دوستی میں آ گیا، سو آ گیا، پھر نہ تو نکل سکتا ہے اور نہ ہی بھاگ سکتا ہے۔''

''کیا کچھ بلیک میل کرنے کا ارادہ ہے؟'' صاحبزادہ تونگر ایک بار پھر بظاہر ڈھیلا پڑ گیا تھا لیکن اُس کے اندر کا کھولاؤ اُس کی آنکھوں سے چھلک رہا تھا۔ لیکن عبید کو اس کی پروا نہیں تھی۔

''ہم آپ کو اپنا پارٹنر بنانا چاہتے ہیں، پارٹنر ان کرائم نہیں بلکہ اپنے کئی کاروباروں میں سے ابھی صرف ایک کاروبار میں تیس پرسنٹ کا پارٹنر اور وہ بھی کچھ انویسٹ کیے بغیر۔''

''عبید صاحب! کیا مجھے چوتیا سمجھتے ہیں آپ کہ میں یقین کر لوں گا، کچھ بھی انویسٹ کیے بغیر ایک کاروبار میں تیس فیصد کی حصہ داری؟''

اللہ ڈِنو عبید نے کندھے اُچکا کر ایک لمبی سانس لی۔ اتنے میں جانان ہاتھ میں ایک فائل اُٹھائے آہستہ خرامی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کی طرف کنکھیوں سے دیکھا اور آگے بڑھ کر فائل کو کھولتے ہوئے انتہائی احترام کے ساتھ صاحبزادہ تونگر کے سامنے میز پر رکھ دی۔ فائل میں محض چند صفحات تھے لیکن سارے کے سارے بادامی رنگ کے اسٹامپ پیپر۔ تونگر نے حیران ہو کر پہلے جانان اور پھر عبید کی طرف دیکھا۔ اُس نے بے اعتنائی سے اپنا چہرہ دوسری جانب پھیر لیا تو جانان نے بھی مسکراتے ہوئے تونگر کو دستاویز دیکھنے کی گزارش اِس دلربائی سے کی کہ وہ مبہوت ہو کر رہ گیا۔ جانان کے بدن کی خوشبو تھی یا اُس کے لباس سے اُٹھتی ہوئی کسی پرفیوم کی مہک کا جادو کہ صاحبزادہ سلطان احمد تونگر کی آنکھیں خود بخود ادھ کھلی فائل میں لگے اسٹامپ پیپرز پر جھکتی چلی گئیں۔ یہ دستاویزات کسی ''ہولی ٹرانزیکشن'' (Holy Transaction) نامی سیکورٹی کمپنی کی تھی کہ جس میں اُسے تیس فیصد شیئرز کے خریدار کی حیثیت سے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں بطور ڈائریکٹر شامل کیا جا رہا تھا۔ اسٹاک ایکسچینج سے اُس کے نام سے شیئرز کی خریداری کی رسید بھی فائل میں لگی ہوئی تھی۔ اُس نے بس رضامندی کے دستخط کرنے تھے کہ جس کے بعد فائل کو سیکورٹی ایکسچینج کمیشن میں منظوری کے واسطے بھجوایا جانا تھا۔ اِس فائل میں اُسے کمپنی کے کاروبار کی نوعیت کی تفصیل کہیں دکھائی نہ دی۔ دو چار بار ورق الٹنے کے بعد اُس نے سر اُٹھا کر اللہ ڈِنو عبید کی جانب دیکھا مگر وہ اُسے کہیں دکھائی نہیں دیا، چاروں طرف جانان ہی موجود تھی۔ صاحبزادہ کو اِس طرح دیکھتا دیکھ کر جانان کے لبوں پر بکھرا ہوا تبسم کچھ اور بھی دشمنِ جاں ہو گیا۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس سے

کچھ پوچھ رہی تھی۔

''کمپنی کا کاروبار.... کاروبار.... کاروبار!!!!'' صاحبزادہ کے گلے سے مری ہوئی آواز نکلی جو اُسے خود بھی مسلسل گونج کی صورت سنائی دے رہی تھی۔ نہ ختم ہونے والی گونج۔ جانان اِس طرح آگے بڑھ کر فائل پر جھکی کہ اُس کے چہرے اور صاحبزادہ تونگر کے چہرے کے درمیان محض کہنے کو فاصلہ رہ گیا۔ زندگی بھر لب ورخسار کی حدت اور دنیا بھر کی خوشبوؤں کا محرم صاحبزادہ تونگر امتیاز نہیں کر پا رہا تھا کہ بدن کی خوشبو کہاں تک پھیلی، پیراہن میں مہک کہاں سے پھوٹی اور لب و رخسار اِس قدر تپے تپے کیوں ہیں۔ جانان نے فائل میں سے مطلوبہ ورق ڈھونڈتے ہوئے دوسرے ہاتھ کو اِس طرح سے فائل پر رکھا کہ وہ صاحبزادہ تونگر کے بائیں ہاتھ کے اوپر رکھا گیا۔ اُس نے آنکھ اُٹھا کر جانان کے طرف دیکھا مگر وہ اِس احساس سے بے خبر متعلقہ ورق تلاش کرنے میں مصروف تھی۔ صاحبزادہ تونگر نے اپنا ہاتھ جانان کے ہاتھ کے نیچے سے کھسکا لیا تو اُس کا ہاتھ میز کی سطح سے جا لگا۔ اب اُس نے آنکھ بھر کر صاحبزادہ تونگر کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں برگشتگی سے ملتا جلتا تاثر تھا کچھ کچھ شکوے کے ساتھ کہ ہاتھ کا وزن ہی کیا تھا جو یوں نیچے سے اپنا ہاتھ کھسکا لیا۔ تاسف کی ایک لہر صاحبزادہ کے بدن میں پھیلتی چلی گئی۔ ہاتھوں کے اِس لمحاتی اتصال میں بھی اُس کے بڑھاپے کی طرف بڑھتے ہوئے جسم میں لطافت برق کی طرح نیم خوابیدہ احساسات کو بیدار کر چکی تھی۔ ندامت تو نہیں تھی مگر پھر بھی وہ جانان سے آنکھ نہیں ملا پا رہا تھا۔

مطلوبہ دستاویز فائل میں سے تلاش ہو چکی تھی۔ جانان نے کمپنی کے میمورینڈم آف ایسوسی ایشن کو صاحبزادہ کے سامنے رکھا اور خود کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنی کبیدگی اُسے جتلانا چاہ رہی تھی۔ صاحبزادہ تونگر اُس کی پیش رفت کو جان بوجھ کر نظر انداز کرنے پر آ گیا تھا۔ جانان سے جڑی ہوئی لطافتیں اور بیش بہا خوبصورتیاں اگرچہ اپنی جگہ اُسے ہوش وحواس سے بیگانہ کرنے پر تلی ہوئی تھیں مگر عبید کی معاون خاص ہوتے ہوئے کیسے ہو سکتا تھا کہ اُس کی پیش رفت کسی پلاننگ کا حصہ نہ ہو۔ اِس خیال کے آتے ہی صاحبزادہ کا ذہن انجانی سی کشمکش سے آزاد ہوا سو ہوا، اُسے سامنے رکھی فائل کے اوراق پر پرنٹ شدہ الفاظ بھی دکھائی دینے لگے تھے۔

''ھولی ٹرانزیکشن'' ایک ایسی سیکورٹی کمپنی تھی جو عالمی سطح پر بزنس کرتے ہوئے دیگر ممالک، خاص طور پر مڈل ایسٹ میں اپنے سیکورٹی آفیسرز اور گارڈز سپلائی کرتی تھی۔ اُس کا ٹرن آؤٹ بھی بہتر تھا اور ساکھ بھی۔ یہ کمپنی تیس برسوں سے کام کرتی چلی آ رہی تھی لیکن اللہ ڈنو عبید کے پاس اِس کی مینجمنٹ دو برس قبل آئی تھی کہ جب اُس نے اِس کے ستر فیصد شیئرز خریدے۔

صاحبزادہ تونگر دستاویز دیکھ چکا تو جانان پھر سے اُس کے قریب چلی آئی لیکن پہلے کی نسبت کچھ فاصلہ رکھ کر۔ اس کے قرب کی تپش اور مہک سے اپنے حواس کو بچا رکھنا اب بھی اُتنا ہی مشکل ہو رہا تھا۔ فائل کے صفحات پھر سے اُلٹ پلٹ ہونے لگے لیکن صاحبزادہ کی آنکھیں جانان کی حرکت کرتی ہوئی انگلیوں پر ٹکی تھیں کہ جن کی گداز شفافیت اُس کے اپنے بدن میں سرسراہٹ پیدا کرنے لگی تھی۔ رگوں میں دھیرے دھیرے بہتے لہو میں نجانے کون سے ہارمونز نے اپنا آپ اُنڈیلا کہ وہ جذبے بھی تحریک پانے لگے جو عرصے سے منوں ہزیمت اور مایوسی تلے دفن ہو چکے تھے۔ اُسے یوں لگا کہ جیسے کوئی زمین میں دبا ہوا سانپ ایک دم باہر آ کر اپنی گلی سڑی کینچلی اُتارنے لگا ہو۔ اُس نے بے اختیار سر کو زور سے جھٹکا۔ فائل پر جانان کی انگلیوں کی حرکت تھم چکی تھی۔ کچھ نئے ورق اُس کے سامنے کھلے رکھے تھے۔ شاید جانان نے کچھ بولا بھی تھا مگر وہ نہیں سُن سکا تھا۔ کمرے میں خاموشی تھی اور وہاں موجود تین کردار بھی بے حس و حرکت۔ صرف صاحبزادہ تونگر کی آنکھوں کے دیدے حرکت میں تھے، کبھی عبید کی طرف، کبھی جانان اور کبھی فائل کی جانب۔

''صاحبزادہ صاحب! یہ اِس کمپنی کی بیلنس شیٹ ہے اور اِس کے ساتھ اِس سال کی تازہ آڈٹ رپورٹ۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ کمپنی کا سرمایہ کتنا ہے اور اِس کی شیئر ویلیو کتنی بڑھتی رہی ہے۔'' اب کے خاموشی کو اللہ ڈنو عبید نے توڑا تھا۔

صاحبزادہ تونگر نے گردن جھکا کر کاغذات پر نگاہ ڈالی۔ وہاں ٹوٹل کی لائن کے نیچے امریکی ڈالر کے نشان کے سامنے کتنے ہی ہندسے درج تھے۔ آٹھ نو تو ہوں گے ہی۔ صاحبزادہ نے اب بھی اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اللہ ڈنو کی طرف دیکھ رہا تھا جن میں سوال ہی سوال تھے، ایک دوسرے کے اوپر دھرے، ایک دوسرے سے گتھم گتھا سوال۔

"میں جانتا ہوں تونگر صاحب کہ آپ کے ذہن میں وہی سوال چل رہا ہو گا کہ اتنے بڑے سرمائے کی حامل، کامیابی سے چلتی ہوئی کمپنی میں، میں آپ کو کیوں تیس فیصد کا حصہ دار بنا رہا ہوں۔ تیس فیصد کا مطلب ہے کروڑوں روپوں کی آپ کے نام منتقلی۔ ایسے میں آپ کے نزدیک دو ہی باتیں ہوں گی کہ یا تو میں پاگل ہوں یا آپ سے کوئی کام نکلوانے کے لیے آپ کو پھنسا رہا ہوں، حالانکہ کسی ریٹائرڈ افسر کو پھنسانا تو ایسے ہی ہے کہ جیسے کسی مردہ چوہے کے لیے گڑکی لگانا۔ پھنس تو میں خود رہا ہوں کسی چوتیے کی مانند یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں چوتیا نہیں ہوں، تونگر صاحب! بات اتنی سی ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں جتنا کمایا ہے اُس میں سے آدھا، کم از کم آدھا اُن کاغذات میں سے کمایا ہے کہ جن پر آپ کے دستخط ہوا کرتے تھے اور ہاں! وہ شخص الیاس ملک جو مجھے آپ کے دستخط کرا کے دیا کرتا تھا اُس نے تو یقیناً مجھ سے کہیں زیادہ کمایا ہو گا لیکن چھوڑیں اس بات کو، میں اللہ ڈنو عبید ہوں، الیاس ملک نہیں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ کو اِن حالات میں چھوڑ دوں کہ جہاں آپ اپنے گھر ہی میں کتوں سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہوں اور یہ جتنی رقم کے حصص میں نے آپ کے نام منتقل کیے ہیں، آپ سے ہونے والی کمائی کا پانچ فیصد بھی نہیں لہٰذا بے فکر ہو کر دستخط کر دیجیے تاکہ آپ باقاعدہ طور پر کمپنی کے ڈائریکٹر بن سکیں۔"

"لیکن اگر میں آپ کا یہ احسان نہ لینا چاہوں تو؟" صاحبزادہ سلطان احمد تونگر پھر سے بیک وقت بیوروکریسی کی روایتی نرم خوئی اور لاتعلقی جیسے بحرانی رویے سر پر لاد کر عبید کے روبرو تھا۔

"تو میرا کیا بگڑے گا! بگڑے گا تو آپ کا۔" اللہ ڈنو عبید کے رویے میں سفاکیت شامل ہونے لگی تھی۔ تونگر نے بھی فائل بند کرنے کے بعد ایک طرف رکھی اور عبید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال لیں۔

"مسٹر اللہ ڈنو عبید! تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں اپنے گھر میں بہت آسودہ زندگی گزار رہا ہوں، مجھے گھر کے کسی فرد سے کوئی شکایت نہیں اور یہ جو کہانی مجھے تم نے سنائی ہے کہ میرے دستخطوں سے تم نے ملین اور بلین کمائے ہیں، سب بکواس ہے، الیاس ملک، میری بیگم کا کزن ہی نہیں بلکہ بھائی ہے، درست ہے کہ میں اُس کی سفارش مانتا رہا ہوں مگر اُس میں بانیٹری

بینیفٹ کبھی شامل نہیں رہا، اصل بات کیا ہے، میں تمھیں بتاتا ہوں، تم مجھے اپنے ساتھ ملا کر میرے عمر بھر کے تجربے اور ساکھ سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہو، تم جانتے ہو کہ پوری مارکیٹ میں تمھیں کوئی ایک بھی ایسا شخص دستیاب نہیں کہ جس نے گورنمنٹ کی ورکنگ اور مائنڈ سیٹ کو گراس روٹ لیول سے ایپکس لیول (apex) تک دیکھ رکھا ہو، وہ سیاست، تجارت، بیوروکریسی، فوج اور عدلیہ کے معاملات کو اندر سے جانتا ہو، اُن کے کمفرٹ زون تو کیا اُن کے گرے اور بلیک ایریاز کو بھی نہ صرف ذاتی طور پر جھیل چکا ہو بلکہ اُن سے نمٹنا بھی جانتا ہو تو پھر ایسے میں اگر میں تمھیں جائن کرتا ہوں تو تمھاری اِس کمپنی کا بزنس چلے گا نہیں بلکہ دوڑے گا، لہٰذا اِس ڈرٹی گیم کے لیے تم مجھے تیس فیصد دو یا سو فیصد میں تمھارے کسی کام نہیں آنے والا، مجھے میری لائبریری بہت اچھی لگنے لگی ہے۔" صاحبزادہ سلطان احمد تونگر فیصلہ کن انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

"تونگر! تم میری کیلکولیشن سے بہت زیادہ حرامی ہو!" اللہ ڈنو عبید پھر سے استہزائیہ انداز میں مسکراتا ہوا تونگر کے قریب آیا اور اُس کے اُٹھ کھڑے ہونے کی پروانہ کرتا ہوا کرسی گھسیٹ کر اُس کے مقابل بیٹھ گیا۔

"اُدیواشٹ آپ باسٹرڈ مجھے پھر سے گالی دینے کی جرات نہ کرنا۔" صاحبزادہ تونگر ایک دم نقطۂ کھولاؤ پر آ گیا تھا۔

"آپ تو ناراض ہو گئے صاحبزادہ سلطان احمد تونگر صاحب! میں نے آپ کو حرامی اُس سینس میں نہیں کہا بلکہ میں نے تو جس کی ڈُکا کر بجائی ہو اُسے کہتا ہوں پیار سے، حرامی!" اللہ ڈنو عبید دوبارہ تم سے آپ پر آ گیا تھا مگر عجیب سے انداز میں۔

"میں جانا چاہتا ہوں" تونگر اپنے پیچھے رکھی کرسی کو دھکیلتا ہوا میز اور کرسی کے درمیان میں سے نکل کر باہر آ گیا۔

"جانان! روکو ناں انھیں اور بتاؤ کہ ملاقات کا مینو ابھی ختم نہیں ہوا، سویٹ ڈش ابھی باقی ہے اور بھی اِن کی فیورٹ۔" عبید اب تونگر کو باقاعدہ چڑانے پر آ گیا تھا۔

"میں لعنت بھیجتا ہوں تمھاری سویٹ ڈش پر۔" تونگر پھر سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرنے

لگا تھا کہ کمرے کی روشنی کچھ اور بھی مدھم ہوئی لیکن اس کے ساتھ ہی سامنے کی دیوار پر لگی ایل ای ڈی کی سکرین روشن ہو گئی۔ تونگر حیران سا ہو کر وہیں ٹھہر گیا اور اسکرین کی جانب دیکھنے لگا۔

''صاحب تشریف رکھیں اور غور سے دیکھیں، یہ ہے آپ کی فلسفیانہ گفتگو کا عاجزانہ جواب۔'' تونگر کرسی پر بیٹھا تو نہیں لیکن جو کچھ سامنے سکرین پر دکھایا جا رہا تھا وہ اُس کے ہوش اُڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ یقیناً یہ سات آٹھ سال پرانی ویڈیو تھی کہ جس میں وہ اپنی اُس وقت کی ایک ماتحت آفیسر کے ساتھ حالتِ جماع میں تھا۔ کمرے میں شراب کی بوتلیں اور دیگر اسی نوعیت کے لوازمات موجود تھے۔ یہ کمرہ وہ کیسے بھلا سکتا تھا کہ الیاس ملک کی مہیا کردہ اس سہولت کے سبب اُس نے نجانے کتنی دوشیزاؤں کے ساتھ زندگی کے بہترین لمحات یہاں گزارے تھے۔ ''تو کیا یہ ریکارڈنگ بھی الیاس ملک نے کی ہے۔'' اِس کا تصور کرتے ہوئے بھی اُس کا ذہن چکرانے لگا تھا۔

''تونگر صاحب! ویسے آپ کی پرفارمنس ہر دور میں بہت اچھی رہی ہے، غالباً اسی سبب ہماری جانان بھی آپ کی گرویدہ چلی آ رہی ہے، کیوں جانان!''، عبید عجیب سے انداز میں ہنسا لیکن اُن دونوں میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ''اور ہاں! تونگر صاحب! یہ تو شاید آپ کو کسی نے نہیں بتایا ہو گا کہ ہمارے صوبائی دارالحکومت کے سب سے پوش علاقے میں واقع یہ بنگلو الیاس ملک کا نہیں بلکہ میرا ہے۔'' یہ سُن کر تونگر کو ایسے لگا کہ اُس کی ٹانگوں میں دم نہیں رہا۔ وہ اپنے آپ کو ہوا میں جھولتا ہوا محسوس کر رہا تھا اور پھر اسی انداز میں وہ میز کا سہارا لے کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ جونہی پانچ منٹ کا ویڈیو کلپ ختم ہوا ایک دوسرا کلپ چلنا شروع ہو چکا تھا۔ وہی کمرہ، وہی لوازمات مگر اب اِس کمرے میں لگے مہنگے ترین بیڈ پر تونگر کی جگہ الیاس ملک اور جونیئر خاتون آفیسر کی جگہ ناہید تھی، بیگم صاحبزادہ سلطان احمد تونگر۔ تونگر کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ندامت کا وہ کون سا درجہ تھا کہ جس نے اُس کے سر کو میز پر جھکا دیا۔ شاید وہ رو رہا تھا مگر خشک آنسوؤں کے ساتھ کہ جہاں جہاں سے اُن کا گزر ہو رہا تھا گہری دراڑیں پڑتی چلی جا رہی تھیں۔ فیملی لائف سے متعلق اُس کی زندگی کا تمام عرصہ بس اِسی ایک لمحے میں کسی نے کھرچ کر پھینک دیا تھا۔ ازدواجی زندگی میں وہ بیوی ہی کو اُس کی تقدیس اور توقیر کی اساس گردانتا رہا تھا مگر یہ اساس تو اُسے کبھی دستیاب ہی نہیں رہی۔ اُسے

اپنے بیٹوں کا رویہ یاد آنے لگا۔ "تو کیا اُن کا رویہ بھی اُن کے نطفے کے سبب ہے۔" خجالت کا ایک اور جھٹکا اُسے سر سے لے کر پاؤں تک ہلا گیا۔ "لیکن میں اپنے بچوں کی ولدیت کو کیسے مشکوک سمجھ سکتا ہوں، اُن کی ماں کے کردار کا اُن کے جائز یا ناجائز ہونے سے کیا تعلق؟"

ویڈیو کلپ ختم ہو چکا تھا اور ایل ای ڈی بند۔ کمرے میں روشنی بھی کچھ زیادہ ہو چلی تھی لیکن صاحبزادہ تونگر کی جھکی ہوئی گردن اوپر کو نہیں اٹھ پا رہی تھی۔ سرخ اور سیاہ رنگ کی گرد کو زمین تا آسمان گھماتے ہوئے بگولے تھے کہ جو کمرے میں کہیں سے گھس آئے اور کرچیاں بن کر آنکھوں کو لہو لہو کیے چلے جا رہے تھے۔

"تونگر! میں تمھیں یہ سب کچھ نہیں دکھانا چاہتا تھا حالانکہ تم اور تمھاری بیگم کے ویڈیو کلپس کے میرے پاس اے ٹو زی فولڈرز ہیں اور تم نے جو دیکھے یہ محض اسی جی پی کے فولڈر اے (A) کے پہلے دو کلپ ہیں۔ میں نے تو سوچا تھا کہ تم سیدھے سبھاؤ میری کمپنی میں بطور ڈائریکٹر با وقار طریقے سے شامل ہو گے لیکن عزت شاید تمھارے مقدر میں نہیں، اب تم یہ کمپنی جائن کرو گے مگر ایک ملازم کی حیثیت سے کہ جس کی تنخواہ میں ہر مہینے اُس کی کارکردگی کے مطابق طے کیا کروں گا۔" اللہ ڈتو کا لہجہ انتہائی تلخ اور تحکمانہ ہو چکا تھا۔

جانان نے پھرتی سے میز پر رکھی فائل اٹھائی اور اُس کی جگہ دوسری فائل رکھ دی جس میں محض ایک ورق لگا ہوا تھا۔ ہولی ٹرانزیکشن کمپنی کی جانب سے تونگر کے نام ملازمت کا آفر لیٹر۔ تونگر نے آنکھ اٹھا کر جانان کی طرف دیکھا تو اُس نے قلم کا کیپ اُتار کر اُسے اُس کے سامنے رکھ دیا۔ تونگر نے بے چارگی سے اللہ ڈتو عبید کی طرف دیکھا تو اُس نے لاتعلقی سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

۱۲

رضوان ہاشمی مقدر کے اِس لکھے پر حیران تھا کہ قدرت کیسے مصیبت میں سے عطا اور وہ بھی بے پناہ عطا کا در کھول دیتی ہے۔ آج رات بستر تک جاتے تک وہ کس قدر دلبرداشتہ اور پژمردگی کا

شکار تھا۔ پانچویں بار صوبائی بار کونسل کی ممبر شپ کا خواب اور اُس خواب کی تعبیر کے لیے جوڑی گئی ساری پلاننگ ایک اور مہم جو کی جذباتیت کا شکار ہو کر ایک ہی جھٹکے میں چکنا چور ہو چکی تھی۔ لیکن وہ منزل جو ایک ہی دن میں اُس سے کوسوں دور چلی گئی تھی پھر سے کسی نو بیاہتا دلہن کی طرح خراماں خراماں پازیب کھنکاتی، لجاتی شرماتی اُس کے حجلۂ پندار میں واپس چلی آ رہی تھی اِس قدر سامان جہیز کے ساتھ کہ جس کا نشہ، جس کا سرور باقی ماندہ زندگی میں اُترنا ہی نہیں تھا۔

مایوسی کی انتہا میں وہ تو سکون کی ٹیبلٹ لے کر سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ خوشی خان نے اُس کے دروازے پر دستک دے اُسے نہیں بلکہ اُس کی تقدیر کو جگا دیا تھا۔ جس خوشی خان نے اُس کے خواب بکھیرے تھے وہی اُن کی سعد تعبیر بن کر اُس کے قدموں میں مکمل سرنڈر کر چکا تھا۔ وہی خوشی خان جس نے اُس کی گیم کو برباد کیا تھا اَب اپنی گیم بھی اُس کے ہاتھ میں دینے کے بعد اپنے تحفظ کا طلب گار ہو کر، اُس کی جنبش ابرو کا منتظر تھا۔ رضوان ہاشمی نے اُسے کل دوپہر تک کا وقت محض اپنی بارگین پوزیشن بہتر بنانے کے لیے دیا تھا کہ کچھ ایسا جوڑ توڑ کرے کہ صوبائی بار کونسل کی اپنی ممبری کے ساتھ ساتھ خرچے کے لیے کچھ روکڑا اور تحصیل بار ایسوی ایشن کے عہدوں میں سے جثے کے مطابق حصہ بھی بٹور لے۔ لیکن یہ تو تصور میں نہیں تھا کہ خوشی خان کے جانے کے بعد حاجی بخشن کا فون کسی چھپر کی طرح اُس کے سر پر پھٹے گا اور وارے نیارے کرا دے گا۔ بچپن میں پڑھے ہوئے محاورے ''ایک پنتھ دو کاج'' کا مطلب اُس پر پہلی بار کھلا تھا۔ اور پھر پچاس لاکھ کی پہلی قسط کا بیٹھے بٹھائے مل جانا قسمت کی یاوری نہیں تو اور کیا تھا۔ وہ تو وکلا کی ہڑتال اِس واسطے ختم کرانے کے درپے تھا کہ اُس کی بنی بنائی گیم اُس کے مخالف فریق کے ہاتھ میں جا چکی تھی۔ ایسے میں اُس کی لیڈری کو خاک میں ملانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ ہڑتال ختم کرا دی جائے تا کہ کم از کم پولیس، عدلیہ اور انتظامیہ کے ساتھ ساتھ بار کے پروفیشنل وکلا کی ہمدردیاں تو وہ سمیٹ سکے۔ لیکن اب بدلے ہوئے حالات میں اُس نے صرف اتنا کرنا تھا کہ ہڑتال کی بجھتی ہوئی چنگاری کو پھر سے بھڑکا کر آتش کدہ بنا دینا تھا۔ اپنے پیشے کی اخلاقیات کو ترجیح دینے والے مٹھی بھر وکلا کی حمایت سے غیر محسوس طریقے سے الگ ہو کر اُن کے ساتھ جُڑ جانا تھا کہ جن کا ایقان تشدد، تشدد اور بس تشدد۔

ہی تھا، باقی سب کچھ انھوں نے خود ہی کر لینا تھا۔

کیا نصیب پایا تھا اُس نے کہ دہشت گردی کی دفعات کے ساتھ اگر پرچہ ہوا تھا تو اُس کے مخالفین پر لیکن اُس کی ڈھلی ڈھلائی لیڈری اُس کی ٹیم سمیت واپس اُس کے پاس آ چکی تھی۔ اب اگر رگڑا پولیس ایکشن سے لگے یا الیکشن میں شکست کی صورت لگے گا تو خوشی خان اور اُس کے گروپ کو اور دوکان چمکے گی رضوان ہاشمی کی۔ اب بھلے ہڑتال قیامت تک چلے، وکلا پولیس کو ماریں یا پولیس وکلا کو، جلوس نکلیں یا لاشیں گریں، عدالتیں بند رہیں یا گرا دی جائیں، اُس کا کیا جائے گا۔ اُس کے پاس تو کچھ اور روکڑا، کچھ اور لیڈری۔ اور آخر میں سمجھوتہ تو ہونا ہی ہوتا ہے تو ایسے میں پولیس، انتظامیہ اور عدلیہ اگر کسی کو نجات دہندہ سمجھ کر دوست رکھے گی تو صرف اور صرف اُسے یعنی رضوان ہاشمی کو۔

رضوان ہاشمی نے موبائل فون اُٹھا کر وقت دیکھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ اُس کے لیے حاجی بخشن کے کہے ہوئے آخری جملے سے زیادہ بوجھ پچاس لاکھ روپے کے اُس لفافے کا تھا کہ جس بھجواتے ہوئے حکم نما تاکید بھی جوڑ دی گئی تھی کہ کام آج اور ابھی سے شروع کرنا ہے۔ کچھ دیر سوچ کر اُس نے اپنے موبائل فون میں ایک نمبر ڈھونڈا اور ڈائل کے سبز بٹن کو ہلکا سا دبا کر اُس کا لاؤڈر بھی آن کر دیا۔ دوسری جانب سے نیند کے خمار میں ڈوبی ہوئی آواز نے اِس انداز میں ہیلو کہا کہ جیسے سکرین پر نام دیکھے بغیر اُس نے فون اٹینڈ کر لیا ہو۔

''رشید! میں ہاشمی بول رہا ہوں، گھنٹہ بھر ہی میں سو گئے کیا؟'' رضوان ہاشمی کی آواز سنتے ہی اُس کے سب سے پرانے اور ذمہ دار منشی عبدالرشید کا ہڑبڑا کر مودب ہو جانا فون پر بھی محسوس ہونے لگا تھا۔

''ہاں سنو! اب سونا نہیں، میں ابھی پانچ منٹ میں تمھیں کچھ نمونے کی عبارتیں بھجوا رہا ہوں، شہر کے سب سے اچھے ڈیزائنر کے پاس جاؤ اُسے بھی جگاؤ اور جس ریٹ پر بھی وہ کام کرنا چاہے اُس سے کپڑے کے بینر تیار کرا کر صبح ہونے سے پہلے پوری کچہری، تمام چوک، بس اسٹینڈ، پریس کلب اور شہر بھر کے افسروں کی کوٹھیوں کے سامنے لگوا دو، اور ہاں یہ بینر وکلا ایکشن کمیٹی کی

جانب سے ہوں گے، ہمارا نام کہیں بھی نہیں آنا چاہیے۔"

رشید سے بات کرنے کے بعد رضوان ہاشمی نے اپنے شمس پور آفس کے انچارج منشی غلام عباس کو فون کیا اور وہی ہدایات دہرا دیں جو اس سے پہلے رشید کو دے چکا تھا لیکن اب کے کچھ اضافہ کیا کہ ضلع شمس پور کی باقی دو تحصیلوں فتح گڑھ اور کلیم پور میں بھی یہی بندوبست کر دیا جائے۔ فون بند ہوا تو اُسے ایک طرف رکھنے کے بعد رضوان ہاشمی نے نیم دراز ہوتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ اُس کے چہرے پر اگرچہ سکون تھا لیکن مونچھیں بھی مسکراتے ہوئے لبوں کے ساتھ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ یکایک وہ پھر سے اُٹھ بیٹھا۔ سائیڈ ٹیبل پر پڑی ہوئی ڈائری اُٹھائی اور سوچ سوچ کر ایک خالی صفحے پر کچھ نام لکھنے لگا۔ نام لکھ چکا تو فون اُٹھا کر محفوظ شدہ نمبروں میں کوئی نمبر تلاش کرنے لگا۔ ایک نمبر پر رُک کر ابھی وہ ڈائل کا بٹن پریس کرنے ہی والا تھا کہ سامنے دیوار پر لگے کلاک پر نگاہ پڑی جہاں رات کے بارہ بجنے میں سے پانچ منٹ رہتے تھے۔ اُس نے نمبر ڈائل کرنے کی بجائے موبائل فون پر وقت دیکھا تو وہاں بھی گیارہ بج کر پچپن منٹ ہوئے تھے۔ رضوان ہاشمی کے چہرے پر تذبذب کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ چند لمحے اِس کیفیت میں رہنے کے بعد اُس نے فون ایک طرف رکھا، ڈائری میں مزید کچھ لکھا اور پھر ٹیبل لیمپ کی روشنی کو مدھم کرنے کے بعد لیٹ گیا لیکن جس قسم کی ہیجانی کیفیت سے وہ گزر رہا تھا، اُس نے نیند کو کہاں قریب پھٹکنے دینا تھا۔

رضوان ہاشمی کو اپنی وکالت کا ابتدائی دور یاد آ رہا تھا کہ جب محض دو سال کی پریکٹس کے بعد وہ حیدر گوٹھ کی تحصیل بار کا جنرل سیکریٹری منتخب ہو گیا تھا۔ یہ بھی اُس کی خوش بختی تھی کہ اُس کے ساتھ صدر منتخب ہونے والا وکیل ستر برس کا ہونے کے باوجود نان پریکٹسنگ ہی رہا تھا۔ علاقے کا شریف النفس زمیندار ہونے کے ناتے اُسے پریکٹس کی ضرورت ہی نہیں تھی بس ایڈووکیٹ کا لاحقہ نام کے ساتھ لگانا مطلوب تھا۔ بس پھر کیا تھا، عملی طور پر تحصیل بار کی صدارت بھی رضوان ہاشمی کے پاس آ گئی۔ حقیقی صدر محض دستخط کرتا تھا اور ٹھپہ رضوان ہاشمی کا چلتا تھا۔

اُس کی مہم جو طبع کو کمائی کا ایک آسان ذریعہ اس وقت ہاتھ آیا کہ جب ایک وکیل اپنے

موکل کے ساتھ اُس کے چیمبر میں آیا اور جیب سے دس ہزار روپے کے نوٹ نکال کر میز پر رکھ دیئے۔ رضوان ہاشمی نے نوٹ اُٹھا کر اُس کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھا۔

''بس کل ایک دن کی ہڑتال کا نوٹس کر دو، یہ دس ہزار تمھارے۔'' وکیل نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

''ایک دن کی ہڑتال! مگر کس لیے اور جواز کیا ہے؟'' ہاشمی اب حیران ہو چلا تھا۔

''ہڑتال اس لیے کہ میرے موکل کی قتل کے کیس میں کل عبوری ضمانت کی آخری پیشی ایڈیشنل سیشن جج کی کورٹ میں ہے، کل اس سر پھرے جج نے مزید مہلت نہیں دینی اور اگر درخواست ضمانت پر بحث ہوگئی تو وہ خارج اور یہ اندر ہو جائے گا۔'' وکیل نے پھر اُس کے کان میں سرگوشی کی۔

''لیکن کل ہڑتال ہو بھی جائے تو جج پرسوں کی تاریخ رکھ دے گا، پھر کیا کرو گے؟'' رضوان ہاشمی کو یہ ترکیب سراسر بچگانہ لگ رہی تھی۔

''جب ہڑتال ہوگی اور وکیل جج کو کورٹ روم میں بیٹھنے ہی نہیں دیں گے تو پیشیاں ریڈر ڈالے گا، بس وہیں کوئی جگاڑ کر لیں گے۔'' وکیل اب بھی مطمئن تھا۔

''لیکن بھائی میرے! ہڑتال کے نوٹس میں جواز کیا لکھیں۔''

''جواز میں ہوں ناں! اسی بار کا ممبر ہوں کل رات میرے گھر چوری ہوئی ہے اور پولیس پرچہ نہیں درج کر رہی یعنی مقامی پولیس کے رویے کے خلاف۔'' وکیل کے چہرے پر کچھ اور پھیلے ہوئے اطمینان کو دیکھ کر رضوان ہاشمی کی حیرت کم نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن اُس کی حیرت سے قطع نظر وکیل صاحب نے اپنے لفافے میں سے ایک درخواست نکالی اور دس ہزار روپے کے ساتھ میز پر رکھ دی۔ یہ درخواست اُس کی جانب سے صدر بار کے نام پولیس کے رویے اور کرپشن کے خلاف لکھی گئی تھی۔

اگلے روز حیدر گوٹھ کچہری میں پولیس کے رویے اور بڑھتے ہوئے جرائم کے خلاف ہڑتال تھی۔ وکلا نے عدالتوں کا بائیکاٹ کیا ہوا تھا۔ کچھ پیشہ ور وکلا نے اپنے موکلان کے اصرار پر

عدالتوں میں پیش ہونے کی کوشش کی مگر ہڑتالی وکلا انھیں کھینچ کھانچ کر باہر لے آئے۔ جس جج نے کمرۂ عدالت میں بیٹھ کر کام کرنے کی کوشش کی اُس کی عدالت کو باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ عدالتوں کا کام ٹھپ ہوا تو دور دراز سے آنے والے مقدمات کے فریقین اور بڑی مشکل سے لائے گئے گواہ پھر سے ایک نئی پیشی لے کر بے نیلِ مرام واپس چلے گئے۔ رضوان ہاشمی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ دس ہزار روپے کے عوض اُس کا جاری کردہ محض ایک نوٹس اتنا اہم ہو گا کہ تحصیل بھر کی عدالتوں کا کام بند اور اُس کے نام کا چرچا ڈویژن بھر میں ہونے لگے گا۔ پھر تو یہ معمول بن گیا کہ کسی فریق مقدمہ کے پاس گواہ نہیں ہیں تو ہڑتال، حکم امتناعی کی تاریخ میں توسیع کرانی ہے تو ہڑتال اور اگر کسی مقدمہ کو غیر معینہ مدت کے لیے لٹکانا ہے تو ہڑتال۔ کبھی پولیس کے خلاف، کبھی انتظامیہ کے خلاف اور کبھی کسی جج کے رویے کے خلاف۔

اتنی آسانی سے آنے والے پیسے نے جہاں رضوان ہاشمی کو اعتماد دیا وہاں وکلا سیاست میں اُس کے لیے کامرانیوں کے دروازے کھول دیے۔ آج پچاس لاکھ کے پیکٹ کی غیر متوقع وصولی نے اُسے وہی دس ہزار روپے یاد کرا دیے کہ جو اُس نے پہلی بار ہڑتال کرانے کے لیے وصول کیے تھے۔ کہاں دس ہزار روپے میں ہڑتال اور کہاں پچاس لاکھ اور وہ بھی پہلی قسط۔ کتنا ریٹ بڑھ گیا تھا ہڑتال کرانے کا۔

اگلی صبح خلاف معمول رضوان ہاشمی کافی دیر سے اُٹھا۔ اُٹھتے ہی اُس نے پہلے وقت دیکھا اور پھر آنے والی کالز اور واٹس ایپ میسج دیکھے۔ وقت نو بجے کا تھا اور اِن کمنگ یا نہ سُنی گئی کال کوئی بھی نہیں تھی۔ ہاں مگر واٹس ایپ اکاؤنٹ میں بہت زیادہ میسجز موجود تھے۔ اُس نے ایک ایک کر کے کھولنے شروع کیے تو اُس کا چہرہ اطمینان کا مظہر بنتا چلا گیا۔ اُس کے منشیوں نے کمال کر دیا تھا۔ حیدر گوٹھ کے ساتھ ساتھ فتح گڑھ، کلیم پور اور شمس پور میں ہر اُس جگہ پر بڑے بڑے بینر آویزاں ہو چکے تھے کہ جن کے بارے میں اُس نے حکم دیا تھا۔ اپنے عملے کے لیے اُس کی ہدایات حکم کا درجہ رکھتی تھیں۔ منشیوں نے تصویروں کے ساتھ ساتھ ویڈیو کلپ بھی بنا کر بھیج دیے تھے کہ جن سے موقع کی پوری تفصیل دستیاب ہو رہی تھی۔ اُس نے ویڈیو کلپس میں دیکھا کہ نہ صرف عام آدمی

بلکہ کچہری آنے والے وکلا بھی دیدے پھاڑے بینرز پر لکھے اشتعال انگیز نعروں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

رضوان ہاشمی نے وہیں بستر پر بیٹھے بیٹھے اپنے دونوں منشیوں سے بار روم اور وکیلوں کے چیمبرز میں ہونے والی گفتگو کی رپورٹ جاننا شروع کی تو معلوم ہوا کہ حیدر گوٹھ میں آج جن وکلا نے ہڑتال ختم کرنے کا ارادہ کیا ہوا تھا، بینرز دیکھ کر اُن کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ یہی حال کم وبیش فتح گڑھ، کلیم پور اور شمس پور کی کچہریوں کا تھا کہ جہاں وکیل اگرچہ ہڑتال پر نہیں تھے لیکن بینرز پر لکھی عبارت نے اُن کے خون کو بھی کھولا دیا تھا۔ انھیں شدت سے احساس ہونے لگا تھا کہ حیدر گوٹھ کے وکلا مظلوم اور بے قصور ہیں، اُن کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ کہیں کہیں یہ گفتگو بھی ہونے لگی کہ آج اگر حیدر گوٹھ کے وکلا پولیس تشدد کا نشانہ بنے ہیں تو کل کلاں اُن کے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔

معلوم یہ بھی ہوا کہ پولیس، عدلیہ اور انتظامیہ میں بھی ان بینرز کے بارے میں چہ مگوئیاں شروع ہو چکی تھیں۔ جو لوگ یہ توقع کر رہے تھے کہ وکلا کی مزاحمت دم توڑ چکی، وہ بھی وکلا ایکشن کمیٹی کے اراکین اور اُن کے اگلے لائحہ عمل کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہو رہے تھے لیکن پورے تیقن کے ساتھ تو ابھی پولیس کی سپیشل برانچ بھی اپنی رپورٹ مرتب نہیں کر پائی تھی۔

اتنے میں کمرے کا دروازہ کھلا اور رضوان ہاشمی کی بیگم اندر داخل ہوئی۔ اگرچہ آج ہاشمی کے لیٹ اُٹھنے کے بارے میں اُس کے چہرے پر کئی سوالات کلبلا رہے تھے لیکن اُس نے پوچھا ایک بھی نہیں۔ اگر پوچھا تو بس اتنا کہ ناشتہ لگوا دوں؟

رضوان ہاشمی نے ناشتہ لگانے کے لیے کہہ تو دیا لیکن فون پر آنے والی کالز اور میسج اُسے باتھ روم تک بھی نہیں جانے دے رہے تھے۔ لہٰذا وہ فون سمیت باتھ روم میں چلا گیا۔ واپسی پر ابھی ناشتے کی میز تک بمشکل پہنچ ہی پایا تھا کہ خوشی خان کی طرف سے واٹس ایپ میسج موصول ہوا۔ اتنی جلدی اتنی پراگریس پر نہ صرف وہ بہت زیادہ خوش تھا بلکہ دیئے گئے وقت ایک بجے سے پہلے ملنے کی درخواست کر رہا تھا لیکن رضوان ہاشمی نے ابھی کوئی ریسپانس دینا مناسب نہ سمجھا۔ وہ خوشی خان کو اُس کی اوقات میں رکھنا چاہتا تھا۔

''آج کیا کوئی خاص بات! پہلے تو آپ آٹھ بجے کچہری جانے سے پہلے فون کو ہاتھ تک نہیں لگایا کرتے تھے اور آج یہ حال کہ آپ فون کو چھوڑ ہی نہیں رہے!'' رضوان ہاشمی کی بیگم معمول کے خلاف مصروفیت پر زچ ہوئی بیٹھی تھی۔

رضوان ہاشمی نے موبائل فون کی سکرین سے نگاہیں ہٹائیں اور سر اُٹھا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور خاموش رہا۔ ایک زیرک وکیل ہوتے ہوئے وہ جانتا تھا کہ کہاں کتنا بولنا ہے اور کہاں نہیں بولنا۔ وہ چند لمحے تک اُسے دیکھتا رہا۔ اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ اتنی کند ذہن اور سراپا حماقت عورت کے ساتھ کس طرح اُس نے زندگی کے پینتیس برس گزار دیئے۔ اُس کا جی چاہا کہ اپنے ذوق جمال پر جی بھر کر لعنت بھیجے کہ کدو نما اِس چغد کے ساتھ وہ ایک عرصہ تک ہمبستری بھی کرتا رہا اور دو بچے بھی پیدا کر لیے جو شکلاً اور عقلاً ماں ہی کا پرتو تھے۔ اکثر اُسے یہ سوچ کر اپنے آپ سے کراہت ہونے لگتی کہ وہ کیسے اِس کھٹے ڈکار جیسی عورت کے ہونٹ چومتا رہا ہوگا، کیسے اِس کے بنجر سے سیم زدہ ہو چکے وجود سے حظ اُٹھاتا ہوگا۔ اب بھی اگر وہ اُس کے احمقانہ سوالوں پر خاموش رہتا تھا تو محض شر کو رفع کرنے کے لیے کہ یہ معاشرہ اُس بیوی کو تقدیس کے سنگھاسن سے نیچے اترنے ہی نہیں دیتا کہ جو بدقسمتی سے شوہر کی قریبی رشتہ دار بھی رہی ہو۔ لہٰذا بہت سی اعصاب شکن معاشرتی بلاؤں سے بچ رہنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ جس پر وہ کامیابی سے عمل کر رہا تھا۔ اور آج تو اُس نے بہت کچھ خاص کرنا تھا کہ جس کے لیے اُسے مکمل ذہنی ارتکاز کی ضرورت تھی۔ اِس واسطے وہ چائے کی پیالی لے کر اُٹھا اور واپس بیڈ پر بیٹھ کر تحصیل سے صوبائی سطح کے اُن تمام وکلا سے باری باری حال احوال کرنے لگا کہ جو نہ صرف وکلا سیاست میں سرگرم تھے بلکہ بااثر ہونے کے ناتے کچھ بھی کر گزرنے کی حیثیت رکھتے تھے۔ رضوان ہاشمی کو چونکہ اپنی وجودی حیثیت کے موثر استعمال کا ہنر آتا تھا اس لیے اِس مرحلے پر اُس کا اپنی طرح کی وکلا قیادت کی سماعت تک محض یہ تاثر پہنچا دینا کہ حیدر گوٹھ کے وکلا سے بہت زیادتی ہوئی ہے، آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دینے کے لیے کافی تھا۔ کل شب کی بنائی ہوئی فہرست سے ابھی ایک دو نام باقی تھے کہ موبائل فون کی سکرین پر واٹس ایپ میسج کی اطلاع روشن ہوئی۔ میسج کرنے والے کا نام دیکھتے ہی رضوان ہاشمی کے چہرے پر

پریشانی کے آثار نمودار ہوئے۔ اُس نے جلدی سے میسج کھولا۔ عتیقہ ہاشمی کی جانب سے بھیجا گیا یہ چند سطروں کا میسج اُس کا چہرہ متغیر کردینے کے لیے کافی تھا۔

وہ پریشان تھی کہ جبار ڈرائیور صبح سویرے کسی کو کچھ بتائے بغیر اُس لڑکی رُباب کو لے کر کہیں چلا گیا ہے جسے دو روز قبل یہاں چھپا کر رکھا گیا تھا۔ پریشانی کی بات یہ بھی تھی کہ اُس فارم ہاؤس میں جو ماں بیٹی کام کاج کے لیے رکھی گئی تھیں، اُن میں سے ماں یعنی منظوراں بھی غائب تھی۔ پریشانی یہ بھی تھی منظوراں کی بیٹی نرگس کو بھی کچھ خبر نہیں تھی کہ اُس کی ماں، کب، کس کے ساتھ اور کتنے بجے وہاں سے غائب ہوئی۔

عتیقہ کا واٹس ایپ میسج پڑھنے کے بعد ایک لمحے کے لیے رضوان ہاشمی بھی ہل کر رہ گیا۔ نجانے کیوں تشفی سی تھی کہ شاید جبار اُسے حاجی بخشن کے پاس چھوڑنے کے لیے گیا ہو لیکن پریشانی یہ بھی تھی اُس نے اگر ایسا کیا تو اُس کی اجازت کے بغیر کیوں کیا۔ رُباب حاجی بخشن کی امانت تھی اور اُس میں خیانت کے مضمرات رضوان ہاشمی سے بہتر اور کون جانتا تھا۔ مجسٹریٹ کی عدالت پر حملے اور فرنیچر کو آگ لگائے جانے کے درمیانی عرصے میں حاجی بخشن کے آدمیوں نے جتنی صفائی سے رُباب کو نکال کر اُس کی گاڑی تک پہنچایا تھا وہ بھی غضب واردات تھی لیکن اصل واردات تو باقی گرفتار شدگان کو بھی وہاں سے نکال کر دائیں بائیں کرنا تھا، جسے کمال ہنر مندی سے تکمیل تک پہنچایا گیا۔ اب پولیس کے پاس نہ تو تفتیشی ریکارڈ رہا تھا اور نہ ہی گرفتار شدہ ملزمان۔

رضوان ہاشمی نے جلدی سے جبار کو فون کیا۔ جبار سے ملنے والی تفصیل نے اُسے مزید پریشان کر دیا۔ اگرچہ رضوان ہاشمی کے چار اسلحہ بردار ملازم فارم ہاؤس کی بیرونی نگرانی کے لیے ہمہ وقت موجود رہتے تھے لیکن جبار کو گزشتہ دو راتوں سے فارم ہاؤس میں صرف کسی ایمرجنسی سے نمٹنے کے لیے ٹھہرایا جا رہا تھا۔ جبار کے مطابق اُسے صبح سویرے مخبری ہوئی کہ پولیس سمجھ رہی ہے خوشی خان اکیلا رہ گیا ہے اور دکلا مزید ہڑتال کے لیے اُس کا ساتھ نہیں دے رہے لہٰذا منصوبہ یہ بنا کہ آج نہ صرف خوشی خان کو گرفتار کر لیا جائے بلکہ مفرور کسی لڑکوں اور لڑکیوں بھی ڈھونڈ نکالا جائے، اس واسطے امکان تھا کہ شاید رضوان ہاشمی کے فارم ہاؤس پر بھی ریڈ نہ ہو جائے۔

رضوان ہاشمی نے پہلے تو جبار کی خوب ڈانٹ ڈپٹ کی کہ پولیس کی ایسی جرات کب سے ہوئی کہ وہ اُس کے فارم ہاؤس پر ریڈ کرے مگر جب جبار نے یاد دلایا کہ اُس نے کب اس فارم ہاؤس کو اپنی رہائش گاہ ڈیکلیئر کیا ہوا ہے تو وہ بھی ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ ایسے میں تو پولیس کے پاس ریڈ کرنے کا معقول جواز ہو سکتا تھا۔ اگر رُباب وہاں سے برآمد ہو جاتی تو عین ممکن تھا کہ فارم ہاؤس کے کسی نامعلوم مالک کے خلاف ملزمہ کو غیر قانونی پناہ دینے کے جرم میں پرچہ تو پہلے درج کر لیا جاتا لیکن بعد ازاں ایک سینئر وکیل کا بھرم رکھنے اور اُس کی اشک شوئی کی خاطر معافی تلافی کا ڈراما رچا لیا جاتا۔ رضوان ہاشمی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اُسے لگا کہ جبار کو ملازم رکھتے ہوئے اُس سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ اُسے اپنے انتخاب اپنی مردم شناسی پر فخر کا احساس ہو رہا تھا۔

''تو اب کہاں جا رہے ہو اور منظوراں کدھر ہے؟''

''سرکار! فون پر نہیں بتاؤں گا، ابھی کہیں رُک کر میسج کرتا ہوں، بہر حال آپ کی اپنی اعتماد کی جگہ جا رہا ہوں، منظوراں بھی میرے ساتھ ہے، اِس بی بی کے ساتھ کسی اپنی عورت کا ہونا بہت ضروری تھا۔''

تھوڑی دیر میں جبار کا واٹس ایپ میسج بھی مل گیا۔ رضوان ہاشمی نے پڑھا اور ایک بار پھر جبار کی عقل مندی پر مسکرا دیا۔ لیکن اصل مسئلہ تو ابھی باقی تھا کہ اس صورتِ حال میں حاجی بخشن کو کیسے مطمئن کیا جائے۔

۱۳

اگلی صبح حاجی بخشن بھی حیدر گوٹھ اپنے ہوٹل پہنچ چکا تھا۔ پولیس کے ریڈ میں چونکہ پکڑ دھکڑ صرف ڈرائیوروں کے ''خدمت گار'' لوگوں کی ہوئی تھی اس لیے ہوٹل بھی کھلا رہا اور کاروبار بھی چلتا رہا۔ چھاپے کی رات تو بات پھیلنے کے سبب لمبے روٹ کے ڈرائیوروں نے یہاں بریک لگانی چھوڑ دی تھی مگر چند گھنٹوں بعد جب سب امن امان کی بات چلی تو پھر سے رونق میلہ جم گیا۔ کل

رات آئی جی حمید الرحمٰن سے ہونے والی گفتگو کے بعد حاجی سویا نہیں تھا بلکہ اسی گو یڑ میں رہا کہ ریڈ ہوا تو آخر ہوا کیوں۔

کافی دیر سر کھپانے اور گزشتہ دس بارہ دنوں میں مختلف سرپرستوں کے رویوں کو حمید الرحمٰن کی ملفوف دھمکی سے جوڑ کر دیکھا تو عقدہ کھلتا چلا گیا۔ بچپن میں وہ مولوی کے پاس نورانی قاعدہ محض اس لیے پڑھنے جاتا تھا کہ وہاں گاؤں کے بہت سے بوڑھے آ کر مولوی کے ساتھ بہت چسولی گپیں لگایا کرتے تھے۔ وہاں ایک نائی بھی آیا کرتا تھا، سب سے بوڑھا اور کمر خمیدہ لیکن تھا بہت جہاندیدہ۔ بچپن میں اُس کی زبانی سُنی ہوئی بات بخشن کو آج بھی اس لیے یاد تھی کہ دیہاتوں میں رہنے والے غربا کے بچوں کا بچپن ہوتا ہی نہیں۔ پیدا ہوتے ہی اُنھیں حالت شعور میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ عمر اگرچہ بچوں کی سی ہوتی ہے لیکن سماعت، مشاہدہ اور رویے بڑوں سے بھی بڑے ہو جاتے ہیں۔ بوڑھا نائی کہا کرتا تھا کہ سرداری کا کوئی فائدہ نہیں اگر وہ اپنے پسند کی عورت کو ران تلے نہیں رکھتا۔ دولت، حاکمیت لاتی ہے اور حاکمیت، دولت لیکن جب دولت اور حاکمیت دونوں ہوں تو آخری طلب پھر عورت ہی ہوتی ہے، صرف عورت۔ حاجی بخشن نے اس بات کو پلے سے تو باندھا مگر کامیابی کا راستہ اس طرح ڈھونڈا کہ عورت کے ذریعے دولت اور دولت کی راہیں اختیارات تک پہنچا، حاکموں تک پہنچا، حکومت تک پہنچا۔ اُس نے اِن تینوں کو زیرِنگیں لانے کے لیے مرد کے خالی پن کو استعمال بھی کیا اور اُس کا استحصال بھی۔ وہ جان گیا تھا کہ مرد چاہے کھیت مزدور ہو، صوفی ساہوکار ہو یا دنیا کے سب سے طاقت ور ملک کا حکمران، وہ زندگی بھر اسی خالی پن کو بھرنے، اپنا آپ بانٹنے، اپنا آپ شریک کرنے کے لیے اپنے آپ کو بیچتا رہتا ہے مگر یہ خلا بھر نہیں پاتا۔

بخشن کو بھی اُس کا یہی خالی پن اس منزل تک لایا تھا۔ وہ خالی پن جب اُس کی ماں نے صرف تین ماہ کے بعد اُس کا دودھ چھڑانے کے لیے اپنے تھنوں کو کڑوی رسوَل لگائی اور اُسے بلکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اُس نے اپنے باپ کا خالی پن دیکھ رکھا تھا کہ جس کی بیوی اپنے چار بچوں کو اُس کے سر تھوپ کر اپنے چھوٹے بہنوئی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اسی سبب نہ تو اُس نے اپنے خالی پن

کو بھرنے کی کوشش کی اور نہ ہی شادی۔ بس جب بھی جسم میں شہوت اُتری، اُسے کمزوری اور عذاب بننے سے پہلے ہی نکال باہر کیا۔ عورت کو جز وقتی جسمانی شراکت تک محدود رکھا اس توقع کے بغیر کہ وہ کبھی اُس کی شریک زندگی بھی ہو سکے گی۔ اُسے یقین تھا کہ عورت مرد کے اندر جذباتی کھوکھلا پن پیدا کرنے اور اُسے بڑھاوا دینے کے لیے بنی ہے، اُسے پُر کرنے کے واسطے نہیں۔ بخشن کے نزدیک اُس کے ہوٹل پر پولیس کا ریڈ بھی کسی صاحب اختیار کی جانب سے اپنا اسی قسم کا کھوکھلا پن بھرنے کی کوشش کا ضمنی نقصان نہیں تو اور کیا تھا۔

بخشن جونہی اس نتیجے پر پہنچا، وہ واپس حیدر گوٹھ چلا آیا اور آتے ہی اپنے کارمختیار فیض کریم کو پھر سے ڈرائیوروں کے لیے ''سہولت مرکز'' کھولنے کا حکم دے دیا۔ گاہکوں کے تحفظ کے لیے اپنے لوگوں کو اسلحہ دے کر ادھر اُدھر بٹھا دیا گیا کہ اگر پولیس پھر سے کوئی شرارت کرنے کی کوشش کرے تو زندہ بچ کر کوئی نہ جائے۔ بخشن طے کر چکا تھا کہ اگر پولیس نے اُس کی اتنی خدمات کے بعد بھی اُس کا لحاظ نہیں کیا اور ریڈ کی کالک اُس کے منہ پر مَل دی تو وہ کس لیے اُس کا لحاظ کرتا پھرے۔ پولیس نے جس کسی کی خوشنودی کے لیے یہ سب ڈراما کیا تھا، اُس کا جواب حوصلہ ہار کر نہیں بلکہ سینہ تان کر ہی دیا جا سکتا تھا۔

بخشن کو رضوان ہاشمی کی کارگزاری کی رپورٹ بھی مل چکی تھی اور پولیس کے خلاف تین چار بینر اُس کے ہوٹل کے سامنے بھی لگ چکے تھے۔ لیکن بخشن نے آتے ہی ہوٹل کے سامنے لگے سارے کے سارے بینر اُتروا دیئے۔ سوال یہ تھا کہ اب اگلا قدم کیا ہو۔ وہ ہوٹل کی عمارت سے دو ایکڑ کے فاصلے پر بنے ہوئے اپنے وسیع دفتر کے وسطی کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس اُس کے دو سیکورٹی گارڈز نے دروازے کے باہر اپنی اپنی حفاظتی پوزیشن سنبھال لی۔

کچھ دیر خاموشی سے سوچنے کے بعد اُس نے رضوان ہاشمی کو فون کیا مگر خلاف معمول اُس کا فون بند مل رہا تھا۔ بخشن نے وائس میسج بھیجنے کا سوچا لیکن پھر کچھ سوچ کر فون ایک طرف رکھ دیا اور کارمختیار کو بلانے کے لیے انٹرکام اُٹھالیا۔ کارمختیار فوری طور پر کمرے میں آیا اور اُس کے سامنے مودب کھڑا ہو گیا۔

''فیض کریم! یہ بتاؤ کہ جو لڑکے ریڈ میں پکڑے گئے تھے اُن میں سے کتنے واپس ڈیوٹی پر آئے ہیں؟''

''لڑکے سارے آ چکے ہیں سرکار! بس وہ چھکے اور دونوں لڑکیاں رُباب اور ریشم ابھی تک نہیں پہنچیں۔'' فیض کریم نے ایک ہی سانس میں پوری رپورٹ گوش گزار کر دی۔ حاجی بخشن کچھ دیر سوچتا رہا اور ایک لمبی سانس لی۔

''ٹھیک ہے یہ سب آ جائیں تو انھیں اُن کے کام پر لگا دینا اور وہ لڑکی ہے ناں رُباب! اُسے آتے ہی میرے پاس بھجوا دو اور ہاں! جس شام ریڈ ہوا وہ اِس لڑکی کا پہلا دن تھا ناں یہاں سروس پر!''

''جی! پہلا دن تھا، پہلے تو وہ....'' حاجی بخشن نے اُس کی بات مکمل ہونے سے پہلے اُچک لی۔ ''اُس روز کچھ کام بھی کیا تھا یا....؟''

''نہیں سرکار! ابھی باری ہی نہیں آئی تھی اُس کی۔'' فیض کریم نے جلدی سے بات پوری کر دی۔

حاجی بخشن چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ جیسے کہنے کو کچھ نہ ہو یا بہت کچھ ہو۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد سر اُٹھایا۔ ''میری بات غور سے سُنو! ہو سکتا ہے پولیس اپنا ریکارڈ دوبارہ بنا رہی ہو اور اِن غریب خدمت گاروں کی گرفتاری کے لیے پھر سے کوشش کرے، لہٰذا سوائے رُباب کے، باقی سب کو اِدھر اُدھر کر دو لیکن اِن کو غائب کرنے سے پہلے نئی کھیپ آ جانی چاہیے تا کہ سروس رُکے ناں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پولیس مخبری کے لیے اپنے لوگوں کو ڈرائیور بنا کر بھیجے لہٰذا جب تک معاملہ ٹھیک نہیں ہو جاتا سروس صرف پرانے اور اعتماد کے ڈرائیوروں کو اور کسی کو نہیں اور ہاں، ولایتی کی سپلائی رات کتنے بجے پہنچ رہی ہے؟''

''رات دو تین بجے تک!'' فیض کریم نے احتیاط سے اندازہ لگایا۔

''ٹھیک! بس انتظام ایسا رکھو کہ جونہی اُترے ویسے ہی غائب، سب تقسیم۔''

اتنے میں موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ فیض کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے اُس نے سکرین کی

طرف دیکھا۔ رضوان ہاشمی کی کال تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ بولتا، حاجی بخشن پہلے بول پڑا۔
''ہاشمی صاحب! اچھے بھلے وکیل ہو کر کیوں پولیس کو مخبری دیتے ہو کہ وکلا ایکشن کمیٹی میں نے بنائی ہے۔''

''حاجی صاحب! کیا بات کرتے ہو! میں اور تمھاری مخبری کروں؟ لگتا ہے رات چھوہر نے تکور زیادہ کر دی ہے۔'' ہاشمی نے قہقہہ لگانے کی ناکام کوشش کی۔

''ہاشمی صاحب! ایک تو جب تم اِس طرح ہنسنے کی کوشش کرتے ہو تو بہت برے لگتے ہو، ساری بات چھوڑ دو! یہ جو تم نے میرے ہوٹل کے سامنے ایک نہیں چار چار کپڑے والے اشتہار لگوا دیئے ہیں اب پولیس نے شک تو مجھ پر کرنا ہے ناں، میں نے سب اُتروا دیئے ہیں انھیں کسی مکو ٹھپ جگہ پہ لگواؤ۔''

''اُس بھڑوی کے بینر والے کی عقل ہی اتنی ہے.... اُس نے سوچا ہوگا کہ ریڈ اِدھر پڑا ہے تو بینر لگانے سے ہوٹل کا مالک خوش ہوگا، اُسے کیا پتا کہ اِس کا مالک کس قماش کا بدمعاش ہے۔'' رضوان ہاشمی نے پھر قہقہہ لگانے کی کوشش کی مگر فوراً ہی رک گیا۔

''کون کتنے قماش کا ہے تو اِس چکر میں نہ پڑ ہاشمی صاحب! یہ بتا کہ ہڑتال کی کیا پوزیشن ہے؟''

حاجی بخشن مقصد کے علاوہ کوئی بات سُننے کو تیار ہی نہیں تھا۔

''حاجی صاحب! تم اِسے ہڑتال سمجھو، فائنل۔''

''ہاشمی صاحب! پچاس لاکھ ایڈوانس میں نے ہڑتال سمجھنے کے لیے نہیں دیئے، ہڑتال ہونے، رہنے اور چلنے کے لیے دیئے ہیں اگر صرف سمجھنے والا پچھواڑا ٹھکوانا ہوتا تو یہ پنگا لینے کی کیا ضرورت تھی؟'' بخشن بار بار اُکھڑنے لگا تھا۔

''حاجی یار! فکر کیوں کرتے ہو، کس کی مجال ہے کہ ہڑتال ختم کرا سکے پورے صوبے میں ہڑتال نہ کرائی تو نام بدل دینا۔'' رضوان ہاشمی اُس کے ذہنی دباؤ کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا لہٰذا خاموش ہو گیا کہ فون بند کر دے۔

''ہاں سنو! جب تک یہ پھڈا چل رہا ہے تمھارا فون بند نہیں ہونا چاہیے، کسی وقت بھی کوئی نیا مسئلہ کھڑا ہو سکتا ہے، اور ہاں کھڑے ہونے سے یاد آیا وہ لڑکی رُباب! اُسے اب بھجوا دو میرے پاس کسی محفوظ رستے سے، میں حیدر گوٹھ آ گیا ہوں واپس اپنے دفتر میں اور اُسے فیض کریم کے پاس نہیں اُتارنا، سیدھا میرے پاس بھجوانا ہے میرے آفس میں۔'' حاجی بخشن بدستور اُکھڑا اُکھڑا سا تھا۔

''تو کیا رُباب ابھی تک پہنچی نہیں وہاں! ابھی معلوم کرنے کے لیے تو فون کیا تھا۔'' ہاشمی ایک دم پریشان ہو گیا۔

''تو بھجوا دیا اُسے، کب بھجوایا؟'' بخشن کچھ کچھ پرسکون سا لگنے لگا تھا۔

''یہی کوئی سات بجے صبح، جبار ڈرائیور نے لے کر آنا تھا فیض کریم کے پاس۔'' ہاشمی کی پریشانی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

''لڑکی تو یہاں نہیں پہنچی، اب گیارہ بجنے والے ہیں، اِس کا مطلب ہے چار گھنٹے گزر گئے جب کہ فاصلہ صرف چالیس پینتالیس منٹ کا ہے.... جبار پہنچ گیا واپس؟'' بخشن کا اکھڑ لہجہ گھمبیر سا ہونے لگا تھا۔

''نہیں! وہ بھی نہیں پہنچا ابھی تک۔'' ہاشمی سے بولا نہیں جا رہا تھا مگر جتنا بھی بولا اُس نے حاجی بخشن کو طیش کے ساتویں آسمان پر پہنچا دیا۔

''ارے اُو بھڑوے! تو میرا یار ہے کہ یار مار، تین دنوں میں تجھے ساٹھ لاکھ دے چکا ہوں اور تیرا حال یہ ہے کہ ایک چھوٹی سی امانت تیرے پاس رکھی تھی، تو اُس میں بھی خیانت کر گیا، اُو کیسا وکیل ہے تو! اتنا بڑا نام بنا رکھا ہے، جج تھر تھر کانپتے ہیں اور حالت یہ ہے کہ چار گھنٹے بعد مجھ سے پوچھ رہا ہے چھوہر پہنچی کہ نہیں؟ تو نہیں جانتا اُس لڑکی نے میرا کتنا نقصان کرا دیا ہے، ایک بات کہتا ہوں فائنل، کان کھول کر سن لے! وہ چھوہر میرے پاس با اَمان نہیں پہنچی تو وکالت تو بھی یہاں نہیں کر سکے گا۔'' حاجی بخشن نے غصے سے کانپتے ہوئے فون کو میز پر پٹخ دیا۔

اتنے میں فیض کریم کمرے میں داخل ہوا لیکن جونہی حاجی بخشن کے چہرے کے تاثرات

دیکھے، واپس جانے لگا۔

''اوئے آئے کیوں تھے اور جا کہاں رہے ہو؟'' بخشن اُسے دیکھتے ہی زور سے دھاڑا۔

''بتانے آیا تھا کہ دونوں چھکے بھی آ چکے ہیں اور ریشم بھی لیکن رُباب ابھی تک نہیں پہنچی۔''

فیض کی توقع کے برعکس بخشن کچھ نہیں بولا۔ وہ مسلسل سوچے جا رہا تھا۔ بڑھتی ہوئی خاموشی نے فیض کو مزید بولنے کا حوصلہ دیا۔

''نئی کھیپ آ چکی ہے سرکار! ریڈ والے خدمت گاروں کو گورکھ پور بھجوانا تھا بس رُباب کا انتظار تھا۔''

''بھڑوے! میں نے کہا تھا ناں کہ آتے ہی رُباب کو میرے پاس بھیجنا تو اُس کا انتظار کس لیے! بھیجو سب کو گورکھ پور۔'' حاجی بخشن ایک بار پھر ہتھے سے اُکھڑ چکا تھا۔ ''اور ہاں! جبار کی خبر لگاؤ، ہر صورت میں، ہر طریقے سے۔''

''جبار! ہاشمی صاحب کا ڈرائیور؟'' فیض کریم نے حیران ہو کر بخشن کی طرف دیکھا۔

''بھڑوی کے! اور کتنے جبار ہیں ہمارے سرکل میں؟''

فیض کریم کوئی بھی جواب دیئے بغیر محض سر ہلاتے ہوئے اُلٹے قدموں کمرے سے باہر جا چکا تھا۔ کمرے میں پھر سے خاموشی طاری ہو چکی تھی۔ حاجی بخشن کچھ دیر تک خالی نگاہوں سے سامنے کی دیوار کو دیکھتا رہا اور پھر آنکھیں موند لیں۔ دیوار پر لگی پینٹنگ نجانے کس ملازم نے کب سے وہاں آویزاں کی تھی۔ یقیناً اُس سے پوچھ کر لگائی ہوگی لیکن یاداشت میں نہیں تھی، لیکن جب جب وہ اِس تصویر کو دیکھتا اُس کا غصہ، اُس کی پریشانیاں اِس میں جذب ہوتی چلی جاتیں۔ تصویر کچھ خاص نہیں تھی۔ کچھ کبوتر تھے کسی چھت پر، کچھ منڈیر پر بیٹھے ہوئے اور کچھ ڈالے گئے دانے کو چگتے ہوئے۔ دانہ کھانے والے کبوتروں میں ایک خوبصورت کبوتری بھی تھی جس کے گرد ایک کبوتر مستی سے اپنے پر پھیلائے، گردن اکڑائے، شہوت بھری آنکھوں کے ساتھ رقصاں حالت میں چکر کاٹ رہا تھا۔ لیکن کبوتری بظاہر اُس کی دعوت سے بے نیاز دانہ اس طرح فاصلہ رکھ کر چگ رہی تھی کہ وہ اُس کے قریب نہ آنے پائے جب کہ منڈیر پر بیٹھے کبوتروں میں شاید اُسے رجھانے کا

دم نہیں تھا۔ اس لیے وہ اُن دونوں کو دیکھ تو رہے تھے لیکن یاس اور ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ۔

حاجی بخشن نے ایک دم آنکھیں کھول لیں۔ اُس کی نگاہ پھر سے اُس مستان کبوتر کے تیوروں پر جا ٹکی۔ بہت سے عقدے جو ابھی کھل نہیں پا رہے تھے، کھلتے چلے گئے۔ اُس نے چند لمحے توقف کیا اور پھر موبائل فون اُٹھا کر اُس کے مندرجات کی فہرست میں کوئی فون نمبر تلاش کرنے لگا۔ مطلوبہ نمبر تو مل گیا لیکن کافی دیر تک کوشش کیے جانے کے باوجود رابطہ نہ ہو سکا۔ اُکتائے ہوئے انداز میں اُس نے فون اپنے سامنے میز پر رکھا کہ کچھ دیر کے بعد پھر کوشش کرے گا لیکن فون میز پر رکھتے ہی اُس کی اسکرین روشن ہو گئی جس پر مطلوبہ نمبر چمک رہا تھا۔

۱۴

صاحبزادہ سلطان احمد تو گھر واپس لوٹا تو کسی گاڑی کی ٹوٹی ہوئی ونڈ سکرین کی طرح کرچی کرچی ہوتے ہوئے بھی اِس طرح جڑا ہوا تھا جسے کوئی ہلکا سا ہچکولا یا کسی ہاتھ کا غیر محتاط جھکولا تک زمین پر بکھیر سکتا تھا۔ اللہ ڈِتو خواجہ عبید کے فارم ہاؤس سے گھر تک کا سفر کیسے کٹا، کچھ یاد نہیں تھا، یاد تھا تو بس اُس کی ذاتی زندگی کا بے گور و کفن لاشہ جسے اب دفنانے کی حاجت نہیں رہی تھی۔ آج کے دن تک وہ سمجھتا رہا تھا کہ اُس جیسا کامیاب بیوروکریٹ شاید ہی کوئی اور ہو گزرا ہو کہ جس کا نہ تو کوئی سکینڈل، نہ ہی محکمانہ انکوائری اور نہ ہی کسی تعزیر کا سامنا لیکن یہ یقین محض واہمہ ثابت ہو چکا تھا۔ خلق خدا اُسے کیا سمجھتی رہی، فہم کا یہ زاویہ تو اُس تک پہنچا ہی نہیں تھا۔ اپنی حد تک وہ دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شاید اب بھی بات کر سکتا تھا کہ اُسے مرد ہونے کا زعم تھا۔ لیکن اُس کے تئیں تو اُسے اُس کی بیوی، اُس کی ناہید نے کمزور کر دیا، توڑ کے رکھ دیا۔ اور وہ الیاس ملک جس پر وہ تمام عمر اپنی ذات سے بھی زیادہ بھروسہ کرتا رہا، سیاہ سفید کا مالک بنائے رکھا اُسی نے اُس کے چہرے پر یوں کالک مل دی کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہا۔

گھر آتے ہی اُس نے چاہا کہ چیخ چیخ کر ناہید کے کرتوت کی دہائی دے کہ کس طرح اُس کے نام کی توقیر کو داغدار کیا اور اُس شخص کے ساتھ منہ کالا کرتی رہی کہ جسے وہ اپنا بھائی کہتی تھی لیکن

اُس بھائی نے اپنی ہوس کاری کے لیے اُسے برتا بھی تو وہاں لے جا کر کہ جو اللہ ڈنو عبید جیسے شاطر کا بنگلا تھا۔ اللہ ڈنو عبید کی عیاری نے اُسے اس طرح مار ڈالا کہ اُس کی بیوی کو بھی اُسی بستر پر الیاس ملک سے ہم بستر کرایا کہ جس بستر پر وہ الیاس ملک کی مہیا کردہ عورتوں کے ساتھ صحبت کیا کرتا تھا۔ ناہید نے بھی اُس کے عمر بھر کے اعتماد کا صلہ اس طرح دیا کہ خود کو ایک جہان کے سامنے ننگا کر کے تھوتھو کرانے کا موقع دے دیا۔

لیکن وہ کچھ بھی تو ایسا نہ کر سکا۔ لونگ روم سے گزر کر وہ اپنے بیڈ روم میں جانے لگا تو حسبِ معمول سجی سنوری ناہید اُس کے سامنے آ گئی۔ تقریباً ننگی لباس تقریباً... لباس اُگڑتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس نے تونگر کو دیکھا تو ایک لمحے کے لیے حیران ہو کر رُکی کہ اس مردے میں جان کہاں سے پڑ گئی مگر پھر کوئی بھی بات کیے بغیر باہر چلی گئی۔ شاید کسی ڈنر پر جا رہی تھی۔ تونگر کو اب تک کی ازدواجی زندگی میں شاید اُس کا برہنہ سراپا کبھی ذہن میں بھی نہیں رہا تھا لیکن وہ حیران تھا کہ آج خواجہ عبید کے دکھائے گئے ویڈیو کلپ میں ناہید کے جو زاویے دیکھنے کو ملے وہ کسی طرح بھی اعلیٰ درجے کی پورن اسٹار سے کم نہیں تھے۔ تونگر حیران تھا کہ اُس کے ساتھ بستر پر کسی مردہ گائے کی طرح ڈھیر ہوئی عورت اپنے جنسی رویوں میں اِس قدر بھی شدت پسند ہو سکتی ہے کہ مقابل مرد کو بھنبھوڑ کر، نچوڑ کر رکھ دے۔

صاحبزادہ تونگر کمرے میں داخل ہوا اور لباس تبدیل کیے بغیر بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔ آنکھیں شاید تنہا ہونے کی منتظر تھیں۔ آنسوؤں کا بوجھ سہارا نہ گیا تو کھل کر برسیں اتنا کہ آنسو تھمنا بھول گئے۔ آنسو تھمے تو سہی مگر روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ گھر میں اُس کا وجود پہلے ہی غیر ضروری قرار دیا جا چکا تھا مگر امید تھی کہ کبھی تو گھر والوں کو اُس کی کمی محسوس ہو گی لیکن آج یہ خوش فہمی بھی دور ہو گئی۔ اب ایسے گھر کو گھر کیسے کہا جا سکتا تھا کہ جس کی بنیادوں سے چھت تک مکمل بیگانگی کا راج تھا۔ یکا یک اُسے احساس ہوا کہ اُس کے بیڈ پر کوئی اور وجود بھی ہے۔ اُس نے ہچکیوں کے درمیان آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ کمرے میں ہر سو اندھیرا تھا۔ زندگی میں پھیل چکی تاریکی کا اثر تھا یا شدتِ ندامت کا بوجھ کہ بیڈ روم میں داخل ہوتے وقت اُسے لائٹ آن کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ

ہوئی۔ تونگر نے کھلی آنکھوں پر کچھ اور دباؤ بڑھایا تو دھندلکے میں اُسے ناہید کا برہنہ بدن دکھائی دیا جس کے ساتھ اب ایک اور بدن بھی لپٹا ہوا تھا، الیاس کا بدن۔ اُن کے جذبات کی دحشت سے تونگر کے اعصاب میں ارتعاش پیدا ہونے لگا تھا۔ اِس احساس سے نجات کے لیے اُس نے آنکھوں کو بھینچ لیا۔ کھنچاؤ اِس قدر تھا کہ آنکھوں کے پاتال میں بچے کھچے آنسو بھی باہر کی راہ پانے لگے۔

رات کے کس پہر اُس کی آنکھ لگی، کھانا کھایا یا نہیں، کوئی اُس کے کمرے میں آیا یا نہیں، صبح کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ آتے ہوئے جاڑے کی قدرے خنک دھوپ آٹھ بجے کے لگ بھگ ہلکی ہلکی تمازت پھیلانے لگی تھی۔ معمول کے مطابق وہ اُٹھ کر لان میں بچھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا تو خانساماں نے ناشتہ چُن دیا۔ ناشتہ دیکھ کر اُس کا جی اوبنے لگا تو تونگر نے تھرموس سے بلیک کافی نکالی اور ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔ کافی کے آدھے کپ نے ہی اُس کی طبیعت پر چھائی ہوئی مردنی کو آہستگی سے اس طرح ہٹایا کہ جذبات پر عقلیت غالب آنے لگی۔

اُسے یاد آیا کہ اپنی بھرپور جوانی کے دنوں سے اب ریٹائر ہونے سے کچھ عرصہ پہلے تک اُس نے ناہید یا بچوں کو وقت ہی کتنا دیا تھا۔ دن بھر دفتر اور شام کو وہیں سے کلب چلے جانا معمول ہی رہا۔ کچھ ترقی ہوئی تو رات گئے تک کی میٹنگز اور اگر تبادلہ کسی دور دراز کے ضلع یا صوبہ میں ہو گیا تو کئی کئی ہفتوں کی دوری کا سامنا ناہید اور بچوں ہی کو رہا۔ اور پھر جب سے الیاس ملک اُس کی زندگی میں داخل ہوا تو آخرِ ہفتہ کی شب بسری کے ساتھ ساتھ ہفتے کی دو تین راتیں بھی اکثر کسی مہ وش کی بانہوں میں گزرنے لگیں۔ ایسا بھی ہوا کہ مہینے گزر جاتے مگر ناہید کے ساتھ خلوت یا ازدواجی رابطوں کی نوبت ہی نہ آتی۔ صاحبزادہ تونگر حیران ہو رہا تھا کہ شادی کے اولین دنوں میں ناہید کے چڑچڑے پن، ہر وقت کی کھچ کھچ اور پھر بڑھتی ہوئی لاتعلقی کو وہ ناہید کے زاویہ نگاہ سے کیوں ناں دیکھ سکا۔ وہ اُن اُجڑی ہوئی راتوں کا حساب کیوں ناں رکھ سکا کہ جو ناہید اُس کے فراق میں گزارتی رہی تھی۔ کیا ایک نظر انداز کر دی گئی بیوی کو خبر نہیں ہوتی کہ اُس کا شوہر کتنی شراب معدے میں اُنڈیل کر اور کتنے گھنٹے اُس سے الگ کسی نئی عورت کی جنسی تشفی کے واسطے خود کو تھکا تا رہا ہے۔

ایسے میں اگر کسی اپنے نے مہم جوئی کرتے ہوئے اس فاصلے میں پڑاؤ ڈالنے اور شکستہ ہو چکی دیوار میں نقب لگانے کی کوشش کی تو ایک جوان عورت کس طرح انکار کر سکتی تھی۔ اس قسم کے حالات میں اُلجھی ہوئی عورت شاذ و نادر ہی کسی مرد کی دراندازی کو روکنے کی ہمت رکھا کرتی ہے خاص طور پر جب وہ مرد لائق اعتبار بھی ہو اور محفوظ و مامون موقع بھی میسر ہو۔

تونگر کا ذہن نہایت تیزی سے ورق پہ ورق پلٹائے جا رہا تھا۔ خیالات کی گتھیاں اُلجھ کر سلجھ اور سُلجھ کر پھر سے اُلجھ رہی تھیں۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ جس نوعیت کی دراڑیں ازدواجی زندگی میں پڑ چکی تھیں اور جس طرح اُس کا متبادل اُن دراڑوں میں اپنی جگہ بنا چکا تھا، اُس کے ہوتے ہوئے کم از کم اس زندگی میں گزر چکے ایام اولین کا اپنی تمام وارفتگی کے ساتھ بحال ہونا ممکن نہیں رہا تھا۔ بہت سی اُلجھی ہوئی تکلیف دہ باتیں نتھر کر تونگر کے سامنے آ رہی تھیں۔ اب اگر اس گھر کی چار دیواری میں وہ بے وقعت ہو چکا تھا تو اِس کا ذمہ دار کوئی اور نہیں، وہ خود تھا۔ ناہید نے جو کیا وہ اُس کی پیدا کردہ صورتِ حال کا فطری ردِعمل تھا اور جو کچھ اُس کی اولاد اُس کے ساتھ کر رہی تھی وہ بھی اِس قسم کے حالات میں متوقع تھا، غیر متوقع نہیں۔ اب صاحبزادہ تونگر کے لیے کوئی بھی فیصلہ کرنا مشکل نہیں رہا تھا لہٰذا اُس نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

کل شام جب صاحبزادہ تونگر نے اللہ ڈنو عبید کے ہاں اپنی ملازمت کے معاہدے پر دستخط کیے تو وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ ملازمت کیا ہے اور اُس کی ذمہ داریاں کیا کچھ ہیں لیکن بعد میں جانان کی طرف سے دی گئی بریفنگ سے بھی وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ اللہ ڈنو کو اُس سے کس قسم کی خدمات مطلوب ہیں۔ اُس کے دستخط ہوتے ہی اللہ ڈنو تو کمرے سے چلا گیا تھا مگر وہ کافی دیر تک گم سم حالت میں وہیں موجود رہا تھا۔ اُسے اب بھی یاد نہیں تھا کہ جس معاہدے پر اُس نے دستخط کیے وہ معاہدہ کیا تھا۔ تونگر نے جلدی سے بچی کھچی کافی کپ میں اُنڈیلی اور ایک لمبا گھونٹ لیا۔ کافی کی کڑواہٹ نے جلد ہی اندر کی کڑواہٹ کو رقیق کر دیا۔

''عبید نے اگر مجھ سے کوئی غیر قانونی کام ہی لینا ہے، زبردستی، اس طرح سے بلیک میل کرتے ہوئے تو اُسے میرے ساتھ ملازمت کا معاہدہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اِس قسم کے

کاموں کے لیے اِس قسم کے قانونی معاہدے نہیں کیے جاتے، اگر وہ ملازمت کا معاہدہ نہیں تھا تو پھر اور کیا تھا؟'' ایک اور خیال بھی اُس کے ذہن میں پھر سے گردش کرنے لگا تھا''اگر اللہ ڈنو عبید کے پاس مجھے بلیک میل کرنے اور اپنے کام نکلوانے کا اتنا مواد موجود تھا تو اُس نے مجھے میری سروس کے دوران بلیک میل کیوں نہیں کیا، پوسٹنگ پر ہوتے ہوئے میں آسانی سے اُس کے تمام کام کرسکتا تھا، یقیناً بات کوئی اور رہی ہو گی اور وہ تیس فیصد کی پارٹنر شپ دینے کا معاملہ بھی شاید اُس طرح سے نہیں تھا کہ جیسا دکھایا جا رہا تھا۔''

تشکیک کے اِس پہلو نے صاحبزادہ تونگر کے قدم ڈگمگا دیئے۔ اُسے اللہ ڈنو عبید کا چہرہ اور اُس پر پھیلی ہوئی رعونت اور حقارت یاد آنے لگی تھی کہ جب وہ لائبریری روم چھوڑ کر جا رہا تھا۔ ''کتنے چہرے اور لہجے تھے اُس شخص کے؟'' تونگر جب اللہ ڈنو کے فارم ہاؤس پر جا رہا تھا، اُسے ہرگز اِس قسم کی کمینگی کی توقع نہیں تھی اور نہ ہی یہ کبھی سوچ پایا تھا کہ بس ایک ہی ملاقات وہ شخص کیا سے کیا ہو جائے گا۔ ''اِس قدر خوشامد کے بعد اِس قدر بیگانگی، مغائرت اور طوطا چشمی!''

اِن حالات میں اُسے گھر چھوڑ دینے کا فیصلہ قبل از وقت اور احمقانہ لگنے لگا تھا۔ تونگر کا خیال تھا کہ اب ناہید کا سامنا کرنے کی نسبت بہتر ہو گا کہ کسی کرائے کے گھر میں شفٹ ہو جائے لیکن اب الگ رہنے کی اذیت اِس گھر میں رہنے کی اذیت سے کئی گنا زیادہ لگنے لگی تھی۔ جو بات ابھی تک اُس کے اور اللہ ڈنو کے بیچ تھی، اُس کے الگ رہنے کی صورت میں راز نہیں رہ پائے گی۔ تونگر کے مطابق ممکن تھا اِن ریکارڈنگز کا علم ملک الیاس کو بھی رہا ہو مگر ابھی تیقن سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اُسے اپنی ویڈیوز کی بھی خبر ہے یا نہیں۔

ابھی صاحبزادہ سلطان احمد تونگر یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میز پر رکھا اس کا فون تھرتھرانے لگا۔ اُس نے بلنک کرتی ہوئی سکرین کو دیکھا، نمبر اجنبی تھا لیکن اب اُسے کوئی بھی کال اٹینڈ کرنے میں کوئی جھجک نہیں رہی تھی۔

''میں جانان بول رہی ہوں تونگر صاحب!''

تونگر کا دل چاہا کہ فوراً فون بند کر دے لیکن ایک دن میں بھونچال کی طرح وارد ہونے

والے واقعات اُسے اِس قدر سراسیمہ کر چکے تھے کہ اس کے حلق سے سوائے ''جی'' کے اور کوئی بھی لفظ نہ نکل سکا۔ ایک لمحے کے لیے کئی سُرخ سوالیہ نشان تونگر کے ذہن میں کلبلا کر رہ گئے اس لیے کہ اِن خبیثوں کے ٹولے سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن خلاف توقع جانان کی آواز میں ہمہ قسم مٹھاس ضرورت سے کچھ زیادہ ہی در آئی تھی۔

''لگتا ہے آپ ابھی تک ہم سے ناراض ہیں، اس معاملے میں ہمارا کیا قصور! باس اور آپ دونوں دوست ہیں اور دوستوں کے درمیان تو اس قسم کی کھٹ پٹ اکثر ہو ہی جاتی ہے، پلیز! Don't take it to your heart.''

''میرے لیے کوئی حکم؟'' صاحبزادہ تونگر ابھی تک اِس صورتِ حال سے مفاہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ کہاں کل اُس کا جانا اور کہاں کن حالات میں واپسی اور پھر آج یہ ایک اور رویہ، ایک اور جال۔

''ہم کہاں آپ کو حکم کر سکتے ہیں! ہم تو آپ کے غلام ہیں..... باس نے ہمیں آپ کی ماتحتی میں دے دیا ہے۔'' جانان کے لبوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ تونگر کو اُس کی آواز میں بھی سجھائی دے رہی تھی۔

''آپ اور میری ماتحتی میں؟ آپ ہی ہمیں بتائیں کہ ہم ہیں کیا؟'' باوجود کھولاؤ کے صاحبزادہ تونگر اپنی آواز میں غصہ پیدا نہیں کر پا رہا تھا۔ کل کی ملاقات نے اُس کے وجود سے انا اور مزاحمت دونوں کہیں نچوڑ لیے تھے۔ مستعمل معنی میں اگر غیرت، انا اور مزاحمت ہی کی مشترکہ وجودیت کا نام تھا تو وہ اُس کے وجود سے معدوم ہو چکی تھی، محسوس ہی نہیں ہو رہی تھی۔ دوسری جانب جانان بھی اُس کی اس کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے حظ اُٹھا رہی تھی۔

''آپ ہی تو ہمارا سب کچھ ہیں، باس کے غصے کو دل پر مت لیں اور بھول جائیں کل جو کچھ ہوا، باس بھی سب کچھ بھلا چکے ہیں، اب آپ ہی چیف ایگزیکٹو ہیں ''ہولی ٹرانزیکشن'' کے۔''

اللہ ڈنو کی اِس قلابازی پر صاحبزادہ تونگر چکرا کر رہ گیا۔ ملازمت کے دوران اُسے ہر قسم کی انتہائی ناخوشگوار اور معاندانہ صورت حال سے واسطہ پڑتا رہا تھا، اُس نے انکوائریاں کیں اور

انکوائریوں کا سامنا بھی کیا، حرامی الدہر اور نطفۂ نا تحقیق لوگوں سے مختلف ادوار میں دو دو ہاتھ بھی کیے مگر نہ تو کسی لمحے گھبرایا اور نہ ہی ہراساں ہوا۔ مگر کل کے بعد اُس میں مزاحمت کا حوصلہ ہی نہیں رہا تھا۔ شاید اِس کی ایک وجہ یہ رہی ہو کہ ملازمت کے دوران اُس کے منصب پر حملے ہوتے رہے تھے، کسی نے بھی اُس کی ذات اور ذاتی کرداریوں پامال کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید منصب سے دشمنی رکھنے والوں کے کچھ اصول رہے ہوں گے جو ذات اور ذاتی کردار پے وار کرنے والوں کے ہاں مفقود تھے۔ قبل ازیں ہراساں نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تو ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی فیملی کو اپنی پشت پر محسوس کرتا تھا جب کہ اِس سماجی ڈھارس سے محروم ہو کر وہ اپنے آپ کو اگلے مورچوں کا ایک ایسا یک و تنہا سپاہی محسوس کر رہا تھا جو حریف عساکر کے محاصرے میں آ چکا ہو۔

"آپ کہاں کھو گئے سر! یقین کریں میں حرف بحرف سچ کہہ رہی ہوں، بس کل سہ پہر سے شام تک کے چند گھنٹے اپنی یادداشت سے محو کر دیں۔" جانان کا لہجہ ایسا نہیں تھا کہ جس پر مزید شک کیا جا سکتا۔ اگر یہ اداکاری تھی تو کمال کی پختگی تھی۔ اگر چھل تھا تو غضب کا جس کے ہوتے ہوئے بھی یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

"مجھے کیا کرنا ہے؟" صاحبزادہ تونگر اپنے حلق کا سوکھا پن بمشکل برداشت کرتے ہوئے بولا۔

"سر! کل میں نے اتنی تفصیل سے تو بریفنگ دی تھی آپ کو کمپنی کی ورکنگ کے بارے میں۔" جانان حیران ہو رہی تھی۔

"مجھے کچھ یاد نہیں کہ آپ نے مجھ سے کیا کہا تھا۔" صاحبزادہ تونگر لاتعلق سا تھا۔

"جی سر! میں آپ کی کیفیت کو بہت اچھے سے محسوس کر سکتی ہوں، میں معافی چاہتی ہوں اگر میری کوئی بات کل کے ناخوشگوار اپی سوڈ میں آپ کو بری لگی ہو، آج سے آپ مجھے اپنا غلام سمجھیے۔" جانان کا لہجہ واقعی معذرت خواہانہ لگ رہا تھا۔ صاحبزادہ تونگر اِس پر کیا کہتا، سو خاموش رہا۔ کچھ توقف کے بعد جانان پھر سے اُسی لہجے میں بولی کہ جیسے واقعی شرمندہ ہو رہی ہو۔

"آپ تشریف لے آیئے، میں پھر سے بریفنگ دیتی ہوں، آج کی میٹنگ اہم ہے، کمپنی

کی پالیسی اور حکمت عملی کو نئے حالات کے مطابق رکھنے پر غور کرنا ہے، اور ہاں! باس آج آفس نہیں آئیں گے، وہ کل رات ہی ملک سے باہر چلے گئے تھے۔"

"تو پھر میٹنگ کس سے ہوگی؟" صاحبزادہ تونگر حیران تھا۔

"میں ہوں ناں سر!" جانان کے لہجے میں پھر سے مٹھاس گھلنے لگی تھی۔

"میں سمجھا نہیں، مجھے اپنی جاب کا پتہ نہیں، اور میں کیا بناؤں گا پالیسی یا حکمتِ عملی اور وہ بھی صرف آپ کے ساتھ بیٹھ کر جب کہ مجھے کارپوریٹ سیکٹر میں اس طرح سے کام کرنے کا تجربہ ہی نہیں کہ جس طرح سے آپ لوگ چاہ رہے ہیں۔" تونگر خاصا تلخ ہو رہا تھا۔

"سر! آپ تشریف تو لائیں! اب آپ کمپنی کے ایم ڈی ہیں، آج آپ نیا کنٹریکٹ سائن کریں گے اور اپنے الگ دفتر میں بیٹھیں گے، میں آپ کو بریفنگ دوں گی اور آپ ابھی صرف اُن ایریاز کی نشاندھی کریں گے کہ جہاں جہاں ہم مستقبل میں کمپنی کو بہتری کی طرف لے جا سکتے ہیں، ابھی بورڈ آف ڈائریکٹرز کا اجلاس نہیں ہو رہا، مطمئن رہیں، وہ اُس وقت ہوگا جب آپ چاہیں گے۔"

"اور میری تقرری بطور ایم ڈی کس نے کی ہے؟" تونگر گڑبڑا کر رہ گیا تھا۔

"باس کمپنی کے چیئرمین ہیں اور وہ ایسا کرنے کے مجاز ہیں۔" جانان اب کے مطمئن لگ رہی تھی۔ "اور سر! آپ تیار ہو جائیں، آپ کا شوفر کمپنی کی گاڑی لے کر آپ کے ہاں پہنچتا ہی ہو گا۔"

۱۵

حاجی بخشن نے جس لہجے میں رضوان ہاشمی کو اُس کی اوقات یاد دلائی تھی وہ بھی اُس کی حیثیت کا ازسرِنو تعین کرنے کے واسطے ایک نئی بازی کی بساط بچھانے کا سوچنے لگا تھا۔ اُس کی اجازت کے بغیر ہی سہی مگر جس طریقے سے جبار اُس لڑکی رُباب کو بخشن کی حدود سے باہر نکال کر لے گیا تھا، اِس نے اُلجھی ہوئی بازی کو رضوان ہاشمی کے حق میں پلٹنے کی بنیاد استوار کر دی تھی۔ بس

اب چال چلنے کے لیے کسی بہتر مہرے کا انتخاب کرنا تھا۔ حاجی بخشن کی آواز سننے کی سمعی غلاظت سے چھٹکارا پانے کے لیے رضوان ہاشمی نے فون ایک طرف پھینکا، کچھ دیر آنکھیں موندے ٹانگیں لٹکائے اپنے بیڈ پر بیٹھا رہا، پھر ایک فیصلہ کن انداز میں اُٹھا اور واش روم میں گھس گیا۔ بازی کو ازسرِ نو جمانے کے لیے اُس کا اپنے فارم ہاؤس پہنچنا ضروری ہو گیا تھا کہ جہاں عتیقہ کا قرب اُسے فراواں توانائی عطا کرتا تھا وہیں اُس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو بھی مہمیز کیے رہتا تھا۔

بیس بائیس برس کی عتیقہ کے رضوان ہاشمی سے نکاح کو ابھی بمشکل نو دس ماہ ہوئے تھے۔ خفیہ طور پر کیے گئے اِس نکاح کے گواہ بھی رضوان ہاشمی کے دو قریبی اور با اعتماد ملازم تھے۔ ایک اُس کا ڈرائیور جبار اور دوسرا منشی حیات علی۔ عتیقہ کی کہانی بھی عجیب تھی۔ وہ کسی پھل کی طرح رضوان ہاشمی کی گود میں گری تو اُس نے گود کو چنگل بنا کر اُسے بچ نکلنے کا موقع ہی نہ دیا۔ عتیقہ رینکنگ کے اعتبار سے ملک کی بہترین یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھی کہ اُس کے والدین ایک حادثے کا شکار ہو گئے۔ تحصیل حیدر گوٹھ میں چھ مربع زرعی اراضی اور صوبائی دارالحکومت میں بیش قیمت بنگلے جائیداد کی اکلوتی وارث ہونے کے نتیجے میں اُس کے ماموں اور رشتے کے چچا کے درمیان شروع ہونے والی کشمکش فطری تھی جس میں کامیابی کا پہلا زینہ ہی عتیقہ کو اپنے قبضے میں رکھنا تھا۔ بات عدالت تک پہنچی تو وکیل تک پہنچنا بھی لازمی امر تھا۔ سو رضوان ہاشمی بھی اِس گیم کا حصہ بنتا چلا گیا۔ عتیقہ چونکہ ماموں اور چچا دونوں سے خوفزدہ ہو چکی تھی لہٰذا رضوان ہاشمی یہ سنہری موقع کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ اُس نے اپنی گیم شروع کی اور اُن دونوں کو ہاتھ ملتا ہوا چھوڑ کر جائیداد سمیت عتیقہ کو لے اُڑا۔ ماموں اور چچا سے چھپ کر رہنا اگر عتیقہ کی مجبوری تھی تو اُسے اپنے گھر والوں سے چھپا کر رکھنا رضوان ہاشمی کی، اِس طور اُس کا کچھ عرصہ پہلے بنایا گیا فارم ہاؤس آباد ہو گیا۔ کچہری کی بے پناہ مصروفیت کے بعد سے رات گئے تک اُس کا وقت فارم ہاؤس میں گزرتا اور باقی جو بچ رہتا وہ گھر پر گزارنا پڑتا مگر اُس کی روح کہیں فارم ہاؤس ہی میں اٹکی رہتی۔

یہ فارم ہاؤس بھی رضوان ہاشمی نے خفیہ طور پر حیدر گوٹھ اور فتح گڑھ کے وسط میں واقع محکمہ اوقاف سے ٹھیکہ پر لی گئی بیس ایکڑ اراضی کے شمال مغربی کونے کے آخری ایکڑ میں بنا رکھا تھا۔ ہر

سال لیز پر دی جانے والی موضع نبی پور کی یہ اراضی اُس نے بیس برس پہلے ایک سال کے لیے لی اور پھر مقامی سول کورٹ میں محکمے کے خلاف دعویٰ دائر کر کے حکم امتناعی حاصل کر لیا۔ اب بیس برس سے نہ تو وہ محکمے کو زرمستاجری ادا کر رہا تھا اور نہ ہی اراضی کا قبضہ چھوڑ رہا تھا۔ چونکہ محکمہ اور عدالت دونوں اُس کی سرشت ضرر رسائی سے خوفزدہ تھے، اس لیے اُس نے دھڑلے سے وہاں فارم ہاؤس بھی بنا لیا۔ اگرچہ اسے بھی خاصی حد تک خفیہ رکھا گیا تھا مگر موضع نبی پور کے لوگ اتنا ضرور جانتے تھے کہ یہ اراضی ہاشمی صاحب کی اور ڈیرہ بھی اُسی کا ہے۔

رضوان ہاشمی تیار ہو کر باہر نکلا تو اُس کا دوسرا ڈرائیور عبدالقدوس بھی گاڑی تیار کیے کھڑا تھا۔ وہ اُس کے لیے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولنے لگا تو اُس نے منع کر دیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اُس کے ذاتی معاملات سے نا آشنا اور گھر والوں سے زیادہ قریب عبدالقدوس کو ساتھ لے جانا اپنا اشتہار لگوانے کے مترادف تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ گاڑی کو گیئر میں ڈالتا اُس کے فون کی سکرین روشن ہو گئی۔ یہ خوشحال خان کی جانب سے واٹس ایپ کال تھی۔ رضوان ہاشمی نے وقت دیکھا، ابھی تو پونے بارہ ہوئے تھے جب کہ اُس نے خوشی خان کو ایک بجے کا وقت دیا ہوا تھا۔

''شاید کوئی ایمرجنسی رہی ہو۔'' یہ سوچ کر ہاشمی نے فون اٹینڈ کر لیا۔

خوشی خان خاصا پریشان تھا۔ اُس کے مطابق بار کے کچھ غیر سیاسی اور پروفیشنل وکلاء نے بار روم میں میٹنگ شروع کر رکھی تھی جس کا واحد ایجنڈا ہڑتال کے خاتمے سمیت عدلیہ و انتظامیہ سے اچھے تعلقات کی بحالی تھا۔ خوشی خان کو یہ بھی خبر تھی کہ اگر ابھی ہڑتال کے خاتمے کا اعلان ہو جاتا ہے تو اُس کی گرفتاری یقینی تھی۔

''تو کیا کیا جائے؟'' رضوان ہاشمی کے لہجے میں تسکین آمیز رعونت تھی۔

''سر! کل رات میں نے آپ سے گزارش کی تھی ناں! اب مہربانی کریں کوئی راستہ نکالیں۔'' خوشی خان کے ایک ایک لفظ سے سراسیمگی عیاں تھی۔ ''سر! معاملات ہاتھ سے نکلتے جا رہے ہیں، میری تو پوری کی پوری گیم اُلٹ چکی ہے۔''

''ہوں'' رضوان ہاشمی نے کچھ سوچنے کا تاثر دینے کی کوشش کی۔ ''خوشی خان! پلٹی ہوئی

بازی یونہی نہیں بن جاتی، قربانیاں دینی پڑتی ہیں، مفادات بانٹنے پڑتے ہیں۔"

"تو میں نے کب انکار کیا ہے! آپ حکم تو کریں، بلیں تو سہی۔" خوشی خان کی سراسیمگی میں اُتاولی بھی شامل ہو چکی تھی۔

رضوان ہاشمی نے فتح گڑھ روڈ پر اپنے فارم ہاؤس سے کہیں پہلے کوئلے کی ایک بہت بڑی ٹال کے عقب میں گاڑی روک لی جہاں اُس کی ہدایت پر خوشی خان پہلے ہی اپنی گاڑی پر پہنچ چکا تھا۔ اُس کی گاڑی رکتے ہی خوشی خان تیزی سے اپنی گاڑی سے نیچے اترا اور اُتنی ہی تیزی سے رضوان ہاشمی کی گاڑی کا دروازہ کھول کر تعظیماً اُس کے گھٹنے چھو لیے۔ رضوان ہاشمی نے اُسے دوسری جانب سے اپنے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

یہ بظاہر بہت بڑا لیکن ویران سا ٹال تھا جہاں بعد دوپہر ٹرکوں میں ادھ جلی لکڑی کا کوئلہ لادنے کا کام شروع ہوتا اور رات گئے تک وہاں سے کوئلے سے بھرے ہوئے ٹرک مختلف شہروں کے لیے روانہ ہو جاتے۔ کچھ دیر ہاشمی کی سیاہ رنگ کی ٹیوٹا سرف میں خاموشی رہی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ایک بہت بڑے معرکے کے بعد شکست خوردہ سپہ سالار کسی فاتح کے حضور اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کر رہا ہو۔

"اگر گیم واپس ہاتھ میں آجائے تو مجھے کیا ملے گا؟" ہاشمی کے لہجے میں نخوت آمیز تسکین کا درجہ اور بھی بلند ہو چکا تھا۔

"سر! میں آپ کا شاگرد ہوں، میرے پاس جو بھی ہے آپ کی عطا ہے، آپ حکم تو کریں۔" خوشی خان نے رضوان ہاشمی کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ جہاں کسی بڑی سودے بازی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔

"پھر سوچ لو خوشی خان! بوجھ کہیں تمھاری سکت سے زیادہ نہ ہو جائے۔" رضوان ہاشمی کی نگاہیں گاڑی کی سکرین کے پار جمی تھیں۔ خوشی خان نے اپنی عاجزی اور رضا کا حتمی مظاہرہ ایک بار پھر اُس کے گھٹنوں کو چھونے کے بعد دونوں ہاتھ جوڑ کر کیا۔

"حیدر گوٹھ اور شمس پور دونوں بارز کا جنرل سیکریٹری میرا ہو گا۔" رضوان ہاشمی کا جملہ سنتے ہی

خوشی خان کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اُسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ آج کی ڈیل کی قیمت کیش نہیں بلکہ چند دنوں بعد ہونے والے بار کے سالانہ الیکشن میں اتنی بڑی سودے بازی ہو گی۔

''لیکن سر! شمس پور کے دونوں پینل میرے حمایت یافتہ نہیں۔'' خوشی خان کا گلا سوکھنے لگا تھا۔

''مجھے سب خبر ہے خوشی خان! ہم مفروضوں پر نہ بات کریں گے اور نہ ہی بحث، وقت بہت کم ہے، ہم صرف ہاں یا نہ کہیں گے، اُس کے بعد جو ہو گا دیکھا جائے گا۔'' رضوان ہاشمی کے لہجے میں اچھی خاصی سختی آ چکی تھی۔ ''میری بات غور سے سنو! حیدر گوٹھ بار کے الیکشن میں اپنے پینل کے صدر کو میں ہرواؤں گا تاکہ تم جیت سکو اور جنرل سیکریٹری کے الیکشن میں تم اپنے پینل کے اُمیدوار کو ہرواؤ گے تاکہ میرا امیدوار جیت سکے۔ یہی عمل شمس پور کی ڈسٹرکٹ بار میں بھی دہرایا جائے گا۔ اب دوسری بات! صوبائی بار کونسل کے انتخاب میں بھی تمہارا پورا گروپ مختیار سلیمی کی بجائے مجھے ووٹ دے گا اور آخری بات یہ کہ صوبائی بار کونسل کے الیکشن کے اخراجات میری توقع سے کہیں بڑھ چکے ہیں، مجھے پچاس لاکھ روپے بھی چاہیے ہوں گے۔''

جوں جوں رضوان ہاشمی کی شرائط سامنے آتی گئیں توں توں خوشحال خان کا چہرہ زرد پڑتا چلا گیا۔ رضوان ہاشمی نے خوشی خان کے سُتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''خوشی خان! لگتا ہے تم نے ابھی سیاست محض دیکھی ہے، سیکھی نہیں، حالانکہ ایک عرصہ گزارا ہے میرے پاس۔'' رضوان ہاشمی نے اُسے ایک اور جھٹکا دے دیا۔

''سر! مجھے قبول ہے، جو بھی آپ نے کہا۔'' آواز خوشی خان کے گلے میں پھنس رہی تھی۔

''بس آپ آج اور ابھی کچھ ایسا کریں کہ سب کچھ میرے ہاتھ میں واپس آ جائے۔''

''برخوردار! ہمارے ہاتھ میں بھی کچھ دو گے تو.....'' رضوان ہاشمی نے ایک اور جھٹکا دیا۔

خوشی خان نے پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں کی دو گڈیاں جیب سے نکال کر بونٹ پر رکھ دیں۔

''سر! یہ دس لاکھ ہیں، باقی چالیس آج شام سے پہلے پیش کر دوں گا۔''

''اور ہاں اایک اور بات تو رہ گئی، ان تمام باتوں کی تمھاری طرف سے گارنٹی کون دے گا، میرا مطلب ہے کہ اِس معاہدے کا ضامن کون ہوگا۔'' رضوان ہاشمی نے ایک اور جال اُس کی طرف پھینک دیا۔

''سر! کمال کرتے ہیں آپ! میں آپ کا شاگرد ہوں، مجھ پر اعتبار آپ نہیں کریں گے تو کون کرے گا؟'' خوشی خان خوشامدانہ سی پھیکی ہنسی ہنس دیا۔

''اسی لیے تو ضامن مانگ رہا ہوں کہ میرے شاگرد ہو۔'' ہاشمی نے قہقہہ لگایا۔

''آپ جو حکم کریں.... ویسے جو بھی ضامن ہوگا کیا وہ اِس معاہدے کو راز رکھ سکے گا؟ اور یہ بھی تو دیکھیں کہ میں اپنے اُستاد کو جانتے ہوئے بھی اُس پر اعتبار کر رہا ہوں۔'' خوشی نے تعظیم اور طنز کو آپس میں جوڑ دیا تھا۔

رضوان ہاشمی نے عجیب سے انداز میں قہقہہ لگانے کی کوشش کی مگر پھر اسے ادھورا چھوڑ دیا۔

''یہ میں نے بھی سوچا ہے اور بہت سوچ سمجھ کر ایک ترکیب نکالی ہے، ہم دونوں کو ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے، جب تمھاری طرف سے باقی رقم پہنچے گی اُس وقت تک ضامن اور ضمانت کا بھی کچھ کرلیں گے۔''

خوشی خان کچھ بھی کہے بغیر سرف سے اُتر کر اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا۔ رضوان ہاشمی نے بھی گاڑی کو آگے بڑھایا۔ اُس کا رخ اب اپنے فارم ہاؤس کی طرف تھا جب کہ بیک مرر گواہی دے رہا تھا کہ خوشی خان کی گاڑی واپس حیدر گوٹھ کی طرف مڑ چکی تھی۔ رضوان ہاشمی نے ایک لمبی سانس لی اور اُس کے چہرے پر چھپر پھاڑ کامیابی کی مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ اُسے ہاتھ سے نکل چکی اپنی گیم کو واپس لانا تھا جس کا معاوضہ بھی وہ نہیں بلکہ دو دوسرے فریق چکا رہے تھے۔ اُسے بس بجھتی ہوئی آگ کو بجھانا نہیں بلکہ کچھ اور، اُس سے بھی زیادہ اور بھڑکانا تھا۔

فارم ہاؤس میں داخل ہوتے ہی اُس نے گاڑی مردانہ حصہ میں روک لی کہ جہاں پھلدار پودوں کے درمیان مخملیں گھاس نے اچھے خاصے وسیع قطع اراضی پر اپنا سبزہ بکھیر رکھا تھا۔ گاڑی سے نکل کر ملازموں کی خیریت پوچھتا ہوا وہ گھاس پر رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا جہاں

سردیوں کے آغاز کی دھوپ نے اپنی ٹکور کرتی ہوئی میٹھی تمازت پھیلا رکھی تھی۔ اُس نے کچھ دیر پہلے اپنا بند کیا ہوا فون آن کیا تو اُس میں حاجی بخشن کی تین کالز کے علاوہ حیدر گوٹھ بار کے صدر، شمس پور ڈسٹرکٹ بار کے صدر اور کچھ کالز صوبائی بار کونسل کے دستوں کی تھیں۔ اب سب سے اہم کام دو تھے۔ رُباب کے معاملے میں حاجی بخشن کو الجھائے رکھنا اور حیدر گوٹھ کی ہڑتال کو پورے صوبے تک پھیلا دینا۔

۱۶

حاجی بخشن نے جلدی سے موبائل فون اُٹھالیا۔ سکرین پر بلنک کرتا ہوا نام دیکھ کر اُس نے غصے سے ہونٹ بھینچ لیے مگر صرف چند ثانیے کے لیے، پھر کسی منجھے ہوئے اداکار کی مانند ایک دم اپنے چہرے پر انتہائی خوشامدانہ تاثر پیدا کرتے ہوئے کال ریسیو کرنے والا بٹن پریس کر دیا اور دوسری جانب سے کسی کے بولنے سے پہلے خود ہی لجاجت بھرے شکوے کے انداز میں بول پڑا۔

''سرکار! کوئی ناراضگی ہے ہم غریب لوگوں سے، ہم تو آپ کے تابعدار ہیں، آپ ہی کا دیا ہوا کھاتے ہیں، سرکار! ہمیں بلا کر خود ہی اپنے ہاتھوں سے جوتے مار لیتے لیکن جو ہوا آپ کے شایانِ شان نہیں ہوا۔''

''کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو بخشن! کہیں دن کو تو چڑھا کر نہیں بیٹھ گئے۔'' دوسری جانب سے کہے گئے اِس جملے میں برتری اپنا آپ دِکھا رہی تھی۔

''ناں سرکار! میری مجال جو پی کر آپ سے بات کروں، میں تو ہاتھ جوڑے بیٹھا ہوں بس اَب معافی ہو جائے، آپ کی پسند ابھی آپ کی خدمت میں پہنچانے آجاتا ہوں۔'' حاجی بخشن نے اپنے ہاتھ اِس انداز میں جوڑ لیے کہ جیسے واقعی اُسے دیکھا جا رہا ہو۔

''کیا بکواس کر رہے ہو بخشن! کون سی پسند اور کون سی معافی؟'' بولنے والے کی برتری اب کے رعونت آمیز طیش میں بدل رہی تھی۔

''سرکار! حکم ہو تو میں پانچ منٹ کے لیے آجاؤں! وہیں پیش ہو کر عرض کرتا ہوں۔'' بخشن

کی آواز میں عاجزی کی انتہا تھی۔ دوسری جانب ایک لمحے کے لیے خاموشی رہی۔ اُس کے بعد ایک مختصر سا جملہ کہ چار بجے آجاؤ اور پھر کال بند ہو گئی۔

حاجی بخشن نے غصے میں فون ایک طرف پھینکا اور منہ میں بھری ہوئی ننگی گالیوں کو قے کے سے انداز میں باہر اُگل دیا۔ ''بھڑوا پچھواڑا امرا امرا کے آج اگر وزیر اعلیٰ کا مشیر بن گیا ہے تو اپنی ہی سنگت کو خصی کرنے پر تُل گیا ہے، کیا ہوا کہ اِس کی پسند کی گشتی رُباب کو اپوزیشن کے ایم پی اے نادر خان کے پاس بھجوا دیا تو اُس کا مطلب یہ نہیں کہ میرے کیے کرائے اور لاکھوں کروڑوں کے کاروبار کی منجی ٹھوک دی جائے، کوئی نکاح میں تھوڑی تھی اِس ملک یاور بختیار کے، ابھی اِسے فتح گڑھ کی چھوٹی سیٹ سے میں نے خرچہ کر کے ایم پی اے بنوایا، پارٹیاں کیں، مجرے کرائے، شرابیں لٹائیں اور پھر چٹی دے کرا سے مشیر بنوایا مگر یہ کنجر کا بچ، نمک حرام میرے ہوٹل پر پولیس کا ریڈ کرا رہا ہے، اِس کی اگر ایک ہی فلم نیٹ پر چلا دوں تو پھر دیکھتا ہوں کتنے دن چلتی ہے مُشیری۔'' شدید غصے کے باعث بخشن کی باچھوں سے جھاگ بہنے لگی تھی۔

ملک یاور بختیار کے رعونت بھرے لہجے اور لاتعلقی کے بھونڈے انداز سے حاجی بخشن کو یقین ہو چلا تھا کہ ریڈ واقعی اُسی نے کرایا ہے ورنہ ابھی تک تو اُس نے اپنی چھٹے گویڑ کی بنیاد پر اندازہ لگایا تھا کہ اِس کارروائی کے پیچھے لازماً کوئی اتنا طاقت ور شخص ہے کہ جس کے دباؤ کے سامنے نہ صرف پولیس اور انتظامیہ بے بس ہو گئی بلکہ اِن دونوں محکموں میں اُس کے چھوڑے ہوئے پالتو مخبر بھی بے خبری کا شکار رہے۔

حاجی بخشن نے گھڑی پر وقت دیکھا۔ ابھی دوپہر کے پونے دو ہوئے تھے۔ جب کہ ملک یاور بختیار کے فارم ہاؤس تک کا فاصلہ لگ بھگ ایک گھنٹے کا تھا۔ یکا یک اُسے خیال آیا کہ رُباب کے پہنچنے یا نہ پہنچنے کا ابھی تک اُسے کچھ بھی نہیں بتایا گیا تھا۔ اب تو ملک یاور سے بھی تذکرہ ہو چکا کہ وہ اُسے ساتھ لے کر وہاں پہنچ رہا ہے۔ گو کہ اِس پیشکش پر بھی ملک نے کسی قسم کا کوئی تاثر یا ردِعمل نہیں دیا تھا لیکن وہ ملک یاور بختیار کی رگ رگ سے واقف ہونے کے علاوہ اُس کے گھٹیا پن کی تمام سطحوں کا بھی بھیدی تھا۔ لیکن جب فیض کریم کی جانب سے دو بجنے پر بھی رُباب کے نہ پہنچنے

کی خبر ملی تو اُس کا غصہ ایک بار پھر غضبناک ہو گیا۔ مغلظات کی ایک اور بوچھاڑ اُس کے منہ سے نکلی اور رضوان ہاشمی کی محرمات سے اُس کے کئی ناجائز تعلق علامتی طور اُستوار ہوتے چلے گئے۔ طیش کے عالم میں اُس نے دور پھینکا ہوا موبائل فون اُٹھایا اور پہلے سے کی جا چکی کالز کی فہرست میں سے ری ڈائل کے لیے رضوان ہاشمی کا نام تلاش کرنے لگا۔

یہ انتہائی نازک لمحہ تھا۔ فیض کریم جانتا تھا کہ حاجی بخشن کے رضوان ہاشمی سے طویل عرصے کے تعلق کے باوجود یہ ایک کاروباری تعلق تھا جس میں خلوص اور دیانت ایک حد تک ہی پنپ پاتے ہیں۔ ایسے میں اُس سے کسی بھی قسم کی مزید سخت گفتگو یا گالم گلوچ کسی اَن دیکھے نقصان کا باعث بھی ہو سکتی تھی، خاص طور پر اِن حالات میں کہ جب چہار جانب مخالفانہ فضا کے سبب سارے سَتی کا گماں ہو رہا تھا۔ طالع اِس قدر برگشتہ کہ سونا بھی ہاتھ لگانے سے مٹی ہونے لگا تھا۔ اِس سے پہلے کہ حاجی بخشن ری ڈائلنگ کا بٹن دباتا فیض کریم ہاتھ جوڑ کر اُس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''سرکار! وکیل صاحب کو فون کرنے سے پہلے میری ایک گزارش سن لیں، صرف ایک گزارش!''

حاجی بخشن نے نخوت اور طیش کے عالم میں فیض کریم کو دیکھا اور گردن جھٹک کر نظر انداز کر دیا۔ فیض کریم اُس کے قدموں میں بیٹھ گیا اور پاؤں پکڑ لیے۔

''سرکار! وکیل صاحب کو ابھی فون نہ کریں، جبار کو میں اُس کے نطفے سے جانتا ہوں، بہت حرامی ہے وہ! اُسی نے کوئی چالاکی کی ہے، میں نے بہت مہا حرامی قسم کے شکرے اُس کے پیچھے لگا دیئے ہیں، وہ ہمیں دھوکا دے کر کہیں نہیں بھاگ سکتا، آپ کی طبیعت ٹھنڈی ہو جائے تو پھر وکیل سے بات کر لیں، رُباب بے چاری نے بھاگ کر کہاں جانا ہے۔''

''لیکن یہ کام اکیلے جبار کا نہیں مجھے تو یہ سارا کھیل وکیل ہی کا لگتا ہے، میں کرتا ہوں اِس کا بندوبست، ساٹھ لاکھ دو دنوں میں دے بیٹھا ہوں اور پھر یہ حرامی پن بھی میرے ساتھ! اگر میں نے ابھی اس کی کھٹیا کھڑی نہ کی تو آگے جا کر یہ میرے تھوک کے ساتھ میری مار کے رکھ دے گا۔'' حاجی بخشن نے اپنے پاؤں فیض کریم کے ہاتھوں سے چھڑوا لیے۔ وہ پھر ہاتھ جوڑ کر اُس کے

سامنے کھڑا ہو گیا۔

''سرکار! وقت دیکھیں وقت کے تقاضوں کو سمجھیں، جس کاروبار پر ہمارے دشمنوں نے وار کیا ہے وہ تو آپ کے کاروبار کا چالیسواں حصہ بھی نہیں، اس کام سے ہمیں کیا بچتا ہے، ہمیں تو اُس کام سے لاکھوں کروڑوں بچتے ہیں کہ جو کسی کے علم میں بھی نہیں یا اگر علم ہے بھی تو اُسے چھیڑنے کی سکت اور ہمت نہیں، دوستوں کو دشمن بنا کر دشمنوں کا حلقہ اتنا وسیع نہ کریں کہ کل کو ایک مٹھ ہو کر وہ خدانخواستہ آپ کے اصل کاروبار کو بھی نشانے پر رکھ لیں۔''

فیض کریم کے منت ترلے کا اتنا اثر تو ضرور ہوا کہ بخشن کے چہرہ کا تناؤ آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ اُس کا حوصلہ کچھ اور بڑھا اور وہ حاجی بخشن کے سامنے میز کی دوسری طرف آ کر اپنی کہنیاں لگا کر جھکتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بولا۔

''سرکار! رُباب جیسی لڑکیوں کا کیا ہے آڈی مارو تو دس نکل آتی ہیں بھوئیں سے، ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت اور چسولی، ملک یاور کے لیے کوئی ایسا دانہ ڈھونڈیں گے کہ وہ رُباب کو بھول جائے گا، آپ اُس گشتی کے لیے پوری لنکا نہ ڈھائیں بلکہ جتنا چھپر پھٹا ہے اُسے مرمت کرانے کی سوچیں۔''

''اوئے بھڑوے! تو مجھے عورت کی سائنس سمجھا رہا ہے، مجھے! جس نے عورت کے سمو سے سے کروڑوں اربوں کی بادشاہی کھڑی کی ہے، عورت کی کس کس جگہ پر کتنے بال ہوتے ہیں، میرے بھیجے میں اُن کی پوری جنتری ہے، تجھے کیا خبر کہ کونسی چسولی ہے اور کون سی رسولی اور رس بھری، تو رُباب کی چس کو نہیں جانتا اور نہ ہی اُس کسک اور تڑپ کو جانتا ہے کہ جو وہ اپنے ساتھ بستر پر سونے والے کو دے کر جاتی ہے، معاملہ اتنا سادہ نہیں، معاملہ نادر خان اور ملک یاور بختیار کی باشت کا ہے، حسد کا ہے، اور سب سے بڑا چڑ کہ ملک یاور کو تو نے مجھ سے پوچھے بغیر اُس گشتی کو ڈرائیوروں کے سہولت خانے میں بٹھا کر لگایا ہے، اگر نادر خان کی طرح یاور بھی اپوزیشن میں ہوتا تو اتنی بھڑکی نہ کھاتا، مسئلہ تو اُس کی مُشیری کا ہے جو اُسے دلوائی میں نے ہے اور وہ کنجر کا بیج اُسے استعمال بھی میرے اوپر کر رہا ہے۔''

''لیکن سرکار! جو بھی کریں کچھ اس طرح کا کریں کہ یہ مشکل وقت گزر جائے اور گزرے بھی آپ کی مرضی سے۔'' فیض کریم سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا لیکن ہاتھ ابھی تک جوڑ رکھے تھے۔

ٹھیک چار بجے حاجی بخشن کی پراڈو ملک یاور بختاور کے ڈیرے کے اندرونی حصے میں بنے ہوئے فارم ہاؤس کے مین گیٹ پر تھی۔ ڈیرے کے صدر دروازے کے برعکس یہاں پولیس کی بجائے اُس کے ذاتی گارڈز سیکورٹی ڈیوٹی پر تھے۔ ملک یاور بختاور کے مشیر بننے سے پہلے حاجی بخشن کی گاڑی اُس کے اندرونی پورچ تک جاتی تھی لیکن آج انھی گارڈز نے اُسے گاڑی وہیں پارک کر دینے کا اشارہ کر دیا۔ حاجی کو اپنے کھولاؤ پر قابو پانے میں اگرچہ دقت ہو رہی تھی لیکن پھر بھی اُس نے ڈرائیور کو گاڑی وہیں روکنے کو کہا اور لمبی لمبی سانسیں لیتا ہوا گاڑی سے اتر گیا۔

بخشن کا خیال تھا کہ اُسے پہلے کی طرح اندرونی ڈرائینگ روم میں بٹھایا جائے گا کہ جس کی وسعت بہت بڑی بڑی ڈانس پارٹیوں کے لیے کافی ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن آج ملازم اُسے باہر لان میں بنی ہوئی نو تعمیر شدہ چودری میں لے آیا کہ جس کے چاروں دروازے دبیز شیشے کی دہری تہہ سے بند کیے ہوئے تھے۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی ہونے لگی تھی لیکن چودری کا اندرونی درجہ حرارت بہت بہتر تھا۔ ہلکا ہلکا گرم اور سکون آور۔ سکون کا احساس اس لیے بھی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا کہ شیشوں کے اُس پار چاروں جانب پھیلی ہوئی سبز گھاس اور جوبن پر آئے ہوئے زرد پھولوں کے تختوں نے جادو جگا رکھا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ حاجی بخشن کو اپنی ہتک محسوس ہو رہا تھا۔ اُسے اپنے خاص ڈرائینگ روم میں نہ بٹھایا جانا واضح پیغام تھا کہ ملک یاور بختاور اُس سے فاصلہ کر چکا ہے اور اب کسی قسم کی منت سماجت فضول تھی۔ حاجی بخشن نے سر کو جھٹکا دیا اور وہاں رکھی ہوئی چار کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ وہ طے کر چکا تھا کہ شطرنج کی بساط بچھا کر آج بازی کچھ اس طرح آغاز کرنی ہے کہ مات دشمنوں کا مقدر بن جائے۔ اُسے بچپن میں اپنے باپ کے بوڑھے دوست کی کہی ہوئی ایک بات بہت یاد آ رہی تھی جو اُسے کسی ہندو برہمن نے سنائی تھی کہ اپنے قاتل کو تو بھلے معاف کر دیا جائے لیکن جو تمھاری روٹی روزی کا دشمن ہو اُسے کوئی معافی نہیں۔

ملک یاور بختاور نے چودری میں آتے آتے اُسے آدھا گھنٹہ مزید انتظار میں رکھا۔ صبر کی

اِس آزمائش کے دوران کئی بار بخشن کا حوصلہ جواب دے جاتا رہا لیکن وہ پھر بھی اپنے قدموں پر قائم رہا۔ ملک یاور بخناور آیا بھی تو اُس کا آنا نہ آنے کے برابر تھا۔ آج وہ اُس کا جوئی وال ملک بخناور نہیں بلکہ وزیرِاعلیٰ کا مُشیر ملک یاور بخناور تھا۔ بخشن اندر سے بجھ کر رہ گیا۔ اُس نے تو ملک کو اِس لیے مشیر بنوایا تھا کہ وہ اُس کے دھندوں کی اُسی درجے کی سرپرستی کرے گا کہ جس درجے کے اُس سے مفاد لیا کرتا تھا۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ وہ چند ہفتوں میں اپنے خاص طور طریقوں سے وزیرِاعلیٰ کے اتنے قریب چلا جائے گا کہ اِس علاقے کے سیاہ وسفید کا مالک بن بیٹھے گا۔

اپنی اندرونی ٹوٹ پھوٹ کو چھپاتے ہوئے حاجی بخشن نے واسکٹ کی اندرونی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اُٹھ کر بڑے ادب سے اِس طرح میز پر ملک کے سامنے رکھا کہ پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں کی چار گڈیاں باہر کو جھانکنے لگیں۔ ملک یاور اُس کی اِس حرکت کا نوٹس لیے بغیر ٹکٹکی باندھے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس کے چہرے اور آنکھوں سے لاتعلقی آمیز حقارت ٹپک رہی تھی۔ بخشن دوبارہ اپنی نشست سنبھال چکا تو اُس نے ہلکے سے تجسس سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر نگاہیں بخشن کے چہرے پر گاڑ دیں۔ وہ جان گیا کہ ملک یاور بخناور نہ پوچھ کر بھی اُس سے کیا پوچھنا چاہتا ہے، لیکن پھر بھی خاموش رہا۔

بخشن رباب کے لطفِ وصال کی آتش سے بھی آشنا تھا اور ملک یاور کی بھڑکی ہوئی خواہش کے لبریز ہو چکے پیمانے کو بھی چھلکتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ رباب کے دہکے ہوئے وجود میں کچھ اِس طرح کی حدت تھی کہ اُس سے جسمانی اتصال مرد کو باؤلا کر دیتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا کہ وہ مردوں سے مرد ہونے اور مردانگی بگھارنے کا انتقام لیتی تھی۔ وہ اپنے اِس اتصال کے ذریعے مرد کو پیش رفت کا موقع دیے بغیر خود ہی اِس انداز میں پہل کرتی کہ پل بھر میں اُس کا سرکشی پر آمادہ نفس فتح یابی کے خواب دیکھتا دیکھتا، مفتوحین میں شمار ہو چکا ہوتا۔ کھولتی ہوئی چاشنی میں بھاپ ہوئے گلاب جامن کی طرح وہ اپنا آپ جتلائے بغیر ہونٹوں سے مَس ہوتے ہی ذائقہ بن جاتی، حلول ہو جاتی۔ اُسے مردوں کی مردانگی کو اپنے بس میں کرتے ہوئے پچھاڑنے کا ہنر آتا تھا۔ کچھ

اپنی سرشت اور کچھ تجربات کے بعد وہ جان چکی تھی کہ مرد ایسی عورت کو کبھی نہیں بھلا پاتا کہ جو اُسے بستر میں رگیدے، ہلکان کرے اور نچوڑنے کی بجائے نچوڑ کر رکھ دے۔ جب وہ پہلی بار بخشن کے ہاں آئی تو خمیر میں تلاطم تو تھا لیکن تجربہ نہیں تھا لیکن پھر بھی کئی دن وہ اس کے سرور میں مدہ ماتا رہا۔ ایک عرصے کے بعد کوئی ایسی عورت اس کے حلقہ کار میں آئی تھی کہ جس کی طرح میں شدتِ اتصال اور اُس کا بے باک برتاؤ کڑک سے کڑک مرد کو بھی اُس کے جنون میں مبتلا کر سکتا تھا۔ ایسا جنون کہ جو حواس کے ساتھ ساتھ تخت اور بخت سے بھی محروم کر دے۔ اُس نے رباب کو احساس دلائے بغیر کہ اُس میں کیا کیا گُن اور کون کون سے جوہر جزوِ ہستی ہیں، باقی لڑکیوں سے الگ کر لیا۔ اب وہ خاص موقعوں اور خاص لوگوں کے سکون کو جنون میں منقلب کرنے کے لیے مختص ہو چکی تھی۔

اگرچہ ملک یاور کا رعونت سے لت پت یہ رویہ حاجی بخشن نے پہلی بار دیکھا تھا مگر اس قسم کے رویے اُس کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ زندگی میں بارہا وہ بہت سے کم ظرف لوگوں کے کم ظرفی کے ایسے ایسے مظاہرے دیکھ چکا تھا کہ جن کے سامنے ملک یاور اناڑی دکھائی دے رہا تھا۔ حاجی بخشن جانتا تھا کہ ملک کے سینے میں رُباب کے فراق کی آگ دہکی ہوئی ہے اور اُسے کسی پل قرار نہیں لیکن ملک بھی اِس کیفیت کو بخشن پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ظاہر ہونے کی صورت میں اُسے یقین تھا حاجی بخشن جیسے گُرگے کو ثبوت مل جاتا کہ اُس کے ہوٹل پر پولیس کا ریڈ اُسی نے کرایا ہے۔ حاجی بخشن نہایت عیاری سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے چاہ رہا تھا تجسس اِس قدر بڑھے کہ ملک یاور خود اُس سے رُباب کے بارے میں پوچھنے پر مجبور ہو جائے۔ لیکن تجسس کے بتدریج بڑھتے جانے کے باوجود اصل موضوع پر اُن دونوں میں سے کوئی نہیں آ رہا تھا، نتیجتاً ماحول خاصی دیر سے بوجھل سا تھا۔

''اکیلے آئے ہو؟'' ملک یاور دل کے بوجھ کو زیادہ دیر نہ سنبھال سکا تو اپنے تجسس کو ایک بے ضرر سا رنگ دینے کی کوشش کی۔

حاجی بخشن کی بچھائی ہوئی بساط پر ملک یاور کو مات ہو چکی تھی۔ اُس نے کسی فاتح کی طرح

باڑی سمیٹی اور چہرے پر ہر ممکن کرب انگیز یبوست طاری کر لی۔ اُس کا شک یقین میں بدل چکا تھا۔ اگرچہ دشمن روبرو تھا مگر پھر بھی اُسے آخری مات دینے کے لیے اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ لیے۔

''چھوہر نادر خان کے پاس ہے۔''

''کون سی چھوہر ا رُباب؟ مگر نادر خان کے پاس کیسے!'' ملک یاور کی آنکھیں ایک دم پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''نادر خان نے ہی تو میرے ہوٹل پر پولیس کا ریڈ کرایا ہے، وہ کب سے اُس لڑکی کے لیے پاگل ہو رہا تھا..... میں بھلا آپ کی چیز اُسے کیسے دیتا؟ اُس حرامی کو جیسے خبر ملی کی رُباب میرے آفس میں ہے تو اُس نے ہوٹل پر ریڈ کے بہانے اُسے بھی میرے آفس سے پکڑوا کر ظاہر یہی کیا کہ وہ ہوٹل میں ''چلنے'' کے واسطے بیٹھی ہوئی تھی۔'' حاجی بخشن کے چہرے پر یبوست نما کرب مزید گہرا ہو چلا تھا۔

''جو لڑکی پولیس ریڈ میں پکڑی گئی وہ رُباب تھی؟'' لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے نوآموزوں جیسی اداکاری ملک یاور کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ لیکن جس بے چینی اور تکلیف سے وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا، وہ اداکاری نہیں تھی۔

''اور کیا ملک صاحب! آپ کی امانت کو پولیس کے شکنجے سے نکالنے کے لیے رضوان ہاشمی کو وکیل کیا، مجسٹریٹ کی عدالت کو آگ لگوائی، ڈی ایس پی اور اے سی کی عدالتوں کا ککھ نہیں چھوڑا، کل سے پورے صوبے میں وکیلوں کی ہڑتال ہونے جا رہی ہے، میں تو تین کروڑ کے نقصان تلے آ گیا آپ کی رُباب کو پولیس کے چکر سے نکالنے کے واسطے، لیکن جو ڈرائیور ہنگامے کے وقت رُباب کو کچہری سے نکال کر لے گیا تھا وہ کمزور پڑا تو رُباب کو راستے ہی میں نادر خان کے آدمی لے اُڑے..... اِدھر آپ ناراض، اُدھر میری بھی پونجی برباد..... میں تو کہیں کا نہیں رہا۔'' حاجی بخشن تقریباً رو پڑا۔

''حاجی! یہ رقم اُٹھاؤ اور اَب جاؤ، انتظار کرو اور دیکھو کہ میں نادر خان کے ساتھ کرتا کیا ہوں اور ہاں! تم بھی سُن لو! اگر تمھاری بات غلط نکلی تو ذمہ داری کا بوجھ، سارے کا سارا تم پر ہوگا۔''

۱۷

اِس نئے کھیل کو صاحبزادہ سلطان احمد تونگر سمجھ نہیں پارہا تھا۔ کیا یہ گاجر اور چھڑی کی کوئی صورت تھی یا اُس کے اعصاب کو اِس بری طرح کچل کر کسی بہت بڑی گیم کی منصوبہ بندی کی جا رہی تھی۔ لیکن بات پھر وہی تھی کہ اُس جیسے ایک ریٹائرڈ بیوروکریٹ سے آخر کون سا ایسا مفاد لیا جا سکتا تھا کہ جس پر اِس قدر حربوں سے اتنی زیادہ سرمایہ کاری کی جارہی تھی۔ بات یقیناً کچھ اور تھی کہ جس پر ابھی پردہ ڈلا ہوا تھا۔ یہ پردہ کب اُٹھے اور اُس کے اُٹھنے تک کیا کچھ سامنے آئے، ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

تونگر کی بوکھلاہٹ اور اُلجھاؤ کا سبب جانان کے فون سے زیادہ اُس کا رویہ تھا۔ واضح تھا کہ اب اُس کی ڈیوٹی اُسے لبھانے اور پھر سے اُس دفتر میں ایک بڑی پوزیشن پر بٹھانے کے لیے لگا دی گئی تھی کہ جہاں ایک روز پہلے وہ اُسی کے سامنے اپنی تکریم، تحریم اور پندار سے محروم کیا گیا تھا۔ کیا وہ ایک ایسی عورت کا سامنا کر سکے گا کہ جو نہ صرف اُس کے خلوت کے لمحات بلکہ اُس کی بیوی کے ملک الیاس کے ساتھ جنسی حظ اُٹھاتے ہوئے اُس کے بدن کے ایک ایک اشارے سے آگاہ تھی۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ تونگر کی اِس عمر کی مردانہ صلاحیت اور حیثیت بھی اُس سے ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی تو ایسے میں جانان کا التفات سکرپٹڈ کے سوا کیا کہا جاسکتا تھا کہ جس کے پیچھے اللہ ڈنو عبید کا مکروہ چہرہ جھانک رہا تھا۔

اِس سے پہلے کہ صاحبزادہ تونگر کسی فیصلے پر پہنچ پاتا، جانان کی جانب سے بھیجی ہوئی گاڑی پہنچ گئی۔ اُس نے کئی بار سوچا کہ گاڑی کو واپس بھجوا دے مگر ہر بار یہ خوف دامن گیر کہ انکار کی صورت میں نجانے اِس کا بدلہ کس انداز میں چکایا جائے۔ قوتِ فیصلہ کی مفقودگی اور مسلسل الجھاؤ کے سبب تونگر کے اعصاب جواب دینے لگے تو شوفر کو انتظار کرنے کا پیغام بھجوانے کے بعد وہ تیار ہونے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ بیڈ روم میں جاتے ہوئے اُس کا سامنا ناہید سے ہوا۔ اُس کے چہرے پر پھر وہی رعونت، کدورت اور اجنبیت، اِس کے باوجود تونگر کو یوں لگا کہ جیسے وہ اُس سے

کچھ کہنا چاہ رہی ہو کہ آج کل یہ کیا چل رہا ہے، کہاں آنا جانا ہو رہا ہے لیکن وہ کوئی بھی بات کیے بغیر پاس سے گزر گئی۔ تونگر کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی ناہید ہے کہ جو شادی کے بعد کے کچھ برسوں میں نہ صرف اُس سے چپکی رہتی بلکہ اِدھر اُدھر کا پوچھ پوچھ کر اُسے زچ کر دیتی۔ پھر جب یہ فاصلہ بڑھنا شروع ہوا تو تونگر نے سمجھا کہ شاید وہ جذباتی پختگی کی طرف آ رہی ہے لیکن اب تاسف تھا، ملال تھا اُسی وقت جان لینے کا کہ یہ عمر کے ساتھ در آنے والی پختگی نہیں تھی جو اُن دونوں کے بیچ خلیج بن کر حائل ہو رہی تھی بلکہ کوئی اور تھا جس نے اپنا وجود اُن دونوں کے درمیان پھانسے کی طرح پیوست کر رکھا تھا۔

کچھ باتیں مرد کی سمجھ میں اُس وقت نہیں آتیں کہ جب اُن کا سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ اُن باتوں میں سرفہرست عورت کا جنسی میلان، ہیجان اور اُس کے فطری تقاضے ہوتے ہیں۔ مرد اُنھیں اپنی خودساختہ ذہنی اور جسمانی برتری کے سبب ہر عمر میں عورت کی ناپختگی سمجھ کر نظرانداز کرتا رہتا ہے۔ عورت کا کسی خاص مرد پر اپنا آپ نچھاور کرنا اُس کی جذباتی وابستگی اور پختگی کی انتہا ہوتی ہے۔ وہ تو عمر کے ہر حصے میں جب بھی کسی مرد کو اِس قابل سمجھتی ہے اُس پر یونہی والہانہ انداز میں اپنا آپ تصدق کرتی ہے لیکن مرد اُس کی جانب سے دھتکارے جانے کے رویے کو بھی اُس کی جذباتی پختگی سمجھ کر ہواؤں میں اُڑتا ہے کہ اب اُس نے عورت کو زیرِدام کر لیا۔ مرد کبھی سمجھ ہی نہیں پاتا کہ اِس طور زیرِدام آئی ہوئی عورت وجودی اعتبار سے ہوتی تو اُسی کے پاس ہے لیکن جسمانی اختلاط کی تمام حسیات اور اپنا آپ سمیٹ کر کب کی کہیں اور جا چکی ہوتی ہے۔ سوچوں کے اِس گرداب میں چکراتا ہوا تونگر روہانسا ہو گیا۔

اُسے کچھ یاد نہ رہا کہ کب وہ تیار ہوا اور کب گاڑی میں بیٹھا، حواس تب بحال ہوئے جب اللہ ڈنو کے فارم ہاؤس میں بنے ہوئے آفس کے پورچ میں گاڑی رُکی اور وہاں انتظار کرتی ہوئی جانان نے آگے بڑھ کر نہ صرف گاڑی کا دروازہ کھولا بلکہ اُس کا ہاتھ تھام کر اُسے گاڑی سے باہر آنے میں مدد دی۔ آج بھی وہ نیوی بلیو پینٹ کوٹ میں ملبوس اور خوشبوؤں میں نہائی ہوئی تھی۔ تونگر کے گاڑی سے باہر آنے کے دوران اُس نے اپنے سینے کا دایاں اُبھار عمداً تونگر کے بازو سے مَس

کیا۔ اپنی اس بے ربط کیفیت اور پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ بھی وہ اتنا ضرور جان گیا کہ جانان نے اندر سے اِن اُبھاروں کو غیر ملبوس رکھا ہوا ہے۔ اس قسم کے حالات میں اس نوعیت کے استقبال نے اُسے اتنا خوفزدہ کیا کہ تونگر کا اپنے پاؤں پر کھڑا رہنا محال ہو گیا۔ جانان نے تونگر کی پریشانی کو بھانپ لیا اور من ہی من میں اپنے عزائم کی کامیابی کا لطف لیتے ہوئے اُسے مزید امتحان میں ڈال کر مکمل ناک آؤٹ کرنا چاہا۔ اُس نے چہرے پر اضطراب کی کیفیت طاری کرتے ہوئے سہارا دینے کے انداز میں اپنا دایاں بازو تونگر کی کمر میں حائل کرتے ہوئے بائیں ہاتھ سے اُس کا بایاں بازو تھام لیا۔

تونگر کے لیے یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع تھا کہ سراسیمگی کے عالم میں اُس نے فوراً اِدھر اُدھر دیکھا۔ شوفر گاڑی لے کر جا چکا تھا۔ پورچ میں اُن کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ تونگر نے ہولے سے اپنے آپ کو جانان کی مدارت سے اِس طرح آزاد کیا کہ اُسے محسوس ہی نہ ہو۔

"خیال کیجیے! ابھی آپ کو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہمارا سہارا چاہیے ہو گا۔" جانان کی مسکراہٹ اپنی دل آویزی سمیت واپس آ چکی تھی۔ لیکن تونگر کسی بھی قسم کا ردِعمل دیئے بغیر پورچ سے راہداری تک کی تین سیڑھیاں چڑھ گیا۔ جانان بھی کھل کھلاتی ہوئی اُس سے ایک قدم کا فاصلہ رکھتے ہوئے اوپر آئی اور اُسے کل کے راستے کی اُلٹی سمت ایک اور خوبصورت راہداری میں لے آئی جس کے آخری سرے پر ایک دروازہ کھلا اور وہ دونوں ایک انتہائی نفاست سے سجے ہوئے ایگزیکٹو آفس میں تھے۔ صاحبزادہ تونگر نے بے اختیار ایک لمبی سانس لی جس میں اطمینان جھلک رہا تھا۔

"یہ ہے سر آپ کا آفس!"، جانان چہچہائی، "اور ہم رہے آپ کے غلام۔"

صاحبزادہ تونگر نے بظاہر ایک بار پھر سُنی ان سُنی کر دی لیکن دراصل وہ جانان سے آنکھ ملانے سے کترا رہا تھا۔ بھلا کیا عزت ہو سکتی تھی اُس کے لیے جانان کے دل میں کہ جس کی بیوی کی شرمناک ویڈیوز خود اُس کے قبضے میں ہوں اور اُس نے اپنے باس کے حکم پر اپنی موجودگی میں اُس کی نمائش بھی کی ہو۔ اگر کوئی شخص ناہید سے جبراً زنا کا مرتکب ہوتا تو پھر بھی کوئی بات تھی لیکن جس

مستی اور جس جنون سے وہ اپنی جنسی جبلت کو الیاس کے ساتھ وحشیانہ انداز میں تسکین دے رہی تھی، وہ اُس کی بدچلنی اور عیاش طبع ہونے کی واضح دلیل تھی۔ شاید وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ جانان جو اُسے چوتیا بنائے جانے کی مکمل منصوبہ بندی سے آگاہ ہے اُس کے بارے میں کیا سوچتی ہوگی کہ یہ سالا دوکوڑی کا بیوروکریٹ جو ایک عرصے تک عوام کو پھنے خانی دکھاتا رہا ہے، اب اپنی باری پر پچھواڑے سے پلو اُٹھا کر اُلٹا لیٹ گیا ہے۔ وجہ جو بھی رہی ہو لیکن حقیقت یہی تھی کہ تونگر ایک بار پھر اُن لوگوں کے رحم وکرم پر تھا کہ جو اُسے استعمال تو کرنے جا رہے تھے لیکن کب، کہاں اور کیسے، اسے ابھی صیغۂ راز میں رکھا ہوا تھا۔

''بیٹھیے ناں سر! آپ نجانے کیا سوچے جا رہے ہیں۔'' جانان ایک ادا سے اُس کے قریب آئی اور پھر سے اُس کا بازو تھام کر آفس ٹیبل کے پیچھے رکھی ایگزیکٹو ریوالونگ چیئر کی جانب لے جانے لگی۔ اُس کے لباس کی جنبش اور بدن کے لوچ سے جتنی بھی خوشبوئیں جاگ سکتی تھیں، ایک دم سے بیدار ہوئیں اور تونگر کے مشامِ جاں کو مہکاتی چلی گئیں۔ اب کے تونگر نے خود کو جانان کی گرفت سے چھڑانے کی بجائے خلافِ توقع پلٹ کر جانان کے دونوں بازوؤں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔ تونگر کی اس اچانک حرکت سے جانان بوکھلا گئی۔ اُس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے تونگر کی طرف دیکھا جو خود اُس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے ہوئے تھا لیکن کسی بھی تاثر سے یکسر عاری۔ جانان تھوڑا سا کسمسائی مگر چند ہی لمحوں میں اپنے خوف کو مسکراہٹ میں بدل لیا۔

''اچھا تو لاتعلقی کا سب ڈراما تھا، آپ تو ابھی تک پوری فارم میں ہیں، لیکن ایسی جلدی بھی کیا! ہم تو ویسے بھی آپ کے غلام ہیں۔'' جانان نے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔

''لڑکی! تو مجھ سے چاہتی کیا ہے، بتاتے کیوں نہیں تم لوگ کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟'' صاحبزادہ تونگر نے جھنجلاہٹ میں جانان کو جھنجوڑا اور پھر سر جھٹکتے ہوئے اُس کے بازوؤں کو چھوڑ کر ایک طرف صوفے پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔

جانان پہلے تو سُن ہو کر تونگر کی طرف دیکھتی رہی۔ اُسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ مایوسی اور مردنی کا شکار یہ بوڑھا اس طرح بھی جارحیت پر اتر سکتا ہے۔ وہ خوف زدہ نہیں بلکہ حیرت سے متحیر

تھی کہ اُس کا جادو اِس قدر سرعت سے مردہ مردوں کی منجمد حسیات میں تلاطم برپا کر سکتا ہے۔ طمانیت کا یہ احساس اُسے پھر سے اپنے آپ میں لے آیا اور ایسے میں نجانے کیا سوچ کر وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھی اور اُس کے کندھے سے لگ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ تونگر اُس کے اس طرح صوفے پر بیٹھنے سے قطعی لاتعلق، روہانسا ہوا اُس کے چہرے کی مخالف سمت خالی آنکھوں سے دیوار کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ کافی دیر گزر گئی، وہ دونوں یونہی بیٹھے رہے۔ صاحبزادہ تونگر کو جذباتی طور پر رو ہو چکے ہونے کے اِس مرحلے سے نکلنا تھا جب کہ اُس کی اِس کیفیت کا ادراک جانان کو بھی بخوبی تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی، جنبشوں کے جمود اور ایک فہیم دلربا دوشیزہ کے ملبوس لمس نے تونگر کو اندر تک سے مسمرائز کرنا شروع کر دیا تھا۔ تونگر کے جسم کا تناؤ کچھ ڈھیلا ہوا تو اُس کی آنکھوں کے غلاف نیچے گرنا شروع ہو گئے۔ یہ وہ لمحہ تھا کہ جب جانان نے تونگر کا اپنی طرف والا بایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور کبھی اُسے ہلکا ہلکا دبانے لگی اور کبھی سہلانے۔ تونگر کی مزاحمت قطعی طور پر ختم ہو چکی تھی۔

اتنے سے اتصال کو برقرار رکھتے ہوئے وہ کمال آہستگی سے اِس طرح اُٹھی کہ تونگر کا بایاں ہاتھ اُس کے ہاتھ میں رہا۔ بازو میں کھنچاؤ محسوس ہوا تو تونگر نے بھی آنکھیں کھول دیں اور کھوئے کھوئے انداز میں جانان کی طرف دیکھا۔ جانان نے اُس کے بازو کو اپنی طرف ہلکا سا کھینچتے ہوئے اُٹھنے کا اشارہ کیا تو تونگر کسی روبوٹ کی طرح اُٹھا اور اُس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ایگزیکٹو چیئر کی طرف آیا اور کچھ کہے بغیر بیٹھ گیا۔ جانان کی آنکھیں روشنی سے بھر گئیں اور چہرہ کچھ اور دمک اُٹھا۔

''کانگریچولیشن سر! بہت گریس فل لگ رہے ہیں آپ۔'' جانان کی آواز کا ترنم پورے رچاؤ میں تھا لیکن تونگر کا چہرہ پرسکون ہو کر بھی ہر قسم کے تاثرات سے عاری دکھائی دے رہا تھا۔ جانان میز کی دوسری جانب درمیان میں رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ چند ثانیے تو اُس نے تونگر کی جانب سے کسی عمل یا ردِعمل کے انتظار میں گزارے لیکن حالات کو جوں کا توں پا کر اُس نے میز پر رکھی بیل کو پریس کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہی کل والی لڑکی، اُنہی سہمی ہوئی اداؤں اور اُسی ترتیب سے

کافی اور دیگر لوازمات لیے کمرے میں داخل ہوئی اور اُسی انداز میں اپنا کام کرنے کے بعد کمرے سے باہر چلی گئی لیکن جاتے ہوئے جس انداز سے اُس نے جانان کو پشت سے اور صاحبزادہ تونگر کو آنکھ بھر کر دیکھا، اُس میں بہت کچھ تھا، کہنے کو بھی اور سمجھنے کو بھی لیکن اُس کا یہ دیکھنا دونوں نہ دیکھ سکے۔ اب کمرے میں پھر سے وہ صرف دو ہی تھے، کہنے کو بھی بہت کچھ تھا لیکن جو کچھ وہ دونوں کہنا چاہ رہے تھے، اُس طرح کہہ نہیں پا رہے تھے۔

گرم گرم کافی کی خوشبو نے تونگر کے منجمد اعصاب کو مہمیز کیا تو کچھ دیر کے بعد ہی اُس کے چہرے پر یبوست کی جگہ بشاشت نے لے لی۔ جانان کی طرح داری میں گھمنڈ تو پہلے بھی تھا مگر اُس میں اب فاتحین جیسا متکبرانہ رنگ ڈھنگ بھی جھلکنے لگا تھا لیکن اسے وہ کمال خوبی سے عاجزی میں منقلب کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اتنے میں تونگر نے کافی کی پیالی ایک طرف کی اور بے جھجک ہو کر اپنی نگاہیں جانان کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ اُس کی آنکھوں میں کسی منجھے ہوئے بیوروکریٹ جیسی گہرائی تھی جس میں بہت سے سوال نوک دار بھالوں کی صورت باہر کو جھانک رہے تھے۔ تونگر کا ذہن بیدار ہوا تو چہرے پر بھی جلال میں گندھی ہوئی منافقت ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گئی۔ وہ اب اپنی جون میں واپس آنے لگا تھا کہ جس کے پس منظر میں تیس پینتیس برس کی حاکمیت کی خصلت ہویدا ہو رہی تھی۔ جانان نے اپنی کارپوریٹ زندگی میں اِس قسم کا چہرہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ جس پر بیک وقت اتنے سارے تاثرات ہوں۔ جس صاحبزادہ سلطان احمد تونگر کو وہ کل سے دیکھتی چلی آ رہی تھی، یہ شخص تو اُس سے یکسر اور قطعی مختلف تھا۔ کہاں وہ رسوائیوں سے گھائل، مایوس اور ہزیمت زدہ شخص کہ جس کے اعصاب اُس کے اعتماد کو سہارنے سے قاصر تھے اور کہاں یہ اپنے آپ میں شکوہ کو جلوہ افروز کرتا ہوا تمکنت انداز چہرہ کہ جس کے جسمانی تکلم میں بھی کسی بدطینت و بے رحم حملہ آور جیسا کر و فر تھا۔ جانان گھبرا کر رہ گئی۔

لیکن تونگر کی یہ کیفیت محض کچھ دیر کے لیے رہی۔ چند ثانیے کے بعد اُس کا چہرہ پھر سے نرم اور پر سکون ہوتا چلا گیا جس پر نہ تو پہلے جیسی شکست و ریخت تھی اور نہ کچھ دیر پہلے والی نخوت اور بے رحمی۔ جانان کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اِس شخص سے کیا بات کرے جو اُس کے سامنے اِس قدر

تذلیل کا سامنا کرنے کے بعد بھی ایک عجیب سے کروفر اور دھج کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ جانان کے نزدیک یہ شخص اُن کے مقاصد کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ وہ فوری طور پر اللہ ڈنو عبید سے رابطے کی خواہاں تھی لیکن ایسے میں اُس کا فوری طور اُٹھ کر باہر جانا صاحبزادہ تونگر کے بھروسے کو کاری نہ سہی مگر ضرب ضرور لگا سکتا تھا۔ سواُس نے وہیں بیٹھے رہنے کا فیصلہ کرلیا۔ اپنی بے چینی پر قابو پانے کے بعد جانان مسکرائی۔

''آپ کافی اور لیں گے تونگر صاحب! مجھے تو شدید طلب ہو رہی ہے۔''

''حیرت ہے! آپ کی طلب کافی چکا دیتی ہے۔''

''آپ حکم کریں، ہم تو ویسے بھی آپ کے غلام ہیں۔'' جانان نارمل ہونے کی کوشش میں پھر سے مسکرانے لگی تھی۔

''جو میں پوچھتا ہوں آپ وہ بتاتی نہیں، جو میں چاہتا ہوں آپ وہ پلاتی نہیں تو یہ غلام ہونے کی مجھے سمجھ نہیں آئی۔'' تونگر کے چہرے پر پھر سے وہی جلال آمیز نخوت جاگنے لگی تھی جب کہ آنکھوں میں شرارت تھی، کمینگی یا پھر شہوت، جانان کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''یہ شخص کہیں اُس کے ساتھ کھیل تو نہیں کھیل رہا۔'' لیکن جانان نے ذہن میں آیا یہ خیال فوراً ہی جھٹک دیا۔ ''وہ میرے ساتھ کیوں کھیلے گا، وہ تو خود قابلِ رحم کے قابل ہے، اُس کے پاس بچا ہی کیا ہے، عمر بھر کا کمایا ہوا کچھ بھی نہیں، نہ بیوی، نہ دولت اور نہ ہی اولاد، جس شخص کی آخری عمر کی توقیر یا تذلیل باس کے پاس رکھی سینکڑوں ویڈیوز میں سے بس کسی ایک ویڈیو کے سوشل میڈیا پر اپ لوڈ ہونے یا نہ ہونے پر منحصر ہو وہ کیسے اکڑ سکتا ہے خاص طور پر میرے سامنے کہ جس نے اُس کی بیوی کا بھی سبھی کچھ اُس کی موجودی میں، اُس کی نظروں کے سامنے دیکھ رکھا ہے لیکن پھر بھی اس کا اعتبار کیا جانا اپنے آپ کو دھوکا دینا ہوگا کہ جس کی تربیت ہی دوسروں کو مشکلات میں ڈال کر خود بچ نکلنے کی رہی ہو تو کیوں ناں! اس کو باس سے ہٹ کر الگ سے ڈھب پر لانے کی کوشش کی جائے؟''

عجیب بات تھی کہ اس دوران صاحبزادہ تونگر کوئی بھی بات کیے بنا صرف جانان کے چہرے

کی طرف دیکھتا رہا جیسے اُس کے ذہن میں آئے ہوئے خیالات جاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ جانان کو صاحبزادہ تونگر کی آنکھیں پھر سے قطعی اجنبی دکھائی دینے لگی تھیں، برمے کی طرح بدن میں گھس کر ہڈیوں میں سے گودا اور کھوپڑی میں سے دماغ نکالتی ہوئیں۔ اِس کے باوجود جانان نے ایک مدھ بھری مسکان کے ساتھ اپنی مست قامت کو لہرایا اور کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پورے بدن کی جوانی آنکھوں میں اُنڈیلی جا چکی تو اُس نے ایک بھرپور نگاہ سے صاحبزادہ تونگر کو مطلوب انداز میں دیکھا کہ جس کا مفہوم اور کچھ بھی نہیں تھا سوائے مکمل حوالگی کے کہ ہم تو آپ کے غلام ہیں۔ صاحبزادہ تونگر نے بھی جانان کے اِس طرح دیکھنے کو دیکھا مگر نظر انداز کر دیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اُس کو کس انداز میں چاروں طرف سے ہانکا جا رہا ہے۔ اُس کی نگاہ اُس گڑھے کو تلاشنے میں سرگرداں تھی جہاں اُس کو گھیر گھار کر گرایا جانا مقصود تھا۔

جانان نے سامنے رکھے فائل کیبنٹ کی دراز کھول کر ایک فائل نکالی، اُس میں لگی دستاویزات کا جائزہ لیا اور پھر ایک چٹ پر کچھ لکھنے کے بعد اُسے فائل میں ایک کونے پر چپکایا اور اُسی اپنے مخصوص مست خرام میں دو تین قدم اُٹھائے اور فائل کھول کر صاحبزادہ تونگر کے سامنے میز پر رکھ کر خود اُس کی داہنی جانب اِس طرح جھکی کہ بدن کا لوچ تونگر کی رگوں میں دوڑتے لہو پر چابک برسانے لگا۔

''صاحب! یہ ہے آپ کا نیا کنٹریکٹ اِس پر آپ کے دستخط ہونا ہیں۔'' جانان کے لب کیا ہلے، خوشبو اُس کے جوار کو مہکاتی چلی گئی۔ صاحبزادہ تونگر نے چاہا کہ کچھ پڑھ سکے، شرائط کا جائزہ لے سکے مگر اِس سے پہلے کہ شعور آگہی دے پاتا، وہ معاہدہ پر دستخط کر چکا تھا۔ جانان نے اُسی انداز میں مسکراتے ہوئے اگلا صفحہ پلٹا جہاں ایک چھوٹی سی چٹ پہ لکھا تھا۔

''بشرطِ رازداری میں آپ سے کچھ اہم بات کرنا چاہتی ہوں، مجھے آج رات ہی ملیے یہی کوئی آٹھ بجے شب میرے اپارٹمنٹ میں، کھانا اکٹھے کھائیں گے۔'' چٹ کے نیچے جانان کا فون نمبر اور پتہ لکھا ہوا تھا۔ صاحبزادہ تونگر نے سر اُٹھایا اور حیرت سے جانان کی طرف دیکھا۔ جانان نے مسکراتے ہوئے دونوں آنکھیں اثبات کے سے انداز میں بند کر لیں۔

۱۸

رضوان ہاشمی فارم ہاؤس کے بیرونی لان میں محض وکلا سیاست کے دوستوں کو فون کرنے کے لیے بیٹھا تھا مگر اَن سُنی فون کالز کی فہرست میں حاجی بخشن کا نام دیکھ کر اُس کا خون کھول اُٹھا تھا۔ دن کے پہلے پہر اُس نے جس طرح اُس کی تذلیل کی تھی وہ بھلائے نہیں بھول رہی تھی۔ اِس بات کی پروا کیے بغیر کہ دور کھڑے اُس کے گارڈز کیا تاثر قائم کریں گے اُس نے کسی مخاطب کے نہ ہوتے ہوئے بھی خود کلامی کے انداز میں بخشن کو طویل بحر کی غیر روایتی گالیاں دینا شروع کر دیں جن کے بیچوں بیچ چھوٹے چھوٹے تمسخر آمیز قہقہے بھی شامل ہو رہے تھے۔

''اے دو ٹکے کے بھڑوے! اب دیکھتے ہیں کہ تو میری وکالت بند کراتا ہے یا میں تیرے کاروبار کی منجی ٹھوکتا ہوں، رُباب کو بھول جا اَب خبیث کے بچے! اب تو اُس کی شکل کو بھی ترسے گا کنجر کے بچے'' کچھ دیر بعد رضوان ہاشمی کے قہقہے تو بند ہو گئے لیکن گالیاں نہ رُک سکیں۔ عجیب وضع کی گالیاں تھیں کہ جن کے ذریعے وہ بخشن کی ممکنہ محرمات سے خلوت کے تعلقات نہایت شدومد سے اُستوار کیے جا رہا تھا۔ کیسی تسکین تھی حاجی بخشن سے گالیاں کھانے کے بعد اُسے گالیاں دینے میں۔ کیا لطف تھا کہ جو اُسے گالی گالی انبساط کے جرعے عطا کیے جا رہا تھا۔ کافی حد تک بھڑاس نکل چکی تو اُسے خیال آیا کہ وکلا سیاست کے اُن بزرجمہروں سے رابطہ کرے جو نہ صرف اُسے اپنا گرو مانتے تھے بلکہ پورے صوبے کے عدالتی اور انتظامی معاملات کو کسی بھی وقت جامد کر دینے پر قدرت رکھتے تھے۔ وہ اب اُس مدار سے باہر نکل چکے تھے کہ جہاں لوگوں سے بات کی جاتی ہے، درخواست کی جاتی ہے، اب وہ اُس مقام پر تھے کہ جہاں جنبشِ ابرو بھی حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ حکم بھی ایسا کہ جس میں سرتابی کی نہ تو مجال اور نہ ہی شائبہ۔

رضوان ہاشمی نے پہلے تو وہ نمبر ملائے کہ جن سے فون کالز آ چکی تھیں یعنی حیدر گوٹھ تحصیل بار کے صدر، شمس پور ڈسٹرکٹ بار کے صدر اور صوبائی بار کونسلز کے کچھ عہدیداران۔ ان سب سے رضوان ہاشمی نے کچھ اِس طرح دردمندی سے بات کی کہ جیسے صوبے کے ہی نہیں بلکہ پورے ملک

کے وکلا کا پروفیشن، اُن کی بقا اور مقصدیت خطرے میں ہو اور اگر یہ ہڑتال نہ ہوئی تو ہزاروں وکیل اور اُن کے بیوی بچے فاقہ کشی کا شکار ہو جائیں گے۔ طے یہ پایا کہ اگلی صبح صوبائی بار کونسل کی کال پر ایک دن کے لیے پورے صوبے میں ہڑتال ہوگی اور اگر معاملات مثبت انداز میں طے نہ ہوئے تو اگلے ہفتے سے یہ ہڑتال غیر معینہ مدت کے لیے ہوگی۔ جب کہ تحصیل حیدر گوٹھ اور ضلع شمس پور کے وکلا ابھی اگلے لائحہ عمل تک مسلسل ہڑتال پر رہیں گے۔ رضوان ہاشمی کی کئی برسوں سے خواہش تھی کہ وہ صوبائی بار کونسل کا تیسری بار مکمل ٹرم کے لیے وائس چیئرمین بنے لیکن اب کے اُس کی یہ خواہش پوری ہوتی دکھائی نہیں دے رہی تھی کیونکہ صوبائی سطح پر وکلا کی ہڑتال کے لیے اُسے موجودہ وائس چیئرمین کی آئندہ بھی اسی عہدے پر رہنے کی شرط کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اِس کے باوجود رضوان ہاشمی کے لیے یہ کسی طور بھی خسارے کا سودا نہیں تھا۔ ابھی تو اُس نے حاجی بخشن اور خوشحال خان کی صورت صرف دو بکرے ذبح کیے تھے، سونے کے انڈے دینے والی مرغی رُباب نے تو ابھی دولت کے انبار لگانے تھے کہ جس کے سامنے وکلا سیاست کا بڑے سے بڑا عہدہ بھی ہیچ تھا۔ رضوان ہاشمی نے فاتحانہ سرشاری کے عالم میں اگلا فون جبار کو کیا تو ایک اور اچھی خبر اُس کی منتظر تھی۔ رُباب کو اُس کی ہدایت کے مطابق انتہائی محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دیا گیا تھا۔ بس اب ایک ہی مسئلہ کسی حد تک پریشانی کا باعث ہوسکتا تھا کہ رُباب کے معاملے میں حاجی بخشن کو کس طرح مطمئن رکھا جائے وگرنہ وہ کسی بھی وقت نہ صرف جبار تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا تھا بلکہ وکلا کا معاملہ جلد حل ہونے کی صورت میں خود رضوان ہاشمی کے لیے بھی متوقع مالی مفادات میں خسارے کا باعث ہوسکتا تھا۔ لیکن یہ سبھی کچھ ابھی امکانات کی حد تک تھا جب کہ رضوان ہاشمی امکانات کو معدوم کرنے اور معدوم سے نئے امکانات پیدا کرنے میں ہنرمندی کا زعم رکھتا تھا۔

طمانیت کے اِن لمحات میں وہ جھومتا جھامتا ہوا اُٹھا تو سیکورٹی پر متعین گارڈ چوکس ہو گئے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ رضوان ہاشمی اندر زنانے میں بھی جائے گا یا یہیں سے ہی واپس چلا جائے گا۔ پہلے بھی ایسا کئی بار ہو چکا تھا کہ وہ اندر زنان خانے میں جانے کی بجائے اپنی اِسی مخصوص جگہ پر آ کر بیٹھتا اور کچھ فون کرنے کے بعد یہیں سے ہی واپس چلا جاتا۔ یہاں بیٹھ کر فون پر ہونے

والی گفتگو کے مختلف مزاج اور مختلف آہنگ ہوتے جن سے مخاطب کی شخصیت اور اُس سے ہونے والی بات چیت کی اہمیت اور نوعیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوا کرتا تھا لیکن اِس دوران کوئی بھی ملازم اُس کے قریب پھٹکنے کی جرات نہیں کرتا تھا، حتیٰ کہ اُس کا سرچڑھا ملازم جبار بھی۔ لیکن آج وہ واپس نہیں گیا بلکہ اپنے مخصوص انداز میں خراماں خراماں اندر کی جاب چل دیا۔

خلاف معمول عتیقہ آج اُس کے استقبال کو موجود نہیں تھی ورنہ اُس کے آنے کی اطلاع پا کر وہ اپنے بیڈ روم یا ٹی وی لاؤنج سے باہر نکل کر گھر کے داخلی دروازے کے مقام پر بنے ہوئے پگوڈا صورت برآمدے میں چلی آیا کرتی تھی۔ فتح یابی کے تمام تر امکانات کی بساط بچھانے کے بعد سرمستی کے عالم میں اپنے آپ سے بھی بے خبر ہو چکے رضوان ہاشمی کے لیے اگر چہ یہ امر زیادہ اہم نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ چونک کر رہ گیا۔ اُس نے وہیں رُک کر اِدھر اُدھر دیکھا مگر ملازمہ تک موجود نہیں تھی۔ رضوان ہاشمی کی اِتراہٹ ہوا ہو چلی تھی۔ صدر دروازے سے وہ ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوا تو وہاں بھی ہو کا عالم تھا۔ ہزاروں وسوسے ایک دم سر اُبھار کر اُس کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔

''کہاں جا سکتی ہے عتیقہ؟'' اب کے وہ تیزی سے عتیقہ کے بیڈ روم کی طرف بڑھا مگر بیڈ روم کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ رضوان ہاشمی کے لیے اپنے پاؤں پر کھڑا رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ ''کیا کوئی واردات؟'' لیکن باہر حفاظت پر مامور گارڈز کے ہوتے ہوئے کسی کی کیا مجال جو اِس نوعیت کی واردات کا تصور بھی کر پائے۔ رضوان ہاشمی وسوسوں کے بعد اندیشوں میں گھرتا چلا جا رہا تھا۔

''یہ بھی تو ممکن ہے کہ عتیقہ کے وہ رشتہ دار کوئی ایسی ویسی کارروائی نہ کر گزرے ہوں کہ جن کو غچہ دے کر عتیقہ نے مجھ سے نکاح کر لیا تھا؟ لیکن وہ یہاں تک پہنچیں گے کیسے؟ باہر گارڈز ہیں اور اُن کی نگاہ سے بچ کر کسی پرندے کا بھی اندر پہنچ پانا تقریباً ناممکن! تصور بھی محال۔'' رضوان ہاشمی نے بند دروازے کو پہلے کھٹکھٹایا مگر جب کوئی جواب نہیں ملا تو دونوں ہاتھوں سے زور کا تھپتھپایا۔ بیڈ روم کے اندر کی خاموشی، ہر آنے والے لمحے کے ساتھ اُس کی پریشانی کو بڑھائے چلی جا رہی تھی۔

''شاید وہ مجھ سے کسی بات پر ناراض ہو لیکن ایسا اگر ہوتا تو عتیقہ آج فون پر ہونے والی گفتگو میں اِس کا احساس ضرور دلاتی.... شکر رنجی اگر کوئی ہے تو ضرور فون کے بعد پیدا ہوئی ہو گی لیکن اِس سے پہلے کئی بار خاصے بڑے اختلافات کے باوجود نہ تو اُس نے کبھی ایسا رویہ اپنایا اور نہ ہی کبھی ایسا تاثر دیا۔'' واہموں کی بھرمار سے تنگ آ کر رضوان ہاشمی ٹی وی لاؤنج میں رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ کندھوں سے سر کا بھاری پن سہارا نہ گیا تو اُس نے جھکے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اچانک ہی ایک خیال اُس کے ذہن میں کوندے کی طرح لپکا۔

''کیا کہیں عتیقہ نے.... خودکشی! نہیں نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتی۔'' رضوان ہاشمی نے خود ہی اِس خیال کو جھٹک دیا۔ لیکن یہ خیال اُس کا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھا، بار بار پھر سے اُبھر کر سامنے آ جاتا۔ اُسے یاد آ رہا تھا کہ نکاح کے فوراً بعد ہی سے اُس نے شدت سے ماں بننے کی خواہش کا آئے روز اظہار کرنا شروع کر دیا تھا لیکن اُس نے اِس مطالبے کو درخورِ اعتنا جانا ہی نہیں تھا۔ شاید اِس لیے کہ عورتوں کی اکثریت اپنا تحفظ نکاح کے تسلسل میں نہیں بلکہ جنے ہوئے بچے کے وجود میں دیکھتی اور محسوس کرتی ہے جب کہ اِس کے برعکس یہی اولاد اپنی آخری عمر میں دوسری شادی کرنے والے مرد کو سماجی طور پر بیچ چوراہے میں صرف ننگا ہی نہیں کرتی، اُس کے پندار کے بخیے تک اُدھڑوا دیتی ہے۔ ایسے میں رضوان ہاشمی جیسے شخص کو عتیقہ کا ماں بننا کس طرح گوارا ہو سکتا تھا۔ اُس نے جب اِس مطالبے کو سرے سے اہمیت ہی نہ دی تو عتیقہ نے دھیرے دھیرے اپنے جسم کی عطا کو رضوان ہاشمی کی جکڑ بندی سے واپس سمیٹنا شروع کر دیا۔ اُس کی گزر چکی جوانی کو اپنی چڑھتی جوانی کے وفور سے سیراب کر دینے پر تلی ہوئی عتیقہ نے کسی ایسی نہر کے آخری سرے کی طرح کا وطیرہ اپنا لیا کہ جس میں پانی اپنی مرضی سے آتا ہے، کبھی آیا تو اکثر نہ آیا۔

رضوان ہاشمی اِس سے پہلے عتیقہ جیسی کسی کم عمر مگر عالی نسب عورت کی جانب سے اِس طرح اپنائے جانے کی شناس نہیں رکھتا تھا اور نہ ہی یہ تعلق قائم ہوتے وقت وہ جان سکا کہ حالات کے کون سے جبر کے تحت اُس سے کم و بیش ایک تہائی کم عمر کی لڑکی اُس سے یوں نکاح کرنے پر چڑھ دوڑی تھی۔ وہ تو پیشہ ور عورتوں کی تحریص اور جنسی عمل کو بطور مطالبہ کر برتے جانے کے رویوں کا

عادی تھا۔ کیا ہوا کہ کبھی کبھار کسی عائلی مقدمے کی ناروا پیچیدگیوں میں اُلجھی ہوئی کوئی عورت مقدمے کی باقی ماندہ فیس کے طور پر اُس کے دفتر کے صوفے پر مجرا ہوئی۔ اُسے کیا خبر کہ عورت کی عطا اور اُس کے مطالبے کی حدِ امتیاز کیا ہے، کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم۔

رضوان ہاشمی نے اِس خیال کو ایک بار پھر ذہن سے جھٹک دیا۔ اُس کے نزدیک عتیقہ کا اُس سے مسلسل اغماض برتنا اُس کی کچی عمر کے چلبلے پن سے زیادہ کچھ نہیں تھا کہ جسے سنجیدہ لیا جاتا۔ ''لیکن اگر کچھ بھی ایسا نہیں تھا تو عتیقہ گئی کہاں۔'' یہ وہ سوال تھا کہ جس کا جواب اُسے بھائی نہیں دے رہا تھا۔ ''اگر دروازہ نہیں کھلتا تو کیا ملازموں کو بلا کر اُسے توڑ دیا جائے؟'' اور اندر اگر عتیقہ کی لاش ملی تو کیا ہوگا؟، کیا اُس کا سبھی کچھ اُس کی عزت وقار اور ناموس سمیت مستقبل کی پلاننگ، فتحیابی کی وہ بساط جسے وہ ابھی ابھی بچھا کر آیا تھا، برباد نہیں ہو جائے گی؟ اور سب سے بڑی بات یہ کہ لاش کا کیا ہوگا!! اگر اُسے کہیں گڑھا کھود کر دبا بھی دیا تو کل کلاں کو اُس کی ناموجودی کا معاملہ کیسے دبایا جا سکے گا۔''

اتنے میں چٹاخ کی ایک آواز کے ساتھ ہی اندر سے مقفل دروازے کا ہینڈل گھومنے کی آواز سنائی دی۔ انتہائی سکوت کے عالم میں اپنی بدخیالیوں کے ہجوم سے نبرد آزما رضوان ہاشمی صرف بری طرح چونکا ہی نہیں بلکہ صوفے پر اُچھل پڑا۔ سامنے نیم تاریک کمرے کے ادھ کھلے دروازے میں پرچھائیں کی مانند دکھنے والی عورت عتیقہ کے سوا اور کوئی نہیں تھی۔ ہاشمی اُٹھا اور اپنائیت آمیز لہجے میں مسکراتا ہوا اُس کی طرف بڑھا۔ عتیقہ کو زندہ سلامت دیکھنے کے بعد وہ اپنے آپ کو خوش قسمت ترین شخص سمجھ رہا تھا کہ جس کا سب کچھ داؤ پر لگنے سے پہلے ہی ''محفوظ'' کے ٹھپے کے ساتھ ڈینجر زون سے نکال کر ایک طرف کر دیا گیا تھا۔

''کیا ہو گیا تھا، کیسی ہو، یہ بھی بھلا کوئی وقت ہے سونے کا؟'' رضوان ہاشمی نے بیڈروم میں داخل ہوتے ہوتے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس سے پہلے کہ وہ ارادتاً اُسے کندھوں سے پکڑ کر سینے سے لگاتا، عتیقہ بہتے ہوئے پانی کے ہلکورے کی طرح ایک طرف ہو کر دیوار پہ لگے سوئچ بورڈ سے کمرے کو کچھ اور منور کرنے لگی۔

''میں تو یہ سمجھی کہ آپ باہر ہی سے جا چکے ہوں گے۔'' عتیقہ نے رضوان ہاشمی کے قدرے پھیلے ہوئے بازوؤں اور پوچھے گئے سوالات کو نظر انداز کرتے ہوئے خود ہی سوال کر دیا۔

''میں بھلا ایسے کیسے جا سکتا ہوں؟'' رضوان ہاشمی نے بھی جرح کے سے انداز میں جواب کی بجائے سوال کا فیل آگے بڑھایا۔

''اور وہ جو آج کل اکثر باہر ہی سے واپس چلا جاتا ہے، وہ کون ہے؟'' رضوان کے مزید قریب آنے پر چھریرے بدن کی قیامت قامت عتیقہ ایک اور سوال کرتی ہوئی دیوار کے ساتھ سٹ کر کھڑی ہو گئی۔ رضوان ہاشمی نے جلدی سے آگے بڑھ کر اُسے کندھوں سے آن دبوچا اور لانبی سی گردن کے پیچھے، بائیں کان کی لو کے نیچے بوسہ لینے کی کوشش کی لیکن عتیقہ نے ٹھوڑی کا دباؤ نیچے کندھے کی طرف بڑھا کر اتنی جگہ ہی نہ چھوڑی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو پاتا۔ رضوان ہاشمی کی سانس پھولنے لگی تو شکم کا پھیلاؤ بھی عتیقہ کے جسم پر ناروا گرانی کا باعث ہونے لگا۔ اُس نے ایک ادا سے رضوان ہاشمی کو ایک طرف دھکیلا اور دیوار سے نکل کر بیڈ روم چیئر پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

''کیا کمال خوبی ہے ہاشمی صاحب آپ میں، آپ اپنی بیوی کے ساتھ بھی مقدمے جیسا سلوک کرتے ہو کہ جسے ہر حال میں جیتنا آپ کی انا جو ٹھہرا، بیوی اور خاص طور پر وہ غیر اعلانیہ بیوی جو آپ کی ترجیحات میں انتہائی کم تر درجہ رکھتی ہو کس طرح یہ توقع کر سکتی ہے کہ اُس کے جذبات کا بھی خیال رکھا جائے گا، اُسے اور کچھ نہیں تو کم از کم گوشت پوست کا انسان ہی سمجھ لیا جائے تو بڑی بات لیکن آپ کہاں سوچیں گے اور کیوں سوچیں گے! میں تو آپ کے فرصت کے لمحات کا ایک کھلونا کہ بس آیا اور چڑھ دوڑا یہ جانے بغیر کہ اُس کی اپنی حالت کیا ہے! کیا وہ اِس قابل بھی ہے کہ آپ کے شہوت رانی کے کھیل میں ذہنی اور جسمانی طور پر آپ کا ساتھ دے سکے؟'' رضوان ہاشمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ سوالات کرتے کرتے عتیقہ کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں، آواز بھرا گئی تو اُس نے سر کو گھٹنے پر ٹکا دیا اور رونے لگی۔

رضوان ہاشمی دم بخود سا اپنی سانسیں درست کرتا ہوا قدرے دور پلنگ کی پائنتی کی طرف بیٹھ

کر ٹکر ٹکر اُسے روتا ہوا دیکھنے لگا۔ نکاح کے بعد سے آج پہلی مرتبہ عتیقہ نے اِس قسم کی زبان استعمال کی یا اِس قسم کا رویہ اپنایا۔ وگرنہ اِس سے پہلے وہ ایک ایسی عورت کی طرح پیش آتی تھی کہ جس کا مقصدِ حیات اُس کی جسمانی اور ذہنی تکان اُتارنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کیا یہ اُس کی اعلیٰ نسبی کی خوتھی یا تعلیم یافتہ ہونے کا شعور اور انانیت کہ جس نے اُسے دیوار سے لگا دیکھ کر پلٹ کر جھپٹنا یاد دلا دیا؟ اور یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ایسا کچھ نہ ہو اور کچھ ایسا ہو گیا ہو کہ جس کے بعد رضوان ہاشمی اُس کی ترجیحات میں نہ رہا ہو۔ اگر ایسا ہے تو کون ہے وہ کہ جس نے اُسے عتیقہ جیسی کچنار کی کچی کلی کے حلقۂ دلبری سے باہر لا پھینکا ہے؟

۱۹

حاجی بخشن، ملک یاور بختاور کے فارم ہاؤس سے نکلا تو شام ہو چکی تھی۔ اُس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی پہلا فون فیض کریم کو کیا مگر جب معلوم ہوا کہ رُباب اور جبار دونوں کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا تو شدتِ طیش اور پھر اُسے ضبط کرنے کی کوشش میں اُس کے چہرے کے نقوش بگڑ گئے اور زبان گُنگ ہو کر رہ گئی۔ ویسے بھی فیض کریم کو اب مزید کتنی گالیاں دی جاسکتی تھیں کہ نہ تو اُن دونوں کو غائب کرنے میں اُس کا کوئی قصور تھا اور نہ ہی اب اُن کے تلاشنے میں ناکامی کا اُس کی کارکردگی سے کوئی واسطہ۔ اتنا تو طے تھا کہ رُباب عدالتی ہنگامے والے دن کے بعد سے آج صبح تک رضوان ہاشمی کے فارم ہاؤس پر تھی۔ یہ بھی ثابت ہو چکا تھا کہ رُباب کو آج صبح جبار ہی اپنے ساتھ لے کر وہاں سے نکلا تھا لیکن اُس کے بعد کا کوئی سرا ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ گئے تو گئے کہاں۔ حاجی بخشن کی اپنی فہم کے مطابق رُباب اور جبار کی گمشدگی اور اُس کے ہوٹل پر چھاپہ، دونوں ایک ہی سازش کی دو کڑیاں تھیں۔ اگر کڑیاں نہیں بھی تھیں تو پھر بھی ان دونوں واقعات کے درمیان کوئی نہ کوئی ربط ضرور تھا۔

اُدھر ملک یاور سے آج کی ملاقات نے اتنا تو واضح کر دیا تھا کہ اُس کے ہوٹل پر پولیس کے چھاپے کے پیچھے تمام تر اختیارات کے باوجود اِس چغد کا ہاتھ نہیں ہوسکتا۔ اگر اِس ریڈ کے پیچھے

آئی جی حمید الرحمٰن بھی نہیں، ملک یاور بھی نہیں تو تیسرا کون ہو سکتا ہے کہ جو اتنی جرات کرے۔ حاجی بخشن کا ذہن کسی بپھرے ہوئے دریا کا گرداب بن کر رہ گیا تھا۔ سطح پر آنے والی ہر سوچ کو لپیٹ لپاٹ کر نیچے اَنت گہرائی کی جانب گھمائے چلا جا رہا تھا۔ اُس نے گاڑی ایک طرف کھڑی کرا دی اور ڈرائیور کو نیچے اُتر جانے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور اُتر چکا تو حاجی بخشن نے سیٹ کی پُشت پہ گردن ٹکا کر آنکھیں بند کرتے ہوئے لمبی لمبی سانسیں لینا شروع کر دیں۔ چند لمحوں کے بعد آنکھیں کھول کر اُس نے موبائل فون پر رضوان ہاشمی کا نمبر تلاش کرنا چاہا مگر کچھ سوچ کر فون کو پھر سے ساتھ والی سیٹ پر رکھ دیا اور واسکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ تلاش کرنے لگا۔ ہاتھ باہر نکلا تو اُس میں سفید رنگ کی گولیوں سے بھری ہوئی ایک چھوٹی سی شیشی تھی۔ حاجی بخشن نے بغیر کچھ دیکھے شیشی کا ڈھکن کھول کر ایک گولی نکالی اور اُسے ہتھیلی پر رکھ کر بغیر پانی کے پھانک لیا۔ شاید گولی کے ذائقے سے اُس کا بگڑا ہوا منہ کچھ اور بھی بگڑ گیا۔ ایک بار پھر اُس نے آنکھیں موند لیں اور سر کو سیٹ کی پُشت سے ٹکا دیا۔ کچھ دیر بعد ہی اُس کے چہرے کے تاثرات نارمل ہونے لگے لیکن ایک تلخی تھی کہ جو اُس کی صورت سے چمٹ کر رہ گئی تھی۔

حاجی بخشن نے سیٹ کو ٹٹول کر پھر سے فون اُٹھا لیا۔ اُس کا اضطراب کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ رضوان ہاشمی سے بات تو کرنا چاہ رہا تھا لیکن سخت لہجے میں جس سے وہ جان سکے کہ حاجی بخشن جیسے شخص کے اعتماد کو دھوکہ دینا کس قسم کے خوفناک مضمرات کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔ رُباب کو اُس تک واپس پہنچانا رضوان ہاشمی کی ذمہ داری تھی لیکن اُسے اتنی سی پریشانی یا پشیمانی بھی نہیں تھی کہ جس کی امانت میں خیانت ہوئی ہے، اُسے کم از کم باخبر ہی رکھا جائے۔ ایسے معاملے میں تحمل سے کام لینا حاجی بخشن کی طبع کے برعکس تھا۔ اُس نے زندگی میں جو بھی کیا فوری بدلہ چکائے جانے کی حکمت عملی کے تحت کیا لیکن نجانے کیوں آج وہ جب بھی رضوان ہاشمی کا نمبر ملانے کا سوچتا اُس کی آنکھوں کے سامنے فیض کریم کا چہرہ آ جاتا کہ سرکار! ابھی نہیں، آج نہیں۔

حاجی بخشن کو فیض کریم کی بات خاصی حد تک درست لگ رہی تھی کہ اس وقت وہ پورے کا پورا رضوان ہاشمی کے بوجھ تلے اِس طرح دبا ہوا تھا کہ معمولی سی بے احتیاطی اُس کے مفادات کو

ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتی تھی۔ عدالت سے رُباب سمیت چھاپے کے ملزمان کا فرار ہی اِن بُرے اور بگڑے ہوئے حالات میں اُس کے لیے مسائل کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اِسی طرح عدالتوں اور سرکاری دفتروں پر حملے کے الزام میں ایف آئی آر اگرچہ وکلا کے خلاف درج ہوئی تھی لیکن کیا خبر کہ اُس سربمہر ایف آئی آر میں اُس کا نام بھی گھسیڑ دیا گیا ہو خاص طور پر اِن حالات میں کہ جب صوبے کے آئی جی کے تیور بھی اُس کے حق میں کچھ اچھے نہیں تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس کا ٹرپ کا پتا اور سب سے بڑی انوسٹمینٹ رُباب بھی ابھی تک اُس کے قبضے میں تھی۔ بخشن کے تئیں رضوان ہاشمی شاید رُباب کی اہمیت سے بے خبر ہو لیکن ایسے حالات میں اُس کا بے خبر رہنا ہی بہتر تھا۔ ہر طرف سے خدشات میں گھرے ہوئے حاجی بخشن نے فون ایک بار پھر سیٹ پر پھینک دیا۔ لیکن اچانک ہی کوئی خیال اِس طرح کوندے کی طرح لپکا کہ اُس نے فون اُٹھا کر فیض کریم کا نمبر ری ڈائل کر دیا۔

''ہاں فیضو! میں اُس بھڑوے کو فون نہیں کرتا، تمھارا کہنا مانتا ہوں لیکن تم تو کرو اور ہر گھنٹے کے بعد اُس سے پوچھو کہ کس کھڈے میں گھسیڑا ہے اُس مردود ڈرائیور اور اُس گشتی عورت کو۔'' اِس سے پہلے کہ فیض کریم کوئی جواب دیتا وہ پھر بول پڑا۔ ''اور ہاں! تم نے بتایا نہیں کہ جو شکرے تم نے جبار کے پیچھے لگائے تھے، اُن کا کیا ہوا، وہ کس آسمان پر اُڑ رہے ہیں؟''

''ابھی اُنھیں بھی کوئی اَتا پتا نہیں مل رہا جبار اور اُس لڑکی کا، لیکن ہیں وہ اُن کے پیچھے۔'' فیض کریم کی آواز کے دم خم نے حاجی بخشن کو برانگیختہ کر دیا۔ وہ تو اُس سے مری ہوئی منمناہٹ کی توقع کر رہا تھا۔

''ابے اُو بھڑوے! میرا اِدھر پریشانی سے بُرا حال ہے اور تو اُدھر تازہ دم ہوئے بیٹھا ہے، کسی دن تو معاف کر دیا کر اپنے اِن چھکوں کو، تو اِدھر اِس کام میں مصروف ہوگا تو وہ تمھارے شکرے کیا خاک کام کریں گے؟ میں بھی بڑا کنجر کا بیج ہوں جو تمھارے جیسے حرامیوں اور ہڈحراموں کی فوج پال کر بیٹھا ہوا ہے، میں بھی ایک جبار کو رکھ لیتا جو تم سب کی بینڈ بجا کر اوپر چھت پر بیٹھا سیٹیاں بجا رہا ہوتا۔'' اب کے بخشن نے فیض کریم کے جواب کا انتظار کیے بغیر فون بند کر کے ساتھ

والی سیٹ پر پھینک دیا۔ اپنی کوششوں میں پے در پے ناکامیوں سے زیادہ وہ بے حس اور نالائق ملازموں کی بد انتظامی پر تلملا رہا تھا۔ اِسی کھولاؤ اور تلملاہٹ میں اُس نے کھڑکی کا شیشہ تھپتھپایا تا کہ ڈرائیور کو بلایا جا سکے۔ ڈرائیور لپک کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا، اسٹیئرنگ سنبھالا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

ہائی وے تک آتے آتے وہ کچھ دیر عقبی شیشے میں حاجی بخشن کا موڈ دیکھتا رہا۔ جیسے ہی کچھ بہتری کا احساس ہوا تو ہولے سے بولا۔ ''صاحب ایک گزارش تھی۔''

حاجی بخشن نے آنکھ اُٹھا کر اُسے دیکھا لیکن جواب نہیں دیا، بس اپنے خیالوں میں اُلجھا رہا۔ کچھ دیر توقف کے بعد وہ قدرے اونچی آواز میں پھر بولا۔ ''صاحب! اچھا ہوگا کہ آپ گن مین کو ساتھ لے لیا کریں ویسے بھی حالات آج کل کوئی خاص اچھے نہیں۔''

''تو ڈرائیور ہے ناں!'' اب کی بار حاجی بخشن کی تمام تلملاہٹ اُس کی آواز میں در آئی تھی۔

''جی صاحب!''

''تو پھر اپنے کام سے کام رکھ! مجھے پتہ ہے کہ حالات کیا ہیں! مجھے پتہ ہے کہ گن مین کو ساتھ لینا ہے یا نہیں لینا۔'' حاجی بخشن کا لہجہ اِس قدر درشت تھا کہ ڈرائیور نے اِدھر اُدھر دیکھنے کی بجائے اپنی نگاہیں صرف سڑک پر مرکوز کر دیں۔ لیکن اُس کی بات چند لمحوں کے بعد ہی حاجی بخشن کے ذہن میں کھد بد مچا گئی۔ بار بار ایک ہی خیال گردش کرنے لگا کہ آخر اُس نے گن مین کو ساتھ رکھنے کی بات کیوں کی ہوگی۔ کیا اُس نے کچھ سنا ہے، دیکھا ہے یا مختلف اوقات میں مختلف لوگوں سے اس کی فون پر ہونے والی گفتگو سے اندازہ لگایا ہے؟ اب وہ ڈرائیور سے اِس تجویز کا پس منظر معلوم تو کرنا چاہتا تھا لیکن اپنی طبع کے سبب گریزاں تھا کہ وہ کیا سوچے گا کہ حاجی ڈر گیا۔ ابھی وہ اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ فون کی گھنٹی پوری شدت سے بج اُٹھی۔ آج دوپہر کے بعد حاجی بخشن نے پہلی بار یہ آواز سنی تو اُتاولا ہو کر فون اُٹھا لیا۔ دوسری جانب رضوان ہاشمی تھا۔ کسی متوقع اچھی خبر کی آس نے اُسے اور بھی اُتاولا کر دیا۔

''ہاں جی وکیل صاحب! لڑکی پہنچ گئی؟ اگر پہنچ گئی ہے تو دس بارہ تیر ضرور پھیر اپنے ڈرائیور کو، میرا سارا دن برباد کر کے رکھ چھوڑا ہے اس بھڑوے نے۔''

''پہلے میری بات سُن حاجی! وکیل ہوں میں تیرا، تیری تو ہر بات سُن بھی لیتا ہوں، برداشت بھی کرتا ہوں کہ تجھ سے دوستی ہے پرانی اور تعلق بھی ہے، نمک کھایا ہے ایک دوسرے کا، لیکن اپنے کتے بلے اپنے پاس رکھ، اِن سے مجھے فون نہ کرایا کر، اندر کروا دیا تو اِن کی ضمانت کے لیے پورے صوبے میں کوئی وکیل نہیں ملے گا، باقی جس کام کی جتنی فیس لی ہے، اُتنا ہی کروں گا لازمی، ہاں اور اگر تجھے مجھ پر اعتماد نہیں رہا تو آج کے دن تک ہونے والے سارے خرچے نکال کر باقی رقم واپس بھجوا دیتا ہوں ابھی اور پھر کل صبح کچہری آنے کی جرات نہ کرنا، پوری کچہری کھلوا دوں گا، ہڑتال گئی تیل لینے، اور ہاں لڑکی تیری میرے پاس نہیں ہے، وہ تو الٹا میرے ڈرائیور کو بھی بھگا لے گئی، مل گئی تو پہنچ جائے گی! اب بات کر، کیا کہتا ہے؟''

رضوان ہاشمی کی اتنی لمبی تقریر سُن کر تو حاجی بخشن کا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ اُسے حیرت تھی کہ یہ وہی رضوان ہاشمی جس سے یاری نبھانے کے چکر میں نہ تو اُس نے کبھی دن رات کی پرواہ کی اور نہ ہی روپے پیسے کی۔ حتیٰ کہ جب پہلی بار وہ تحصیل بار کے صدارتی الیکشن میں کھڑا ہوا تو پورے ایک مہینے تک مفت کے بھوجن اِسی ہوٹل سے جاتے رہے تھے۔ پھر ضلعی صدر کا الیکشن، صوبائی بار کونسل کا الیکشن اِن سب میں ووٹ دلوانے سے لے کر خرچ اخراجات تک، سبھی کچھ کرتا رہا لیکن کبھی تقاضا نہیں کیا۔ اُلٹا جب بھی کام پڑا فیس پہلے ادا کی۔ کسی اور کا بھی کیس بھجوایا تو کمیشن رکھے بغیر پارٹی سے دگنی تگنی فیس دلوائی۔ اور آج وہی رضوان ہاشمی ایک جوان لڑکی کو ہڑپنے اور ساٹھ لاکھ ڈکارنے کے بعد بھی اُسے آنکھیں دکھا رہا تھا۔ حاجی بخشن کا تمام تر کھولاؤ، تلملاہٹ اور طیش ایک تاسف اور کڑواہٹ میں بدل گئے۔ اُس نے رضوان ہاشمی کو بخشن والے تیور دکھانے چاہے مگر [illegible] نہ بولا گیا۔ لہٰذا کوئی بھی بات کیے بغیر اُس نے فون بند کر کے ایک طرف رکھ دیا اور نگاہیں ونڈ اسکرین سے باہر سڑک پر مرکوز کر دیں۔ مگر اندھیرا ہو چکنے کے بعد یوں ونڈ اسکرین [illegible] دیکھتے آنکھیں دکھنے لگیں تو اُس نے ایک بار پھر سیٹ کی پشت پر سر ٹکا کر آنکھیں

موند لیں۔

چہرہ اگرچہ بظاہر پُرسکون تھا مگر کاسۂ سر میں خیالات کے جھکڑ تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ شدت سے ایک ہی احساس سب سے نمایاں تھا کہ مصیبت آئی بھی تو تن تنہا نہیں بلکہ پوری بارات کے ساتھ۔ عمر کے اِس حصے تک اُسے کسی آزمائش کا سامنا نہیں ہوا تھا اب اگر گزرا لگا تو سب سے پہلے یار لوگوں نے آنکھیں بدل لیں۔

''یہ سب کچھ محض اتفاق نہیں ہو سکتا، یقیناً کوئی سازش ہوئی ہے اور وہ بھی میرے اپنے لوگوں نے مجھے مٹی چٹانے کے لیے کی ہے، لیکن کیوں کی ہے، کس لیے کی ہے، میں نے تو کسی کا کوئی حق نہیں مارا اور نہ ہی کسی سے زیادتی کی، تو پھر یہ کون ہو سکتے ہیں، کون لوگ؟'' اچانک ہی گاڑی کو بریک لگی تو اُس کا سر اگلی سیٹ کی پشت سے جا لگا۔

''اُو بھڑوے! گاڑی چلانا نہیں آتا تو چھوڑ اِس کتے کام کو! فیضو سے کہو تمھیں سہولت خانے میں بٹھا دے، ڈرائیور اچھی خدمت کر کے جاتے ہیں۔'' حاجی بخشن کا غصہ پھر سے بند توڑ کر باہر نکل آیا تھا۔

''صاحب جی کتا آ گیا تھا سامنے۔'' ڈرائیور نے بیک مرر میں دیکھے بغیر مریل سے لہجے میں جواب دیا۔

''تو رگڑ دیتے بھڑوے کو، پراڈو کی کون سی گرِل ٹوٹ جانی تھی۔'' بخشن کے طیش میں سے اکتاہٹ بھی صاف جھانکنے لگی تھی۔ ''بھڑوا، کنجر کا بچہ۔''

حاجی بخشن کے لیے پھر سے آنکھیں موند کر اپنے آپ کو، اپنے آپ سے جوڑنا مشکل لگ رہا تھا۔ چاروں طرف سے تابڑ توڑ نازل ہونے والی سختیوں نے اُسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ درپیش مسئلہ اب صورتِ حال کا نہیں بلکہ اِس صورتِ حال سے باہر نکلنے کا تھا۔ ستم تو یہ تھا کہ اُس کی پلاننگ کا اصل مہرہ رضوان ہاشمی ہی پورس کا ہاتھی ثابت ہو رہا تھا۔ وکیلوں کی ہڑتال نہ چلی، عدلیہ اور انتظامیہ کسی صلح صفائی پر نہ آئیں تو اُس کی کھاٹ کھڑی کرنے کے لیے تو دو کیس ہی کافی تھے، ہوٹل پر ریڈ اور عدالتوں سمیت پولیس اور انتظامیہ کے دفاتر پر دھاوا اور توڑ پھوڑ جہاں انسدادِ دہشت

گردی ایکٹ کی دفعہ بھی ایف آئی آر میں شامل کر لی گئی تھی۔ اُدھر رُباب کی گمشدگی بھی الگ مصیبت۔ امانت واپس کرنے کی بجائے رضوان ہاشمی اُلٹا اُس پر چڑھ دوڑنے کو تُلا ہوا تھا۔ ہوٹل پر ریڈ کی گتھی سلجھاتے سلجھاتے وہ ملک یادر کو نادر خان کے خلاف بھڑکا آیا تھا۔ اب اگر اُن کے درمیان کوئی رابطہ ہو گیا تو رگڑا پھر اُسی کو لگے گا۔ یہ سبھی کچھ سوچ سوچ کر حاجی بخشن کا دل ڈوبنے لگا تو اُس نے ڈرائیور کو گاڑی سائیڈ پر روکنے کا کہا۔

''صاحب جی! یہ آپ کا ہوٹل تو سامنے آ گیا پھر بھی رُک جاؤں؟'' ڈرائیور نے پاؤں بریک پر رکھ دیا تھا۔

''ہاں! ہوٹل آ گیا؟ پتہ نہیں مجھے کیوں دکھائی نہیں دیا، اچھا تم یوں کرو! ہم نے ہوٹل نہیں رُکنا، حیدر گوٹھ شہر سے گاڑی نکالو اور جی ٹی روڈ پے ڈالو، ہم نے لاہور جانا ہے اسی وقت۔''

۲۰

ساتھ بج چکے تھے اور صاحبزادہ سلطان احمد تونگر ابھی تک گومگو کی کیفیت میں تھا۔ پانچ بجے گھر چلے آنے کے بعد سے وہ مسلسل اسی شش و پنج میں رہا کہ جانان کی طرف سے دی گئی دعوت کو قبول کیا جائے یا کسی طور معذرت کر لی جائے لیکن اِس مخمصے کا کوئی سر پیر نہیں مل رہا تھا۔ واہمہ قوی اس بات کا تھا کہ پھر سے اُس کے لیے کوئی اور جال نہ بچھایا جا رہا ہو لیکن متوازی دلیل یہ بھی تھی کہ اگر اُس کے ساتھ کچھ ایسا ویسا کرنا مقصود بھی ہے تو جو کچھ ویڈیوز کی صورت اللہ ڈنو عبید کے پاس تھا، وہ کیا کچھ کم تھا۔ قدرے تشفی اِس لیے بھی تھی کہ ابھی تک سوائے پہلے روز کی ''مدارت'' کے کوئی بھی منفی رویہ اختیار نہیں کیا گیا تھا بلکہ اُسے ایک کمپنی کا مینیجنگ ڈائریکٹر بنا کر ایک خوبصورت آفس کے ساتھ ساتھ جانان جیسی لڑکی بھی اُس کی ماتحتی میں دے دی گئی تھی کہ جس کا قرب اُس جیسے ادھیڑ عمر شخص کے واسطے ویسے ہی ایک عطا سے کم نہیں تھا۔

یہ کمپنی کیا تھی، کون سے کاروبار کے لیے بنائی گئی تھی، یہ تو وہ کنٹریکٹ سائن کرتے وقت دیکھ ہی نہ پایا تھا اور نہ ہی اُس کی تنخواہ یا دیگر مراعات اُس کی نگاہ سے گزر سکیں۔ یہ جانان کی جادو

نگاہی تھی یا اُس کے حسن کی کوئی خفی خوبی کہ جس نے ماحول کو معطر خواب نگری کی مانند دھنک رنگ بنا رکھا تھا۔ اب ایسے میں کنٹریکٹ کی جزیات کو دیکھنے، سمجھنے اور یاد رکھنے کا یارا کس میں تھا۔ اگر کچھ دیکھا بھی تھا تو اب اَن دیکھا سا لگ رہا تھا۔

صاحبزادہ تونگر نے وال کلاک پر نگاہ ڈالی جہاں سوئیوں کی ترتیب سوا سات بجے کا عمل بتا رہی تھی۔ اُس نے جانان کی دی ہوئی چٹ کو ایک بار پھر جیب سے نکالا، کئی بار پڑھ چکے ہونے کے باوجود اُس کے گھر کا پتہ بھی ایک بار پھر پڑھا، یقین نہیں آ رہا تھا کہ جانان کا اپارٹمنٹ اُس کے بنگلے سے صرف دس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ صاحبزادہ تونگر نے کچھ بھی سوچے بغیر واش روم کا رخ کیا کہ گرم باتھ سے اپنے آپ کو فریش کر سکے۔ گرم پانی کے شاور نے نہ صرف اُس کے اعصاب کو سکون دیا بلکہ قوتِ فیصلہ کو بھی اتنا مہمیز ضرور کر دیا کہ وہ جانان کے ہاں جانے کے معاملے میں درپیش الجھن سے مثبت انداز میں نکل سکے۔ یوں اگلے آدھے گھنٹے میں وہ ایک مدت کے بعد اپنے پسندیدہ سیاہ رنگ کے کرتا شلوار اور ویسکوٹ میں ملبوس ہو کر بنگلے سے اپنی گاڑی خود ہی ڈرائیو کرتا ہوا باہر نکل چکا تھا۔

اپنے بیڈ روم سے تیار ہو کر باہر آتے ہوئے اُس نے نہ چاہتے ہوئے اُس خوشبو کو اپنی شخصیت کا جزو بنا دیا تھا کہ جو ریٹائرمنٹ سے پہلے تک وہ خاص خاص پارٹیوں میں شریک ہوتے ہوئے استعمال کرتا تھا۔ برتری کے دنوں میں پہنے جانے والے اِس لباس، مہ وشوں کو فریفتگی پر آمادہ کرنے والی خوشبو اور جانان جیسی حسینہ سے ملاقات کے تصور نے اُس کی خود اعتمادی کو پھر سے اُس کمال درجے تک پہنچا دیا تھا کہ جو اُسے اپنی بیوروکریٹک زندگی کے عروج پر نصیب تھا۔ یہ وہ دور تھا کہ جب پاؤں زمیں پر نہیں بلکہ مزاج کی طرح ہواؤں میں اور فلک کوئی بھی حد ظاہر کرنے سے قاصر دکھائی دیتا تھا۔

اس درجہ خود اعتمادی کے باوجود ذہن میں کہیں یہ خیال ضرور موجود تھا کہ پھر سے زندگی آغاز کرنے کے لمحات میں ناامید سے سامنا نہ ہو لیکن یہ ہو کر ہی رہا اور وہ بھی عین پورچ سے نکلتے ہوئے۔ راستہ نامہرباں ہوئی کالے یا مہربان بلی، نحوست اور ناگواری کا احساس ایک جیسا ہوتا

ہے۔ خاتون نے بھی اس طرح سرشام ایک دھتکارے ہوئے شوہر کو یوں مطمئن چہرے، پر اعتماد چال اور خوب بنے ٹھنے انداز میں باہر کی طرف جاتے دیکھا تو بہ باطن ایک بار ٹھٹکی ضرور لیکن ظاہر سے محسوس نہیں ہونے دیا۔ لیکن اس کے برعکس صاحبزادہ تونگر کو یوں لگا کہ اُس کے بھیتر تشفی اور طمانیت کی ہلکی ہلکی لہریں اور ہلکورے جنم لے رہے ہیں۔ وہ ایک قدم رُکا، لمبی سی سانس لی اور چند ثانیوں کے لیے کھڑے کھڑے آنکھیں موند لیں۔ بس ایک لحہ سکوت کا پھر اُس کے بعد پورچ سے گاڑی تک آتے ہوئے ناہید کی آنکھیں مسلسل اُس کا تعاقب کرتی رہی تھیں لیکن اُس نے پرواہ تک نہ کی۔ عجیب سی ایک تسکین تھی کہ جو اُس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہی تھی۔ حیرت تھی تو بس اتنی کہ یہ بیویاں چاہے وفادار ہوں یا بے وفا، حالتِ تعلق میں ہوں یا لاتعلقی میں، وہ بہر صورت گھر سے باہر جاتے شوہر کو اپنی موجودگی کا احساس دلائے بغیر نہیں رہ سکتیں۔

صاحبزادہ سلطان احمد تونگر ٹھیک آٹھ بجے جانان کے اپارٹمنٹ کے باہر موجود تھا۔ شہر کی سب سے پوش سوسائٹی میں بنے ہوئے یہ اپارٹمنٹ نہ صرف لگژری کے اعتبار سے قابلِ دید تھے بلکہ مالیت کے اعتبار سے بھی کسی بڑے بنگلے سے کم نہیں تھے۔ سکیورٹی کے دو حصار، بیسمنٹ پارکنگ اور ہر اپارٹمنٹ تک رسائی کے لیے خوبصورت ایلیویٹرز نے اِن رہائش گاہوں کو ایک منفرد وقار عطا کر رکھا تھا۔

اپارٹمنٹ کا دروازہ پہلی بیل پر ہی کھل چکا تھا کہ جیسے مکین آنے والے مہمان کی آمد کے شدت سے منتظر رہے ہوں۔ تونگر کی توقع کے برعکس اُسے جانان کی بجائے اُس کی ملازمہ نے ریسیو کیا اور ڈرائنگ روم کی بجائے ایک ایسے کمرے میں لے گئی جس کا فرنیچر اور اُس کی ترتیب گھرداری کی عمومی ڈیکور سے ہٹ کر بیڈ روم اور سٹنگ روم کی کوئی مخلوط صورت تھی۔ یہاں آ کر اُسے احساس ہوا کہ وہ اپنی روایات کے منافی نہ تو کوئی پھولوں کا بکے لایا ہے اور نہ ہی کوئی اور تحفہ جو جانان کے شایان ہوتا۔ پھر خیال آیا کہ اِس گھر میں اُس کی آمد ابھی تک کسی ذاتی مہمان کی سی نہیں تھی بلکہ اِس کا تعین آج کی ملاقات کے بعد ہونا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ملاقات دفتری تعلق کا تسلسل ہو یعنی کوئی ایسا معاملہ جس پر وہاں سہولت یا رازداری سے بات نہ ہوسکتی ہو۔ لیکن یہ کیا کہ

وہ جانان کی ذات سے جڑی ہوئی کسی خوش فہمی کا شکار ہو کر کشاں کشاں یہاں چلا آیا۔ اللہ ڈنو عبید جیسے شاطر کاروباری کی وفادار ملازمہ اور اُس کے ہر اچھے برے کی ساتھی بھلا اُس پر کیوں فریفتہ ہونے لگی یا کس لیے اپنا دل کھول کر اُس کے سامنے رکھ دے۔

یہ خیال کیا آیا، صاحبزادہ سلطان احمد تونگر کی تمام تر خود اعتمادی، جو بظاہر ایک حسین عورت کے التفات کی خوش فہمی پر استوار تھی، جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ مسرت کی جگہ تاسف نے لی اور کھلی کھلی طبیعت مکدر ہو کر رہ گئی۔ مشام جاں کو معطر کر دینے والے ماحول میں بھی اُسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اِس پے سوا اپنے آپ سے کراہت کا احساس اور ندامت الگ کہ محض ایک چٹ پر کیوں بھاگا چلا آیا۔ زندگی بھر ایک سے بڑھ کر ایک حسین عورت کو اپنی دسترس میں رکھنے کے بعد اب جب کہ اُس کے پاس کچھ بھی ایسا باقی نہیں رہا تھا جو عورت سے قرب کی خواہش کو اعتبار بخش سکتا تو ایسے میں کس برتے پر اُس نے جان لیا کہ ایک کارپوریٹ حسینہ کا محض بلاوہ، اُس کے ذوق دیرینہ کا اعادہ ہو سکتا ہے۔

اتنے میں ایک مخصوص خوشبو کا جھونکا کمرے میں داخل ہوا جس کا احساس فسوں کی مانند اُس کے مسام مسام کو معطر اور اُس کے اعصاب کو زیرِ نگیں کرتا چلا گیا۔ صاحبزادہ تونگر نے آنکھ اُٹھائی تو سامنے جانان تھی، مست اندام، کھلکھلاتی ہوئی، اِٹھلاتی ہوئی۔ سیاہ سلک کا ٹراؤزر اور سیاہ شیفون کی سلیولیس شرٹ جس میں سے اُس کا دودھیا جسم فراوانی سے چھلک رہا تھا۔ وہ کھلے ہوئے تراشیدہ بالوں کو جھومنے کے سے انداز میں جھلاتی ہوئی آگے بڑھی اور جس صوفہ چیئر پر براجمان صاحبزادہ سلطان احمد تونگر اُسے حیرت سے گُنگ ہو کر تکے جا رہا تھا، اُس کے بازو پر چڑھ کر اِس طرح بیٹھ گئی کہ اُس کا بایاں بازو خود بخود تونگر کی گردن میں حائل ہوتا چلا گیا۔ اِس بے تکلفی میں جانان کے سینے کا اُبھار بھی اپنی تمام تر نرماہٹ اور گداز کے ساتھ تونگر کے کندھے سے مَس ہونے لگا تھا۔ ایسے میں مسمرائز ہو چکے سلطان احمد کی آنکھیں تو کھلی تھیں مگر اُن میں دم نہیں رہا تھا۔

''مجھے سو فیصد یقین تھا کہ آپ آ ؤ گے۔'' جانان کی مسکان میں گندھی ہوئی یہ زیر لب خفیف سی جنبش ہلکی سی آواز کی صورت تونگر کو کہیں دور سے آتی ہوئی سنائی دی۔ جانان نے چند لمحے تک

تونگر کے ردِعمل کا انتظار کیا مگر جب پھر بھی اُس کا چہرہ بے تاثر رہا تو وہ صوفے کے بازو سے اُٹھ کر اُس کے قدموں میں اِس طرح بیٹھی کہ اُس کا چہرہ تونگر کے گھٹنوں پر ٹِک کر اُس کی آغوش میں اور اُس کی زلفیں تونگر کے ہاتھوں کی دسترس میں بکھری ہوئی تھیں۔ جانان نے ساکت ہوتے ہوئے بھی اتنی سی جنبش ضرور کی کہ اپنے دونوں ہاتھ اُن کی نرمی اور ملائمت سمیت تونگر کے جوتوں پر رکھ دیے اور اُنھیں آہستہ آہستہ پنڈلیوں پر پھیرتے ہوئے گھٹنوں تک لے جانے لگی۔

تونگر نے ایک دم بیدار ہوتے ہوئے جلدی سے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ جانان جو ابھی تک فرش پر بچھے قالین پر بیٹھی، تونگر کے گھٹنوں پر سر ٹکائے ہوئے تھی، خاموش نہ رہ سکی اور کھل کھلا کر ہنس دی۔ ''آپ کمرے میں لگے کسی خفیہ کیمرے کو ڈھونڈ رہے ہو؟''

تونگر کچھ نہیں بولا مگر اُس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ کیمرے کی ممکنہ موجودگی کے سبب ہی ایک دم پریشان ہو گیا تھا۔ تونگر کی اِس کیفیت کا مزہ لیتے ہوئے جانان نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور قالین سے اُٹھ کر بیڈروم چیئر کو قریب گھسیٹتے ہوئے اُس کے روبرو ہو کر بیٹھ گئی۔

''برا نہ مانیے گا تونگر صاحب! آپ کی اہلیت اور کرائسس مینجمنٹ کی صلاحیت دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کی یہ حالت کیوں ہوئی ہے۔''

صاحبزادہ تونگر کو جانان کا یہ لطیف طنز اب بھی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔ اُس نے حیران ہو کر کھوئی کھوئی آنکھوں سے جانان کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے جانان بھی پریشان ہو گئی۔

''کیا آپ ٹھیک ہیں؟''

صاحبزادہ تونگر پھر بھی اُسی کیفیت میں رہا۔ اُسے خود سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اُس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ جسم کی تمام حسیں بیدار ہوتے ہوئے بھی بیدار نہیں تھیں۔ وہ اطراف کو اِس طرح سے دیکھ رہا تھا کہ جیسے اُسے لوکل انستھیزیا دے کر صوفے پر بٹھا دیا گیا ہو۔

''جناب! یہاں آنے سے پہلے آپ نے کوئی میڈیسن تو نہیں لے لی؟ کوئی خاص والی۔'' جانان نے ایک بار پھر چہکتے ہوئے ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کی۔

تونگراب بھی بے تاثر نگاہوں سے جانان کی طرف دیکھتا رہا۔ کچھ دیر تک جب اُس کی جانب سے کوئی جواب نہ آیا تو جانان پریشان ہو کر خود ہی کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''آپ نے مجھے غلط سمجھا....آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''میں نے کب اور کیا غلط سمجھا اور مجھے کیا ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا؟'' یہ سوال تونگر کے ذہن میں ضرور اُبھرا مگر وہ زبان سے ادا نہ کر سکا۔ بس چہرے پر ایک متجسس سوال کی سی لہر اُبھری اور بہتی چلی گئی۔ اُس نے جانان کی طرف دیکھا، وہ کمرے سے باہر جا چکی تھی۔ صاحبزادہ تونگر نے آنکھیں موند لیں۔ بہت سے سوالات نے ایک دم دھاوا بول کر اُس کے ذہن کو ماؤف کر دیا تھا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد جس طرح اُس کے ہونے کی نفی کی گئی تھی، جس انداز میں اُسے اللہ ڈنو عبید ملا، جس قسم کی جاب اُسے جتنے مشاہرے پر پیش کی گئی، اُس کی ذاتی زندگی کا یوں ویڈیوز کی صورت دستاویز ہونا، ناہید کی بے وفائی، اولاد کی نافرمانی اور پھر جانان جیسی لڑکی کا اللہ ڈنو عبید کی خاص ملازمہ ہوتے ہوئے بھی اپنے باس کے اعتماد کو دھوکہ دے کر اُسے یوں تخلیے میں بلا کر جسمانی تعلق پر مائل کرنا کسی طور بھی فطری محسوس نہیں ہو رہا تھا لیکن وہ پھر بھی جانان کے پاس چلا آیا تھا۔ تونگراب اپنے آپ سے انتہائی شرمندہ ہو رہا تھا۔ اُسے احساس تھا کہ اُس کا رویہ کسی طور بھی مہذب پن کے زمرے میں نہیں آتا تھا لیکن ذہن میں اُٹھنے والا تلاطم بھی کوشش کے باوجود اُس کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ کوئی چوک سا تھا کہ جس کے ٹریفک سگنل کے بلب ایک دم فیوز ہوئے اور ہر طرف سے آنے والی ٹریفک نے ایک دوسرے میں پھنس کر نکلنے کے سبھی راستے مسدود کر دیے۔

جانان کے کمرے سے چلے جانے کے بعد اُسے احساس ہوا کہ جس طرح سے وہ سمجھ رہا تھا، سب کچھ ویسا نہیں تھا۔ جانان کا اُسے یوں اپنے تخلیے میں بلا لینا کسی صورت حال کا ردعمل بھی ہو سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ جیسے اُسے جال میں پھنسا کر یوں پھڑکنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے، جانان بھی کسی ایسے جال کا شکار رہی ہو، یا اب تک چلی آ رہی ہو۔ لیکن پھر بھی تونگر اُس کے یوں اپنے قدموں میں بیٹھ کر جسم کو مَس کرنے یا لباس اور رویے سے جسمانی اختلاط پر مائل کرنے کو کسی طور بھی فطری رویہ سے تعبیر نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک شاطر بیوروکریٹ کا ماضی رکھنے والے نے بھی ان حالات میں

جانان کے گھر آتے ہوئے بس اِسی حد تک سوچا تھا کہ کوئی ایسی خاص بات ہو گی جس کا آفس میں بیان کیا جانا وہاں کے تقاضوں کے منافی رہا ہو گا لیکن اُس کی بجائے اُس سے الگ طرح کا غیر متوقع برتاؤ کیا گیا جس کے لیے ایک پامال ذہن قطعی طور پر تیار نہیں تھا۔ بہر حال جو بھی ہوا، تونگر اپنے رویے پر شرمندہ ہو رہا تھا۔ اگر کوئی دلربا لڑکی اپنی تمام تر نسائی ہُنر کے ساتھ اُس پر مائل بہ عطا ہو رہی تھی تو اُسے کیا ضرورت تھی اُس سے یوں بے اعتنائی برتنے کی۔ کہاں گیا وہ صاحبزادہ سلطان احمد تونگر کہ جسے اپنی رعونت آمیز مردانہ وجاہت سے حسیناؤں کو اپنی گرفت میں رکھ کر تڑپائے رکھنے کا زعم تھا۔ نجانے اُس کے خون کے بہاؤ میں کون کون سے غدود کی حیات بخش رطوبتیں شامل ہوئیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی آنکھیں شرر باری ہونے لگیں۔ جانان کی انگلیوں کا لمس اپنے آپ ہی ہر اُس جگہ پر جاگنے لگا کہ جہاں جہاں اُسے کچھ دیر قبل چھوا گیا تھا۔

لیکن ایسے میں ایک دھڑکا اور بھی تھا۔ اُس سے مایوس اور رنجیدہ ہو چکی جانان کیا واپس پلٹے گی یا اُسے چلے جانے کا پیغام بھجوا دیا جائے گا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا تونگر کے پچھتاوے اور ڈیپریشن میں بھی توں توں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ایسے میں کسی کے چلنے کی چاپ سنائی دی۔ تونگر کا پورا جسم سماعت گاہ بن گیا۔ یہ چاپ جانان کے قدموں کی تو نہیں تھی۔ اور پھر وہی ہوا کہ جانان کی بجائے اُس کی ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی۔ تونگر سکتے کی سی کیفیت میں تھا۔ لیکن ملازمہ اُسے وہاں سے چلے جانے کا کہنے کی بجائے چپ چاپ ایک کونے تک گئی اور وہاں رکھی ہوئی تپائی اُٹھا کر تونگر کے صوفے کے سامنے رکھ دی اور پھر انہی قدموں واپس چلی گئی۔

اُس کے جاتے ہی خوشبو کا ایک جھونکا آیا اور معطر کمرہ کچھ اور بھی معطر ہو گیا۔ جانان پہلے کی طرح کھل کھلاتی ہوئی آئی اور بیڈ کے ساتھ بنی ہوئی خوبصورت الماری کھول کر اندر سے بلیک ڈاگ وسکی کی بوتل نکال لائی۔ اِس دوران ملازمہ پھر سے ایک ٹرالی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی جس پر کرسٹل کے دو خوبصورت گلاس، پانی کی تھرموس اور ڈرائی فروٹ کی قابیں دھری تھیں جب کہ اُس کی نچلی منزل پر اسکاچ وسکی اور واڈکا کی کچھ اور بوتلیں ترتیب سے رکھی تھیں۔

''ہو سکتا ہے کچھ اِس طرح سے آپ کا موڈ ٹھیک ہو ورنہ آپ نے تو ہم سے بات نہ کرنے

کی قسم کھا رکھی ہے۔'' جانان ایک انداز دلربائی سے بدن کو لچکاتی ہوئی ٹرالی کے قریب آئی اور بلیک ڈاگ وسکی کے دو پیگ بنا کر اُن میں سے ایک اُٹھایا اور تونگر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہوئی صوفہ چیئر کے کشادہ بازو پر اِس طرح سے بیٹھی کہ بدن کا ملائم بوجھ اُس کے دائیں کندھے پر آ گیا۔ جانان کی مخصوص خوشبو کا ہالہ تونگر کے گرد رقصاں ہو گیا۔ مسحور ہو چکے صاحبزادہ تونگر کی آنکھیں بند ہونے لگیں تو جانان نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وسکی کا پیگ اُسی کے ہاتھ کی گرفت میں رہنے دیا۔

''میں نے سُنا تھا کہ بلیک ڈاگ آپ کا فیورٹ برانڈ ہے۔'' جانان نے اپنے لب تونگر کے کان کے قریب لا کر اِس طرح سرگوشی کی کہ آواز کی لہریں اُس کے پورے بدن میں ارتعاش پیدا کرتی چلی گئیں۔

''تم سے کس نے کہا؟'' تونگر کی آواز کہیں دور، بہت دور گہرائی میں سے آ رہی تھی۔

جانان نے وہیں، اُسی انداز میں اپنا ایک بازو تونگر کے کندھے پر دراز کرتے ہوئے گردن کے گرد حائل کیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنا پیگ اُٹھا کر پیمانے سے پیمانہ ٹکرا دیا۔ ایک ایک گھونٹ دونوں کے حلق سے اترا تو تکلم کا سلسلہ بھی وہیں سے جڑ گیا کہ جہاں سے ٹوٹا تھا۔ ''ہم تو آپ کے غلام ہیں سَر، ہم آپ کی خبر نہیں رکھیں گے تو کون رکھے گا۔''

''اچھے غلام ہو..... حکم چلاتے ہو، حاکمیت کرتے ہو اور پھر بھی غلام۔'' پہلا پیگ ختم ہونے کو آیا تو تونگر کے چہرے کا تناؤ بھی کم ہوتا ہوتا ہلکی ہلکی مسکراہٹ میں بدل گیا۔ جانان سے رہا نہ گیا، اُس نے تونگر کے کندھے پر بازو کا دباؤ بڑھایا تو اُس کے لب جانان کے لبوں کو چھونے لگے۔ ''آپ بھی کیا سمجھو گے کہ کیسی بدکردار لڑکی ہے، کس طرح کی زندگی گزار رہی ہے، جان نہ پہچان اور یوں ایک ایسے مرد کی قربت کی طلب گار ہو رہی ہے جو بظاہر اُس کی طلب پوری کرنے پر قادر ہی نہیں، وجہ نہیں پوچھیں گے؟''

اس سے پہلے کہ صاحبزادہ تونگر کوئی جواب دیتا، کمرے کا بند دروازہ کھلا، دونوں کی نگاہیں دروازے کی جانب اُٹھیں، دروازے میں اللہ ڈنو عبید اپنے پورے تیوروں اور قامت کے ساتھ

ساکت ہوا موجود تھا۔ اُس کی آنکھوں میں غیر یقینی اور چہرے پر درشتی تھی۔ تونگر اور جانان کی آنکھیں بھی اُسی پر مرکوز ہو چکی تھیں مگر حیرت اور خوف کی ملی جلی کیفیت میں پھیلی ہوئی۔

۲۱

حیدر گوٹھ کی جھیل کنارے والی بستی سے بھڑکنے والی آگ کچھ اس طرح پھیلائی گئی کہ دھواں پورے صوبے کی بستیوں سے اُٹھنے لگا تھا۔ حیدر گوٹھ کے واقعے کو پانچ روز گزر چکے تھے اور پورے ضلع میں پوری سول سیکشن اور دیگر عدالتوں کے ساتھ ساتھ وکلا نے پولیس اور انتظامی افسروں کے دفاتر کا بھی بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ دیوانی اور عدالتی ریمانڈ کے لیے عدالتوں میں پیش ہونا ممکن ہوا تو مجسٹریٹ اپنے گھروں میں بیٹھ کر ریمانڈ کی درخواستوں پر احکام دینے لگے۔ اس بات کی خبر وکلا ایکشن کمیٹی کے سربراہ اور آئندہ الیکشن کے صدارتی امیدوار خوشحال خان کو ہوئی تو اُس نے مجسٹریٹ صاحبان کی رہائش گاہوں کا گھیراؤ شروع کروا دیا۔ لہٰذا اب تو مجسٹریٹ صاحبان کے پاس کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ زیرِ حراست ملزمان کو ریمانڈ پر تھانے میں اور جوڈیشل ریمانڈ پر جیل جا چکے ملزمان کو ڈسٹرکٹ جیل میں جا کر دیں۔

رضوان ہاشمی سے معاملات طے ہو جانے کے بعد جونہی اگلے روز پورے صوبے کے وکلا نے حیدر گوٹھ کے وکلا کے ساتھ یکجہتی کے لیے ہڑتال کی تو خوشحال خان بھی روپوشی ترک کر کے منظرِ عام پر آ گیا اور احتجاجی وکلا کی قیادت سنبھال لی۔ ایف آئی آر میں نامزد وکیلوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے بھی عافیت اسی میں سمجھی کہ خوشحال خان کو اپنا رہنما تسلیم کرتے ہوئے فساد کو اتنا زیادہ پھیلا دیں کہ حکومت اور عدلیہ کے پاس ماسوائے جھک جانے اور سمجھوتہ کرنے کے اور کوئی آپشن باقی نہ رہے۔ حاجی بخش کے معاملے میں رضوان ہاشمی پہلی بار تشکیک کا شکار ہوا تھا۔ لیکن دل ہی دل میں مانتا تھا کہ اس میں قصور حاجی کا نہیں ہے۔ حاجی بخش نے تو وعدے کی پاسداری میں اتنی سی کوتاہی کی تھی کہ طے شدہ فیس میں سے باقی کی رقم ابھی تک نہیں بھجوائی تھی لیکن رضوان ہاشمی خود کس منہ سے دستِ طلب دراز کرتا کہ اُس نے تو حاجی کے انسانی اثاثوں میں سے انمول ترین

رہی خود اُس کا صوبائی بار کونسل کا پانچویں بار ممبر بننے کا خواب بھی ادھورا رہ جاتا۔

اُدھر دوسری جانب نہ تو ضلع کا سیشن جج وکلا سے مذاکرات کا کوئی عندیہ دے رہا تھا اور نہ ہی پولیس کا ڈی آئی جی اور ڈی پی اُو۔ صوبے کا چیف سیکریٹری تو کیا ضلع کا ڈپٹی کمشنر یا ڈویژنل کمشنر بھی کسی قسم کی کوئی لچک دکھانے پر آمادہ دکھائی نہیں دیتے تھے۔ بس اتنا تھا کہ ہڑتالی وکلا کی عدلیہ اور انتظامیہ مخالف نعرہ بازی یا دھرنوں پر کسی قسم کا ردعمل کا ظاہر نہیں کیا جا رہا تھا۔ وکلا کی جتھوں کی صورت آئے روز کی توڑ پھوڑ، دنگے اور فسادات اور پولیس اور انتظامیہ کے سینئر افسروں کے ساتھ ساتھ جج صاحبان پر بات بے بات جسمانی تشدد کے بڑھتے ہوئے واقعات کے بعد اب کے اوپر بیٹھے ہوئے بڑوں نے شاید پالیسی ہی بنالی تھی کہ حیدر گوٹھ کے واقعے کو ٹیسٹ کیس کے طور پر لینا ہے اور کسی طور بھی معافی تلافی یا مٹی پاؤ کی بات پر نہیں آنا کہ جس کے سبب ہر بار اُن کے حوصلے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

اِس دوران پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کا رویہ بھی وکلا کے ساتھ مخالفانہ رہا جس کا نہ تو رضوان ہاشمی سمیت خوشحال خان نے کوئی نوٹس لیا اور نہ ہی مقامی رپورٹرز کو خوش کرنے یا ڈرانے دھمکانے کی کوئی سنجیدہ کوشش کی گئی۔ بس تحصیل حیدر گوٹھ کے پریس کلب کے صدر کو پیغام بھجوا دیا گیا کہ صحافی ہو یا کوئی اور طرم خان، زندگی میں ایک نہ ایک بار تو کچہری آنا ہی پڑتا ہے اور یاد رکھا جائے کہ کچہری سے جان چھڑانے کے لیے اخبار نہیں، وکیل کام آتا ہے۔ یہی حال سوشل میڈیا کا تھا جہاں وکلا کے احتجاج کو وکلا گردی کا نام دے کر سماجی ردعمل پر مبنی طرح طرح کے میمز پوسٹ کیے جا رہے تھے۔ لیکن تھانہ کچہری سے اُکتائے ہوئے عام شہری وکیلوں کے خلاف اِس مہم کو کچھ زیادہ بے تابانہ نہیں لے رہے تھے۔ یوں کہیں کہ ملا جلا ردعمل تھا۔

رضوان ہاشمی اپنے تمام تر ذہنی خلفشار کے ہوتے ہوئے بھی صورتِ حال کو نہایت احتیاط سے جانچ رہا تھا۔ کوئی چھوٹی سی بھی غلطی، بے احتیاطی یا جذباتیت بنے بنائے کھیل کو بگاڑ سکتی تھی۔ اُس نے جہاں وکیلوں کی مقامی لیڈر شپ اور غیر سیاسی سینئر وکلا کو دامے، درمے، سخنے اپنی مٹھی میں کر رکھا تھا وہاں اُس نے وکیلوں کی ضلعی، ڈویژنل اور صوبائی قیادت کو بھی حلقۂ اثر میں لے رکھا

تھا۔ جہاں کہیں سے بھی چھوٹی سی خبر ملتی کہ تحصیل اور ضلع کے دیہاڑی دار وکیل بے روزگاری سے تنگ آ کر عدالتوں میں پیش ہونے کا سوچ رہے ہیں تو انھیں نوجوان وکلا پر مشتمل اسی کام کے لیے بنائے گئے جتھوں کے ذریعے دھمکانے کے بعد دلجوئی کے لیے اُن کے گھر خشک راشن بھی بھجوا دیا جاتا اور اگر کوئی کھاتا پیتا عمر رسیدہ وکیل اس طرح کی سوچ سوچتا ہوا بھی پایا جاتا تو اُس سے نمٹنے کے لیے ہم خیال سینئرز کا گروپ الگ سے تھا جو انھیں وکلا تحریک میں دراڑ ڈالنے سے اجتناب کی مودبانہ دھمکی دینے پر قدرت رکھتا تھا۔

ایک دن اور گزرا مگر صورت حال جوں کی توں رہی۔ وکلا کا وہی سارا دن کچہری میں جمع ہو کر دھرنے کی صورت نعرہ بازی کرنا، خوشحال خان کی جانب سے دن بھر مہیا کیے گئے چائے سموسے کے علاوہ دوپہر کو بریانی پر ہاتھ صاف کرنا اور گھر چلے جانا معمول بن کر رہ گیا تھا۔ اس ہڑتال میں اگر کوئی طبقہ بری طرح پس رہا تھا تو وہ مقدمات کے فریقین تھے۔ وکیل ان سے فیس لیتے ہیں اور حکومت اُن سے ٹیکس اور کورٹ فیس کہ جس سے انصاف پر مامور افسروں کو تنخواہیں اور دیگر سہولتیں دی جاتی ہیں۔ جب کہ عدالتی نظام کے ان ان داتاؤں کے لیے نہ تو کچہریوں میں بیٹھنے کی بنچیں ہوتی ہیں اور نہ ہی پینے کے لیے پانی یا رفع حاجت کے لیے کوئی بیت الخلا اور اگر وکیل ججوں کے خلاف ہڑتال کریں تو گھر بیچ کر انصاف لینے کے لیے کچہری آنے والے یہی لوگ اپنے بنیادی انسانی حقوق سے بھی محروم رہتے ہیں۔ اب بھی حیدر گوٹھ سے اُٹھنے والے فتنے کی سزا شمس پور ضلع کے وہ سارے لوگ بھگت رہے تھے کہ جو کسی نہ کسی طور عدالتی مقدمات کے فریق تھے۔ حالات کے تیور دیکھتے ہوئے رضوان ہاشمی نے صوبائی بار کونسل کے وائس چیئرمین پر صوبے بھر میں غیر معینہ مدت کے لیے ہڑتال کرنے کے لیے دباؤ بڑھا دیا مگر ایک روزہ ہو چکی ہڑتال کے بعد اب وہ کسی طور مزید ہڑتال کے لیے تیار نہیں تھا۔

ایک لمحے کے لیے تو رضوان ہاشمی گھبرا گیا۔ ضلع شمس پور سے ملحقہ اضلاع کی بار ایسوسی ایشن کے صدور تو اُس کا ساتھ دینے کو تیار تھے لیکن حکام پر جتنا دباؤ صوبائی بار کونسل کی ہڑتال سے پڑتا تھا وہ چار پانچ اضلاع کے وکلا کی ہڑتالوں سے نہیں پڑنے والا تھا۔ رضوان ہاشمی نے

شطرنج کی اس بازی کو ازسر نو ترتیب دیا اور ایک نئی چال چل دی۔ اُس نے اپنے ملحقہ اضلاع کے ان وکلا کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی کہ جو نہ صرف ان دنوں صوبائی بار کونسل کے ممبر تھے بلکہ ان کا آئندہ الیکشن میں بھی کامیابی کا پورا پورا امکان تھا۔ یہ سب وہی لوگ تھے کہ جن کی حمایت کے بغیر موجودہ وائس چیئرمین اگلی ٹرم میں کامیابی کا صرف خواب دیکھ سکتا تھا۔

یہ ترکیب بھی کارگر نہ ہو سکی۔ وائس چیئرمین کو نہ صرف اپنی اکثریت بلکہ اپنے الیکشن جیتنے کے ہنر پر بھی گھمنڈ تھا۔ وہ ذاتی تعلقات سے زیادہ کرنسی کی طاقت استعمال کرتا تھا اور ہر بار اپنے مخالف امیدوار کو پچھاڑ دیتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ لمحۂ موجود میں رضوان ہاشمی کے ساتھ ہو چکے ممبران صوبائی بار کونسل وقت پڑنے پر اُسی کے ساتھ کھڑے ہوں گے، رضوان ہاشمی کے ساتھ نہیں۔ معاملات ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر رضوان ہاشمی بھی وائس چیئرمین کی صحت مندی آزمانے کے لیے تیار ہو گیا لیکن بارگین کے لیے جتنی رقم کا اندازہ اُس نے دل ہی دل میں لگایا وہ وصول شدہ رقم میں سے ادا کرنے کی صورت میں اچھی بھلی مقدار اُس کے اکاؤنٹ سے نکل جاتی تھی۔ ایسے میں اُس نے حاجی بخشن سے بقایا فیس وصول کرنے کی ٹھانی اور زہاب کے معاملے پر ہو چکی عہد شکنی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پوری دھنائی کے ساتھ حاجی بخشن کا نمبر ڈائل کر دیا مگر تین چار بار کوشش کے باوجود نمبر ملا نہیں۔

حاجی بخشن کو وہ جتنا نقصان پہنچا چکا تھا وہ اُس بقایا فیس سے کہیں زیادہ تھا کہ جو اُس کے ذمہ واجب الادا تھی۔ اتنی سی بات تو رضوان ہاشمی بھی جانتا تھا کہ اب باقی کا کام اُسے زہاب کی قیمت پر اور خوشحال خان سے کیے گئے عہد کے لیے کرنا پڑے گا۔ ویسے بھی اس مرحلے پر وہ پیچھے ہٹنا چاہتا بھی تو نہیں ہٹ سکتا تھا کیونکہ حاجی بخشن اور خوشحال خان ایڈووکیٹ کا مقصد اور منزل ایک تھی۔ ایک کو مزید نقصان پہنچانے کے لیے وہ دوسرے کی کٹیا کھڑی نہیں کر سکتا تھا۔ سو زہر کے گھونٹ پی کر رہ گیا اس تسلی کے ساتھ کہ اگر زہاب بخشن کے لیے ہیرا تھی تو وہ اُسے کوہِ نور بنا کر سودا بازی کرے گا۔

حاجی بخشن سے کوئی جواب نہ ملنے کے بعد رضوان ہاشمی نے اپنے مفادات اور حاصل شدہ

منفعت کا تخمینہ لگا کر کچھ اتنی رقم خیال ہی خیال میں ایک طرف کر لی کہ اگر اس کے بدلے باقی کی رقم بچ جاتی ہے تو سودا برا نہیں۔ اَب اُس نے اسی پس انداز رقم کو پانچ پر تقسیم کر کے اس کے پانچویں حصے سے وائس چیئرمین کے ساتھ اگلے الیکشن کے لیے عطیے کے نام پر بارگین کا سلسلہ شروع کیا۔ اَب اسے رضوان ہاشمی کی خوش بختی کہیں کہ بات پانچویں حصے پر ہی بن گئی اور وہ صوبے کی سطح پر غیر معینہ مدت کے لیے ہڑتال پر مان گیا مگر ہفتے میں صرف ایک روز جمعہ کے لیے۔ رضوان ہاشمی کے لیے یہ بھی بہت بڑی کامیابی تھی کہ ایک تحصیل کے معاملے کو وہ صوبائی سطح تک لے گیا تھا۔ یوں پس منظر میں ہوتے ہوئے بھی اُس کا نام ایک بہت موثر اور کارساز وکیل رہنما کے طور پر تسلیم کیا جانے لگا تھا۔ یہ وہ شہرت تھی کہ جو اسے صوبائی بار کونسل کا وائس چیئرمین بن کر بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اب رہا ضلع شمس پور میں روزانہ غیر معینہ ہڑتال کا معاملہ تو وہ محض اُس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

صوبائی بار کونسل کی جانب سے ہر جمعہ کے روز ہڑتال کا اعلان ہوتے ہی عدلیہ اور انتظامیہ کے بڑوں نے اپنے تئیں اس صورت حال سے نکلنے کی ترکیبیں شروع کر دیں۔ عدلیہ کے علاوہ پولیس اور انتظامیہ نے بھی کوئی ایسا قدم اٹھانے سے گریز کی پالیسی پر کاربند رہنا ہی مناسب سمجھا کہ جس سے سلگ رہی آگ مزید بھڑک اُٹھے۔ پولیس اور انتظامیہ کا خیال تھا وکیل اور جج اصل میں دونوں ایک ہیں اور اُن دونوں نے جلد یا بدیر ایک ہی ہو جانا ہے۔ ایسے میں انتظامی افسروں کا اُٹھایا ہوا کوئی بھی ایسا ویسا قدم اُن دونوں کے نزدیک ناقابل معافی قرار پائے گا۔ نتیجتاً ٹھیکرا بھی اُن کے سر پر ٹوٹے گا اور رگڑا بھی انھیں لگے گا۔ لیکن اس کے برعکس ضلع شمس پور کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج نے ضلع بھر کے عدالتی افسروں کو حکم دے دیا کہ وہ اگلے روز سے باقاعدگی سے کورٹ روم میں بیٹھیں، کام کریں اور مناسب انتظار کرنے کے بعد بھی اگر کوئی فریق مقدمہ یا وکیل حاضر نہیں ہوتا تو اُس فریق کے خلاف کارروائی یقینی بنائی جاوے۔ مدعی نہیں تو دعویٰ خارج اور اگر مدعا علیہ غیر حاضر ہے تو کارروائی یکطرفہ عمل میں لانے سے گریز نہ کیا جائے۔

سیشن جج کے اِس حکم کو ضلع شمس پور کے وکلاء نے درخور اعتنا نہ جانا کیونکہ ماضی میں مختلف

اضلاع میں اس قسم کی صورت حال میں اس نوعیت کے احکامات سیشن ججوں کے لیے ہزیمت کا باعث بنتے رہے تھے۔ اگلے روز ضلع بھر کی عدالتوں میں تمام مجسٹریٹ اور جج صاحبان اپنی اپنی عدالتوں میں بیٹھ تو گئے لیکن سراسیمہ اور نوشتہ دیوار ہو چکے خوف سے ہچکچاہٹ کا شکار رکے جوان کے ستے ہوئے چہروں سے عیاں تھا۔ پہلی پکار پر مقدمات کے فریقین کی جانب سے کوئی پیش نہ ہوا تو حسب حکم اشتہارات انتظار میں رکھ دی گئیں۔ تھنٹہ دو گھنٹے کے بعد دوسری پکار پر بھی جب نہ تو وکیل حاضر آئے اور نہ ہی مقدمات کے فریق تو جج صاحبان نے سیشن جج کے حکم کے مطابق انھیں عدم پیروی کے زمرے میں خارج کرنا شروع کر دیا۔ ابھی ہر عدالت میں دس بارہ مقدمات ہی اس طور خارج ہونے ہوں گے کہ ضلع کچہری سمیت تینوں تحصیلوں میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ وکلا نے دھرنا چھوڑ کر جلوس نکال لیے اور سیشن جج کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے مختلف عدالتوں میں توڑ پھوڑ کے علاوہ ججوں کو کمرۂ عدالت سے باہر نکال کر عدالتوں کو تالے لگانے لگے۔ قسمن پور کی ضلع کچہری میں پہلا بھرپور حملہ سیشن جج کے خلاف ہوا۔ بپھرے ہوئے وکیلوں نے کمرہ عدالت کے اونچے پلیٹ فارم پر چڑھنے کے بعد سیشن جج کو طعنوں اور بددعاؤں کی ضربت میں رکھ لیا۔ سیشن جج کے عملے نے یہ حال دیکھا تو باہر کو بھاگنے لگے۔ کسی میں سے کسی نے پھرتی کی اور ڈرائیور سے سرکاری گاڑی کی چابی۔ ایسے میں کہ جب سیشن جج کو بچانے والا کوئی نہ رہا تو انھیں گھسیٹ کر کورٹ روم سے باہر لائے اور ضلع کی سب سے بڑی عدالت کو تالا لگا کر اس میں ہلچل ڈال دی۔

ضلع بھر کی سبھی کچہریوں میں نکلنے والے مشتعل وکلا کے جلوس، پولیس، اے سی اور ڈی سی کو بھلا کر اب ایک ہی نعرہ لگا رہے تھے کہ قسمن پور کے عوام دشمن، وکیل دشمن اور انصاف دشمن سیشن جج کو فی الفور نوکری سے نکالا جائے۔ صورت حال کا یہ غیر متوقع بدلاؤ رضوان ہاشمی اور خوشحال خان کو نہال کر گیا۔ انھیں اپنی منزل قریب دکھائی دینے لگی تھی۔

۲۲

اگرچہ گاڑی کے حیدر گوٹھ سے نکل کر جی ٹی روڈ پر آتے ہی حاجی بخشن نے خواب آور

گولیوں کی دگنی مقدار ایک گھونٹ پانی سے نگل لی تھی مگر سات گھنٹے کے سفر کے بعد بھی رات گئے لاہور پہنچنے تک نیند اُس کی آنکھوں سے دور ہی رہی۔ ہر طرف سے مسائل میں گھرے ہوئے ذہن میں فوری خدشہ ڈرائیور کی ممکنہ نیند کا بھی گھر کر کے بیٹھ گیا تھا۔ ایسے میں نیند کا گزر کہاں سے ہوتا۔ بس ایک غنودگی سی تھی کہ جس میں بیداری کا پہلو زیادہ حاوی تھا۔ لیکن اس غنودگی نے اُس کے کھولتے ہوئے دماغ کا درجۂ حرارت اتنا تو کم کر دیا کہ اُس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت قدرے بحال ہوگئی۔

راستے میں ایک ٹرک ہوٹل آیا تو اُس نے گاڑی رکوا کر ڈرائیور کو نیچے اتار دیا کہ وہ سگریٹ چائے پینے کے بعد تازہ دم ہو سکے۔ ڈرائیور کے نیچے اترتے ہی اُس نے فون اُٹھالیا۔ نجانے کس سبب اُس کا اس ڈرائیور سے اعتماد ایک دم ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ گزشتہ دو تین روز کے واقعات کے بارے میں اُس نے بہتیرا سوچا مگر کہیں سے بھی ڈرائیور مشکوک دکھائی نہیں دیا لیکن پھر بھی دل اُس کی گواہی دینے سے انکاری ہو گیا تھا۔ اِس قسم کے معاملات میں جس حس کو چھٹی یا ساتویں حس سے تعبیر کیا جاتا ہے، حاجی بخشن اُسے دل کی آواز کہتا تھا۔

ڈرائیور کی عدم موجودگی میں اُس نے پہلا فون فیض کریم کو کیا کہ جو کافی دیر سے اُس کی واپسی کا منتظر تھا۔ اُس نے چھٹتے ہی حاجی کو رُباب کے ابھی تک واپس نہ آنے کے بارے میں بتانا شروع کر دیا اور یہ بھی کہ اُس کے شکرے ابھی تک جبار کو تلاش کرنے میں بھی ناکام رہے تھے۔ اُس کے یوں بے تکان بولنے سے حاجی بخشن پٹڑی سے اترتا اترتا رہ گیا۔

"آ جائے گی رُباب بھی بھڑوے! جانا کہاں ہے اُس نے، اتنی چھوٹی سی تو دنیا ہے، خیر چھوڑ اُسے، جو میں کہتا ہوں وہ کر! میرے آئندہ حکم تک خدمت صرف لمبے روٹ کے ڈرائیوروں کی، چھوٹے موٹوں کی چھٹی اور ہاں نیٹو سے آنے والا ولایتی پانی ہوٹل پر نہ اُترے اور نہ ہی یہاں سے کسی ڈلیوری کا چکر، تم خود چلے جانا تیس کوس والے اسٹور پر اور پانی کو وہیں گراؤنڈ کرا دینا تاکہ کوئی بھڑوا منہ نہ مار سکے۔"

حاجی بخشن فون بند کرنے ہی لگا تھا کہ اُسے محسوس ہوا کہ فیض کریم اُس سے کچھ پوچھنا چاہتا

ہے۔ ”یہی پوچھنا ہو گا کہ میں کدھر ہوں اور کب آؤں گا! تو بھڑوے سُن کان کھول کر، میں جہاں بھی ہوں تمھیں دیکھ رہا ہوں اور جب آنا ہو گا تو بتا دوں گا۔“ اب کے حاجی بخشن نے دوسری طرف کی آواز پر کان دھرے بغیر فون بند کر دیا۔

لیکن یکا یک دل میں کیا خیال آیا کہ فون دوبارہ آن کر لیا۔ اسکرین پر فیض کریم سے فون کے دوران کسی اجنبی نمبر سے مِس کال آئی ہوئی تھی۔ حاجی بخشن نے خاصی دیر تک ذہن پر زور دیا مگر یہ نمبر کسی طور بھی اُس کے حافظے میں نہیں تھا۔ اُس نے ری ڈائل کرنے کے لیے بٹن کو دبانا چاہا مگر پھر کچھ سوچ کر اُنگلی اُٹھالی کہ ہو سکتا تھا کہ کوئی دشمن اُس کی موجودہ لوکیشن معلوم کرنا چاہ رہا ہو۔ اس خیال کے آتے ہی حاجی بخشن نے فون بند کر کے سیٹ پر ایک طرف رکھا اور باہر کھڑے ہوئے ڈرائیور کو گاڑی میں اندر آنے کا اشارہ کیا جو چائے اور سگریٹ کی حاجت پوری کرنے کے بعد ہونقوں کی مانند اُسے دیکھ رہا تھا کہ کب اشارہ ہو اور وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے۔

شب دو بجے کے لگ بھگ وہ لاہور پہنچا تو اُس کے بنگلے کی چار دیواری تک سو چکی تھی۔ چونکہ آج وہ اپنی آمد کا پہلے سے بتائے بغیر آیا تھا لہٰذا سیکورٹی گارڈ سمیت کوئی بھی اُس کا منتظر نہیں تھا۔ کافی دیر تک ہارن بجانے کے بعد ایک اونگھتے ہوئے غیر مسلح گارڈ نے مین گیٹ کھولا تو حاجی بخشن کا خون کھول اُٹھا۔ ”یہ ہیں وہ بھڑوے کہ جن کے بھروسے پر میں زندگی گزار رہا ہوں۔“ اُس کی بڑبڑاہٹ سُن کر ڈرائیور چونکا۔

”کچھ مجھ سے کہا صاحب؟“

”نہیں، تمھارے باپ سے کہہ رہا ہوں، وہ جو سامنے آنکھیں کھول کر کھڑا ہے۔“

ڈرائیور نے شرمندہ ہو کر آنکھیں اسکرین کے باہر مرکوز کر دیں لیکن ایسا کرتے ہوئے جن نگاہوں کے ساتھ اُس نے حاجی بخشن کو دیکھا تھا، وہ حاجی کی دید سے اوجھل رہیں۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹ کی تیز روشنی میں سیکورٹی گارڈ گیٹ پورا کھولنے یا نہ کھولنے کا فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ حاجی بخشن گاڑی سے اُتر کر اُسے کوئی جھانپڑ رسید کرتا ڈرائیور نے ہیڈ لائٹس آف کر دیں۔ سیکورٹی گارڈ نے پارکنگ لائٹس کی روشنی میں جونہی حاجی بخشن کو گاڑی میں بیٹھے دیکھا، اُس کی تو

جان ہی نکل گئی۔ جلدی میں پورا گیٹ کھولنے کی کوشش میں اُس کا فرشی ٹنڈا جام ہو کر رہ گیا۔ گھبراہٹ اور بڑھی تو یہ حربہ ناکام ہو گیا۔ رات بھر کے جاگے ہوئے اور پیش آمدہ صورتِ حال سے دل برداشتہ حاجی بخشن کا دل چاہا کہ نیچے اتر کر اُسے فنا کر کے رکھ دے مگر پھر نجانے کیا سوچ کر ڈرائیور کو نیچے اترنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود زہر کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اُسے آج پہلی بار لگا کہ کسی بھی ناپسندیدہ صورتِ حال میں کسی کی کوتاہی پر فوری ردِعمل دینا کس قدر نقصان کا باعث ہو سکتا ہے۔

حاجی بخشن نے تو ضبط کیا لیکن اُس کا غیظ اُس کے ڈرائیور میں منتقل ہو گیا۔ اُس نے گھبرائے ہوئے سیکورٹی گارڈ کو ایک طرف دھکا دیا اور فرشی ٹنڈے کو اوپر اٹھا کر گیٹ کھول دیا۔ سیکورٹی گارڈ کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے کہ ابھی حاجی بخشن اس کی آتما چھلنی کرتے ہوئے ادھیڑ کر رکھ دے گا لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ اُسے ویسے ہی حیران پریشان چھوڑ کر حاجی کی گاڑی گیٹ سے گزرتے ہوئے رہائش گاہ کی طرف بڑھ گئی۔

حاجی بخشن نے اپنے بیڈروم سے ملحقہ پڑھنے والی لائبریری کے دروازے کی چابی اپنی جیب سے نکالی اور تالے میں گھمائی مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ پہلی بار اُس کے اندر چھپا ہوا لاوا ضبط کے بندھن توڑنے پر آ گیا۔ مگر اس غیظ میں غضب سے زیادہ حیرت اور تجسس شامل ہو چکے تھے۔ اُس کا حکم تھا کہ اس دروازے کو اندر سے بند نہ کیا جائے کیونکہ جس کی چابی ہمیشہ اسی کے پاس رہتی ہے مگر یہ جرأت کس نے اور کس لیے کی ابھی پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ گھر میں تو وہ ملازموں سمیت صرف شہزادی رہتی تھی۔ اُن میں سے کسی کی جرأت نہیں تھی کہ حاجی بخشن کے حکم کو یوں روند کر رکھ دیں۔

اُس نے ایک دو بار پھر چابی گھمائی، دروازے کو دھکے دیے مگر صاف ظاہر تھا کہ وہ اندر سے بند ہے۔ حاجی بخشن نے اسے چھوڑ کر اس سے ملحقہ دروازے کو تھپتھپانا شروع کر دیا جو شہزادی کے بیڈروم کے نزدیک تھا، لیکن اُس کی آواز اب بھی شہزادی کے کمرے تک نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ بخشن نے جیب سے فون نکالا اور شہزادی کا نمبر ڈائل کیا۔ خلاف توقع اُس نے پہلی بیل پر

ہی فون اٹینڈ کر لیا۔

''تم جاگ رہی ہو اِس وقت؟'' بخشن کے لہجے میں تشکیک نما حیرت نمایاں تھی۔

''نیند نہیں آ رہی تھی۔'' شہزادی کی آواز میں اُسے پہلی بار کھنک سی سنائی دی۔

''کیوں؟'' بخشن اُس کی موجودہ کیفیت کا اندازہ لگانا چاہ رہا تھا۔

''آپ یاد آ رہے تھے۔'' شہزادی پھر کھنکی مگر بخشن کو تصنع کا تاثر ملا۔

''دروازہ کھولو میں باہر موجود ہوں۔''

حاجی بخشن کا یہ جملہ بجلی بن کر گرا اور دوسری جانب ایک لمحے کے لیے سناٹا چھا گیا۔

''تو آپ کہاں ہیں، اپنے کمرے میں؟'' شہزادی کے لہجے میں مسرت کے باوجود کھنک غائب ہو چکی تھی۔

''حرامزادی! دروازہ اندر سے بند رکھو گی تو میں کیسے اندر آؤں گا؟'' کوشش کے باوجود حاجی بخشن اپنے غصے کو دبانے میں ناکام رہا تھا۔ ''یہ دروازہ کھولو! بڑا دروازہ، مین والا۔''

گھبراہٹ میں شہزادی اپنا فون بند کرنا بھول گئی اور لپک کر دروازے پر پہنچی، جھٹ سے کھولا جس کے باہر بخشن اپنی آتش ہوئی آنکھوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ تھکاوٹ، کسل مندی اور یبوست اُس کے چہرے پر اشتہار بن کر چپکی ہوئی تھی۔ شہزادی کا دل دھک سے رہ گیا۔ بخشن نے اُسے مزید کچھ کہنے کی بجائے اُسے سر سے پاؤں تک نگاہ بھر کر دیکھا۔ رات کے دو بجے کے بعد کے عمل میں بھی وہ سجی سنوری اور خوشبوؤں میں نہائی ہوئی تھی۔ لباس بھی کچھ ایسا تھا کہ جیسے خاص طور پر کسی تقریب کے لیے یا اپنے کسی محبوب کے لیے بیوٹی پارلر سے بن ٹھن کر ابھی ابھی آ رہی ہو۔ شہزادی نے اپنے چہرے پر بے خوف مسکراہٹ لانے کی کوشش کی لیکن جب کامیاب نہ ہو سکی تو اپنے تاثرات چھپانے کے لیے آگے بڑھ کر بخشن سے لپٹ گئی۔

حاجی بخشن بولا اب بھی کچھ نہیں بس شہزادی کو اُس کے کھلے ہوئے بالوں سے پکڑا اور اِس طرح بل دیا کہ اُس کی گردن پیچھے کی طرف مڑ کر بخشن کے دائیں ہاتھ کو مَس کرنے لگی کہ جس ہاتھ کی گرفت میں اُس کے بال تھے۔ اِس طرح بال کھینچنے سے شہزادی کا کرب میں گرفتہ چہرہ اُبھر کر

بخشن کے سامنے آ گیا۔ شہزادی کے رس بھرے ہونٹ ادھ کھلے سے بخشن کے ہونٹوں کے روبرو تھے۔ اُس کا دل چاہا کہ ان ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں میں دبا کر اِن کا سارا رس اپنے حلق میں ٹپکا لے مگر جب دیکھا کہ ان ہونٹوں پر لگی ہوئی لپ اسٹک کہیں کہیں سے اُتری ہوئی ہے تو اُسے کراہت ہونے لگی کہ نجانے کون بھڑوا ان ہونٹوں کی لالی پر اپنے مکروہ ہونٹ صاف کر گیا ہے۔

مٹھی میں آئے ہوئے بالوں کو اچانک ہی بخشن نے ایک جھٹکا دیا جس سے شہزادی کا منہ دوسری طرف ہو گیا۔ دوسرے ہاتھ سے بخشن نے اُس کے بائیں بازو کو مروڑ کر پیچھے کی طرف کیا اور یوں اس حالت میں اُسے پہلے اپنے بیڈ روم کی لابی میں لے گیا جہاں باہر کھلنے والا دروازہ واقعی اندر سے بولٹ تھا۔ یہ حرکت غیر ارادی طور پر نہیں بلکہ عمداً ہی ہو سکتی تھی۔ حاجی بخشن نے پہلے تو شہزادی کو اُسی حالت میں اندر سے بولٹ دروازہ زبردستی دکھایا اور پھر اُس کے بال اور بازو چھوڑ کر اُسے تھپڑوں کی بوچھاڑ پہ رکھ لیا۔ دو چار منٹ یہ یلغار رہی تو بخشن ہانپ گیا۔ تھپڑوں کی ضربات سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو گیند کی صورت بناری شہزادی کسی آہ و بکا کے بغیر بس مار ہی کھاتی رہی۔ حاجی بخشن تھک چکا تو اُسے گھسیٹتا ہوا اُس کے کمرے میں لایا اور زور کی ایک لات اُس کے چوتڑوں پر مار کر بستر پر گرا دیا۔ دن بھر کے رکے ہوئے غصے، مایوسی اور پے در پے ناکامیوں نے ایک ہی ہلّے میں شہزادی کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ بخشن کے تشدد سے ادھ موئی لڑکی اُس سے پوچھ بھی نہ سکی کہ اُس کے ساتھ یہ سلوک کیوں، کس لیے؟

شہزادی کو اُس کے کمرے میں پھینکنے کے بعد طیش میں غضب ناک ہوتے حاجی بخشن نے چھ بیڈ روم کے اِس بنگلے کے وہ کمرے بھی کھنگال ڈالے کہ جو عرصے سے بند پڑے تھے۔ دونوں ملازماؤں کو کمروں سے نکال کر تلاشی لی گئی۔ یہی حال ڈرائیور اور سیکورٹی گارڈ کے کوارٹرز کا ہوا مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ آخر تھک ہار کر وہ اپنے بیڈ روم میں آیا تو ساڑھے تین بج چکے تھے۔ بدن ٹوٹنا شروع ہوا تو شراب کی طلب ہوئی۔ شراب کی طلب ہوئی تو شہوت نے جسم میں ہلکورے لینے شروع کر دیے۔ شہوت سر چڑھ کر بولی تو اُس نے شہزادی کو سامنے لا کھڑا کیا۔

"کیوں مارا میں نے اُسے، ویسے بھی اُسے جہاں بھیجتا ہوں، چپ چپیتے چلی جاتی ہے،

اُف تک نہیں کرتی تو آج اگر اُس نے اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ بستر سانجھا کر لیا تو کون سا جرم کر لیا؟، اُس بھڑوے تھانیدار نے بھی اُسے مجھ سے منگوا کر اپنے یار بیلیوں کے حوالے کر دیا تھا تو آج کون سی نئی بات ہو گئی کہ میں نے اِس بے چاری کی جان نکال لی۔'' بخشن اپنے کیے پر کچھ کچھ ندامت محسوس کرنے لگا تھا لیکن اُس کی یہ کیفیت پل بھر میں بدل گئی اور اُس کے اندر سے وہی پہلے والا بخشن پوری ڈھٹائی کے ساتھ باہر نکل کر کھڑا ہو گیا۔

''وہ میری زرخرید ہے، میرے روز ینے میں ہے، رکھیل ہے میری، تو کیا حق ہے اُسے اپنی مرضی کرنے کا، میں اُسے چاہے کالے چور کے پاس بھیجوں یا کسی افسر کے پاس، میری مرضی ہے ناں، لیکن اُس کی یہ جرات کیسے کہ یوں من مانی کرتی پھرے۔''

حاجی بخشن نے منہ میں آئی جھاگ کو باہر نکالنے کے لیے زور کا کھنکارا اور بیڈ سے اُٹھنے کی کوشش نہ کرتے ہوئے قالین پر ہی تھوک دیا۔ ایسے میں اُس کی نگاہ اُٹھی تو سامنے دروازے کی اوٹ میں شہزادی سمٹی سمٹائی، نگاہیں نیچی کیے آدھی ظاہر آدھی چھپی ہوئی کھڑی تھی۔ چہرے کا جتنا حصہ دکھائی دے رہا تھا وہ بری طرح سوجا ہوا تھا۔ گورے گورے نرم گالوں پر بخشن کی موٹی انگلیوں کے نشان پوری شدت کے ساتھ اُبھر آئے تھے۔ بخشن کا دل پسیج گیا مگر غصہ اب بھی اس کی راہ میں مزاحم تھا۔

''اندر مر اندر، وہاں کھڑی کیا کر رہی ہو حرامزادی!'' بخشن کی للکار سے اگرچہ وہ تھرا گئی لیکن پھر بھی سہمی سہمی سمٹی اندر آئی اور جھکی جھکی آنکھوں کے ساتھ اُس کے قدموں کی جانب کھڑی ہو گئی۔

''اُدھر جاؤ، دارو نکال لاؤ اور ساتھ میں کچھ کھانے پینے کا بھی۔''

شہزادی اِس طرح سے الماری کی طرف لپکی جیسے ایک لمحے کی تاخیر بھی اُسے پھر سے پھٹو پھٹ کر سکتی تھی۔ اُس کی اِدھر اُدھر کی جنبش میں اُس کا رسیلا بدن ڈھیلے ڈھالے ریشمی لباس میں کچھ اس طرح سے حرکت میں تھا کہ جیسے رقص کے کوئی نئے بھید بھاؤ موزوں کر رہا ہو۔ شراب کا پہلا گھونٹ ابھی دور تھا مگر بخشن کے خون کے بہاؤ میں سرور جاگنے لگا تھا۔ شہزادی کے ملبوس بدن کے سبھی اُبھار اپنی پوری پوری پیمائش کے ساتھ اُسے اپنے ہاتھوں کے تصرف میں محسوس ہونے لگے

تھے۔ چند ساعتوں میں وہ شراب اور دیگر لوازمات کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اُس کے قریب آ کر پیگ بنانے لگی۔ بخشن نے دیکھا کہ آنسوؤں کے سبب اُس کی آنکھوں کا کاجل بے ترتیب سا پھیل چکا تھا۔ اس پھیلاؤ میں آنسوؤں کی تازہ لکیریں اب بھی اُمڈے ہوئے سیہ بادلوں میں چمکتی ہوئی بجلی کے کوندے جیسی لگنے لگی تھیں۔ آنکھوں سے پھسلتی ہوئی بخشن کی نگاہ شہزادی کی ناک پر رکی جہاں بائیں نتھنے پر ایک چھوٹی سی خون آلود لکیر اُس کی تھپّلی پر پڑنے والی ضرب کی شدت کا پتہ دے رہی تھی۔ یہی حال نچلے ہونٹ کا تھا کہ جو دو جگہ سے ہلکا ہلکا چر گیا تھا۔ اس چرنے کے سبب اُس کا متورم ہونا تو لازمی امر تھا۔ بخشن نے شہزادی کے ہاتھ سے پیگ لے کر ایک بڑا سا گھونٹ بھرا۔ اُسے یوں لگا کہ جیسے شہزادی کا سوجا ہوا نچلا ہونٹ اُس کے ہونٹوں کی گرفت میں آ چکا ہو۔ رس بھرا، رسیلا، میٹھا جس میں بوند بوند خون کی ملاحت شراب کا سواد سوا کر رہی تھی۔

شراب پیتے ہوئے بخشن کی نگاہ شہزادی کے چہرے پر ایسی ٹکی کہ جنا مشوار ہو کر رہ گیا۔ اس دوران وہ پلنگ کی پائتی پر جسم کا تھوڑا سا حصہ ٹکائے نیچے قالین کی طرف دیکھتی رہی۔ پہلا پیگ ختم کرنے کے بعد بخشن نے گلاس اُس کی طرف بڑھایا۔ دوسرا پیگ بنا کر بخشن کے حوالے کرتے ہوئے شہزادی نے ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ اُس کی جانب کی۔ کیا کچھ نہیں تھا اس ایک ساعت کے دیکھنے میں۔ شکوے، شکایتیں، ناراضگی، بے بسی اور برگشتگی۔ بخشن تڑپ کر رہ گیا۔ کس قدر تسکین، کس قدر راحت اور کس قدر آسودگی تھی اس ملوک سے رس بھرے بدن میں کہ جسے پیار کرنے اور اُس سے طمانیت کشید کرنے کی بجائے اُسے ادھیڑ کر رکھ دیا گیا تھا۔

دوسرا پیگ بھی ختم ہو گیا مگر اُن کے مابین بات چیت بحال نہ ہو سکی۔ صورت یہ تھی کہ بخشن حیدر گوٹھ کے سبھی مسائل، معاملات اور پریشانیاں بھلا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں شہزادی کو بھنبوڑنے کی کوشش کر رہا تھا اور شہزادی اُس کے کاروباری تلاطم سے بے خبر اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے قالین کی بُر کو کھرچے اور ادھیڑے جا رہی تھی۔ تیسرا پیگ لیتے ہوئے بخشن نے شہزادی کو کلائی سے پکڑ لیا۔ رنگ برنگی کانچ کی چوڑیاں اس طرح کڑکڑائیں کہ ٹوٹتے ہوئے بھی شہزادی کی کلائی کو کئی جگہوں سے چھید ڈالا۔ اِن چھیدوں سے لہو کی ننھی ننھی بوندیں ابھی اُمڈنے کو تھیں کہ

بخشن نے ایک جھٹکے سے شہزادی کو اپنے اوپر گرا لیا۔

"بھڑوی! کسی کنجر کا بچ! کچھ تو تم میں ایسا خاص ہے کہ حیدر گوٹھ کا ایس ایچ اُو تمھارے لیے باؤلا ہوا پھرتا ہے، ابھی تو میں نے تمھیں زمانے کی نگاہوں سے بچا کر رکھا ہے، اگر سامنے آ گئی تو نجانے کس کس کا خون تمھارے سر چڑھے گا۔"

شہزادی اب بھی خاموش رہی۔ وہ کسی بھیڑیے کی مانند اُس کے جسم کو کاٹ رہا تھا، بھنبھوڑ رہا تھا، رگید رہا تھا لیکن اُس کی جانب سے بخش دبی دبی سسکیوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر کے بعد ہی بخشن ایک طرف ہو کر ہانپنے لگا۔ شہزادی برہنہ حالت میں اس طرح سے اُٹھ کر پلنگ سے ٹیک لگا کر بیٹھی کہ نہ تو نیم دراز تھی اور نہ ہی دراز۔ اُس نے پہلی بار حاجی بخشن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا کہ جو کنکھیوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شہزادی کی آنکھوں میں تمسخر تھا، ایسا تمسخر کہ جس کی تفہیم بخشن کے سوا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ بخشن کو یوں لگا کہ ایک ہاتھ سے شہزادی نے اُسے گردن سے دبوچ رکھا ہے اور دوسرے ہاتھ سے اُس کے سر پر جوتے برسائے جا رہی ہے۔ شہزادی سے آنکھیں ملانا اُس کے بس میں نہیں رہا تھا، سو اُس نے آنکھیں چراتے ہوئے موند لیں۔ بس ایک ہی خیال کسی چابک کی طرح اب بھی اُس کے ٹھنڈے خمار ذہن میں شڑاپ شڑاپ کیے جا رہا تھا کہ کاش ایسا ہو سکتا کہ دنیا کے سبھی مرد، مردانگی ختم ہوتے ہی مار دیے جاتے۔

اِس صورتِ حال میں وہ حیدر گوٹھ تو کیا اپنی زندگی سے بھی بے خبر ہو چکا تھا۔

۲۳

صاحبزادہ سلطان احمد تونگر گھر پہنچنے تک مسلسل کھولاؤ کی حالت میں رہا۔ اُسے پورا یقین تھا کہ جانان نے اُس کے ساتھ دھوکا کیا ہے وگرنہ کیسے ممکن تھا کہ کوئی بھی باہر سے آنے والا یوں دبے پاؤں براہ راست اپارٹمنٹ کے اُس کمرے میں چلا آئے کہ جس میں وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ نہ کوئی دستک اور نہ ہی کسی ڈور بیل کی آواز۔ وہ تو اِس بات پر بھی حیران تھا کہ اللہ ڈنو عبید عین اُس

وقت پر ہی کیوں آیا کہ جب خاصی دیر تک کمرے سے غائب رہنے کے بعد جانان واپس آئی اور شراب کے پیگ لیے ہوئے اُس کے ساتھ ایک ہی صوفہ چیئر میں گھس کر بیٹھ گئی۔ اس حالت میں اُن دونوں کو یوں بیٹھا دیکھ کر اللہ ڈنو عبید تو کیا کوئی بھی دیکھتا تو وہی سوچتا کہ جو اللہ ڈنو عبید نے سوچا اور اُس کا اظہار بھی کیا۔

''کیا سبھی عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں، نا تحقیق و نا شناس، وصف آدمیت سے عاری، خود غرض اور لالچ شعار۔'' وہ سوچتا رہا کہ جانان نے وہیں دراز ڈالی تھی جہاں ناہید نے محض لکیر کھینچی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اپنی فطرت کے برعکس اللہ ڈنو عبید نے نہ تو کوئی ہنگامہ برپا کیا اور نہ ہی جانان پر کسی قسم کا کوئی تشدد کیا۔ بس باتوں ہی باتوں طعن و تشنیع کے چرکے لگائے اور چل دیا جب کہ جانان انتہائی خوفزدہ اور گھبرائی ہوئی تھی۔ اُس کے جانے کے بعد بھی وہ مسلسل یہی کہتی رہی کہ بہت برا ہوا اب یہ شخص آپ کو تو کچھ نہیں کہے گا لیکن اُس سے بدلے کر رہے گا۔ اُسے اپنی ملازمہ پر شبہ تھا۔ وگرنہ کیسے ممکن تھا کہ کبھی اُس کے اپارٹمنٹ نہ آنے والا اللہ ڈنو عبید یوں چپکے سے وہاں چلا آئے۔ آخر باہر کا دروازہ کسی نے تو کھولا ہو گا۔ مگر تونگر کے نزدیک یہ سب پہلے سے لکھا ہوا اسکرپٹ تھا، اداکاری تھی کہ جس کا مقصد ایک سازش کے تحت اُسے مزید ہراساں اور ذلیل کرنا تھا۔ اللہ ڈنو عبید کے جاتے ہی وہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جانان اُس کی منتیں کرتی رہی کہ اس پریشان کن صورت حال میں وہ اُسے تنہا چھوڑ کر نہ جائے لیکن وہ چلا آیا۔ وہ اُس کے پیچھے دوڑتی ہوئی اپارٹمنٹ کے دروازے تک آئی لیکن وہ اُسے پلٹ کر دیکھے بغیر وہاں سے نکل آیا۔

ابھی وہ اسی انتشار سے باہر نہیں نکل پایا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور گھر کا خانساماں اندر چلا آیا۔ صاحبزادہ تونگر نے اپنی حیرت کو چھپائے رکھنے کے واسطے قصداً اُسے ایک ایک نگاہ غلط انداز سے دیکھا۔ وہ بیگم صاحبہ کا پیغام لایا تھا کہ کھانے پر اُس کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ ''یہ کیا ماجرا ہے! اس گھر میں تو مل کر کھانا کھانے کا کلچر ہی ختم ہو چکا تھا تو ایسے میں آج کیا ہو گیا کہ مجھے کھانے پر بلایا جا رہا ہے۔'' تونگر نے گھڑی پر وقت دیکھا۔ رات کے سوا نو ہو رہے تھے۔ ''تو کیا اس وقت تک میرا انتظار ہو رہا تھا؟ شاید ناہید کو میرا ابھر سے گئے وقتوں کی وضع میں سرِشام باہر جانا

ہضم نہیں ہو پا رہا تھا۔

''میں کھانا کھا چکا ہوں۔'' جاگی ہوئی بھوک کے باوجود اُس نے خانساماں کو ٹال دیا۔

''بیگم صاحبہ کہتی ہیں کہ کھانا کھا بھی چکے ہوں تو کچھ دیر کے لیے آجائیں۔'' اب کے تونگر کا پریشان ہونا بنتا تھا۔ ضرور کچھ خاص تھا کہ جس کے واسطے اتنا اصرار ہو رہا تھا ورنہ وہ ناہید کے لیے اتنا اہم نہیں رہا تھا کہ اُس کا رات کے کھانے پر اتنی دیر تک انتظار کیا جائے۔ ''شاید میری کسی رہی سہی جائیداد کو اپنے نام منتقل کرانا چاہتی ہو لیکن کون سی جائیداد؟'' تونگر کو دور دور تک کسی ایسی جائیداد کا شائبہ تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بلکہ ذہنی انتشار کچھ اور بھی بڑھ گیا تھا۔

اِس غیر یقینی کے عالم میں وہ ڈائننگ روم تک گیا تو حیرت کا ایک اور جھٹکا اُس کا منتظر تھا۔ سامنے ڈائننگ ٹیبل پر ملک الیاس اور ناہید خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ گھر کے سربراہ کی نشست پر ملک الیاس اور اُس کے پہلو والی کرسی پر ناہید بیٹھی ہوئی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی الیاس کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا لیکن ناہید نے اُسے کلائی سے پکڑ کر دوبارہ اُسی کرسی پر بٹھا دیا۔ تونگر کھسیانا سا ہو کر ٹیبل کی دوسری جانب ناہید کے مقابل بیٹھ گیا۔ وہ اُس کے آنے سے پہلے ہی کھانا شروع کر چکے تھے۔ لاشعوری طور پر اُس نے ایک ہی نگاہ سے دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ اُس کے بیٹھ جانے کے بعد بھی اُس کی موجودی کو نظر انداز کرتے ہوئے کسی بے تکے موضوع پر اپنی گفتگو کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ اللہ ڈنو عبید کے پاس موجود اُن کی خلوت کی ویڈیوز کے منظر تونگر کی آنکھوں کے سامنے پرچھائیوں کی طرح لہرانے لگے مگر وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

''جناب کہاں ہوتے ہیں آپ! سنا ہے پھر سے سرِ شام گھر سے غائب رہنے لگے ہیں؟'' ملک الیاس نے تونگر کو یوں اپنی جانب خالی آنکھوں سے تکتے دیکھا تو ناہید کی بات کو ادھورا چھوڑ کر اُس کی جانب پلٹ آیا۔ اُس کے لہجے میں نہ تو تکریم تھی اور نہ ہی پہلے جیسا لحاظ، بس طنز تھا، تشنیع تھی۔

''لگتا ہے تم اب بھی مجھ پر نظر رکھتے ہو۔'' تونگر نے ناہید کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنے پہلے والے لہجے میں الیاس کو جواب دیا۔ مگر وہ دونوں گڑبڑائے نہیں۔ الیاس نے تو بات

کو قہقہے میں اُڑا دیا لیکن ناہید اُس کا نوٹس لیے بغیر پہلے والے موضوع پر پھر سے الیاس سے بات کرنے لگی۔ لیکن صاف محسوس ہو رہا تھا کہ الیاس اُس کی بجائے تونگر سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ بار بار تونگر کی طرف دیکھتا لیکن ہر بار ناہید اُسے اپنی جانب متوجہ کر لیتی۔ عجیب بات یہ بھی تھی کہ اُسے کھانے پر بلایا گیا تھا لیکن ناہید نے اُسے ایک بار بھی کھانا لینے کو نہیں کہا اور اپنی گفتگو میں مگن رہی۔ نجانے کیا وجوہات رہی ہوں گی کہ جن کے سبب تونگر اپنے لیے کھانا نکالنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔ حالانکہ گھر اُس کا تھا، کھانا اُس کے روپوں سے بنا تھا اور بیوی بھی اُس کے روبرو تھی تو پھر بھوک کے باوجود کھانا لینے کے لیے کسی اور کی طرف سے درخواست کیے جانے کی توقع یا امید کس لیے۔ غالباً اُس ماحول میں تونگر کے واسطے ایک اجنبیت در آئی تھی جو اُس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔ نجانے اُس کا تحکمانہ رویہ کہاں گیا جو کبھی وہ ان دونوں سے روا رکھتا تھا۔ حیرت تھی کہ اُن دونوں کے ناجائز تعلقات کی ویڈیوز کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود وہ نہ صرف اُن سے خوفزدہ تھا بلکہ عجیب نوعیت کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو چکا تھا۔ جب کہ اِس کے برعکس وہ دونوں ذہنائی برتری میں تھے شاید یہ سوچ کر کہ تونگر و اُن کے جسمانی تعلقات کا علم نہیں۔

''تونگر صاحب! آپ کھانا نہیں کھا رہے؟'' جب الیاس نے اِس طرز تخاطب پر تونگر ششدر رہ گیا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اُس کا پالتو اور اُس کی ہر خواہش پر دم ہلانے والا اب اُس کے گھر کھانے کی میز پر اُس کی جگہ بیٹھ کر اُسے اُس کے نام سے پکار رہا تھا۔

''حیرت ہوئی کہ تم اب میرے سامنے میرا نام لینے لگے؟''

''ابھی تو میں نے صرف آپ کا نام لیا ہے صاحبزادہ سلطان احمد تونگر! تھو تھو نہیں کی۔ پھر کیا کریں گے جب چاروں طرف سے آپ پر تھو تھو ہوا کرے گی۔'' الیاس ملک کا لہجہ ایک دم بدل گیا تھا، لگتا نہیں تھا کہ وہ کبھی اُس کا باکار رہا ہوا ہے جو اُس کے سامنے اونچا سانس لینے کی بھی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ جب کہ ناہید اب بھی جان بوجھ کر لاتعلق سی ہوئی کھانا کھانے میں مگن تھی کہ جیسے دل ہی دل میں پہلے سے ڈیزائن کی گئی صورتِ حال کا مزہ لے رہی ہو۔ پھر بھی انکھیوں سے اُس کی دید اور کان، اُن دونوں پر مرکوز تھے۔

"بالآخر تو مجھ پہ تھوکا کرے گا۔" توگر کے اندر دبا ہوا تمام تر طیش اس ایک جملے کے سبب دوبارہ سے پھوٹ کر باہر آ گیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور پوری قوت سے ملک الیاس کو چانٹا مارنا چاہا مگر اس سے پہلے ملک نے وہیں بیٹھے بیٹھے بہت سرعت سے اس کی کلائی دبوچ کر اس طرح مروڑ دی کہ اس کی کلائی کی ہڈیاں ٹوٹتے ٹوٹتے بچیں۔ توگر تڑپ کر رہ گیا اور وہ پھر سے کرسی پر گر کر بیٹھ گیا۔ مروڑی گئی کلائی سے اٹھنے والی درد میں اور تذلیل کے کرب نے اس کے چہرے کے نقوش بگاڑ دیے تھے۔

"یہ انہیں تھا کہ ریاضت نے یہ فن صرف عورت سے کھیلنے کے لیے ہی نہیں سیکھا کہ عقل سے بھی پیدل ہو گئے ہو۔" ناہید کی زبان پہ زہر اور آنکھوں میں نفرت تھی۔ توگر نے اسے اس کے انداز میں دیکھا لیکن چند ساعتوں ہی میں بے بسی سے مغلوب ہو کر شرمندگی سے ادھر ہو کے توگر سے وہاں بیٹھے رہنا مشکل ہوا تو اس نے اٹھ کر جانے کے لیے پیچھے کی طرف قدم اٹھائے لیکن ناہید کی داخلی دھمکی کے سبب کھڑا نہ ہو سکا۔

"ابھی بیٹھو ادھر۔ جس بات کے لیے ہم بیٹھے ہیں اس کا جواب اسے دے دو، جو میں پوچھ رہی ہوں اس سے۔" ناہید کی گمبھیر آواز میں کراہت جھلک رہی تھی۔

"تم پوچھو۔" توگر پھر اکڑ رہ گیا۔ ناہید ہر وقت ہر بات ملک صاحب کہنے والی اب الیاس اب اس کے سامنے ہی اسے تم کہہ کر مخاطب ہو رہی ہے۔ ناہید نے معنوی ناگواری سے الیاس کی طرف دیکھا لیکن الیاس نے مسکراتے ہوئے گردن اثبات میں ہلا دی۔ "تمہیں پوچھنے کا اچھا تجربہ ہے۔ میری نسبت بہتر پوچھو گی۔"

"اللہ ڈنو جیدے سے تمہارا کیا معاملہ چل رہا ہے۔" ناہید نے یکایک اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت سفاکی سے پوچھا۔ اللہ ڈنو کا نام سنتے ہی صاحبزادہ توگر اندر سے ہل کر رہ گیا لیکن کوشش کی کہ اپنے آپ کو بظاہر مجتمع رکھ سکے۔ اس دوران اگرچہ وہ خاموش ہی رہا لیکن ناہید نے اپنی آنکھوں کو بدستور اس کی آنکھوں پہ مرتکز کیے رکھا۔ الیاس اس اثنا میں شاید اپنی باری کے انتظار میں لاتعلق بنا رہا لیکن جب کافی دیر تک توگر نے کوئی جواب نہ دیا تو اسے مداخلت

کا موقع مل گیا۔

''کچھ پوچھا ہے میڈم صاحبہ نے تم سے۔'' اِلیاس کا کچھ ہی دیر میں ''آپ'' سے ''تم'' پر آجانا بہت کچھ آشکار کر رہا تھا۔

''میں پابند نہیں ہوں کہ تم دونوں کی کسی بات کا جواب دوں، ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ وہ میرا دوست ہے۔'' تونگر کے لہجے میں بھی کڑک واپس آرہی تھی۔

''کب سے دوست ہے؟'' اِلیاس نے تمسخر بھرے انداز میں مودب ہو کر پوچھا۔

''تمھیں اِس سے مطلب، تم دونوں کو یہ خوف ہے کہ وہ تمھارے پول نہ کھول دے مجھ پر۔'' تونگر نے اگرچہ بات یہیں ختم کرنے والے انداز میں جواب دیا لیکن یہ جواب ناہید اور اِلیاس دونوں کو چونکا گیا۔ انھوں نے قدرے پریشانی سے کرمعنی خیز انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا، بس چند سیکنڈز کے لیے اور اُس کے بعد اُن کے چہرے ایک نئی حکمت عملی کی خبر دینے لگے۔ اُن کے چہروں پر سکون تھا کہ ڈھٹائی، کچھ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا۔

''تم شاید نہیں جانتے کہ اُس کا دھندہ کیا ہے اور تمھیں کس مقصد کے واسطے استعمال کیا جا رہا ہے۔'' اب کے ناہید کے لہجے میں ملائمت تھی مگر کدورت پھر بھی عیاں تھی۔

''مجھے نہ تو اُس کے دھندے سے غرض ہے اور نہ ہی اپنے استعمال ہونے سے، جس طریقے سے مجھے تم نے استعمال کیا ہے کیا وہ اِس سے بھی بدتر کرے گا؟'' تونگر جھنجلا گیا تھا۔

''تم شاید بلیک میل ہو رہے ہو؟'' اِلیاس غیر فطری طور پر پُرسکون تھا۔

''اور یہ موقع اُسے کس نے دیا؟ تم آستین کے سانپ تھے اِلیاس، تم نے میری ویڈیوز بنائیں اور اُس کے حوالے کر دیں۔'' صاحبزادہ تونگر بری طرح پھٹ پڑا تھا۔

''یہ بالکل بکواس ہے۔'' اِلیاس طیش میں پھنکارا۔

''کیا یہ بھی بکواس ہے کہ تم مجھ سے کروڑوں روپے کے کنٹریکٹ اُسے دلوا کر اپنے نام سے میری خوشامد کے لیے کی گئیں پارٹیاں اللہ ڈنو عبید سے کرواتے رہے۔''

''تم شروع ہی سے چوتیا تھے تونگر، اِس طرح کے معاملات میں اِس طرح ہی ہوتا ہے، جو

مفاد لیتا ہے، خرچہ بھی وہی کرتا ہے۔'' اِلیاس اب کے انتہائی دھیما تھا۔

''تم نے عیاشی کی، عبید نے مال بنایا، میں نے تو صرف بھاگتے چور کی لنگوٹ پر ہاتھ رکھا۔''

تونگر پھر اُٹھ کھڑا ہوا لیکن اِلیاس نے ایک بار پھر اُسے بٹھا دیا۔

''تونگر! میری بات غور سے سُن لو، مجھے یقین ہے کہ اللہ ڈنو عبید تمھیں تمھاری ویڈیوز کی بنا پر بلیک میل کر رہا ہے، تم اگر بلیک میل ہو گئے تو ایسی دلدل میں پھنسو گے کہ نکلنے کا راستہ تو کیا سانس لینے کے لیے آکسیجن بھی نہیں ملے گی۔''

ایسے میں تونگر سے رہا نہیں گیا، فوراً ہی پھٹ پڑا اگر لہجہ دھیما رکھا، ''ویڈیوز تو تم دونوں کی بھی ہیں، تم کیوں نہیں ہوئے بلیک میل؟، اُس نے کیا نہیں یا تم ہوئے نہیں؟ تم سے کیا کام لیا ہے اُس نے، تم کہاں استعمال ہوئے ہو؟ مجھے بھی بتاؤ ناں، تاکہ میں بھی اِس گیم کو سمجھ سکوں۔''

''تو تم کو سب پتا ہے ہمارے بارے میں؟'' ناہید کا لہجہ ہی نہیں الفاظ بھی سرد تھے۔

''پتا ہی نہیں، وہ سب کچھ دیکھ رکھا ہے کہ جو تم دونوں کرتے رہے ہو۔'' تونگر نے بات ختم کرنے کے لیے آخری کارڈ بھی کھیل لیا۔''تم دونوں اِس قابل ہی نہیں کہ آج کے بعد کسی بھی حوالے سے میرے تعلق میں رہ سکو۔''

''اگر یہ سب کچھ طے ہو چکا تو پھر تمھیں یہ گھر چھوڑنا ہو گا، ابھی چھوڑ دو یا کل صبح، آپشن تمھارے پاس ہے۔'' ناہید کے ہاں سفاکیت اُسی طرح موجود تھی۔

''میں کیوں چھوڑنے لگا یہ گھر، میرا اپنا گھر؟'' تونگر نے خشمگیں ہو کر ناہید کی طرف دیکھا۔

''تونگر صاحب! جس طرح تم میری زندگی کا ماضی ہو چکے ہو اُسی طرح تمھاری سبھی جائیداد میرے نام ہو چکی ہے، اب یہ تم پر منحصر ہے کہ معاملہ عدالتوں میں لے جاؤ، مقدمے لڑو اور پھر انتظار کرو کہ کب تمھارے حق میں فیصلے آتے ہیں، زندگی میں یا مرنے کے بعد، اور ہاں دوسری آپشن یہ ہے کہ جو عزت بچ رہی ہے اُسے پوٹلی میں باندھو اور خاموشی سے ایک طرف ہو کر بیٹھ جاؤ، تمھارے اخراجات کے واسطے تمھاری پینشن ہی کافی ہے۔''

''میں کیسے تمھاری زندگی کا ماضی ہو گیا؟'' حیرت اور صدمے سے تونگر کی زبان میں لکنت

آنے لگی تھی۔

"اچھا؟ تمھیں یاد نہیں کہ تو نے کب مجھے طلاق دی تھی؟" ناہید کے چہرے پر تفاخر تھا، بے باکی یا ڈھٹائی، سکتے میں آئے ہوئے تونگر سے کچھ طے نہیں ہو پا رہا تھا۔

"طلاق اور میں نے؟ میں نے کب طلاق دی تمھیں، جھوٹ بولتی ہو تم۔" تونگر حواس باختہ ہو رہا تھا۔

"تم سب کچھ گنوانے کے ساتھ ساتھ اپنی یادداشت بھی گنوا بیٹھے ہو، ایک سال ہو گیا طلاق دینے اور اب تو وہ قانونی طور پر موثر بھی ہو چکی ہے۔" ناہید نے بھی اس بازی کا آخری کارڈ شو کرا دیا تھا۔

"یہ بکواس ہے، جعل سازی ہے، میں نے تمھیں ہرگز طلاق نہیں دی۔" تونگر شدید غصے میں کرسی کو ایک طرف دھکیلتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو! اگر رہی سہی عزت بھی گنوا کر دنیا کو تماشا دکھانا ہے تو کر لو چیلنج اس طلاق کو کسی عدالت میں، پھر دیکھتے ہیں کہ تم کیسے اور کب تک مجھے اپنی بیوی بنائے رکھتے ہو۔" ناہید کے چہرے پر اب تفاخر تھا، بس تفاخر اور وہ بھی پوری بے مروتی کے ساتھ۔

۲۴

شمس پور کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج پر وکلا کے حملے اور ضلع بھر کی عدالتوں کی تالہ بندی نے تحصیل حیدر گوٹھ کی کچہری سے اُٹھنے والے دھوئیں کو اس قدر شر بار کیا کہ صوبے بھر کی بار اور بینچ میں صرف فاصلے ہی نہ بڑھے بلکہ اُن کے درمیان اَنا اور کدورتوں کی بہت اونچی دیوار بھی حائل کر دی گئی۔ ایک طرف ضلعی عدلیہ کے جج وکلا کی بڑھتی ہوئی متشددانہ کارروائیوں کے سبب بے وقار اور غیر محفوظ ہو چکے تھے تو دوسری جانب وکلا اس بات کے شاکی ہوتے ہوئے عدلیہ پر برہم تھے کہ اُن کا ساتھ دینے اور اُن کے مسائل کا کوئی حل نکالنے کی بجائے اُلٹا اُن کے مقدمات کو بلا سماعت یکطرفہ طور پر خارج کیا جانے لگا تھا۔ وکلا کی تحریک جو تحصیل حیدر گوٹھ کے ایک

مجسٹریٹ کے خلاف شروع کی گئی تھی اب اُس کا نشانہ ضلعی عدلیہ کا سب سے بڑا جج تھا۔ اس کے نتیجے میں وہی آفیسر ہی نزاع کا باعث بن گیا کہ جس نے پہلے سے موجود تنازعے کا کوئی حل نکالنا تھا۔ وکلا کا مطالبہ اب صوبائی ہائی کورٹ سے تھا کہ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج سمیت تمام ضلع کے ججوں کو نہ صرف یہاں سے تبدیل کیا جائے بلکہ اُن کے طرزِ عمل کے سبب اُن کے خلاف محکمانہ کارروائی بھی عمل میں لائی جائے۔ اِس تبدیل شدہ صورتِ حال میں اگر کسی کے لیے اطمینان اور چھٹکارے کا راستہ نکلا تھا تو وہ انتظامیہ اور پولیس تھی۔ ڈپٹی کمشنر اور ڈسٹرکٹ پولیس آفیسر نے ضلع کے سبھی ماتحت افسروں کو خبردار کر دیا تھا کہ اِن حالات میں وہ کوئی ایسا قدم نہ اُٹھائیں کہ جس کے نتیجے میں وکلا کی توپوں کا رخ اُن کی طرف ہو جائے۔ اس تنبیہ میں یہ بھی واضح کر دیا گیا تھا کہ عدلیہ کی جانب سے ممکنہ طور پر دیئے گئے کسی بھی ایسے حکم کی تعمیل میں قصداً تاخیر کی جائے جس سے وکیلوں کے اشتعال میں آنے کا احتمال ہو۔

اِس واقعے کے فوراً بعد سیشن جج نے اپنی رہائش گاہ میں بنائے گئے کیمپ آفس میں ضلعی صدر مقام پر تعینات جج صاحبان کا اجلاس بلالیا جس میں طے پایا کہ صوبائی ہائی کورٹ کو تفصیلی رپورٹ بجھوانے کے ساتھ ساتھ اُن تمام وکلا کے خلاف نہ صرف تعزیرات پاکستان بلکہ انسداد دہشت گردی ایکٹ کی دفعہ ۷ کے تحت فوجداری کارروائی کا آغاز کیا جائے جو انفرادی اور اجتماعی طور پر اِس جرم کے ارتکاب میں ملوث پائے گئے ہیں۔ اجلاس میں یہ بھی طے پایا کہ شرپسند عناصر کے خلاف موثر ترین کارروائی کے لیے ڈپٹی کمشنر اور ڈسٹرکٹ پولیس کو بھی کیمپ آفس میں بلا لیا جائے۔ لیکن اُن کے دفاتر میں رابطے پر واپسی اطلاع دی گئی کہ وہ دونوں شمس پور میں موجود نہیں۔

اِس اطلاع نے سیشن جج کو ملنے والی اُس خفیہ رپورٹ کی تصدیق کر دی کہ انتظامیہ کے ساتھ ساتھ پولیس بھی اپنے آپ کو عملی طور پر ضلعی عدلیہ اور وکلا کے باہمی تنازعے سے الگ رکھنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ سیشن جج نے ضلع کے سینئر سول جج کو حکم دیا کہ وہ انتظامیہ اور پولیس کے ضلعی سربراہان کی عدم موجودگی کی وجوہات معلوم کرنے کے ساتھ ساتھ سپرنٹنڈنٹ سیشن کورٹ کی مدعیت میں آج کے واقعہ کی ایف آئی آر تھانہ سول لائنز میں درج کرانے کا اہتمام کرے۔ سینئر

سول جج نے کچھ ہی دیر بعد زبانی رپورٹ پیش کی کہ ڈپٹی کمشنر اور ڈسٹرکٹ پولیس آفیسر دونوں اپنی رہائش گاہوں میں موجود ہیں لیکن عملہ کو اِس کے برعکس بیان کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ سیشن جج جو پہلے ہی حالتِ غضب میں تھا کچھ اور غضبناک ہو گیا۔ اُس نے اپنے سپرنٹنڈنٹ کو صوبائی چیف سیکریٹری اور انسپکٹر جنرل آف پولیس سے ٹیلی فون پر بات کرانے کو کہا مگر سینئر ایڈیشنل سیشن جج اور سینئر سول جج نہایت ادب سے آڑے آ گئے۔

''سر! حالات پہلے ہی بہت خراب ہیں اور ایسے میں ہمیں کوئی نیا محاذ نہیں کھولنا چاہیے، ڈپٹی کمشنر اور ڈسٹرکٹ پولیس آفیسر دونوں کی جرات ہی نہیں کہ وہ آپ کی حکم عدولی کریں، انھیں یقیناً اوپر سے ایسا کرنے کو کہا گیا ہوگا، کچھ فائدہ نہیں ہوگا انھیں شکایت کرنے کا، اُلٹا یہ شرمندہ ہونے کی بجائے ڈھیٹ بن جائیں گے۔''

سیشن جج اُن کی بات پر توجہ دینے کی بجائے اُلٹا اُن دونوں پر برس پڑا۔ ''اِن کی یہ جرات کہ میرے حکم پر میٹنگ میں آنے کی بجائے گھر میں بیٹھے رہیں، میں آج اور ابھی انھیں سیدھا کرتا ہوں، صوبے کا عدالتی نظام بل کر رہ گیا ہے اور ڈی سی، ڈی پی او صاحب گھر بیٹھے بانسری بجا رہے ہیں، ملاؤ فون آئی جی اور چیف سیکریٹری سے۔''

میٹنگ میں شریک تمام جج اپنی اپنی کرسیوں میں دبک گئے۔ ہر طرف سکوت سا چھا گیا۔ سینئر سول جج اور سینئر ایڈیشنل سیشن جج بھی چہروں پر ماتحتانہ خجالت لیے اندرو اندری لاتعلق ہو کر بیٹھ گئے۔ سپرنٹنڈنٹ نے باری باری چیف سیکریٹری اور آئی جی کے دفاتر میں فون کیے مگر اُن میں سے کوئی بھی اپنے آفس میں نہ ملا۔ لہٰذا شمس پور کے سیشن جج کے نمبر اِس تاکید کے ساتھ اُن کے پرائیویٹ سیکریٹریوں کو لکھوا دیئے گئے کہ ایمرجنسی ہے، فوراً بات کرائی جائے مگر یہ بات اگلے ایک گھنٹے میں بھی نہ ہو سکی۔ اِس دوران الیکٹرانک میڈیا کے ساتھ ساتھ سوشل میڈیا پر بھی ٹکرز چلنے لگے اور پوسٹیں لگنے لگیں۔ الیکٹرانک میڈیا مکمل طور پر وکلا کو قصوروار گردان رہا تھا جن کے لیے وکلا گردی کی استعمال ہونے والی ترکیب اب اجنبی نہیں رہی تھی لیکن سوشل میڈیا پر ملا جلا ٹرینڈ تھا۔ ایک پوسٹ اگر عدلیہ کے حق میں لگ رہی تھی تو دوسری عدلیہ کے خلاف۔ سیشن جج کو خاص طور

پر صورتِ حال بگاڑنے اور انصاف کے تقاضوں کے منافی حکمت عملی اپنانے کا ذمہ دار ٹھہرایا جارہا تھا۔ جب کہ سیشن جج اِن تمام ٹرینڈز سے قطع نظر مسلسل پولیس، انتظامیہ اور وکلا کے رویوں پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے اب سینئر ججوں سے آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں مشاورت کرنے لگا تھا۔ لیکن کوئی بھی سول جج یا ایڈیشنل سیشن جج اپنی انفرادی رائے دینے سے گریزاں تھا۔ سب ہاں میں ہاں ملا رہے تھے لیکن دل ہی دل میں پریشان تھے کہ دیکھیں کس کا کہاں ٹرانسفر ہوتا ہے کیونکہ ماضی میں ہونے والے لاتعداد واقعات کا منطقی نتیجہ اُن کے سامنے تھا۔

آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں ضلعی عدلیہ کے جج صاحبان تو اپنی مشاورت مکمل نہ کر پائے لیکن وکلا نے اس سے پہلے ہی اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان اب حیدر گوٹھ کی تحصیل بار یا ضلع شمس پور کی ڈسٹرکٹ بار کی طرف سے نہیں تھا بلکہ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج شمس پور کی مبینہ کرپشن اور وکلا کے ساتھ غیر انسانی رویہ اپنانے کے خلاف صوبائی بار کونسل کی جانب سے صوبہ بھر کی عدالتوں کے تا حکم ثانی بائیکاٹ کا تھا۔

کافی دیر سے سیشن ہاؤس کی میٹنگ میں بیٹھے ہوئے ضلعی صدر مقام کے جج صاحبان کے چہرے اِس اطلاع کے ساتھ ہی تفکرات میں ڈوب گئے لیکن ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن کے نزدیک یہ محض بلیک میلنگ کا حربہ تھا جس کے آگے وہ ضلعی عدلیہ کو گردن نہیں جھکانے دے گا اور پورے ضلع میں عدالتی امور بہر صورت جاری رہیں گے۔ ایسے میں کچھ سینئر ایڈیشنل سیشن ججوں نے دبی زبان میں ٹکراؤ کی پالیسی سے اجتناب برتنے کا مشورہ دیا تو سیشن جج نے اُسے بزدلی اور اپنے فرائض سے پہلو تہی قرار دیتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا کہ وکیل چاہے جو بھی رویہ اختیار کریں، عدالتیں کھلی رہیں گی اور کام بھی ہوگا۔ سیشن جج کا خیال تھا کہ بار کے چند مٹھی بھر شر پسند عناصر اُن وکلا کو اپنے عزائم کا یرغمالی نہیں بنا سکتے کہ جو سیاست کرنے کی بجائے عام آدمی کو انصاف دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سیشن جج نے اپنے ماتحت ججوں سے کہا کہ اگر جج عدالتوں کو بند کر کے بیٹھ جائیں تو وہ وکلا کہاں جائیں گے کہ جو اکثریت میں ہیں اور انھیں عدالتی بائیکاٹ سے کوئی سروکار نہیں۔ ایسے وکلا کو خوفزدہ ہونے سے بچانے کے لیے اُن کی حوصلہ افزائی بہت ضروری ہے۔

میٹنگ برخاست کرتے ہوئے سیشن جج نے پورے اعتماد کے ساتھ اپنے عزائم کا اعادہ کیا اور سب سے وعدہ لیا کہ کسی بھی حوصلہ شکن صورتِ حال میں وہ ان ہڑتالی وکلا کا آلہ کار بننے کی بجائے استعفیٰ دینے کو ترجیح دیں گے۔

دوسری جانب اس اچانک پیدا شدہ صورتِ حال پر مسرور و شاداں رضوان ہاشمی اور خوشحال خان کی خوشی اُس وقت کافور ہو گئی کہ جب اس تحریک کی قیادت ڈسٹرکٹ بار شمس پور کے صدر بشیر سیال اور ممبر صوبائی بار کونسل عبدالرب ارباب ایڈووکیٹ کے ہاتھ میں آ گئی۔ صوبائی بار کونسل کے وائس چیئرمین نے بھی صوبائی سطح پر عدالتی بائیکاٹ کا اعلان انھی کے دباؤ میں آ کر کیا تھا اور باقی اضلاع کی قیادت سے بھی انھی کا رابطہ ہو چکا تھا۔ یوں ایک ہی دن میں رضوان ہاشمی، خوشحال خان اور تحصیل بار حیدر گوٹھ کی وکلا سیاست پس منظر میں چلی گئی۔ انھیں خطرہ اس بات کا نہیں تھا کہ پولیس فوری طور خوشحال خان کو گرفتار کر لے گی بلکہ خدشہ یہ تھا کہ جتنی محنت سے انھوں نے اپنی شہرت اور اپنا مقام صوبائی سطح تک بنا لیا تھا وہ اچانک زمین بوس ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ عدلیہ، انتظامیہ اور پولیس سے کسی تصفیہ کے وقت بھی محض سیشن جج پر سمے کا معاملہ ہی طے ہوگا، خوشحال خان اور دیگر وکلا کے خلاف ایف آئی آر میں سمجھوتے کا کسی نے دھیان ہی نہیں کرنا۔

امکان یہ بھی تھا کہ اگر ہڑتال کی قیادت دو چار دن مزید بشیر سیال اور عبدالرب ارباب کے پاس رہی تو حیدر گوٹھ سمیت ضلع کی تینوں تحصیلوں میں بھی انھی کے حمایت یافتہ امیدوار الیکشن میں فتح یاب ٹھہریں گے۔ یہ وہ مقام تھا کہ جہاں سے اگر وہ اتنی محنت کے بعد بھی اس آسانی سے لڑھک گئے تو پھر واپس اس جگہ تک آنے میں بھی ایک عرصہ لگنا تھا جس کے وہ کسی صورت بھی متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ رضوان ہاشمی اور خوشحال خان کو ضلع کی وکلا سیاست میں اپنے خواب بکھرتے ہوئے دکھائی دیے تو دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

شام ہوتے ہی جونہی ٹیلی وژن چینلوں پر پرائم ٹائم ٹاک شوز شروع ہوئے تو تقریباً ہر چینل پر کوئی نہ کوئی وکیل رہنما بھی شریکِ گفتگو تھا۔ اینکرز کے تابڑ توڑ سوالات کے باوجود ان وکلا رہنماؤں نے وکلا گردی کی مخالفت میں ایک متوازی بیانیہ ملک کے طول و عرض میں پھیلا دیا کہ

جس کی رو سے شمس پور کے وکلا وہاں کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کو زدوکوب کرنے اور اُس کی عدالت کی تالہ بندی کے لیے حق بجانب تھے۔ اس طرح جہاں سیشن جج شمس پور کے رویے کو بدترین اور عدالتی وقار کے منافی ثابت کر دیا گیا وہاں مجموعی طور پر ضلعی عدلیہ میں بڑھتی ہوئی کرپشن اور نااہلی کو بھی ایک ایشو کے طور پر موضوع بحث بنالیا گیا یوں دن بھر جو واقعہ شمس پور کے وکیلوں کی وکلاگردی کے لحاظ سے لائق مذمت رہا، دن ڈھلنے کے بعد وہی واقعہ ضلعی عدلیہ کی نااہلی اور کرپشن کی بحث میں دفن کر دیا گیا۔ عام لوگ بھی اپنی رائے بدل چکے تھے کہ سالہا سال تک مقدمات کا فیصلہ نہ کرنے والے نکمے اور تساہل پسند ججوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک ہونا چاہیے۔

اگلے روز صبح سویرے ہی یہ خبر پوری کچہری میں پھیل چکی تھی کہ سیشن جج صوبائی بار کونسل کی جانب سے ہڑتال کی کال کی بھی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی عدالت لگانے آ رہا ہے۔ کمرہ عدالت کو چونکہ گزشتہ روز ہی وکیلوں نے تالہ لگا کر اُس میں ایلفی ڈال دی تھی لہٰذا اپنے لگائے ہوئے تالے کی حرمت بچانے کے لیے ستر اَسی وکیلوں کا ڈنڈوں سے مسلح جتھا سیشن کورٹ کے صدر دروازے پر پہرہ دینے لگا جب کہ شمس پور سمیت ضلع کی تمام تحصیلوں میں بھی سبھی عدالتوں کو تالہ لگانے کے بعد وہاں بھی ایلفی ڈال دی گئی اور ہر عدالت کے سامنے وکیلوں کا ایک ایک جتھا تالہ نہ ٹوٹنے کی گارنٹی کے طور پر دھرنا دے کر بیٹھ گیا۔

کچہری آنے سے پہلے سیشن جج نے سینئر سول جج سے سیکورٹی کی صورتِ حال معلوم کی تو بتایا گیا کہ پولیس کی بھاری نفریاں ضلع کچہری کے علاوہ تحصیل کچہریوں میں بھی تعینات کر دی گئی ہیں لیکن گزشتہ کل کے واقعہ کی بھجوائی گئی رپورٹ کے بعد بھی تشدد کرنے والے وکیلوں کے خلاف ایف آئی آر درج نہیں کی گئی تھی۔ خلافِ توقع سیشن جج برہم نہ ہوا۔ بس متعلقہ ایس ایچ اُو کو عدالت میں پیش کرانے کی تاکید کے بعد وہ ڈرائیور، گن مین اور پولیس کی سنگل کیبن گاڑی کی حفاظتی رہنمائی میں کچہری کی جانب روانہ ہو گیا۔

جونہی سیشن جج کی گاڑی سیشن کورٹ کے صدر دروازے پر پہنچی تو اُس کے نیچے اترنے سے

ہی پہلے ڈنڈا بردار وکیلوں نے گاڑی کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور اُس پر ڈنڈے، جوتے اور مکے برسانے شروع کر دیے۔ سیشن جج نے اپنے گن مین کو نیچے اُتر کر ہوائی فائرنگ کرنے کے ساتھ ساتھ سیشن کورٹ میں تعینات پولیس گارد کو بھی بلانے کا کہا۔ گن مین پہلے تو خاصی دیر تک ہچکچاہٹ کا شکار رہا مگر جونہی وہ نیچے اُترا بپھرے ہوئے وکلا نے پہلے تو اُس کی گن چھینی اور پھر اُسی گن کے بٹ سے مار مار کر اُسے ادھ موا کر دیا۔ وکیلوں کے نرغے میں آئے ہوئے سیشن جج نے سینئر سول جج سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر اُس کا فون اٹینڈ نہیں ہو رہا تھا۔ پیلے زرد چہرے کے ساتھ گھبرائے ہوئے ڈرائیور نے بتایا کہ نہ صرف پولیس کی اسکاٹ میں سوار پولیس والے بلکہ حفاظتی ڈیوٹی کے واسطے خاص طور پر ضلع کچہری میں لگائی گئی ایلیٹ پولیس کے اہلکار بھی دور کھڑے نہایت سکون سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ انھیں وہاں صرف موجود رہنے کو کہا گیا ہے، عملی طور پر اپنا فریضہ نبھانے کے لیے نہیں۔ ایسے میں سیشن جج کے پاس وہاں سے نکل آنے کے سوا اور کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا، سو اُس نے ڈرائیور کو وہاں سے کسی نہ کسی طور نکلنے کا حکم دے دیا۔

سیشن ہاؤس کے کیمپ آفس پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ ڈنڈوں اور مکوں کی برسات کے نتیجے میں سرکاری گاڑی کا ہر طرف سے کچومر نکل چکا تھا۔ ایسے میں سیشن جج اور اُس کے ڈرائیور کا زخمی ہوئے بغیر گھر پہنچ جانا محض اتفاق ہی کہا جا سکتا تھا۔ لیکن وہاں آتے ملنے والی پہلی خبر ہی پریشان کن تھی۔ سیشن جج کے حکم پر عدالتوں میں جانے والے ضلع بھر کے ججوں کے ساتھ انتہائی متشددانہ سلوک کے بعد اُن کی عدالتوں کو پھر سے تالا لگانے کے بعد مقفل کیا جا چکا تھا۔

سینئر سول جج کی گاڑی کے ساتھ بھی کم و بیش وہی سلوک کیا گیا کہ جو سیشن جج کی گاڑی کے ساتھ ہوا تھا۔ ان حالات میں سینئر سول جج نے نہایت دل شکستہ انداز میں فون کر کے دیگر جج صاحبان کے ساتھ سیشن ہاؤس آنے کی اجازت چاہی تاکہ آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دیا جا سکے۔ آج پیدا ہونے والی صورت حال نے سیشن جج کو بھی انتہائی مایوس کر دیا تھا۔ پولیس اور انتظامیہ کا رویہ الگ سے پریشان کن تھا۔ وہ بظاہر اپنی موجودگی تو ظاہر کر رہے تھے لیکن عملی طور پر انھوں نے اجتناب کی راہ اختیار کر لی تھی کیونکہ وکیلوں کی طرف سے بھڑکائی گئی اس آگ سے اگر انھیں دامن

بچانے کا موقع مل رہا تھا تو وہ اِس کا فائدہ کیوں نہ اُٹھاتے۔ گزشتہ کل کے واقعہ کی ایف آئی آر کو درج کرنے کی بجائے مسلسل التوا میں رکھا جانا، ڈپٹی کمشنر اور ڈسٹرکٹ پولیس آفیسر کا سیشن جج کی میٹنگ میں شرکت تو کیا رابطے میں بھی نہ آنا اور صوبائی سطح پر بھی کسی دلجوئی یا حمایت کے فقدان نے ضلعی عدلیہ کے سربراہ کو مجبور کر دیا کہ ذلت کی اِس افسری کی بجائے ضلع بھر کے عدالتی افسروں سمیت احتجاجی استعفوں کی تجویز کو اپنی ترجیحات میں سب سے اوپر رکھ لے۔

مایوسی اور ملال کے اِس عالم میں تحصیل حیدر گوٹھ سے ملنے والی خبر نے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کو اور بھی ہلا کر رکھ دیا۔ خوشحال خان ایڈووکیٹ کی قیادت میں وکلا کے ایک مشتعل جتھے نے وہاں کے سب سے سینئر سول جج کو کمرۂ عدالت میں بیٹھے ہوئے اِس طرح بہیمانہ انداز میں تشدد کا نشانہ بنایا کہ اُس کا سر پھاڑ ڈالا۔ وکیلوں نے صرف اِس پر ہی بس نہیں کیا، سول جج کو لہولہان کرنے کے بعد توڑ پھوڑ کرتے ہوئے اُس کے کمرۂ عدالت کو بھی نذرِ آتش کر دیا۔ کیمپ آفس میں رکھے ٹیلی وژن کی اسکرین پر بار بار زخمی سول جج کو دکھانے کے ساتھ ساتھ وکلا رہنماؤں خوشحال خان اور رضوان ہاشمی کی غیض و غضب کے عالم میں کی گئی گفتگو بھی دکھائی جا رہی تھی۔ اُن کے بقول بار کونسل کی کال پر کی جانے والی ہڑتال میں بھی سول جج مذکور عدالت میں بیٹھ کر وکیلوں کو پیش ہونے یا بصورت دیگر مقدمات کی یکطرفہ سماعت پر مجبور کر رہا تھا۔ وکلا کا زکی اِس طرح توہین پر اگر نوجوان وکیل مشتعل ہوئے تو یہ ایک فطری امر تھا جس کا ذمہ دار کوئی اور نہیں بلکہ وہ زخمی جج تھا یا ضلع کا سیشن جج کہ جس نے اُسے ہڑتال کے روز عدالت لگانے پر مجبور کیا۔ پل بھر ہی میں حیدر گوٹھ کچہری میں ہونے والے تازہ واقعہ نے ایک بار پھر خوشحال خان اور رضوان ہاشمی کو وکلا سیاست اور قیادت کی صفِ اول میں لا کھڑا کیا تھا۔ کالے کیمروں کی آنکھ میں جھانک کر بات کرتے ہوئے اُن کے طیش میں کھولتے ہوئے چہروں پر آنکھوں کا رنگ کچھ الگ سے تھا، فتح یابی کی مسرت کا رنگ۔

۲۵

برسہا برس سے راسخ ہو چکے اپنے معمول کے برعکس حاجی بخشن لاہور پہنچنے کے بعد اگلے روز

شام تک نہ تو بستر سے نکلا اور نہ ہی کمرے سے۔ موبائل فون کی گھنٹی بھی شاید پہلی بار خاموش رہی لیکن یہ الگ بات کہ وہ ہر گھنٹے آدھے گھنٹے کے بعد فون اُٹھا کر دیکھ ضرور لیتا کہ کس کس کا فون اور کتنے بجے آیا۔ اُس کے پروردہ اور کئی بار زیرِ احسان رہ چکے لوگوں نے جس طرح سے پہلی بار اُس کے گرد گھیرا تنگ کیا تھا، اُس کی شدت نے حاجی بخشن کو اپنے کاروبار، کاروباری تقاضوں اور مفادات سے ایک دم متنفر نہیں تو لاتعلق ضرور کر دیا تھا۔

پہلی بار اُسے احساس ہوا کہ زندگی میں اتنا کچھ کمانے اور اتنا کچھ لٹانے کے بعد اگر سکون نام کی کوئی چیز اُس کے نصیب میں نہیں تو کیا ہے یہ سب کچھ جس کے لیے وہ اپنے آپ کو خوار کرتا رہا۔ پہلی بار کہیں چھ کا سالگا کہ شادی کی نہیں، اولاد ہے نہیں تو یہ سب کچھ کس لیے۔ کتنے گھر بنائے مگر گھر بار نہ بنائے شاید اس سبب کہ جتنے روپ کسی عورت کے ممکنات میں سے تھے، وہ نہ صرف دیکھ چکا تھا بلکہ اُنھی کو مارکیٹ کر کے، اُنھی کی کمائی کھاتا چلا آ رہا تھا۔ لہٰذا اندر سے ڈرا ہوا تھا کہ کہیں کسی ایک کو گھر میں بٹھا لیا تو وہ وہی کچھ نہ کرے جو دوسروں کے گھروں میں بیٹھنے والیاں اپنے باپ، بھائیوں اور شوہروں سے کرتی چلی آ رہی ہیں۔

شاید اندر و اندری یہی خدشہ اُسے اولاد پیدا کرنے میں بھی لاحق تھا۔ اگر بیٹی پیدا ہوئی تو کہیں اُس کا ٹھکانا کسی دوسرے حاجی بخشن کا ہوٹل نہ ہو اور اگر بیٹا پیدا ہو گیا تو پھر بھی اُسے وراثت میں کیا ملے گا! یہی کاروبار کہ جس میں سب کچھ جائز تھا۔ اور امکان یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ جس طرح اُس نے اپنے بچپن میں بچپن کو نہیں دیکھا، اُسی طرح اُس کی موت کی صورت میں اُس کے بیٹے کا لڑکپن بھی کسی ٹرک ہوٹل کی ''سہولت گاہ'' کی نذر ہو جاتا۔ لیکن پھر بھی دن بھر سوچ یہی غالب رہی کہ آج اگر اُس کا کوئی اپنا ہوتا تو وہ یوں اکیلا زمانے کے بھیڑیوں کے سامنے نہ کھڑا ہوتا۔

سارا دن بستر پر گزار دینے کے باوجود اُسے نیند محض اُن دو تین گھنٹوں کی ہی نصیب ہو سکی کہ جب اُسے شہزادی نے اپنے تئیں پچھاڑ ڈالا تھا۔ گزشتہ صبح کے ابتدائی لمحات میں جب بخشن نے شہزادی کا دل رکھنے کے لیے اُس سے آنکھیں چرائی تھیں تو من ہی من میں مسکرایا ضرور تھا کہ

یہ عورتیں نہیں جانتیں مرد کو پچھاڑ کر بھی اُسے مُنزل ہونے کی مسرت اور تسکین سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ مرد کے لیے اپنی تسکین سے قبل، ساتھی عورت کو لازماً طمانیت کی منزل تک پہنچانے کا چیلنج عورت کے اُن بہتر چلتروں میں سب سے اوپر کا ہے کہ جس کے ذریعے وہ زندگی بھر مرد کو کبھی اپنے آگے اور کبھی پیچھے لگائے رہتی ہے۔ جسمانی تلذذ کی آڑھت، دنیا کا وہ پہلا دھندہ ہے کہ جس میں عورت اجناس کے زمرے میں ہو کر بھی آڑھتی کو ترازو میں بٹھائے رکھتی ہے۔

حاجی بخشن نے آنکھ اُٹھا کر شہزادی کی جانب دیکھا۔ اُس کا چہرہ متورم اور نچلا ہونٹ اب بھی پھٹا ہوا تھا۔ بخشن کے سو جانے کے بعد بھی وہ اُس کے پاؤں اور پنڈلیاں دباتی رہی تھی حتیٰ کہ صبح ہو گئی۔ یہ شہزادی کے گداز ہاتھوں کی نرماہٹ اور میٹھی میٹھی حدت کا کرشمہ تھا کہ بخشن جیسا ہمہ وقت بے چین و مضطرب شخص بھی تھوڑے تھوڑے وقفوں سے اگر سویا نہیں تو زیادہ تر اونگھتا رہا۔ شہزادی کو اُس کی ماں کوئی چھ مہینے پہلے اُس کی خدمت کے لیے چھوڑ کر ایک سال کا معاوضہ پیشگی لے گئی تھی۔ بخشن نے اُسے دیکھتے ہی بھانپ لیا تھا کہ یہ لڑکی اُس کے کاروبار کے اچھا اثاثہ ثابت ہو گی۔ لیکن نجانے کیوں وہ اُسے کاروبار میں ڈالنے کی بجائے اپنے لیے مختص رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن شہزادی کی ماں اُسے بخشن کو سونپنے سے پہلے ایک دو بار ایس ایچ او تھانہ صدر حیدر گوٹھ چوہدری ضیا سے ملوا چکی تھی کہ جو اُن دنوں شاہدرہ میں تعینات تھا۔ چوہدری ضیا کا تبادلہ حیدر گوٹھ کے تھانہ صدر میں ہوا تو اُسے شاہدرہ کی کھوئی کھوئی جیسی شہزادی یاد آئی کہ جو ابھی کچی گری ہونے کے ناتے پیشہ ورانہ حربوں اور چالا کیوں سے بے خبر تھی۔ اگلی بار شہزادی کی ماں کوئی بہانہ کر گئی لیکن ایک روز پھر وہ اُسے اُٹھوا لانے میں کامیاب ہو گیا۔ حیدر گوٹھ تعیناتی کے بعد بھی شہزادی کی یاد ستائی تو رابطہ کرنے پر شہزادی کی ماں نے نئی کہانی ڈال دی کہ وہ کسی ٹرک ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

چوہدری ضیا جیسے گھاگ ایس ایچ او کو دھوکہ دینا اتنا آسان تو نہیں تھا۔ اُس نے شہزادی کی ماں حمیداں کو ایک مقدمہ میں پھنسا کر تھانہ صدر حیدر گوٹھ کی حوالات میں ڈالنے کی بجائے اپنے نجی ٹارچر سیل میں ڈال دیا اور گلو خلاصی کی شرط محض شہزادی کا اتا پتا بتانے کی رکھی۔ حمیداں کی جان پر

بنی تو اُس نے حاجی بخش کا نام لے دیا۔

حاجی بخش سے اُس کی خاص رکھیل کا تقاضا کرنا آسان نہیں تھا۔ چوہدری ضیا اُس کی پہنچ کو بھی جانتا تھا اور کاروبار کی ایک ایک تفصیل کو بھی۔ اُس کا خیال تھا کہ حاجی بخش اگر سمجھ دار ہوگا تو اپنے سب سے بااختیار لوکل افسر کو انکار نہیں کرے گا۔ صرف اتنی احتیاط چوہدری ضیا نے ضرور کی کہ خود حاجی بخش کے پاس گیا اور نہایت باوقار طریقے سے شہزادی کو صرف ایک رات کے لیے مانگ لیا۔ بخش اندر سے پھنو پھٹ تو ہو گیا لیکن چوہدری ضیا کے تیوروں نے اُسے بہت کچھ سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کر دیا۔

''شہزادی اس وقت بہت دور ہے۔ رات کسی وقت بھی تم تک پہنچ جائے گی۔'' نجانے کتنا جبر اور کتنا ضبط کرتے ہوئے بخش نے اتنی سی بات کہنے کو تو کہہ دی لیکن ایک پھانس سی اُس کے دل میں کہیں اٹک کر رہ گئی۔ شروع کے دنوں میں لوگ اُس کے منہ پر اُسے بھڑوا کہتے تھے لیکن آج اُس کے اندر سے کوئی اُسے بھڑوا کہے جا رہا تھا۔

چوہدری ضیا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ''حاجی صاحب! اپنے سرکاری بڑے افسر کو آپ نے ''تم'' کہا ہے، اب اس کا جرمانہ یہ ہے کہ شہزادی ایک رات کے بجائے پورے دو راتوں کے لیے میری مہمان ہوگی۔''

''آخ تھو!''، اس خیال سے جان چھڑانے کے لیے بخش نے کمرے میں بچھے ہوئے غالیچے پر تھوک دیا۔ گزشتہ دنوں کے سبھی واقعات اُسے پوری ترتیب سے یاد آنے لگے تھے۔ یہ سب واقعات اتنی تیزی سے ہوئے کہ حاجی بخش کو کئی دنوں تک ان کے باہمی ربط پر غور کرنے اور کڑی سے کڑی جوڑنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اچانک ہی اُس نے شہزادی کے ہاتھوں سے اپنے پاؤں چھڑائے اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''ایک بات بتاؤ! جب تم چوہدری ضیا کے پاس پہنچی تو اُس کے مُسٹنڈے مہمان پہلے سے وہاں تھے یا بعد میں آئے؟''

''وہ وہاں تو نہیں تھے، چوہدری ضیا نے مجھے سرکاری گاڑی میں کسی اور بنگلے میں بھجوا دیا تھا

جہاں وہ بیٹھے ہوئے تھے۔'' شہزادی اتنے دنوں کے بعد حاجی بخشن کے سوال جواب پر حیران ہو رہی تھی۔

''وہ دوسرا بنگلہ کتنی دور تھا؟'' بخشن کا دماغ تیزی سے کام کرنا شروع کر چکا تھا۔

''مجھے نہیں معلوم، رات کا ٹائم تھا، میں بھی تھکی ہوئی تھی مجھے گاڑی ہی میں نیند آ گئی تھی۔''

''دیر کتنی لگی تھی وہاں جاتے ہوئے؟'' حاجی کا فطری اُتاولا پن پھر سے عود کر آیا تھا۔

''ایک گھنٹہ تو پکا تھا، شاید زیادہ بھی لگا ہو۔'' شہزادی کچھ دیر سوچ کر بولی۔

''بندے کتنے تھے؟ کون سی زبان بولتے تھے، شکل سے کیسے تھے؟'' حاجی اب پر جوش ہونے لگا تھا۔

''تین تھے، تینوں پٹھان، پشتو بولتے تھے، شکل صورت کے تو اچھے تھے لیکن تھے بہت ظالم، پوڈر سونگھ سونگھ کر میرا بہت برا حال کر دیا۔'' شہزادی کو سب کچھ یاد آیا تو چہرہ اتر کر رہ گیا۔

''چوہدری ضیا نے بھی کچھ کیا تھا؟'' حاجی بخشن کا ذہن گھومے جا رہا تھا

''نہ جی، اُس نے تو پہلے بھی میرے ساتھ کچھ نہیں کیا تھا، کبھی کچھ کیا ہی نہیں، البتہ میری ماں کے ساتھ تو پکا ہے۔''

''پہلے بھی کسی دوست کے ساتھ ملوایا تھا؟''

''ہاں! بس ایک بار جب دوسری دفعہ گئی تھی تو مجھے کسی بڑے افسر کے بہت بڑے بنگلے میں چھوڑ آیا تھا۔''

''تو جھوٹ بولتا ہے وہ کنجر کا بچ، گیم کچھ اور ہے۔'' حاجی بخشن منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ پھر فوراً ہی سر جھٹک کر شہزادی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''تمھارا موبائل نمبر ہے اُس کے پاس؟''

''ہاں! زبردستی لے لیا تھا۔'' شہزادی کی صورت رونے جیسی ہونے لگی تھی۔

''تمھیں اب بھی فون کرتا ہے؟''

''ہاں جی روز کرتا ہے مگر میں جواب نہیں دیتی، کل رات کو بھی کیا تھا۔''

''کل رات اِس گھر میں وہی تمھارے پاس تھا ناں؟'' حاجی بخشن بھڑکے بغیر سرد لہجے میں

اِس طرح بولا کہ شہزادی کا رنگ زرد پڑ گیا۔

''نہ جی مجھ سے قسم اُٹھوا لیں، میرے پاس نوکرانیوں کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔''

''اپنا موبائل مجھے دو!'' بخشن کا لہجہ کچھ اور سرد ہو گیا تھا۔ شہزادی نے جلدی سے اپنا موبائل فون اُٹھا کر اُسے دے دیا۔ بخشن کی نگاہ بیک وقت شہزادی کی آنکھوں اور فون دیتے وقت اُس کے کانپتے ہاتھ پر تھی۔ وہ کچھ نہیں بولا، بس شہزادی سے فون لیا اور اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا۔

''جاؤ جا کر الماری کھولو!''

شہزادی تیزی سے بیڈ سے اتری اور کسی عامل کے موکل کی طرح بیڈ روم کے ڈریسنگ ایریا میں بنی ہوئی الماری کھول کر خوفزدہ مگر استفساریہ نگاہوں سے بخشن کی طرف دیکھنے لگی۔

''اِس میں ایک موبائل فون کا ڈبہ رکھا ہوگا، اُسے اُٹھا لاؤ!''

شہزادی نے الماری میں جھانکا تو سیاہ رنگ کا ڈبہ سامنے رکھا تھا۔

''یہ آج سے تمھارا نیا فون ہے اور یہ لو اِس کی سِم۔'' بخشن نے اپنے بٹوے سے ٹشو پیپر میں لپٹی ہوئی ایک سِم نکالی اور شہزادی کو تھما دی۔ ''اِس فون میں اب ایک ہی نمبر ہوگا، میرا اور صرف میرا، جب بھی اِس میں کوئی دوسرا نمبر آیا تو سمجھو تمھاری خیر نہیں، اور ہاں آج سے تم اپنے گھر والوں سمیت ساری دنیا کے لیے مر چکی ہو، تمھارے بارے میں اب جس نے بھی رابطہ کرنا ہوگا، وہ مجھ سے کرے گا۔''

بخشن کی آنکھوں اور لہجے میں کچھ ایسی سفاکیت اُمڈ آئی تھی کہ شہزادی کی روح تک تھرا اُٹھی۔ کل نصف شب کے بعد سے اُن کے درمیان چلی آ رہی تعلقات کی نئی سانجھ دیکھتے ہی دیکھتے ہوا ہو چکی تھی۔ وہ سر جھکائے، ٹانگیں لٹکائے بیڈ کی ایک طرف بیٹھ کر ہاتھ میں پکڑے موبائل فون کے ڈبے کو دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن سے ہلکا ہلکا کھرچنے لگی۔ بخشن اگرچہ خاموش ہو چکا تھا مگر اُس کی برمے کی طرح سوراخ کرتی نگاہیں اُسی پر جمی تھیں۔ آج سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ حاجی بخشن نے اُسے اِس طرح سے دیکھا ہو۔ شہزادی میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ کمرے سے باہر چلی جاتی اور اتنی توقع، اتنی امید بھی معدوم تھی کہ اگر وہ بخشن کا موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش

کرے تو وہ اُس کا مثبت ردِعمل دے گا۔ ماحول، تلخی نہ ہوتے ہوئے بھی تلخ تھا اور بظاہر ملال کا اظہار نہ ہوتے ہوئے بھی سوگوار تھا۔

شہزادی سوچ رہی تھی کہ جس بات کا اُسے الزام دیا جا رہا ہے، اُس میں اُس کی کیا منشا! پہلے ماں نے چوہدری ضیا کے پاس بھیجا اور اب خود حاجی صاحب نے۔ تو پھر یہ ناراضگی کس بات کی، اُس نے تو جو سچ تھا، وہی بتا دیا۔ ''عجیب آدمی ہے، میرا مزہ بھی لیتا ہے، یار دوستوں کو بھی سونپتا ہے اور پھر مجھ پر پابندیاں بھی لگاتا ہے، عورت کی دلالی کرتا ہے اور عورت کو جانتا ہی نہیں کہ وہ جب ایک بستر سے دوسرے پر گئی تو پھر کسی بستر کی نہیں رہتی۔''

جب کہ اُسے خالی خالی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بخشن سوچ رہا تھا کہ عورت چاہے جس عمر، جس معاش اور جس خاندانی پس منظر کی ہو اُس کے اندر سے لوبھ نہیں جاتا، مرد سمیت اپنے اردگرد کی ہر چیز کو خوئے خاصیت سے تولتی اور پرکھتی ہے، چوکھا اور چنگا سمیٹنے کے لیے۔ ''میں اِس بھڑدی کو ٹکے ٹوکری سے اُٹھا کر اپنے بستر پر لایا ہوں، اپنا گھر دیا ہے، عیش عشرت دی ہے، تحفظ دیا ہے، وادھو مقام دیا ہے مگر یہ ابھی تک اپنا ٹانکا اُدھر سے ہی جوڑے ہوئے ہے کہ جہاں سے وہ لگا تھا، حرامزادی کو لت لگ گئی ہے، یہ اب بھی اِدھر اُدھر منہ مارنے سے باز نہیں آئے گی۔''

''میں ذرا کپڑے بدل لوں؟'' شہزادی نے شاید کمرے سے باہر جانے کا حوصلہ پیدا کر لیا تھا۔ اُس کی آواز میں اب کپکپاہٹ نہیں بلکہ میسنی سی منمناہٹ تھی۔ حاجی بخشن نے اُسے بدستور گھورتے ہوئے ذرا سی گردن ہلا دی۔ شہزادی اِس طرح تیزی سے کمرے سے باہر نکلی جیسے خدشہ ہو کہ معمولی سی تاخیر بھی کہیں اجازت کو ممانعت میں نہ بدل دے۔ شہزادی کے کمرے سے باہر جانے کے بعد بھی حاجی بخشن اُس کی چھوڑی ہوئی جگہ کو دیکھتا رہا انہی خالی خولی آنکھوں سے کہ جن میں وہ برمے کی گھومتی ہوئی نوک سمجھ کر اپنے جسم میں چھید تلاش کرتی رہی تھی۔

بخشن کو احساس ہوا کہ شہزادی نے صرف اُس کے بیڈ کو نہیں چھوڑا بلکہ وہ اُس کی زندگی سے بھی جا چکی ہے۔ ''میں نے تو اُسے کبھی زندگی سمجھا ہی نہیں تو پھر اُس کا میری زندگی سے جانا کیا معنی رکھتا ہے۔'' اُس کی سوچ اور خود سے کیا ہوا سوال وہیں دھرے کا دھرا رہ گیا کہ جب کچھ ہی دیر

میں شہزادی لباس بدل کر واپس کمرے میں آئی۔ کمرے سے جاتے وقت کا تنا ہوا چہرہ کھل اُٹھا تھا۔ شہزادی نے لباس کیا بدلا وہ حاجی بخشن کا خوف اور اُس کے سوالوں کی پیدا کردہ یبوست بھی میلے کپڑوں کی ٹوکری میں پھینک کر آئی۔ اتنی سی عمر میں بھی اُسے معلوم ہو چکا تھا کہ آج کے دور میں آسیب اُتارنے کے واسطے کسی بھوپے یا عامل کی نہیں بلکہ ذرا سی بے اعتنائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ سو وہ بخشن کے بیڈ پر اپنی خالی کی ہوئی جگہ کی بجائے سامنے رکھے موڑھے پر بیٹھ کر نئے موبائل فون میں پہلے سے موجود نئے نئے فیچرز کو دیکھ کر مسرور ہونے لگی۔ ابھی چند لمحے پہلے تک کے تناؤ اور تنگی کا شائبہ تک نہیں تھا اُس کے چہرے یا مزاج پر۔

بخشن نے شہزادی کو یوں خنداں اور اپنی حاکمیت کی حد بندیوں سے ماورا ہوئے دیکھا تو تلملا کر رہ گیا مگر پھر بھی گوارا نہیں کر پا رہا تھا کہ اُسے پھر سے اپنے بیڈ پر بٹھا کر اپنی حاکمیت کی جکڑ بندیوں میں جکڑ کر رکھ دے۔ شہزادی کے چہرے پر گلال کی مانند چھلکتی ہوئی جوانی کی مئے ناب بخشن کو بن پئے چڑھتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ اُسے شہزادی کے ساتھ گزرے ہوئے وہ بھی تسکین افزا لمحات، نفسانی جذبات میں سانس لیتے ہوئے محسوس ہونے لگے جو ان دنوں اُسے اُس وقت نصیب ہوئے کہ جن دنوں وہ صرف ٹوٹا ہی نہیں بلکہ بکھرا ہوا تھا۔ اُن لمحات میں اُسے شہزادی ہی نے سمیٹا، لپیٹا اور یکجا کیا۔ شاید یہی وہ لمحات تھے کہ جب اُس نے پوری سنجیدگی سے شہزادی کو اُس کے ماضی سے قطع نظر اپنی زندگی میں قانونی طور شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ''عورت کو کیا یک رُخا ہی دیکھنا، پرکھنا اور برتنا چاہیے یا مجموعی طور پر۔'' اُسے اپنے آپ ہی سے جواب ملا کہ جس رخ سے دیکھو بس آنکھیں نہ کھولنا۔

حاجی بخشن نے بیڈ کی اونچی ٹیک سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ شہزادی کو لاابالی پن میں دیکھنا اُس کے اندر کے مرد کی شکست تھی۔ وہ مرد کہ جس نے زندگی میں ہزاروں نہیں تو سینکڑوں عورتوں کو اُن کی تمام تر معصومیت اور لاابالی پن کے ساتھ قصائیوں کے ہاتھ جز وقتی یا کُل وقتی طور پر فروخت کیا ہوا تھا اور ابھی تک کر رہا تھا۔ عورت پر ترس کھانا اُس کی زندگی کی تقویم اور بخت ہی میں نہیں تھا۔ اُس کی ماں نے بھی اپنے کم عمر یار کے ساتھ بھاگتے ہوئے نہ تو اپنے تین بچوں پر

ترس کھایا اور نہ ہی اپنے فالج زدہ شوہر پر۔ بخشن کو اکثر خیال آتا کہ وہ بھی تو اپنے فالج زدہ باپ اور دو بڑی بہنوں کو چھوڑ کر ایسا بھاگا کہ پھر پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔ ''تو کہیں میں بھی اُسی کنجر کا بیج تو نہیں کہ جس کے ساتھ میری ماں بھاگی تھی۔''

بخشن کی موندی ہوئی آنکھوں میں شہزادی کے ساتھ ساتھ چوہدری ضیا کی شبیہ اُبھری۔ ''تو کیا اُس کے ہوٹل پر ریڈ کا معاملہ چوہدری ضیا کا انفرادی فعل تھا کہ جس کے پس منظر میں شہزادی کی رقابت کارفرما تھی، لیکن حاجی بخشن کے دبدبے کو نظرانداز کرتے ہوئے ایک معمولی ایس ایچ اُو کس طرح یہ قدم اُٹھا سکتا ہے کہ جس میں اُس کی نوکری بھی داؤ پر لگ سکتی تھی۔'' اس پر بھی اُسے اپنے آپ سے جواب ملا۔ ''کوئی ایس ایچ اُو بھی تو بھڑوا بخشن ہو سکتا ہے، کنجر کا بیج۔''

چوہدری ضیا کا چہرہ گم ہوا تو کچھ اور چہرے اُس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ تین پٹھانوں کے نامعلوم چہرے۔ کسی ہوا جھلوڑے کی مانند گھومتے گھومتے اپنی صورت ہی گم کر بیٹھے۔ گرد ہی گرد۔ دھند ہی دھند۔ گرد میں دھند یا دھند میں گرد۔ ایسے میں ایک نام کسی بجلی کے کوندے کی مانند اُس کے ذہن میں لپکا۔ بخشن نے آنکھیں کھولیں اور فون اُٹھا لیا۔ گزشتہ کئی گھنٹوں میں نجانے کتنی فون کال اور کتنے وائس اور ٹیکسٹ میسج اُس کے فون پر آ چکے تھے۔ اُس نے سب کو نظرانداز کرتے ہوئے اُس نام کو اپنے کنٹیکٹ کی فہرست میں ڈھونڈنا چاہا کہ جو ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح لپکا تھا۔ چند لمحوں ہی میں وہ نام اُس کے سامنے تھا۔ کنٹیکٹ میں ہوتے ہوئے بھی فون کی یادداشت بتا رہی تھی کہ پچھلے پندرہ گھنٹوں میں اِس نمبر سے تین کالز اُس کے نام آ چکی تھیں۔

۲۶

رات بھر نیند اُس کے نصیب کی طرح اُس پر سایہ فگن ہونے سے مانع رہی۔ ڈائننگ روم سے نکالے جانے کے بعد ناہید نے اُسے طلاق نامہ کی فوٹو کاپی بھی کمرے میں بھجوا دی کہ جو اُس نے کبھی دیا ہی نہیں تھا۔ طبیعت بار بار اُبلتی رہی کہ اس بدبخت عورت کے ٹکڑے کر کے کتوں کو کھلا دے، کہیں گٹر میں بہا دے لیکن آج الیاس کے تیور دیکھنے کے بعد اُس میں ہمت ہی نہ رہی کہ وہ

ایسا کر پاتا۔ اُس کا جی چاہا کہ خاندان کے بچے کھچے رشتہ داروں کو بُلا کر اِس حرافہ عورت کے کرتوت اُن پر منکشف کر دے لیکن ذرا سے غور کے بعد معلوم ہوا کہ اُن میں سے کوئی بھی ناہید کی مخالفت تو کیا تونگر کی حمایت پر بھی تیار نہیں ہوگا۔ اپنی افسری کے آخری برسوں میں تونگر نے ایسے رشتہ داروں کو اپنے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیا تھا کہ جو نت نئی سفارشوں کے ذریعے تونگر سے اپنے کام کے بہانے لوگوں کے کام نکلوا کر لاکھوں روپے کی دہاڑی لگاتے رہے۔ کئی کئی حیلوں سے رشوت بٹورتے یا ذاتی مفاد کی آبیاری کرتے رہے۔ اِس لیے تونگر جب اپنے عروج کے زمانوں میں بھی ایسے رنگ بازوں سے دور رہا ہو تو وہ اُس کے زوال کے دنوں میں اُس کے ساتھ کیسے کھڑے ہو سکتے ہیں کہ جب مقابل کوئی اور نہیں اُس کے اپنے گھر کا فرد، اُس کی گھر والی رہی ہو۔

اس کے باوجود صاحبزادہ تونگر کو یقین نہیں تھا کہ ناہید اُسے یوں اتنی آسانی سے نہ صرف اپنی زندگی بلکہ اُس کے اپنے گھر سے بھی نکال باہر کرے گی۔ عجب تماشا تھا کہ جس شخص نے زندگی بھر قانون اور قانون کے اطلاق کے ساتھ من مانی کی ہو، آج اُسے اُسی قانون کے جال میں پھنسا لیا گیا تھا۔ وہ رات بھر سوچتا رہا کہ اگر طلاق کا یہ یکطرفہ ڈراما واقعی عدالتوں کے ذریعے رچایا جا چکا ہے تو وہ اُسے چیلنج کرے گا لیکن خدشہ یہی تھا کہ اگر ناہید نے پھر بھی بھری عدالت میں خلع کا مطالبہ کر دیا تو اُسے فیملی کورٹ بھی رد نہیں کر سکے گی۔ یوں جو بات ابھی تین لوگوں میں تھی وہ کھلی ٹرالی میں لدی گندگی کی طرح ہر طرف پھیلتی چلی جائے گی۔ ایسے اُس جیسا کاکڑ بیوروکریٹ کس طور اِس رسوائی کا سامنا کر پائے گا کہ جب منہ دکھانے کو کوئی کونا کھدرا ہی نہ بچے۔

اِن تمام ممکنات اور خدشات سے الجھتے الجھتے وہ صبح تک اِس بدلی ہوئی صورت حال میں اپنے آپ کو اسی مطابق ڈھال لینے کا فیصلہ کر چکا تھا لیکن پھر بھی کہیں گماں ضرور تھا کہ حالات کو جوں کا توں رکھنے کے واسطے ناہید اُسے گھر سے نہیں نکالے گی۔ مگر یہ خیال بھی خام ثابت ہوا۔ خلافِ معمول صبح کا ناشتہ اُس کے کمرے میں بھیجا گیا تو خانساماں ایک چٹ بھی ساتھ لایا کہ جس پر دس بجے صبح لکھ کر اُس کے گرد دائرہ کھینچ دیا گیا تھا۔ تونگر سمجھ گیا کہ یہ گھر چھوڑنے کی ڈیڈ لائن تھی۔

خانساماں سے اُس نے ناہید کا پوچھا تو بتایا گیا کہ وہ سو رہی ہے۔ تونگر نے ایک بار پھر چٹ کو دیکھتے ہوئے خانساماں کی طرف دیکھا۔ اُسے یہ چٹ کل رات ہی دے دی گئی تھی۔

سلطان احمد پر گھبراہٹ سی طاری ہونے لگی۔ کچھ کچھ دم گھٹنے کا احساس اور بدن نڈھال۔ اپنے ہی گھر کو یوں کنبے سمیت چھوڑ کر جانا کس قدر مشکل ہو رہا تھا۔ اذیت صرف جائیداد اور آبرو کھونے کی نہیں تھی، شدت اُس برتاؤ کی تھی کہ جس طور اُس سے یہ سب کچھ چھینا جا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اُسے اپنے ہی گھر میں اجنبی کیا جاتا رہا اور اُسے احساس تک نہ ہوا۔ ناہید کے جس رویے کو وہ محض وقتی لاتعلقی یا زیادہ سے زیادہ ریٹائرڈ ملازموں کی بیویوں میں حیض کی مستقلاً بندش کے بعد کی سفاک بے حسی سمجھتا رہا وہ دراصل اُس کی جڑیں کھوکھلی کرنا تو کیا، جڑیں کھود کر ایک طرف پھینکنے کا عمل تھا۔

تونگر نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ صبح کے آٹھ بجے تھے اور دس بجے تک اُس سے گھر خالی کرنے کا تقاضا کیا جا رہا تھا۔ اُسے اپنی اولاد سے بہت توقع تھی کہ شاید یہ تمام معاملات اُن کے علم میں ہوں اور وہ کم از کم اِس نوبت کو آنے سے روک سکیں لیکن ناہید نے جس انداز میں اُن کی تربیت کی اور جس طور اُن کے ذہنوں میں والد کا شخصی تاثر راسخ کیا گیا اُس کے بعد اُن سے اپنے باپ کے حق میں مزاحمت تو کیا کلمۂ خیر کہنا بھی عبث سمجھا جا سکتا تھا۔ خیالات کی بھرمار نے مایوسی کو درجۂ انتہا تک پہنچایا تو اُس کا جی متلانے لگا۔ وہ تپائی جس پر ناشتہ چنا گیا تھا اُس نے دھکیل کر ایک طرف کی اور اپنے آپ کو اِس کیفیت سے نکالنے کے لیے اُٹھا اور ملبوسات کی الماری کے پٹ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

تونگر کے سامنے اب ایک اور سوال آن کھڑا ہوا کہ اتنے سارے کپڑے وہ کہاں لے کے جائے گا کہ کہیں کوئی جائے پناہ بھی نہیں تھی۔ کسی سرکاری ریسٹ ہاؤس یا ہوٹل کا خیال آیا لیکن وہ کتنے دن وہاں قیام کر سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دو چار ہفتے لیکن پھر کیا ہوگا۔ اب اِس عمر میں الگ گھر کا پورا بندوبست، نگہبانی اور باقی ماندہ مسائل و معاملات کہ جن کا اُسے کوئی تجربہ بھی نہیں تھا۔ پرانے ملازموں میں سے بھی کسی کو بلایا جا سکتا تھا، گھر خریدا نہیں تو کرایہ پر بھی لیا جا سکتا تھا

لیکن حقیقی مشکل اِس بندوبست کو بنانے اور پھر چلانے کی تھی جو پہاڑ کی صورت اُس کے سامنے موجود تھا۔

اچانک اُسے اپنی لائبریری کا خیال آیا تو دل جیسے بیٹھ سا گیا۔ وہ ایسے کئی گھر چھوڑ سکتا تھا لیکن اپنی عمر بھر کی بُک کولیکشن یوں جاہلوں کے پاس چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن مسئلہ پھر وہی تھا کہ پانچ ہزار کے قریب کتب وہ کسی طور اُٹھوا تو لے لیکن فوری طور پر لے کر جائے کہاں۔ کتب ایسا اثاثہ تھیں کہ جن کے واسطے وہ ناہید سے کچھ مہلت دیئے جانے کی بات کر سکتا تھا۔ لیکن وہ تو ابھی سو رہی تھی اور اُسے بارہ بجے سے پہلے جگانے کے مضمرات سے وہ بخوبی آگاہ تھا۔ اِسی مخمصے میں گرفتہ صاحبزادہ سلطان احمد تونگر کی جسمانی توانائی کا گراف ایک دم نیچے کو جانے لگا تو وہ الماری کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ عجیب سی کیفیت تھی کہ کل شب سے کچھ مناسب کھانا نہ کھانے کے سبب بھوک کا احساس بھی شدید ہونے لگا تھا اور طبیعت بھی اوبھ رہی تھی۔

اُس نے خالی نگاہوں سے پورے کمرے کو گردن گھما کر دیکھا۔ رائیگانی دھند کی طرح چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اُسے یاد آیا کہ کتنے دنوں تک وہ دونوں میاں بیوی اِس گھر کے بنائے جانے کی جزیات پر اُلجھتے رہے تھے۔ انھی دنوں اُسے یہ احساس ہوا کہ عورت گھر بنانے کو زندگی کا حاصل سمجھتی ہے۔ بچپن میں گڑیوں کے گھروندے بنانے سے شروع ہونے والا یہ خواب زندگی بھر اُسے جگائے رہتا ہے۔ اِسی کے راہیں وہ ایسے شوہر کے واری صدقے ہوئے رہتی ہے کہ جو اِسے اِس خواب کی تعبیر تک رسائی دے۔ لیکن آج اُسے معلوم ہو رہا تھا کہ گھر بنانا اگر عورت کے لیے زندگی کا حاصل تو گھر بچانا مقصدِ حیات کہ جس میں گھر تک رسائی دینے والے کا سایہ بھی برداشت نہیں ہوتا۔ عورت اور مرد چاہے کسی بھی رشتے میں بندھے ہوں اُن کے بیچ بیگانگی کا ایک دور ضرور آتا ہے۔ کہیں مختصر، کہیں طویل اور کہیں ہمیشہ کے لیے، مستقل۔ بیگانگی کے اِس دور میں مرد بہت کم سوچتا ہے کہ وہ عورت کو نکال باہر کرے لیکن عورت کے دل میں ہمیشہ اُس مرد کو گھر سے نکال باہر کرنے کی خواہش پلتی رہتی ہے کہ جس سے کبھی رتی برابر بھی عدمِ تحفظ کا احساس ہوا ہو۔ سلطان تونگر کو وہ دن بہت یاد آ رہا تھا کہ جب ناہید اِس گھر کا پلاٹ اُس کے نام سے

خریدے جانے پر کئی دن بضد رہی تھی۔ تونگر بھی کئی دن تک اِس ضد کا مزہ لیتا رہا حالانکہ پلاٹ تو وہ پہلے ہی ناہید کے نام سے خرید چکا تھا۔ تونگر نے بہت سوچا لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ناہید کب اور کیسے عدم تحفظ کا شکار ہوئی۔ اِس میں خود وہی قصوروار تھا یا کوئی اور۔ تیقن سے تو اِس بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ملک الیاس کی جانب ناہید خود ملتفت ہوئی یا اُسی حرامزادے نے اسے ورغلایا۔

رنگر بند ہونے کے سبب موبائل فون کا مسلسل ارتعاش تونگر کو واپس اپنے کمرے میں لے آیا لیکن اب یہ کمرہ، اُس کی دیواریں، اُس کا بستر حتیٰ کہ الماریوں میں رکھے ملبوسات بھی ایکدم سے اُس سے اپنی وابستگی کھو چکے تھے۔ صاحبزادہ سلطان احمد تونگر اَب اپنے بیڈروم اور اُس کے سبھی موجودات کو یوں دیکھ رہا تھا کہ جیسے کسی اَن دیکھے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم کو وہاں سے گزرتی ہوئی گاڑی کی کھڑکی میں سے باہر جھانکتا ہوا حیران مسافر دیکھتا ہے۔ لیکن جونہی تونگر کی نگاہ فون کی روشن اسکرین کی طرف اُٹھی وہ ٹھرا کر رہ گیا۔ اسکرین پر اللہ ڈنو عبید کا نام بلنک کر رہا تھا۔ تونگر کا خیال تھا کہ کل شام جانان کے گھر اُس کی آمد اور وہاں ہونے والی بدمزگی کے بعد وہ کبھی اُس سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا لیکن وہ تو پھر سے رابطے میں تھا اور وہ بھی صبح کے ساڑھے آٹھ بجے کہ جب اُس کا عالم بیداری میں ہونا، معمول نہیں ہوتا۔

''تونگر صاحب! میں نے گاڑی بھجوا دی ہے، دس بجنے کا انتظار نہیں کرنا، میں اپنے آفس میں ہوں گا۔'' اتنا کہتے ہوئے اللہ ڈنو عبید فون بند کر چکا تھا۔

''اِس کو کیسے خبر کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے، مانا کہ ملک الیاس کا اِس سے یارانہ رہا ہے لیکن یہ بات، مجھے گھر سے نکالے جانے کی بات، وہ اِس سے کیوں کرے گا؟'' اچانک ہی ذہن میں آنے والے خیال نے تونگر کو گھما کر رکھ دیا۔ ''کیا مجھے اپنے گھر سے نکلوانے میں اِسی حرامزادے کا ہاتھ تو نہیں؟''

کچھ دیر بعد صاحبزادہ سلطان احمد تونگر کسی ہارے ہوئے جواری کی مانند اللہ ڈنو عبید کے آفس میں اُس کے روبرو سر جھکائے بیٹھا تھا۔ تشکیک، شرمندگی، خجالت اور بے بسی کی تصویر۔

اپنے سابقہ گھر سے وہ بس اپنے آپ کو ہی لا سکا تھا۔ محض دو کپڑوں ہی میں رخصت ہو کر چلا آیا۔ اُس گھر میں گزشتہ تیس برسوں سے بکھرے ہوئے صاحبزادہ سلطان احمد تونگر کو سمیٹنا ہی بہت مشکل تھا کجا کہ خود سے متعلقہ اسباب کو بھی اکٹھا کرتا رہتا۔ ہاں ایک لیپ ٹاپ ضرور اُس کے ساتھ رہا کہ جس میں ایک عرصے کی تنہائی کو وہ ناسٹیلجیا کی صورت محفوظ کرتا چلا آ رہا تھا۔ گھر سے باہر نکلتے ہوئے اگرچہ اُس میں پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہیں رہی تھی پھر بھی نجانے کیوں اُسے توقع تھی کہ کہیں کسی دریچے، کسی روزن سے دو آنکھیں اُس پر مرکوز ضرور رہی ہوں گی۔

''نکل آیئے تونگر صاحب اَب اپنے گھر سے، وہ گھر اب ملک الیاس کا ہے۔'' اللہ ڈنو عبید کے غیر سنجیدہ لہجے میں بھی بلا کی سنجیدگی تھی۔ تونگر نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

''لگتا ہے سیدھی سی بات بھی آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہی، جتنی کاملیت آپ کے ہاں عورتوں کو گھیرنے اور اپنے چنگل میں لانے کی ہے کاش اُس سے آدھی اُنھیں اپنے چنگل میں جکڑ کر رکھنے کی بھی ہوتی تو آج آپ کا یہ حال نہ ہوتا۔'' اللہ ڈنو عبید نے اب کے قہقہہ لگا کر صاحبزادہ تونگر کی آنکھوں میں جھانکا جہاں گلے شکوے کے تاثرات ابھرنے لگے تھے۔

''آپ بھی یقیناً یہی سوچ رہے ہوں گے کہ کیسا آدمی ہے! ایک طرف تو اِس مشکل گھڑی میں مجھے گھر سے ریسکیو کراتا ہے اور دوسری جانب میرے زخموں پر نمک پاشی کر رہا ہے۔''

اللہ ڈنو عبید کا خیال تھا کہ تونگر اُس کی بات کی تائید کرے گا لیکن وہ پہلے کی طرح خاموش مگر اُس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔

''آیئے چائے پیتے ہیں۔'' اللہ ڈنو کرسی سے اُٹھا اور تونگر کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ ڈال کر اُسے کونے میں رکھی صوفہ چیئرز کی طرف لے آیا جہاں اُن کے بیٹھتے ہی ایک نئی لڑکی چائے اور ناشتے کے دیگر لوازمات درمیان میں رکھی میز پر چننے لگی تھی۔ اللہ ڈنو نے چائے کی پیالی اُٹھائی اور مسکراتے ہوئے تونگر سے مخاطب ہوا۔

''تونگر صاحب! آخر کونسی گیدڑ سنگھی ہے آپ کے پاس کہ بس دو چار دنوں میں جانان جیسی لڑکی آپ کو اپنے گھر بلا کر سیدھی گود میں آ بیٹھی؟'' سلطان تونگر بہت مضطرب لیکن پھر بھی خاموش تھا۔

''یوں خاموش رہنے سے کام نہیں چلے گا! بھئی میں اُس کا باس ہوں، میں اُس کے سامنے اور وہ میرے سامنے ننگی ہے لیکن دو سال گزر گئے کبھی بستر پر سانجھ نہیں کی، جب تک وہ ہمیں نہ بلائے ہم اُس کے پاس کیوں جائیں، آخر ہماری بھی تو کوئی اَنا ہے ناں۔''

تونگر کھول کر رہ گیا۔ آج کی صبح ایک بار پھر وہ اُس کا محسن بن کر سامنے آیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اللہ ڈنو عبید کی باتوں سے زیادہ اُس کے لہجے پر تڑپ اُٹھا تھا۔ پھر بھی اپنے غصے کو دبانے کے لیے اُس نے چائے کا کپ اُٹھا کر اضطراری طور پر ایک بڑا سا گھونٹ لے لیا۔ چائے گرم تھی اور یہ گھونٹ منہ جلاتا ہوا آناً فاناً حلق سے اترا اور خوراک کی نالی کو کسی خنجر کی طرح چیرتا ہوا چلا گیا۔ تکلیف کی شدت سے نہ صرف اُس کا چہرہ بگڑا بلکہ آنکھوں سے بھی پانی نکل آیا۔ اللہ ڈنو عبید بھانپ گیا کہ ماجرا کیا ہے۔

''یہی تو میں کہتا ہوں کہ چائے کا سواد لینے کے لیے آہستہ آہستہ، ایک ایک چھوٹا چھوٹا گھونٹ لیں اور پھر آخری گھونٹ تک کپ کو اپنے ہاتھ میں جکڑ کر رکھیں، آہا کیا کہنے اُس ہلکی ہلکی حدت کے جو ہاتھ کی ہتھیلی سے ہوتی ہوئی روح تک اتر جاتی ہے۔'' اللہ ڈنو عبید کا روئے سخن شرارت بن کر اُس کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ تونگر اُس کے لطیف اشارے اور روئے سخن کو جان کر بھی کڑواہٹ کا شکار تھا۔ اضطراب اور چڑچڑے پن کو سنبھالا دینا بھی اُس کے لیے مشکل ہو رہا تھا کہ یہ شخص اَب اُسے چائے پینا بھی سکھائے گا۔ ایسے میں اللہ ڈنو نے بھی اپنا لہجہ بدل لیا۔

''چلیں تونگر صاحب! اب کچھ کام کی بات کرتے ہیں، یہ دفتر تو پہلے بھی آپ کا تھا، گاڑی اور ڈرائیور بھی تھا لیکن آج سے اِس فارم ہاؤس کی اینکسی بھی آپ کی ہوئی، عمر بھر کے لیے، اینکسی میں ایک لڑکی بھی ہوگی گل رخ، زیادہ پڑھی لکھی نہیں لیکن بہت اچھی صورت کے ساتھ ساتھ بہت ذہین اور اچھی کُک بھی ہے، کھانا گرم اور آپ کا مزاج ٹھنڈا رکھے گی، اِس کے علاوہ بھی اینکسی کو گھر بنا کر رکھنا اب اُس کی ذمہ داری ہے، اور ہاں! میں آپ کی ڈریسنگ کا معیار جانتا ہوں، دوپہر تک آپ کے بیڈروم کی الماری میں آپ کی پسند کے مطابق کافی سارے لباس دستیاب ہوں گے۔ بس آج سے نئی زندگی شروع کریں اور بھول جائیں کہ کل آپ کیا تھے، دیکھنا اور ثابت کرنا یہ

ہے کہ آج کے بعد آپ کیا ہوں گے؟"

اللہ ڈنو عبید کی باتیں سُن کر سلطان احمد تونگر سکتے میں آ گیا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا جو شخص کل تک جانان کے اپارٹمنٹ میں گھس کر بھی اُس کی ہزیمت اور تذلیل کا اہتمام کرتا رہا ہے، زندگی کے سب سے بڑے امتحان کی اِس گھڑی میں کس روپ میں اُس کے سامنے آیا ہے۔ آج صبح اُسے گھر سے باعزت طور پر بلوانے کے بعد بھی چند لمحے پہلے تک کسی طرح اُس کے زخموں پر نمک پاشی کرتا رہا لیکن چشم زدن میں اُس پر اتنے احسانات! ماجرا کیا ہے؟ کیا چاہیے اُسے مجھ سے؟ کہیں اگلے لمحے پھر تو میرے لیے کسی اور بدسلوکی کا بندوبست تو نہیں کر رکھا! کیا ہے یہ شخص؟ کیا کوئی ذہنی مریض!

اللہ ڈنو عبید اُٹھ کر جانے لگا تو جاتے جاتے پھر ٹھہر گیا۔ اُس کی آنکھوں میں پھر سے شرارت تیرنے لگی تھی۔ "ہاں! ایک بات کہنا تو میں بھول گیا، جانان بدستور آپ کے پاس رہے گی مگر آفس میں، آفس کے کام کی حد تک، آج شاید وہ نہ آئے کہ آپ نے بھری جوانی میں اُسے دل کا مرض لاحق کر دیا ہے لیکن آپ احتیاط کیجیے گا، یہ چھوت کی بیماری آپ تک پہنچی تو شاید آپ کا دلِ ناتواں اَب اُسے جھیل نہ سکے۔"

۲۷

تحصیل حیدر گوٹھ کے تازہ ترین واقعہ نے صوبے بھر کے وکلا اور ضلعی عدلیہ کے ججوں کو ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ وکلا کی ہڑتال میں یہ جج بھی سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ اِن حالات میں نظامِ انصاف نے تو کیا چلنا خود اُن کی عزت، آبرو اور جان بھی خطرے میں پڑ چکی تھی۔ تحصیل بار کے صدر، سیکریٹری کا الیکشن اب تیس پینتیس لاکھ روپے کی سرمایہ کاری تھا تو ضلع کا الیکشن کروڑ ڈیڑھ کروڑ کی۔ اِسی طرح صوبائی بار کونسل کی ممبری کے لیے اخراجات کا تخمینہ دو اڑھائی کروڑ تک پہنچ چکا تھا۔ اُس سے اوپر کے الیکشن اور عہدوں کے حصول کے لیے اس سے کئی گنا زیادہ روپے مفادات کی بھٹی میں جھونک دیئے جاتے تھے۔ اِس قسم کی سرمایہ کاری اُسی طرح کئی گنا منافع کے

ساتھ بار آور ثابت ہوتی تھی کہ جیسے پارلیمنٹ کے انتخابات میں لگائی گئی دولت پانچ برس کی مدت میں چھپر پھاڑ کر واپس آجاتی ہے۔ وکلا سیاست میں کی گئی سرمایہ کاری کی واپسی کے واسطے بھی سال بھر کی مدت میں کئی حربے استعمال کیے جاتے۔ مقدمے کے موکلین سے اُن کی مرضی کا فیصلہ کرانے اور عدالتوں سے مثبت نتائج حاصل کرنے کی یقین دہانی کے بدلے فیس کے نام پر وصول کی گئی بھاری رقوم نے نظام عدل کو بیوپار میں بدل دیا تھا۔ پہلے پہل تو کرپٹ جوڈیشل افسروں سے تعلقات بنا کر وصول شدہ رقم سے ایک چھوٹی سی مقدار اُسے دے کر اپنے حق میں فیصلہ کراتے ہوئے باقی کی تگڑی رقم خود ہڑپ کر لی جاتی اور اگر کوئی کرپٹ جج نہیں مل پا رہا تو پھر دھونس، دھمکیوں اور شکایتی درخواستوں کے ذریعے کمزور اعصاب کے جج کو مجبور کر دیا جاتا کہ وہ اُن کے سامنے جھک جائے۔ اور اگر پھر بھی نہ جھکے تو آخری حربہ اُس جج کی ٹھکائی، کمرۂ عدالت کی تالہ بندی، ہڑتال اور پھر اُس جج کا تبادلہ یا انکوائری لگوانے کے بعد برطرف کرا کر ہی دم لیا جاتا تاکہ باقی جج اُن کے سامنے کھڑے ہونے کی جرات ہی نہ کر سکیں۔

لیکن تحصیل حیدر گوٹھ کی کچہری سے اُٹھنے والے تشدد کے طوفان کی نوعیت بعد کے حالات نے بدل کر رکھ دی تھی۔ رضوان ہاشمی نے حاجی بخشن سے تگڑی فیس صرف اس لیے وصول کی تھی کہ اُس کے ٹرک ہوٹل سے پکڑے گئے زنا کاری کی سہولیات کے گیارہ ملزموں کو جیل بھجوائے بغیر اُسی روز ہی ضمانت پر رہا کرا دے گا۔ دھونس اور دھمکیوں کا حربہ بھی اِسی مقصد کے لیے تھا لیکن واقعات کی غیر متوقع رونمائی نے سب کچھ اُتھل پُتھل کر ڈالا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ آنے والے دنوں میں ہونے والے بار کے الیکشن کی ساری کی ساری سیاست اِسی تنازعے میں گھس کر اپنی اپنی کامیابی کے خواب دیکھنے لگی۔

صورتِ حال کے حد درجہ بگاڑ نے پولیس اور انتظامیہ کو اس حد تک لاتعلق اور محتاط کر دیا تھا کہ وہ ضلعی عدلیہ کے سربراہ سیشن جج پر حملے کی ایف آئی آر درج کرنا تو ایک طرف رہا، حیدر گوٹھ کے سینئر سول جج پر قاتلانہ حملے اور اُس کا سر پھاڑ دینے کی ایف آئی آر پر بھی مودبانہ اجتناب کی پالیسی اپنائے ہوئے تھے۔ پولیس اور انتظامیہ کی جانب سے ''دیکھو اور انتظار کرو'' کی پالیسی کے

پس منظر میں بھی اِس قسم کے کئی واقعات کا غیر منطقی انجام تھا کہ جب ضلعی عدلیہ کے ججوں اور متشدد وکلا کے خلاف وہاں بھی آخر کار صلح صفائی کرادی جاتی کہ جہاں انسداد دہشت گردی ایکٹ کی ناقابل راضی نامہ دفعات بھی ایف آئی آر میں تخصیص سے لگی ہوتی تھیں۔ ایسے میں ایف آئی آر کی منسوخی اور ملزم وکلا کو بے گناہ قرار دیے جانے کا سارا بوجھ پولیس پر آجاتا۔ اَب اگر پولیس قانون کے نفاذ پر ڈٹی رہتی اور غیر قانونی دباؤ کے سامنے جھکنے سے انکار کرتی تو وکلا کے تشدد کا اگلا نشانہ پولیس ہوتی۔ اِس قسم کی صورت حال میں عدلیہ، جس کی حفاظت کے واسطے پولیس نے تشدد سہا ہوتا تھا، اُن کی مدد تو درکنار اُلٹا ملزمان کی ضمانت لے کر پولیس کو محض دانت کچکچانے پر مجبور کر دیا جاتا۔

صوبہ بھر کے وکلا کی ہڑتال، عدالتی بائیکاٹ اور ضلع شمس پور میں تناؤ کی انتہائی صورت حال کا نتیجہ بھی ماضی کی روایات کے مطابق ہی برامد ہوا۔ ہڑتال کے تیسرے دن ضلع شمس پور کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کا فوری تبادلہ کرتے ہوئے اُسے بغیر کسی پیشہ ورانہ تعیناتی کے اُفسر بکار خاص لگا کر نوٹس اظہار وجوہ جاری کر دیا گیا کہ کیوں نہ اُسے غلط طرز عمل اپنانے اور قائدانہ صلاحیتوں کے فقدان کے سبب ملازمت سے فارغ کر دیا جائے۔ اگرچہ اُسے فوری طور پر چارج چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا تھا لیکن اُس کے چارج چھوڑنے سے پہلے ہی نئے سیشن جج نے شمس پور پہنچ کر چارج لینے کی رپورٹ اوپر بھجوادی۔ اِس کے ساتھ ہی ضلع شمس پور کے تمام ججوں اور مجسٹریٹ صاحبان کے دور دراز کے علاقوں میں تبادلوں کا حکم نامہ بھی موصول ہو گیا۔ اُن سب کو فوری طور پر چارج چھوڑنے اور اُن کے جانشینوں کو بھی اگلے روز یہاں کا چارج لینے کی ہدایت کر دی گئی تھی۔

ضلع شمس پور اور اُس کی تحصیلوں کی تمام کچہریوں میں جشن کا سا سماں تھا۔ وکلا کے مختلف گروپ اِس کامیابی کو اپنے اپنے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ضلع کچہری میں اگر رضوان ہاشمی کا مخالف گروپ بہت بڑا جلوس نکال کر اپنی کامیابی کا دعویٰ دار تھا تو رضوان ہاشمی گروپ نے وہاں بھی چکن قورمہ اور چکن پلاؤ کا اہتمام کر رکھا تھا۔ مخالف گروپ کے جلوس میں شامل وکیل اُدھر نعرے لگانے کے بعد جب رضوان ہاشمی کے شامیانوں میں پہنچے تو پلاؤ کی پلیٹ ہاتھ میں آتے ہی نعرے بھی بدل گئے۔ اب ''ہاشمی ساڈا شیر اے، باقی ہیر پھیر اے'' چل رہا تھا۔

یہی حال باقی تحصیل کچہریوں میں بھی تھا سوائے حیدر گوٹھ کے، جہاں ساری کی ساری سیاست اور طاقت رضوان ہاشمی اور خوشحال خان کے ہاتھوں میں آچکی تھی۔ لیکن یہ الگ بات کہ دیگوں کا خرچہ خوشی خان کے ذمے مگر نام رضوان ہاشمی کا چل رہا تھا۔

ضلع شمس پور کی ٹرانسفر ہو چکی عدلیہ انتہائی مایوسی اور دل شکستگی کے عالم میں سیشن ہاؤس شمس پور میں جمع ہو چکی تھی۔ سابقہ سیشن جج اگرچہ تبادلہ ہوتے ہی اپنے اختیارات سے محروم ہو چکا تھا مگر وہ ابھی تک اپنے اس موقف پر ڈٹا ہوا تھا کہ آئے روز کی اس تذلیل سے بہتر ہے کہ احتجاجی طور پر ضلع کے سبھی جج مستعفی ہو جائیں اور پھر وکیل بن کر ان وکیلوں سے اپنا حساب چکتا کریں۔ اس موقع پر سابقہ سیشن جج نے ایک بھرپور جذباتی تقریر کرتے ہوئے وہاں پر موجود سب ججوں سے حلف لیا کہ اجتماعی استعفوں کی پہلے سے تیار شدہ دستاویز پر دستخط کیے بغیر کوئی بھی وہاں سے گھر نہیں جائے گا۔ اجتماعی استعفوں کی اس دستاویز پر سب سے پہلے سابقہ سیشن جج نے دستخط کیے اور اپنے سپرنٹنڈنٹ کو حکم دیا کہ باقی جج صاحبان سے دستخط کرانے کے بعد اس استعفیٰ کو آج ہی اوپر بھجوا دیا جائے لیکن سابقہ سیشن جج کو جب یہ بتایا گیا کہ سپرنٹنڈنٹ سمیت سیشن ہاؤس کا سارا عملہ نو تعینات شدہ سیشن جج کے پاس سرکٹ ہاؤس جا چکا ہے جہاں وہ عارضی طور پر ٹھہرا ہوا تھا تو وہ سکتے میں آ گیا۔

''ہم سے پوچھے بغیر یہ لوگ وہاں کیسے جا سکتے ہیں؟''

''سرکار! سپرنٹنڈنٹ صاحب باقی عملے کے ساتھ جناب سے پوچھنے آئے تھے مگر آپ جناب جج صاحبان کے ساتھ مصروف تھے۔'' مالی نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔

سابقہ سیشن جج شمس پور کا سر چکرا کر رہ گیا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اُس کا انتہائی وفادار عملہ صرف تبادلہ ہو جانے کے بعد یوں بھی طوطا چشمی کر سکتا ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ یہاں سے تبادلے کے بعد وہ کسی ضلع میں تعینات ہونے نہیں جا رہا تھا بلکہ اُسے او ایس ڈی بنا کر انکوائری کے واسطے شوکاز نوٹس بھی دے دیا جا چکا تھا۔ اس بدل چکی صورت حال کا تو اُس نے ادراک ہی نہیں کیا تھا۔ اپنے گھر سے دور دراز کے اس ضلع میں سب سے زیادہ اختیارات رکھنے والا شخص

یوں تنہا اور بے اختیار ہوا تو روہانسا ہو گیا۔ پیٹ میں اُٹھنے والا نا تشخیص شدہ لحاتی مروڑ اُسے رفع حاجت کے لیے باتھ روم تک لے گیا مگر وہاں سے واپسی پر اُس کا ڈرائنگ روم تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ اب اُسے کوئی حیرت نہ ہوئی کہ سوائے سینئر سول جج شمس پور اور حیدر گوٹھ کے مجسٹریٹ کے باقی سبھی جج اُس سے اجازت لیے بغیر جا چکے تھے۔ یوں جانے والوں میں حیدر گوٹھ کا وہ سینئر سول جج بھی شامل تھا کہ دو روز قبل جس کا سر پھٹا تھا۔

سابقہ ہو چکے سیشن جج نے سُتے ہوئے چہرے کے ساتھ سینئر سول جج کی طرف دیکھا مگر اُس نے سر جھکا لیا۔ مسمرائز انداز میں انھیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سیشن جج خود بھی صوفے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے توقف اور سوگوار خاموشی کے بعد اُس نے آنکھ اُٹھا کر سینئر سول جج کی طرف دیکھا تو اُس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا اجتماعی استعفوں کا کاغذ اپنی نشست سے اُٹھ کر سابقہ سیشن جج کے حوالے کر دیا۔ سیشن جج نے بے دلی سے اُسے اُلٹا پلٹا کر دیکھا۔ اُس کے اپنے دستخطوں کے علاوہ اُس پر صرف دو دستخط اور تھے، وہیں موجود سابقہ سینئر سول جج شمس پور اور سابقہ مجسٹریٹ حیدر گوٹھ کے۔ سیشن جج نے نم آلود آنکھوں کے ساتھ متشکرانہ انداز میں اُن دونوں کی طرف دیکھا اور پھر نجانے دل میں کیا دھیان آیا، وہ استعفیٰ کے کاغذ کے ٹکڑے کرتا چلا گیا۔

سیشن ہاؤس کے برعکس شمس پور کے سرکٹ ہاؤس کا میٹنگ روم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جہاں وکلا سیاست کے بڑے بڑے جغادری، بڑے بڑے نام نئے سیشن جج شمس پور کی دعوت پر جمع تھے۔ ڈپٹی کمشنر، ڈسٹرکٹ پولیس آفیسر، حیدر گوٹھ کا اسسٹنٹ کمشنر اور ڈی ایس پی بھی ایک ہی بلاوے پر نہ صرف وہاں موجود تھے بلکہ وکلا راہنماؤں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ نیا سیشن جج شمس پور کیسا ہے، وکلا برادری کے لیے کس قسم کا ریلیف پیکج لے کر آ رہا ہے۔ بس اتنی خبر تھی کہ بہت قابل اور معاملہ فہم ہے، سب سے بنا کر رکھتا ہے۔ ڈیپوٹیشن پر بہت سارے حکومتی عہدوں پر بھی کام کر چکا ہے، لہٰذا اچھی طرح سمجھتا ہے کہ سیشن ججی کس طرح چلائی ہے۔ یہ خبر بھی گرم تھی کہ ضلع شمس پور کا چارج لینے کے بعد نہ تو وہ اپنے پیشرو سیشن جج سے ملا ہے اور نہ ہی کسی پہلے سے تعینات جج یا مجسٹریٹ کو ملاقات کا وقت دیا۔ بات یہ بھی پھیلی ہوئی تھی کہ سابقہ

سیشن جج نے اِسے اپنے ہاں کھانے پر بلایا مگر نئے سیشن جج نے جونیئر ہونے کے باوجود اپنے سینئر کولیگ کا کھانا کھانے سے معذرت کر لی۔ یہ خبر پھیلی تو وکلا کے متحارب رہنماؤں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب اُن کی سُنی اور مانی جائے گی، کسی اور کی نہیں۔

کافی دیر انتظار کرانے کے بعد نیا ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج سرکٹ ہاؤس کے میٹنگ روم میں آیا تو اُس کے چہرے پر کسی قسم کے معذرت خواہانہ تاثرات نہیں تھے۔ اُس کے آتے ہی وہاں بیٹھے ہوئے تمام وکیل رہنماؤں اور پولیس اور انتظامیہ کے ضلعی اور تحصیل سربراہوں نے اپنی نشستوں سے اُٹھ کر اُسے تعظیم دی۔ نیا سیشن جج دیکھنے میں نہ تو کسی دبنگ شخصیت کا مالک تھا اور نہ ہی اُس کے چہرے مہرے سے رعب داب ٹپکتا تھا۔ لیکن ایک عجیب قسم کا میسنا پن تھا کہ جس میں نخوت اور موقع پرستی کوٹ کوٹ کر گندھی ہوئی تھی۔ اُس نے وہاں بیٹھتے ہی اب تک کے واقعات پر وکلا رہنماؤں سے تہہ دل سے معذرت چاہی کہ تبادلہ ہو چکے عدالتی افسران کے ناجائز اور غیر قانونی اقدامات واقعی اِس قابل تھے کہ اُن پر وکلا برادری کو احتجاج اور بھرپور احتجاج کرنا چاہیے تھا۔ اپنے مختصر سے خطاب میں اُس نے وکلا رہنماؤں سے گزارش کی کہ جو ہو گیا سو گیا اب کل سے عدالتی بائیکاٹ اور احتجاجی ہڑتال ختم ہونی چاہیے۔

وکلا رہنماؤں نے نئے سیشن جج کا شکریہ ادا کیا اور اظہارِ مسرت کے ساتھ فوری طور پر ہڑتال ختم کرنے کا اعلان کیا مگر اِس شرط پر کہ وکیلوں کے خلاف درج شدہ فوجداری مقدمات کو فوری طور پر ختم کیا جائے گا اور اگر اِس قسم کی کوئی کارروائی زیرِ غور یا زیرِ التوا ہے تو اُسے بھی بلا تاخیر واپس لے لیا جائے گا۔ نئے سیشن جج نے وعدہ کیا کہ ایسا ہی ہوگا۔ وکلا نے ابھی اپنے کچھ اور مطالبات بھی پیش کرنے تھے مگر سیشن جج اُٹھ کھڑا ہوا اور جاتے ہوئے سپرنٹنڈنٹ کو اشارہ کر گیا کہ ڈپٹی کمشنر اور ڈسٹرکٹ پولیس آفیسر کو سرکٹ ہاؤس میں اُس کے رہائشی کمرے سے ملحقہ منی میٹنگ روم میں بلا لیا جائے۔

نو تعینات سیشن جج نے ڈپٹی کمشنر اور ڈسٹرکٹ پولیس آفیسر کو ایک بار پھر منی میٹنگ روم میں کافی دیر تک انتظار کرایا۔ ملاقات ہوئی تو رویہ اس طرح رکھا کہ جیسے شمس پور کے معاملات میں

وہ قطعی دلچسپی نہیں رکھتا۔ اُس نے اب تک کا احوال بھی سُنا تو اِس انداز میں کہ جیسے سُنی اَن سُنی کر رہا ہو۔ اُن دونوں نے یہاں کے وکیلوں میں سے ایک ایک کا کچا چٹھا بیان کرنا چاہا تو اُس نے اِس علاقے میں جرائم کی نوعیت پوچھنی شروع کر دی۔ اُن دونوں اَفسروں نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا اور اجازت چاہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے لیکن سیشن جج نے اُنھیں ایک بار پھر بٹھا لیا۔ اب کے سیشن جج نے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کی بجائے واضح طور پر کہہ دیا کہ اُس کے پیش رو نے وکیلوں کے خلاف فوجداری مقدمات درج کرنے کے لیے جو بھی رپورٹس بھجوائی ہیں اُن پر کچھ عمل کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ مزید وضاحت کی ٹیج لگا کر اُنھیں واپس سپرنٹنڈنٹ سیشن کورٹ کو بھجوا دیا جائے اور جو ایف آئی آر حیدر گوٹھ کے وکیلوں کے خلاف درج ہو چکی ہے اُس کی منسوخی رپورٹ مرتب کرتے ہوئے علاقہ مجسٹریٹ کو بھجوا دی جائے تا کہ فوری طور پر علاقے میں سکون ہو۔

ڈسٹرکٹ پولیس آفیسر نے ڈپٹی کمشنر کی طرف دیکھا جب کہ سیشن جج اُن دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ''کیا کوئی پرابلم ہے ڈی پی اُو صاحب! اگر کوئی ایسا ایشو ہے تو مجھے بتائیں؟''

''جی ایشو تو ہے۔'' ڈی پی اُو ہلکا سا کھنکارتے ہوئے بولا۔

''تو مجھے بتائیں ناں! کیوں ڈی سی صاحب! ایک دوسرے کے مسائل ہم مل جل کر حل کریں گے تو ضلع چلے گا۔'' بات کرتے ہوئے سیشن جج کی آنکھیں گھومنے لگی تھیں۔

''سر! بات یہ ہے کہ حیدر گوٹھ کچہری کی ایف آئی آر میں منسوخی رپورٹ بنانا ناممکن ہے، درجنوں گواہ ہیں کہ کس کس وکیل نے مجسٹریٹ کی عدالت میں ریمانڈ کے وقت جھگڑا کیا، پولیس فائل کو جلایا، گیارہ ملزمان کو فرار کرایا اور پھر مجسٹریٹ کے کمرہ عدالت کے ساتھ ساتھ اسسٹنٹ کمشنر اور ڈی ایس پی کے دفتروں کو بھی جلا دیا، اتنے بڑے مقدمے کی منسوخی رپورٹ کس قانونی جواز پر تیار کی جائے۔'' ڈی پی اُو نے سیشن جج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سب کچھ ایک دم کہہ دیا۔

''ہوں! تو یہ بات ہے، میں تو آپ کی جان چھڑانا چاہتا تھا اِس فساد سے! اگر آپ ہی نہیں چاہتے تو میں کیا کر سکتا ہوں، پھر خود ہی بھگتیں اِن وکیلوں کو۔''

۲۸

''ہاں بولو بخشن! بہت بڑے آدمی بن گئے ہو کہ اب فون ہی نہیں سنتے۔'' بخشن کے مطلوبہ نمبر ملاتے ہی جھلاہٹ بھری آواز سنائی دی۔

''نہیں سرکار میری ایسی مجال کہاں!'' حاجی بخشن کے لہجے کو پورے بدن کی خوشامدانہ رطوبتیں تر بتر کیے جا رہی تھیں۔

''بھڑوے! تین بار فون کر چکا ہوں پچھلے تین گھنٹوں میں، کس کے پچھواڑے میں گھسے ہوئے تھے؟'' دوسری جانب سے احساسِ برتری تو تھا ہی مگر غصے اور حقارت کا تناسب کچھ زیادہ ہو رہا تھا۔

''میں نے کہاں گھسنا ہے سرکار! میرے ایسے نصیب کہاں، میں تو اپنے آپ سے اُکتایا ہوا ہوں۔'' خوشامد کے باوجود بخشن کے لہجے میں چڑچڑا پن ظاہر ہونے لگا تھا۔ دوسری جانب سے ایک بھرپور قہقہہ سنائی دیا۔

''لگتا ہے کتوں نے سور کو گھیرا ہوا ہے۔''

''کچھ ایسا ہی ہے سرکار.... اور کتے بھی وہ ہیں جو میرے ٹکڑوں پر پل کر اِس مقام تک پہنچے ہیں۔''

''بھڑوے! ہزاروں عورتوں کا سودا کرنے کے بعد بھی معصوم بننے کی کوشش کرے گا تو یونہی جوتے کھائے گا۔''

''ہزاروں کہاں سرکار! چھوٹا سا ٹرک ہوٹل اور اُس سے بھی چھوٹا سہولت خانہ، دس بیس چھکے اور پانچ سات عورتیں، اِس میں کون سا گناہ کر لیا میں نے۔'' بخشن پھر سے منمنایا۔

''ناں! تو نے مجھے چوتیا بنانے کے لیے فون کیا ہے، میں نہیں جانتا کیا کہ تمھارے اصل کاروبار کیا ہیں، کتنے ہیں اور اُن میں سے کتنا کماتے ہو تم یہ ٹوپی ڈراما پولیس کے ساتھ کر سکتے ہو، ڈی سی کمشنر اور وزیروں مشیروں کے ساتھ کر سکتے ہو مگر میرے ساتھ نہیں۔''

''سرکار! آپ تو خوامخواہ ناراض ہو گئے، آپ کے سامنے تو میں کیا اور میرے کاروبار کیا، بادشاہ تو آپ ہیں، میرے جیسے تو کئی آپ کے زیرِ سایہ، آپ کی وجہ سے دال روٹی کما رہے ہیں۔'' بخشن کے تیور ایک پل میں ٹھُس ہو گئے۔

''میری بات سُن! ایک لڑکی تمھارے پاس تھی رُباب، کہاں چھپا رکھا ہے اُسے؟ واپس کر، جانے دے اُسے جہاں سے آئی تھی۔''

''رُباب؟'' بخشن کی آواز گلے میں اٹک کر رہ گئی۔

''بھڑوے! تو اُس کی اصلیت نہیں جانتا! تو نے تو اُسے ٹکے ٹوکری سمجھ کر ڈرائیوروں کے رنڈی خانے میں بٹھا دیا، اب ایسے میں پولیس تمھارے ہوٹل پر ریڈ نہ کرتی تو کیا تمھارے چوتڑ دھلاتی؟ واپس کر اُسے جانے دے۔''

حاجی بخشن کی سماعت جواب دینے لگی۔ ذہن میں خیالات کا بھونچال الگ سے ہر موجود سوچ کو تہس نہس کیے جا رہا تھا۔ ''میں کیا سمجھا تھا لیکن کون ہے یہ رباب؟ کہاں سے آئی ہے یہ رباب'' بخشن ایسے سوالوں میں اُلجھا کہ چُپ سی لگ گئی، سکتے میں آ گیا۔

''ٹھیک ہے! اگر تو نے اسی طرح بدمعاشی کرنی ہے تو پھر اپنا بندوبست کر لے، ابھی تو کتوں نے سور کو گھیر اڈالا ہے تو تیری پھٹ کے رہ گئی ہے، اس کے بعد جو ہوگا وہ تیری سوچ اور سمجھ سے بھی باہر ہوگا۔''

''نہیں سرکار! وہ لڑکی میرے پاس نہیں، وہ تو پولیس ریڈ میں پکڑی گئی تھی، پھر پولیس کے پاس رہی اور اگلے دن جب عدالت میں مارکٹائی ہوئی تو وہ بھی وہاں سے غائب ہو گئی، اور سرکار مجھے کیا خبر کہ وہ کون ہے کہاں سے ہے، میرے پاس تو ایک دلال لے آیا تھا، لڑکی دے گیا اور رقم لے گیا، سرکار میں نے تو اڈے پر بٹھانا تھا کوئی سلائی کڑھائی تھوڑی کرانی تھی۔''

''تو بکواس کرتا ہے، تجھے اگر سب خبر نہیں تو اتنی ضرور ہے کہ وہ کوئی عام تام نہیں بلکہ خاص الخاص ہے۔ اُس حرامی ایس ایچ اُو ضیا کو جان بوجھ کر نہیں بتایا گیا تھا کہ یہ لڑکی کون ہے اور اِس کو کس طرح باقیوں سے الگ کرنا ہے ورنہ وہ ضرور اپنا کوئی لُچ تلتا۔''

"سرکار مجھے پہلے خبر کر دیتے! میں ویسے ہی آپ کو پیش کر دیتا، پولیس ریڈ کی نوبت ہی نہ آتی، اِس ایک پولیس ریڈ کی وجہ سے میرا کباڑا ہو گیا ہے، ہر لحاظ سے۔" بخشن ایک بار پھر منمنایا۔

"مجھے بھی اِس کی خبر نہیں تھی، آج بتایا گیا ہے، پہلے یہ کام کسی اناڑی کے سپرد تھا لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا، اب تم بھی کان کھول کر سُن لو بخشن کہ مجھے وہ لڑکی رُباب ہر صورت میں کل شام سے پہلے اِدھر چاہیے، میرے فارم ہاؤس میں! ورنہ تم تو جانتے ہو کہ اللہ ڈِنو عبید کس بلا کا نام ہے لیکن جن کی یہ لڑکی ہے وہ اللہ ڈِنو عبید کے بھی باپ ہیں۔"

دوسری جانب سے فون بند ہو چکا تھا مگر اِس طرف حاجی بخشن سکتے کے عالم میں بدستور فون کو کان سے لگائے اِس طرح بیٹھا تھا کہ جیسے جسم میں جان ہی نہیں رہی۔ پوری کی پوری گیم اُس کے سامنے کھلی ہوئی تھی مگر اُس کا ذہن مکمل طور پر ماؤف تھا۔ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر۔ اُس نے سوچا نہ تھا کہ اب تک جس لڑکی کی گوری چمڑی اور بدمست جوانی کو اپنے طور پر اعلیٰ درجے کا مال سمجھ کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگا تھا وہ یوں اُس کے زندگی بھر کی مشقت سے جمائے گئے کاروبار اور بنائی گئی عزت کے لیے تباہ کن ثابت ہو گی۔ ایک ٹکے کا بھڑوا اُسے پچاس ہزار روپے میں اُس کے پاس چھوڑ کر ایسا گیا کہ پھر واپس ہی نہ آیا اور نہ ہی اِس لڑکی نے زبان کھولی کہ وہ کہاں کہاں قیامتیں ڈھا کر اُس تک پہنچی تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو لعنت ملامت کی کہ اُڑتی چڑیا کے پر گننے والا بخشن کیونکر ایک لڑکی کو اپنے ہاں جگہ دینے سے پہلے اُس کا آگا پیچھا نہ بھال سکا۔ تاسف تو اِس بات کا بھی تھا کہ تمام تر ذرائع ہوتے ہوئے بھی یہ تک نہ جان سکا کہ اُس کے ہوٹل پر پولیس کا چھاپا کس نے پڑوایا ہے۔ کبھی وہ آئی جی کو موردِ الزام ٹھہراتا تو کبھی شہزادی کو جس کے عشق میں نمک حرام ایس ایچ اُو چوہدری ضیا ہوٹل پر چڑھ دوڑا تھا۔ اب نیا کھاتا یہ کھلا کہ جس بڑی ہستی نے بھی یہ ریڈ کرایا تھا اُس نے خود تو چوہدری ضیا کو نہیں کہا ہو گا بلکہ حکم تو پولیس ہی کے کسی بڑے نے دیا ہو گا۔ اب ایس ایچ اُو کا بڑا ڈی پی اُو سے لے کر آئی جی تک کوئی بھی ہو سکتا تھا لیکن یہ سب کے سب اُس کے پروردہ ہونے کے باوجود اُسی کو دھوکہ دے گئے اور بتایا کچھ نہیں۔ کچھ تو

ایسا تھا کہ جس کے خوف سے اِن افسروں نے اُسے آگاہ کرنا بھی گوارا نہ کیا اور اُس کی عزت یوں رول کر رکھ دی۔

اللہ ڈنو عبید کی بات بھی بخشن ذہنی طور پر ہضم نہیں کر پا رہا تھا کہ اُس کے ہوٹل پر پولیس کے چھاپے کا مقصد اُسے سبق سکھانے سے زیادہ رُباب کو دوسرے کسبیوں سے الگ کر کے وہاں سے نکالنا تھا مگر اِس منصوبے کو ایس ایچ اُو چوہدری ضیا اُس طرح سے مکمل ہی نہ کر سکا اور رُباب کو بھی دوسروں کے ساتھ گرفتار کر کے تھانے پہنچا دیا گیا۔ بخشن کو اللہ ڈنو عبید کی یہ بات بھی بہت عجیب لگ رہی تھی کہ چوہدری ضیا کو ریڈ کرنے تو بھیج دیا گیا مگر اُسے یہ نہ بتایا گیا کہ اُس نے وہاں کرنا کیا ہے۔ عجیب پولیس آپریشن تھا کہ جس لڑکی کو وہاں سے نکالنے کے لیے اتنا بڑا بکھیڑا کھڑا کیا گیا اُسے بھی گرفتار کر کے تھانے پہنچا دیا گیا۔ کیا چوہدری ضیا سے ریڈ کرانے والے نہیں جانتے تھے کہ گرفتاری کی کارروائی پولیس موقع پر نہیں بلکہ تھانے جا کر ڈالتی ہے تو ایسے میں اُن طاقت ور لوگوں نے رُباب کو تھانے سے کیوں ناں واپس منگوا لیا، اُلٹا اُس کی گرفتاری ڈلوا کر اُسے اگلے روز مجسٹریٹ کی عدالت میں بھی پیش کرایا۔ یہ بات بھی بخشن کے لیے ناقابلِ یقین تھی کہ جو طاقت ور لوگ رُباب کا اِس حد تک پیچھا کر رہے تھے انھیں کیوں پتا نہ چلا کہ ہنگامے کے دوران وہ رضوان ہاشمی کی گاڑی کے ذریعے کچہری سے نکال کر کسی محفوظ جگہ پہنچا دی گئی تھی۔

بخشن کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جوں جوں بیدار ہوتی چلی جا رہی تھی اُسے اللہ ڈنو عبید کی کہانی محض جھوٹ کا پلندہ دکھائی دینے لگی تھی۔ اُسے یہ بھی محض ڈھکوسلا لگا کہ اُس سے پہلے کسی طاقت ور ہستی نے رُباب کو اُس کے چنگل سے چھڑانے کے لیے یہ ذمہ داری کسی اناڑی کو سونپی اور اُس کی ناکامی کے بعد اب معاملہ اللہ ڈنو جیسے کنجر کے بیچ کے حوالے کر دیا گیا۔ بخشن سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور اُس طاقت ور ہستی کے چغد پن پر لکھ لعنت بھیجتے ہوئے سوچنے لگا کہ سیدھی سی بات تھی، اگر وہ طاقت ور ہستی، وہ ہیبت خان جو اللہ ڈنو کا بھی باپ ہے، یہ جانتا تھا کہ رباب اُس کے پاس ہے تو سیدھا اُسی کو کہتا کہ یار بخشن وہ لڑکی ہماری ہے ہمیں واپس کر دو تو وہ کون سا انکار کرتا۔

حاجی بخشن نے اللہ ڈنو عبید کی کہانی کو چاروں طرف سے کھنگال لیا۔ اُس کا گویڑ یہ کہتا تھا

کہ بات یہ نہیں، بات کچھ اور ہے۔

"اِس بھڑوے کنجر کے بچے ڈنو کو بھی آج ہی اِس گیم کا پتا چلا ہے اور وہ اِس میں اپنا لُچ تلنے کے واسطے مجھے یوں دھمکاتا ہوا گھس آیا ہے۔" بخشن اب منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا تھا۔ لیکن ایک سوال، بہت بڑا سوال اب بھی بخشن کے سامنے منہ پھاڑے کھڑا تھا کہ اگر یہ سب کچھ یوں نہیں تو پھر اُس کے ہوٹل پر پولیس کا چھاپہ کس نے مروایا؟ کون ہے اس واردات کے پیچھے کہ جس نے حاجی بخشن جیسے گھاگ چلتر باز کو یوں باندھ کر ایک طرف ڈال دیا ہے۔ کوئی تو ایسا تھا کہ جس سے بخشن کا کاروباری عروج اور اثر رسوخ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا یقیناً اِس پوزیشن میں تھا کہ مقامی پولیس حاجی بخشن کی نمک خوار ہوتے ہوئے بھی نمک حرامی پر مجبور ہو جائے اور اُس کے حکم کو حاجی کے مفاد پر ترجیح دیتے ہوئے حاجی کی اینٹ سے اینٹ بجا دے۔

سوچوں کے گڑ دھال میں بری طرح اُلجھا ہوا حاجی بخشن ایک دم اِس بری طرح چونکا کہ اپنی جگہ سے اُچھل پڑا۔ اِس کی وجہ کچھ اور نہیں تھی بلکہ شہزادی تھی جس نے کافی دیر سے موڑھے پر پریشان اور فکر مند بیٹھے حاجی بخشن کو یوں گم سُم ہوتے دیکھا تو اُس کے قدموں میں قالین پر بیٹھ کر آہستگی سے اُس کے پاؤں پکڑے اور ہولے ہولے دبانے شروع کر دیے۔ بخشن کا دل چاہا کہ یوں اُس کے اوسان خطا کرنے پر شہزادی کی ماں بہن ایک کر دے مگر اُسی آن نجانے کیا سوچ کر منہ میں بھری ہوئی سبھی گالیوں کو نگل لیا۔

اگرچہ شہزادی سر جھکائے اُس کے پاؤں دبا رہی تھی لیکن پھر بھی اُس کے ہاتھوں کا لمس اور میٹھا میٹھا دباؤ حاجی بخشن جیسے شاطر کو کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عورت چاہے جس حیثیت میں بھی ہو، یوں بن کہے جب مرد کے بدن کے کسی بھی حصے کو اپنے لمس سے ان کہی تسکین بہم پہنچانے لگے تو سمجھ جایئے کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اُس نے شہزادی کا بازو تھام کر اُسے اُٹھایا اور اپنی دائیں ران پر بٹھا کر اُس کی ڈھلی ڈھلی سی صورت کو دیکھنے لگا۔ شہزادی نے صرف اُسے ایک بار دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔ اُس کے گالوں پر بار بار لال لال بھنور جب کہ ہونٹوں میں خفی سی کپکپاہٹ محسوس ہونے لگی تھی۔ کوئی عجیب سی خوشبو تھی کہ جو شہزادی کے بدن سے اُٹھتے ہوئے

بخشن کے حواس پر چھانے لگی تھی۔ نہ تو یہ کسی پرفیوم کی مہک تھی اور نہ ہی کسی عطر کی باس۔ جوان نسوانی جسم کی رگوں میں جب خون کی گردش تیز ہوتی ہے، پنڈا تپتا ہے تو مسام مسام اپنی ہی خوشبو کی مستی میں عطار ہو کر جھومنے لگتا ہے۔ ایسے میں کوئی اندر سے آنند کی لہر اُٹھی اور بخشن نے شہزادی کو بے اختیار بھینچ لیا۔

وہ اتنی عجلت میں اِس قدر قربت کے لیے تیار نہیں تھی۔ دیسے بھی بخشن کا قرب ہمیشہ سے اُس کے لیے کسی امتحان سے کم نہیں ہوتا تھا۔ اُس کے جسم خاص طور پر منہ سے اُٹھنے والی ناگوار بو اعصاب کو ہلا کر رکھ دیتی تھی۔ ایسے عالم میں اُس کی کوشش ہوتی کہ اپنی سانس اُس وقت تک روکے رکھے کہ جب تک وہ اُسے اپنے آپ سے علیحدہ کرنے کے لیے جسمانی طور پر آمادہ یا فطری طور پر مجبور نہ ہو جائے۔ شہزادی کا چہرہ بخشن کے چہرے سے مَس ہو رہا تھا اور ایک بار پھر اُس کے لیے سانس لینا یا اُسے روکے رکھنا دو بھر ہو رہا تھا۔ جب کہ اُدھر وفورِ جذبات کے عین عروج پر حاجی بخشن سوچے جا رہا تھا کہ اِس عمر میں لڑکیاں چاہے جتنی بھی بھری بھری اور صحت مند ہوں اُن کا وزن محسوس ہی نہیں ہوتا لیکن یہی لڑکی جب ادھیڑ عمر کی عورت بنتی ہے تو دبلے پتلے ہونے کی صورت میں بھی ہڈیاں اِس قدر وزنی ہو جاتی ہیں کہ اُٹھانا مشکل ہو جاتا ہے۔

شہزادی نے سانس تو روک لی لیکن بیک وقت گلے میں خراش اور ناک کے نتھنوں میں سرسراہٹ ہونے لگی تھی۔ چھینک اور کھانسی کو روکنا مشکل ہوا تو شہزادی نے خود ہی اپنے آپ کو بخشن کی جکڑن سے نکالنا چاہا مگر اُس نے اُلٹا اور بھی بھینچ لیا۔ نتیجہ اِس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ بخشن کا چہرہ شہزادی کی چھینک اور کھانسی کی زد میں آ جائے۔ اب کے اُس نے خود ہی شہزادی کو اپنے زانو سے اُٹھا دیا۔ کھانسی تھی کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

''سردی لگ گئی ہے تجھے.... جب نہائی تھی تو گرم کپڑے کیوں نہیں پہنے، لازم تھا جوبن کے نظارے دکھانا کیا؟ کنجر کی بچی۔'' حاجی بخشن پلک جھپکتے ہی اپنے اصل روپ میں آ چکا تھا۔

کمرے کے دوسرے کونے دور جا کر موڑھے پر بیٹھی شہزادی کی کھانسی اگرچہ رُک چکی تھی لیکن وہ اب بھی سہمی سہمی سی لگ رہی تھی۔ چھینک سے نم آلود ناک اور کھانسی کی شدت سے لعاب

زدہ لبوں کو اُس نے دوپٹے کے پلو سے پونچھا اور بخشن کی طرف خوفزدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اُس کا فون پھر آیا تھا۔''

''کس کا؟'' بخشن نے چونک کر شہزادی کی طرف دیکھا۔

''چوہدری ضیا کا؟'' شہزادی گھبرائی تو آواز حلق میں پھنس گئی۔

''پھر اُٹھالیا تھا پرانا فون؟'' بخشن کی آنکھیں باہر کو آنے لگیں۔

''میں کہاں سے اُٹھاتی پرانا فون، وہ تو آپ نے الماری میں رکھ دیا تھا، یہ تو اُس نے نئے فون پر کیا ہے۔'' شہزادی نے ڈرتے ڈرتے نیا فون بخشن کی طرف بڑھا دیا لیکن اُس نے فون دیکھنے کی بجائے اُٹھ کر شہزادی کو گُت سے پکڑ کر اُسے زور کا مروڑا دے دیا۔ بالوں کے کھنچاؤ کی تکلیف سے اُس کی چیخ نکل گئی۔

''حرامزادی! کسی کنجر کا بیج.... نئی سم پر اُس کا فون کیسے آ گیا؟ ضرور پہلے تو نے اُسے فون کیا ہوگا۔'' حاجی بخشن نے شہزادی کی گُت کو اور مروڑا چڑھایا تو اُس کی گردن پیچھے کی طرف مڑ گئی۔

''قسم سے میں نے فون نہیں کیا، میرے پاس تو خود فون آیا، میں نے سمجھا آپ نے کیا ہے مجھے بلانے کے واسطے لیکن جب سُنا تو وہ مُوا چوہدری ضیا تھا۔'' شہزادی کے لیے اتنی سے بات کہنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ حاجی بخشن نے اُس کی گُت چھوڑ کر دھکا دے دیا۔ وہ تھوڑی سی لڑکھڑائی لیکن گری نہیں، فوراً سنبھل گئی۔

''کیا کوئی جادوگر ہے وہ بھڑوا! ٹکے کا پلسیا ہی تو ہے، اُسے نئی سم کا نمبر کیا تمھاری ماں نے دیا ہے یا باپ نے؟'' بخشن غصے کی شدت اور بے دھیانی میں یہ جملہ کہہ تو گیا مگر ماں باپ کا ذکر آتے ہی وہیں پر رُک گیا لیکن بس ایک ساعت کے لیے اور پھر سے آنکھیں نکال لیں۔ ''ماں کو فون کیا تھا؟''

''نہیں اللہ کی قسم نہیں، میں نے کسی کو فون نہیں کیا۔''

''چل دکھا! اِدھر دکھا مجھے فون، میں دیکھتا ہوں کہ تو نے کہاں کہاں چول ماری ہے۔''

بخشن نے آگے بڑھ کر فون شہزادی کے ہاتھ سے چھین لیا۔

۲۹

سلطان تونگر وسیع وعریض فارم ہاؤس کی انیکسی میں منتقل ہو چکا تھا۔ یہاں اُس کا استقبال پورے بدن سے مسکرانے والی دوشیزہ نے کیا جو اپنے نام کی طرح واقعی گل رخ تھی۔ قدرے چھوٹا قد جسے اُس نے لانگ بوٹ، کاٹن کے ٹائٹ ٹراؤزر، گھیردار فراک، لیدر کی سلیولیس جیکٹ اور بالوں کو خوب کستے ہوئے اوپر کو اُٹھا کر بنائی ہوئی پونی ٹیل سے کھینچ کھانچ کر اونچا کیا ہوا تھا۔ اپنی رنگت اور نقوش سے وہ سواتی حسیناؤں سے مشابہت لیے ہوئے تھی لیکن اُردو شستہ مگر کبھی کوئی لفظ پشتو لہجے میں بول جانا اُسے جچ رہا تھا۔ چھٹتے ہی اُس نے بتا دیا کہ اُس کا باپ سوات کا رہنے والا جب کہ ماں افغان مہاجر تھی۔

تونگر اس وقت اِس قسم کی گفتگو سننے کے موڈ میں قطعی نہیں تھا۔ ویسے بھی پہلے ہی ملاقات میں زیادہ بولنے اور خوامخواہ اپنی کہانی سنانے والے لوگ اُسے سخت ناپسند تھے۔ خاص طور پر جب وہ گھریلو ملازم یا ڈرائیور ہوں تو مشکل سے برداشت ہوتے تھے۔ گل رخ کو دیکھتے ہی اُس کے ذہن میں کسی میکسیکن لڑکی کا خیال آیا جسے اللہ ڈنو عبید نے خاص طور پر منگوا کر اپنی انیکسی کو لاطینی امریکن ٹچ دینے کے واسطے رکھ چھوڑا تھا لیکن اُس کے بولنے نے تونگر کے تصورات کو لاطینی امریکہ سے اللہ ڈنو عبید کے اِس فارم ہاؤس میں آن پٹخا تھا۔

گل رخ نے آگے بڑھ کر تونگر کے ہاتھ سے لیپ ٹاپ کا بیگ لیا اور پھر باہر جھانک کر دیکھا کہ ڈرائیور کے پاس کوئی سامان تو نہیں۔ سامان نہ پا کر وہ حیران تو ہوئی لیکن تونگر سے پوچھا کچھ نہیں۔ تونگر بیڈ روم میں جانے کی بجائے بجھے دل کے ساتھ سٹنگ لاؤنج میں رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ گل رخ نے تونگر کا موڈ بھانپ کر لیپ ٹاپ بھی اُس کے ساتھ والی صوفہ چیئر پر رکھ دیا۔

''جب سوات میں طالبان آئے تو پتہ نہیں کیوں اُن دونوں کو مار دیا اور مجھے لے جا کر ایک کیمپ میں بند کر دیا، بہت مشکل سے بچی میں۔'' گل رخ کا خیال تھا کہ تونگر اُس کی بات سُن کر کچھ

بولے گا، کچھ پوچھے گا لیکن وہ خالی نگاہوں سے سامنے کی دیوار کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ وہ بہت مایوس ہوئی۔

یہاں آنے کے بعد بھی کئی کئی دن گزر جاتے تھے کسی سے بات کیے۔ وہ کچن کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر فارم ہاؤس کے آفس ایریا گاڑیوں کو آتا جاتا دیکھتی رہتی۔ کبھی کبھار کوئی مہمان آتا تو پھر بھی اُسے بولنے کا موقع کم ملتا کیونکہ مصروف رہنے کے لیے اُس کے ساتھ کوئی نہ کوئی عورت ضرور ہوتی۔ ویسے بھی صاحب کی طرف سے زیادہ بولنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن اس آنے والے مہمان کے لیے صاحب نے خود فون کر کے خاص خیال رکھنے کی تاکید کی تھی۔ ''لیکن یہ تو کچھ بولتا ہی نہیں تو کیسے پتا چلے گا کہ اُسے کیا کچھ اور کس وقت چاہیے۔'' گل رخ نے دل ہی دل میں سوچا۔ پھر خیال آیا کہ کیوں ناں چائے کافی پوچھ لی جائے۔ لیکن پوچھنے پر بھی تونگر نے محض اُسے غور سے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں انکار کر دیا۔

گل رخ اس اکیلے آنے والے مہمان سے مایوس ہو چکی تو کچن سے ملحقہ اپنے کمرے کا رُخ کیا لیکن پھر جاتے جاتے واپس لوٹ آئی۔ اُسے واپس آتا محسوس کر کے تونگر کی پیشانی پر سلوٹیں سی نمودار ہو گئیں لیکن گل رُخ اس سے بے نیاز اُسے بیڈ روم اور دیگر ضروریات کے بارے میں بتانے لگی جس میں یہ بھی شامل تھا کہ اگر اُسے بلایا جانا مقصود ہو تو کتنے بجے سے کتنے بجے تک اور بیڈ کی کس سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی ریموٹ بیل کے بٹن کو پریس کر کے اُسے بلایا جا سکتا ہے۔

گل رخ چلی گئی تو تونگر کو اپنی آنکھوں میں اُتر آنے والی نمی کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ ایک بھرپور اور کُلی طور پر بااختیار زندگی گزارنے کے بعد آج سے شروع ہونے والا زندگی کا نیا باب ایک ایسے شخص کی صلہ رحمی پر استوار تھا کہ جو کل تک اُس کے قلم سے کیے جانے والے دستخطوں کو اپنی تقدیر سمجھتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ فارم ہاؤس، یہ آفس، رہائش گاہ اور یہ اینکسی جس کی چھت کے نیچے وہ سر چھپائے بیٹھا ہے، اُس کی کسی پوسٹنگ کے دوران کسی فائل پر کیے جانے والے دستخطوں کا حاصل ہو۔ ''کیا ہوتے ہیں کسی صاحب بست وکشاد کے قلم سے گھسیٹے گئے یہ دو چار حرف کہ جو اس کی اپنی تقدیر کے ساتھ ساتھ لوگوں کی تقدیر کے پنوں کو بھی موثر سے غیر موثر اور غیر موثر سے

موثر کیے جا رہے ہوتے ہیں۔" تونگر نے سوچا اور آنکھیں موند لیں۔ "لاکھوں لوگ ہزاروں فائلیں اور فائلوں کے پیچھے کھڑے ہوئے کئی ملک الیاس، اپنی غرض کار آنکھوں کو سیاہ چشموں میں چھپائے، حرص و ہوس کی بتیسیاں کھولے اور خوشامدانہ رال ٹپکاتے، اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر فائلوں کے ساتھ ساتھ میز پر سرکتے، اُچھلتے کودتے، چھینا جھپٹی کرتے۔"

تونگر حیران تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد اُس کی زندگی میں واقعات کی بھرمار اور رفتار اتنی تیز کیوں ہوگئی ہے۔ ہر روز تو کیا، آنے والے پہر کا بھی اعتبار نہیں رہا تھا کہ وہ اُس کی زندگی کو کیا سے کیا بنا کر چلا جائے۔ سنا تھا کہ لوگ ریٹائرمنٹ کے بعد سکون کی زندگی جیتے ہیں، دھیمے انداز میں ایک ایک لمحے کو اُس کے پورے گھیر اور پوری جزئیات کے ساتھ انجوائے کرتے ہیں کہ جس طرح کوئی بچہ لالی پاپ کو منہ میں رکھ کر دھیرے دھیرے اُس کی مٹھاس کو زبان میں سمیٹ کر لطف اندوز ہوتا رہتا ہے۔ مگر یہاں تو زندگی نے اُسے پنچنگ بیگ بنا کر رکھ دیا تھا کہ جو بھی آئے ایک دو مُکے رسید کرتا جائے۔ تونگر سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر یہ سب کچھ اُسی کے ساتھ کیوں ہو رہا ہے۔ مان لیا کہ کارپوریٹ سیکٹر کے جغادری، اعلیٰ پوزیشنز پر رہ چکے سرکاری افسروں کو اُن کی ریٹائرمنٹ کے بعد صرف اِس لیے بہت بڑے مشاہروں پر اپنے دفتروں میں جگہ دیتے ہیں کہ اُن کی شخصیت اور سابقہ آفس کی چکا چوند سے اپنے کاروبار کو بڑھاوا دے سکیں۔ اِس حد تک بھی کوئی ایسا بڑا بھونچال نہیں تھا بس تھوڑی سی مصروفیت نے بڑھ جانا تھا۔ لیکن حالت تو یہ ہو چکی تھی کہ صبح، دوپہر اور شام میں ہونے واقعات کے پے در پے مگر معکوس سمت میں رونما ہونے نے تونگر کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔

سٹنگ روم میں کافی دیر تک نمناک آنکھوں کے ساتھ بے سُدھ پڑے رہنے کے بعد تونگر اُٹھ کر بیڈ روم میں چلا آیا کہ واش روم جا سکے۔ بیڈ روم اچھا خاصا کشادہ اور اُس کی توقع سے زیادہ خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ واش روم بھی بیڈ روم کی طرح نہایت نفاست سے صاف ستھرا رکھا گیا تھا۔ اُس میں شیو کا سامان، ٹوتھ پیسٹ برش، شیمپوز، صابن، مائع صابن، تولیے، پرفیومز اور دیگر اشیا سبھی کچھ اِس طرح سے موجود تھا کہ جیسے ابھی لا کر رکھا گیا ہو۔ بیڈ روم میں بھی وہ سبھی کچھ موجود تھا کہ جو تونگر جیسی شخصیت کو ذہنی سکون کے ساتھ رکھ سکے۔ اُس نے الماریاں کھولیں تو وہاں ہر

موقع کے لیے پہنے جانے والے نئے ملبوسات الگ الگ اور اچھی خاصی وافر مقدار میں پہنچا دیئے گئے تھے۔ حتیٰ کہ ایک کونے میں چھوٹی سی بار بھی تھی کہ جہاں تونگر کی پسندیدہ اسکاچ وسکی کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔

تونگر نے ایک لمبی سانس لی۔ غالباً اطمینان کی سانس۔ آج اُسے پہلی بار اللہ ڈنو عبید سے اچھی وائبز آتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھیں۔ وہ لباس تبدیل کیے بغیر ہی بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ عجیب سا احساس تھا کہ جس بیڈ روم میں بیس برس گزرے اب وہ اُسے کبھی نہیں دیکھ پائے گا۔ لیکن چند لمحے پہلے کی بے سکونی کی شدت بیڈ روم میں داخل ہونے کے بعد بتدریج کم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ملازمت کے دوران جب بھی وہ کسی دوسرے شہر یا دوسرے ملک میں کہیں کارِ سرکار پر کچھ دنوں کے لیے اپنے بیڈ روم سے الگ ہوتا تو اطمینان ہوتا کہ اُس کا بیڈ روم اُس کی واپسی کا منتظر ہے لیکن اب اُس کے منتظر ہونے سے بھی کچھ فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ ناہید سے تیس برس کے رشتۂ ازدواج ختم ہونے کی اِس قدر تلخی یا کڑواہٹ ذہن میں نہیں تھی کہ جتنی اپنے بیڈ روم سے جدا ہونے کی در آئی تھی۔ شاید اِس کا سبب دھیرے دھیرے آشکار ہوتی ناہید کی بے اعتنائی اور بے وفائی ہو کہ جو اُسے مرحلہ وار دور کرتی چلی گئی جب کہ اُس کے بیڈ روم نے تو ایسا کوئی بھی حربہ اختیار نہیں کیا تھا۔ اُس سے تو یک لخت الگ ہونا پڑا۔

سلطان احمد تونگر تو جانان کے الگ ہونے پر بھی متعجب تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اللہ ڈنو عبید کی طرف سے پیدا کردہ بدمزگی اور یوں اُس کے اپارٹمنٹ میں دندناتے ہوئے چلے آنے پر وہ یہ جاب چھوڑ دے گی۔ لیکن آج صبح جب عبید نے تونگر سے یہ کہا کہ جانان بدستور اُس کے اسٹاف میں رہے گی لیکن ہو سکتا ہے آج آفس نہ آئے تو وہ حیران ہوا تھا۔ لیکن عبید کی توقع کے برعکس وہ آفس بھی آئی اور اُس کے ساتھ کچھ فائل ورک بھی کیا۔ جانان کے رویے سے کسی طور بھی نہیں جھلکتا تھا کہ کل شام وہ دونوں کس کیفیت میں ایک ساتھ رہے یا وہاں اللہ ڈنو عبید نے اچانک گھس کر کس قسم کی بے ہودگی کی۔ عبید آج بھی چند لمحوں کے لیے تونگر کے آفس میں اُس وقت دوبارہ آیا کہ جب جانان وہاں موجود تھی۔ ظاہری طور پر اُن میں سے کوئی بھی کل کی روداد بیان کرنا تو درکنار، یاد

کرنے کو بھی تیار نہیں تھا۔ نہ اپنی زبان نہ اپنے رویے اور نہ ہی اپنے اپنے تاثرات سے۔ حتیٰ کہ آپس کے تعلقات میں کھنچاؤ تک بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ بس مسکراہٹ کی دل آویزی اور پورے بدن سے چھلکنے والے التفات کی جگہ کام کے روابط کی سنجیدگی نے لے لی تھی۔ کارپوریٹ کلچر کی اِس دورنگی نے تونگر کے اعصاب کو بوجھل کر کے رکھ دیا تھا۔

جانان کے اچانک سامنے آنے پر پہلے پہل تو وہ خود بھی کھنچا کھنچا رہا لیکن جب دیکھا کہ اُس کی تو آنکھوں تک میں اپنائیت کا شائبہ بھی نہیں رہا تو وہ خود نارمل ہوتا چلا گیا۔ لیکن تعجب پھر بھی باقی رہا کہ اتنے دنوں سے اپنائیت اور کل شام انتہائی قربت کی کچھ گھڑیاں اتنا تو اثر رکھتی ہوں گی کہ وہ اُس سے کچھ اظہار تو کرے، کچھ اور ممکن نہیں تو کم از کم کبیدگی، آزردگی یا شکایت کا انداز ہی سہی۔ لیکن جانان کے چہرے اور رویے سمیت اُس کی سبھی ادائیں جامد اور دلربائی بے تاثر ہو چکی تھی۔ تونگر کو یقین ہو چلا کہ اُس کے اور جانان کے درمیان تعامل کی جو نوعیت اور حدود اللہ ڈنو عبید نے طے کر دی تھیں، اب اُنہی پر عمل ہو گا۔ اگر یہ سچ تھا تو سلطان احمد تونگر سوچنے میں حق بجانب تھا کہ جانان کا التفات اور اُسے اپنے اپارٹمنٹ پر بلا کر اللہ ڈنو عبید کے سامنے یوں بے نقاب کرنا بھی پہلے سے طے تھا جس کا مقصد اُس کے اعصاب سے کھلواڑ کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ لیکن اِس کے باوجود اگر اُسی اللہ ڈنو عبید نے اعصابی شکستگی میں مبتلا اور جذباتی طور پر اُدھڑے ہوئے شخص کے لیے رہائش اور آسائش کی صورت پھر سے اپنے آپ میں یکسو ہونے کا اہتمام کیا تھا، تو یہ سب کیا تھا!

ذہنی کسل مندی کی اِس کیفیت نے تونگر کو اُسی نیم دراز کیفیت میں نیند کی آغوش میں پہنچا دیا۔ بیداری کی اولین کیفیت آتے آتے بھی گھنٹہ سوا گھنٹہ لگ گیا۔ شعوری حالت میں سب سے پہلا جھٹکا اُس کے اُترے ہوئے جوتوں اور اوپر ڈالے گئے کمبل کا تھا جو پہلے بیڈ کی پائنتی کی طرف رکھا تھا۔ اُس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں موند لیں کہ گل رُخ کے سوا کون ہو سکتا تھا۔ بدن میں جان آتے ہی وہ واش روم میں گھس گیا اور کافی دیر تک گرم پانی سے شاور لیتا رہا۔ پانی اور اُس کے درجہ حرارت میں کیسا جادو تھا کہ تمام تر ماندگی بھی صابن کے جھاگ کے ساتھ کہیں اُتری اور نکاس

کے لیے بہتی چلی گئی۔ واش روم میں آنے سے پہلے اُس کا نہانے کا ارادہ نہیں تھا اور نہ ہی شام کے لیے کوئی کرتا شلوار الماری سے نکال کر رکھا لیکن جب وہ تولیہ باندھے واش روم سے باہر آیا تو اُس کے پسندیدہ ترین گہرے بادامی قرمزی رنگ کا کرتا شلوار ازار بند ڈالنے کے بعد بیڈ پر تیار کیا ہوا رکھا تھا۔ اُس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ ''کون ہوسکتا ہے گُل رُخ کے سوا۔'' وہ زیر لب بڑبڑایا لیکن جو بھی تھا، جس نے بھی کیا، اُسے اچھا لگا، شادی کے اولین برسوں کی طرح کہ جب ناہید بن پوچھے ایسا ہی سب کچھ کر دیا کرتی تھی اور وہ حیران ہوتا تھا اُسے کیسے معلوم ہوا کہ اِس وقت میں نے یہ پہننا اور یہ کھانا تھا۔

ابھی وہ تیار ہو کر اپنی پسند کی پرفیوم لگانے کے بعد بمشکل بیڈ روم میں رکھی صوفہ چیئر پر بیٹھا ہی تھا کہ کمرے میں گُل رُخ داخل ہوئی۔ اُن دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا۔ گُل رُخ نے سیاہ رنگ کے سلک کی سلیولیس شارٹ شرٹ اور اُسی رنگ اور اُسی کپڑے کا ڈھیلا ڈھالا ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ اُس کا گلابی چہرہ اور گلابی گدرائے ہوئے بازو حیران کن حد تک اپنی جانب متوجہ کر رہے تھے۔ سہ پہر کا لباس بدلنے کے بعد اُس کی نسوانی کشش کیا سے کیا ہو گئی تھی۔

''کیا دیکھ رہے ہیں حیران ہو کر سلطان صاحب! آپ تو خود بھی قیامت لگ رہے ہو۔'' اتنی سی بات کہتے ہوئے بھی وہ جھینپ گئی۔ اُس کی آنکھیں اور گال ایک ہی وقت میں لال گلال ہو گئے۔ یہ جملہ تونگر نے ایک عرصے کے بعد سنا تھا۔ آخری بار شاید دس برس قبل کہ جب اُس کی پروموشن پارٹی میں اُس کے ایک جونیئر آفیسر کی بیوی نے موقع پا کر اُس کے کان میں یہ جملہ کہا تھا۔ ''آپ سیاہ سوٹ میں قیامت لگ رہے ہو۔''

تونگر پل بھر کے لیے گُل رُخ کے کہے ہوئے تعریفی جملے کے سرور میں کھو گیا۔ اُسے یاد آیا کہ مرد کو اپنی گرفت میں رکھنے کے واسطے عورت ہر رُخ سے اُسے تڑپاتی ہے، کبھی توصیفی بانس پر چڑھا کر اور کبھی اجتناب کے پاتال میں پھینک کر لیکن اِس کے باوجود وہ اِس لمحے کی لذت کو گنوانا نہیں چاہتا تھا لہٰذا بے اختیار مسکرا دیا۔ تونگر مسکرایا تو گُل رُخ بھی مسکرا دی۔

''آپ کے دونام ہیں ناں، ایک سلطان اور دوسرا مشکل سا ہے شاید گنگر! میری زبان پر نہیں آتا لیکن میں آپ کو سلطان کہوں گی، دوسرا نام ویسے بھی کھڑوس کھڑوس سا لگتا ہے۔'' تونگر نے پہلے تو اُس کی بات کو شاید اچھی طرح سے سُنا نہیں تھا لیکن جب اُس کے کہے ہوئے پر غور کیا تو ایک مدت کے بعد قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ اُس نے اپنے نام کے آخری حصے کو خود ہی زیر لب بول کر دیکھا، ''تونگر'' واقعی کھڑوس کھڑوس سا لگتا تھا۔ ہنسی اب کے تونگر کی آنکھوں سے چھلکنے لگی۔

گُل رُخ یقیناً اپنے جسم کے مختلف اعضاء کی خوبیوں اور اُن کی اثر انگیزی کا ادراک رکھتی تھی تبھی تو کمرے کے ایک کونے میں بنے ہوئے بار کی طرف گئی تو ڈھیلے ڈھالے ٹراوزر میں سے باہر کو جھانکتے ہوئے کولہے مٹکاتی ہوئی۔ واپسی پر وہاں رکھی ہوئی چھوٹی سی ٹرالی کو دھکیلتی ہوئی تونگر کے سامنے لے آئی تو سینے کی گولائیاں ٹرالی میں رکھی وہسکی کی بوتل کی گردن سے مَس ہو رہی تھیں۔ اِس نوعیت کی دعوت کی تہذیب تونگر سے بہتر کون جانتا ہو گا لیکن عورت نئی ہونے کے باوجود یہ منظر اتنا بھی نیا نہیں تھا کہ جاذبیت کا باعث ہو سکتا۔ اُدھر تونگر کی بے نیازی سے بے نیاز گُل رُخ نے مسکراتے ہوئے گھٹنوں کے بل ٹرالی کے ساتھ بیٹھ کر دو گلاس اپنے روبرو کیے اور اُن میں وہسکی اُنڈیل کر پیگ بنانے لگی۔

آنے والا ہر لمحہ مکمل ترتیب سے تونگر کے دھیان میں تشکیل پانے لگا تھا۔ اُس نے آنکھیں موند لیں۔ ذہن میں ایک ہی خیال کُلبلا رہا تھا کہ کس قدر چوتیا ہے یہ عبید جو سمجھ بیٹھا ہے کہ صاحبزادہ سلطان احمد تونگر اَب اُس کی انیکسی کی ملازمہ کے ساتھ بیٹھ کر شراب پیے گا۔

گُل رُخ نے بدستور مسکراتے ہوئے ایک گلاس تونگر کے سامنے کیا اور دوسرا اپنے ہاتھ میں پکڑ کر چیرز کرنے کے لیے آگے بڑھایا۔ طیش سے تونگر کا ذہن اُلٹ گیا۔

''کس نے کہا ہے کہ میں شراب پیتا ہوں، کس نے کہا ہے کہ میں تمھارے ساتھ بیٹھ کر پیئوں گا، اُٹھاؤ یہ گلاس اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' تونگر ہذیان میں مبتلا ہوا تو آواز کی طرح اُس کا بدن بھی کانپنے لگا تھا۔

گُل رُخ کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر ٹرالی پر گر گیا اور وہ خود سہم کر ٹرالی کی اوٹ میں ہو گئی۔

۳۰

صبح سویرے ریجنل پولیس آفیسر کا فون آنا رضوان ہاشمی کو پریشان کیے جا رہا تھا۔ بظاہر تو اُسے نہایت احترام سے چائے پر بلایا جا رہا تھا لیکن سینئر فوجداری وکیل ہونے کے ناتے وہ پولیس کے مزاج اور رویوں کا شناور بھی تھا۔ اِسی سبب اگر پریشانی نہیں تو اُلجھن ضرور تھی کہ اِن کا بُلاوا بلا مقصد نہیں ہوتا۔ لاکھ کہا جائے کہ پولیس فورس میں اہلیت اور اخلاقیات کا فقدان ہے، چھوٹے درجے کے رینکرز ملازمین اور اعلیٰ درجہ کے اَفسروں میں ذہنی اور تربیتی تفاوت ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں۔ پولیس ملازم کسی بھی درجے کا ہو، چاہے جس طریقے سے بھی فورس کا حصہ بنے، اُن سب کی سوچ کا محور ایک ہی ہوتا ہے۔ معاملات کو ایک ہی زاویے سے دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔

رضوان ہاشمی اِس لیے بھی اُلجھاؤ کا شکار تھا کہ ضلع شمس آباد میں نئے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج اور دیگر تمام ججوں کی تعیناتی کے بعد وکلا کی ہڑتال بھی ختم ہو چکی تھی اور تمام نزاعی معاملات بھی خوش اسلوبی سے طے پا چکے تھے۔ وکلاء رہنما اِس لیے بھی مطمئن تھے کہ سوائے حیدر گوٹھ میں ہونے والے پہلے واقعہ کی ایف آئی آر کے بعد ازاں کوئی فوجداری پرچہ وکلا کے خلاف نہیں ہوا تھا۔ سابقہ سیشن جج پر تشدد کا اور حیدر گوٹھ میں سینئر سول جج کا سر پھاڑے جانے اور عدالتی املاک کو نذرِ آتش کرنے کے واقعات کے بارے میں پولیس کو اندراج مقدمہ کے لیے دیئے گئے احکامات عملی طور پر غیر مؤثر کیے جا چکے تھے۔ اگر کہیں کوئی چنگاری کسی وقت بھی شعلہ بن سکتی تھی تو وہی ایف آئی آر تھی جو حیدر گوٹھ میں خوشحال خان اور اُس کے گروپ کے وکلا کے خلاف ہوئی تھی۔

اگرچہ نئے سیشن جج کے آنے کے بعد اُس ایف آئی آر پر بھی کسی کارروائی کا کوئی امکان نہیں تھا لیکن پھر بھی خوشحال خان کا اضطراب رضوان ہاشمی کے لیے پوری طرح معنی رکھتا تھا کہ جو اچھی خاصی نقد رقم وصول کرنے کے ساتھ ساتھ تحصیل بار اور صوبائی بار کونسل کے انتخابات پر من مرضی کی سودے بازی کر چکا تھا۔

خوشحال خان اِس واسطے بھی بے چینی اور گھبراہٹ کا شکار تھا کہ تحصیل بار کے انتخاب محض

ایک ہفتے کی دوری پر تھے اور اُس کا مخالف دھڑا اسی ایف آئی آر کے منسوخ نہ ہونے کو جواز بنا کر اپنی الیکشن مہم کو بھڑکائے چلا جارہا تھا۔ خوشی خان کا مخالف پینل ایک طرف تو اُس کے اُن ساتھیوں کو خوف زدہ کر رہا تھا کہ جن کا نام کسی نہ کسی حوالے سے انسدادِ دہشت گردی ایکٹ کے تحت دیئے گئے اِس پرچے میں تھے اور دوسری جانب یہ چرچا کہ آپ ایسے امیدوار کو ووٹ کیوں دیں جو وکیلوں کے خلاف درج کی گئی ایک ایف آئی آر تک منسوخ نہیں کرا سکا۔ یہاں مثال دی جاتی ڈسٹرکٹ بار شمس آباد کی وکلا قیادت کی کہ جنھوں نے ججوں پر جوتے بھی برسائے، عدالتوں کی تالا بندی بھی کی مگر کسی کے خلاف ایف آئی آر تو کیا دوسطری رپٹ بھی درج نہ ہوئی۔

ایسے میں کہ جب رضوان ہاشمی پہلے ہی سے خوشحال خان کے دباؤ کا شکار تھا، جلال گنج کے ریجنل پولیس آفیسر کا بُلاوا آنا کسی بھی پریشانی کا باعث ہوسکتا تھا۔ ہوسکتا تھا کہ اُس کا نام سرکاری دفتروں اور عدالتوں پر خوشحال خان کی چڑھ ماروالے وقوعہ کے محرک کے طور پر ڈال دیا گیا ہو اور یوں اُسے بلوا کر اگر گرفتار کرنا مطلوب نہیں تو کم از کم ہراساں کیے جانے کا امکان تو ہوسکتا تھا۔ لہٰذا جلال گنج روانہ ہونے سے پہلے اُس نے نہ صرف خوشی خان کو بلا کر کچھ ہدایات دے دیں کہ اُس کی گرفتاری کی صورت میں کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے بلکہ صوبہ بھر میں اپنے قریبی وکلا رہنماؤں کو بھی اعتماد میں لے لیا کہ کس صورت میں کیا کرنا چاہیے۔ اب وہ جلال گنج جانے کے لیے اپنے آپ کو خاصی حد تک ذہنی طور پر تیار کر چکا تھا۔

جلال آباد ضلع بھی تھا اور شمس آباد سمیت چار اضلاع پر مشتمل ڈویژن کا صدر مقام بھی۔ حیدر گوٹھ سے جلال آباد شہر جانے کے لیے پبلک ٹرانسپورٹ میں پونے تین گھنٹے کا سفر ذاتی گاڑی میں دو سوا دو گھنٹے میں طے ہوجاتا تھا۔ رضوان ہاشمی حیدر گوٹھ سے صبح نو بجے روانہ ہونے کے بعد ساڑھے گیارہ بجے ریجنل پولیس آفیسر کے دفتر میں پہنچ چکا تھا۔ دفتری عملے نے صاحب کے میٹنگ میں ہونے کے سبب اُسے احترام سے عمومی انتظارگاہ سے متصل ایک ایسی لابی میں انتظار کرنے کو کہا کہ جس کا درمیانی دروازہ آفس سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں کھلتا تھا۔ لابی ہونے کے باوجود وہاں لوگوں کی آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ کبھی کبھار کوئی باوردی نائب قاصد فائلوں کا بستہ

اُٹھائے اُس پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتا ہوا اُدھر سے اِدھر اور اُدھر سے اِدھر گزر جاتا۔

تقریباً ایک گھنٹہ اِسی کیفیت میں گزرا تو رضوان ہاشمی کے اندر کا وکیل جاگنے لگا۔ اُس نے سوچا کہ ابھی دروازہ کھول کر اندر جاتا ہوں اور اِس بے اوقاتے ریجنل پولیس آفیسر کو اُس کی اوقات یاد دلاتا ہوں لیکن اِس سے پہلے کہ وہ اُٹھ کر ایسا کر گزرتا اُسے وہ پس منظر یاد آ گیا کہ جس کے سبب آج وہ خود یہاں موجود تھا۔ غصہ جھاگ ہونے لگا تو وہ اُسے مزید فرد کرنے کے واسطے بغلی کمرے میں سپرنٹنڈنٹ کے پاس چلا آیا کہ جس نے اُسے انتظار کرنے کو کہا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ لینڈ لائن نمبر پر دبی دبی کلرکانہ زبان میں ناک پر رکھی عینک کے اوپر بے دید سے دیدے گھماتے ہوئے کسی سے کوئی کانفیڈنشل بات کر رہا تھا۔ گفتگو کے انداز اور اُس کی سطح سے صاف ظاہر تھا کہ دوسری جانب بھی کوئی اُس کی ہم رتبہ مخلوق تھی۔ سپرنٹنڈنٹ نے ہاشمی کی اپنے آفس میں آمد کو دفتری رازداری میں مداخلت جان کر غصے سے آنکھوں کو اُوپر نیچے گولائی میں حرکت دی لیکن سامنے ایک وکیل کے تیور دیکھ کر فون کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا اور ہاشمی کو مزید انتظار کا کہا کہ وزیر اعلیٰ کی جانب سے کسی اہم معاملے میں طلبیدہ رپورٹ کو حتمی شکل دی جا رہی تھی۔

اِس قسم کی صورت حال نے رضوان ہاشمی کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ سب اچھا نہیں ہے۔ اگر پولیس کو اُس سے کوئی کام ہوتا تو اُسے یوں ذلت انگیز انتظار کی اذیت سے نہ گزارا جاتا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ پورے کا پورا منظر اُسے اپنی حیثیت کا ادراک کرانے کے لیے ترتیب دیا گیا تھا۔ درپیش معاملے کے تمام امکانات اُس کے ذہن میں کھلبلی مچائے ہوئے تھے۔ اُسے یاد آ رہا تھا کہ عدلیہ کے بڑے سے بڑے جج کے چیمبر میں پندرہ بیس جونیئرز کے ساتھ بِلا اجازت چلے جانا اُس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ اُلٹا اُس کی عزت ہوتی، تلخ سے تلخ بات سُنی جاتی، احترام کے ساتھ چائے بھی پلائی جاتی لیکن اِس کے باوجود وکیل کا جھگڑا ہمیشہ ججوں کے ساتھ ہی رہتا ہے، بات بہ بات توہین اور تذلیل کی جاتی ہے، اپنے مفاد اور موکل کی خوشنودی کے لیے اُن کی ذات پر گند اُچھالا جاتا ہے، ہراساں کیا جاتا ہے مگر وہ پھر بھی بار اور بینچ کو ایک ہی گاڑی کے دو پہیے قرار دے کر سر جھکائے رہتے ہیں اور ایک یہ پولیس ہے کہ کس طرح سے اُسے دو گھنٹوں سے باہر گزر گاہ

پر گداگر بنا کر بٹھایا ہوا تھا۔

ابھی وہ اِسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ ایک باوردی اردلی نے آکر اُس کے ایک جانب رکھی تپائی پر چائے کی پیالی اور پانی کا ادھ بھرا گلاس رکھ دیا۔ ہاشمی نے شکریے کے سے انداز میں اردلی کی طرف دیکھا کہ اب اُسے واقعی چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ جاتے جاتے اردلی پھر پلٹا اور ایک چھوٹی رکابی بھی رکھ دی جس میں چند بسکٹ کسی ترتیب کے بغیر دھرے ہوئے تھے۔ رضوان ہاشمی نے چائے کی پیالی اُٹھا کر ہونٹوں سے لگائی اور پھر منہ بگاڑتے ہوئے فوراً ہی واپس رکھ دی۔ نجانے کتنی دیر پہلے کی بنی ہوئی چائے سرد موسم میں کچھ زیادہ ہی سرد ہو چکی تھی۔ اُسی لمحے ایک اور باوردی اردلی اُس کے پاس پہنچا، نام پوچھا اور اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

ایک کشادہ کمرے کے تقریباً وسط میں رکھی بہت بڑی دفتری میز کے عقب میں گھومنے والی کرسی پر ایک درمیانے قد سے بھی انچ دو انچ کم قامت کا دُبلا پتلا آفیسر اپنی کڑک وردی اور چہرے پر درشتی کے ذریعے ہیبت پیدا کرنے کی کوشش میں سر جھکائے اس طرح سے بے خبری کی ظاہرداری جھکا رہا تھا کہ آنے والے ملاقاتی کو اِس مختصر عرصۂ توقف میں بھی اپنی کم حیثیتی کا تاثر دور کرنے میں وقت باقی رہے۔

رضوان ہاشمی میز کے سامنے رکھی، ایک دوسرے کا سامنا کرتی ہوئی دو کرسیوں میں سے ایک کے قریب کھڑا ہو گیا مگر ریجنل پولیس آفیسر بدستور فائل پر جھکا رہا۔ چند لمحے گزرے تو ہاشمی کے اندر سے پھر ایک سر پھرے وکیل نے باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن پہلے پہل صرف ہلکا سا کھنکار کر اپنی موجودگی کا احساس دلانے پر اکتفا کیا۔ آر پی اُو نے آہستہ سے نگاہیں اوپر کیں، اُسے غور سے دیکھا اور مسکرائے بغیر چہرے کی درشتی میں کمی لانے کی کوشش کی۔

''اُو ہو! رضوان ہاشمی صاحب! سوری آپ کو انتظار کرنا پڑا، خیر آپ سے کیا چھپا ہے، کام ہی ایسا ہے کہ اپنی خبر بھی نہیں رہتی، بیٹھیے، تشریف رکھیں۔''

رضوان ہاشمی بیٹھ تو گیا مگر اندر ہی اندر حیرت کے ساتھ کہ نہ تو آر پی اُو کی بھاری آواز اُس کی شخصیت کا ساتھ دے رہی تھی اور نہ ہی اُس کے الفاظ اُس کے جواز کی سچائی کی تصدیق کر پا رہے

تھے۔ ہاشمی کچھ اور بھی مضطرب ہو گیا۔ فوجداری وکیل کی حیثیت سے اُس کا تجربہ کہہ رہا تھا کہ ایسے شخص سے واسطہ نہیں پڑنا چاہیے تھا کہ جو ہیت میں نامکمل، محسوسات میں کمتر، افعال میں ظاہر دار اور اختیارات میں متجاوز ہو۔

''میں نے آپ کو تکلیف دی، آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا کہ آپ نے گزشتہ ہفتے کے ناخوشگوار واقعات میں پولیس فورس کی ہر لحاظ سے مدد کی، اخلاقی معاونت کی اور بہت سے مسائل سے بچائے رکھا، آپ تو صحیح معنوں میں پولیس پرور ہیں۔'' کمرے میں پھر سے آر پی اُو کی زخرے سے نکلتی ہوئی آواز گونجنے لگی تھی جب کہ ہاشمی اندر ہی اندر بھونچکا ہو رہا تھا کہ اُس نے کب پولیس کی مدد کی، اور یہ پولیس پروری! کہیں یہ شخص مجھ پر طنز تو نہیں کر رہا؟ ارادے کیا ہیں اِس کے۔ لیکن بظاہر وہ صرف مسکرا دیا۔

''میں تو سُن کر حیران ہوا کہ اتنا بڑا وکیل جو ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں فیس لیتا ہو، دو دو گھر چلا رہا ہو، شاگردوں کی پوری فوج ہو، جج جس کے نام سے ڈرتے ہوں، چار بار صوبائی بار کونسل کا ممبر رہنے کے بعد اب پانچویں بار الیکشن جیت کر وائس چیئر مین بننا چاہ رہا ہو، وہ یہ کام کیسے کر سکتا ہے۔'' ریجنل پولیس آفیسر نے یہ بات تو رضوان ہاشمی سے آنکھیں ملائے بغیر چھت کی طرف دیکھتے ہوئے شروع کی لیکن آخیر تک آتے آتے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں اِس طرح ڈالیں کہ پلکیں تک نہیں جھپکا رہا تھا۔

رضوان ہاشمی جیسا گھاگ اور رویوں میں سفاک شخص جو جرح کے دوران محض ایک نگاہ میں گواہوں کی زبان گنگ کر دیا کرتا تھا، آر پی اُو کی آنکھوں کی میں اُتری ہوئی بے رحمی سے گھبرا گیا۔ اُس نے زبان سے نہیں بلکہ برمے کی طرح روح میں سوراخ کرتی ہوئی آنکھوں سے ہاشمی پر فردِ جرم عائد کرنا شروع کر دی تھی۔ یہ نکتہ بقا تھا کہ جس پر ہاشمی کے اندر کے وکیل نے کروٹ لی اور بیدار ہو گیا۔ شدتِ طیش سے اُس کی آواز کپکپانے لگی تھی۔

''کس کام کی بات کر رہے ہیں آپ آر پی اُو صاحب!''

''چھوڑیں آپ اِسے فی الحال، ہمارے اپنے ہیں تو بھرم رہنے دیتے ہیں، بس ایک کرم

کریں اُرباب کو کل تک ہمارے پاس پہنچادیں۔'' آر پی اُو کے نرخرے سے نکلنے والی غراہٹ اور بھی بے مہر ہو چلی تھی۔

رُباب کا نام سنتے ہی رضوان ہاشمی کی آنکھیں سُرخ اور چہرہ پیلا پڑ گیا مگر آواز میں بدستور طیش کا ارتعاش تھا۔

''آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں، کون سی رُباب! یہ باتیں آپ کو زیب نہیں دیتیں، اپنے عہدے کا خیال کیجیے، اور یہ کون سے بھرم کی بات کر رہے ہیں آپ، نہ رکھیں بھرم اور بتائیں مجھے کون سا ڈاکہ ڈال رکھا ہے میں نے؟''

''وکیل صاحب! یہ کسی جج کی عدالت نہیں کہ آپ آواز اونچی کر کے، غصہ دکھا کر، بے عزت کر کے اپنا کام نکال لیں گے، یہ ریجنل پولیس آفیسر کا دفتر ہے اس لیے آواز نیچی رکھیں، اور رہی آپ کے ڈاکے کی تفصیل، وہ بھی بتا دیں گے اگر آپ نے کل شام تک رُباب کو واپس نہ کیا تو!'' آر پی اُو کے نرخرے کی حرکت بدستور مدھم مگر غراہٹ کی شدت بڑھ چکی تھی۔

۳۱

حاجی بخشن نامصائب حالات کا شکار ہو کر عجیب مخمصے میں تھا۔ اچھی بھلی زندگی ایک ایسے نوکیلے پتھروں والے دشت میں پھنس کر رہ گئی تھی کہ جہاں قدم قدم پر بارودی سرنگیں بچھی ہوئی تھیں۔ وہ ایک سے بچتا تو دو چار قدم پر دوسری سرنگ کا سامنا اور دوسری سے بچنے کی صورت میں تیسری اور چوتھی موجود۔ کوئی آگے کوئی پیچھے کوئی دائیں تو کوئی بائیں۔ ٹرک ہوٹل کے سہولت خانے پر ریڈ کے بعد جس معمولی سے مقدمے سے بچ نکلنے کے لیے رضوان ہاشمی جیسی توپ سے چڑیا کے شکار کی کوشش کی گئی وہ توپ خود اپنے مفادات پر چل چکی تھی۔ اپنے ورکروں کو مقدمے سے ضمانت کی بجائے ڈسچارج کرانے کی کوشش میں شاہ سے شاہ کے وفاداروں نے نہ صرف علاقہ مجسٹریٹ کی عدالت پر حملہ کر دیا جس کا فائدہ اُٹھا کر خوشحال خان جیسا وکیل بھی اپنی سیاست چمکانے آ گیا۔ اب ایک معمولی سے مقدمے کے ملزم عدالتی مفرور بھی ہو بیٹھے۔ باقی جو کچھ کیا وہ رضوان ہاشمی اور

مقدر کی خرابی نے کیا کہ حمید الرحمٰن جیسے پرانے دوست نے آئی جی ہو کر اُس کے اُن کاروباروں کو بھی تباہ کرنے کی دھمکی دے دی کہ جن پر ابھی تک ہماشما کی نگاہ نہیں تھی۔

تقدیر کی ستم ظریفی یہ بھی تھی کہ سینکڑوں لڑکیوں کے ہوتے ہوئے جس لڑکی کو اپنا بنا کر رکھنے کی خواہش کی وہ اُس ایس ایچ اُو کے عشق میں مبتلا ہو چکی تھی کہ جس نے ٹرک اڈے کے سہولت خانے پر چھاپہ مار کر اُس کی بربادی کی کتاب کا پہلا صفحہ اُس کی زندگی کی پہلی ایف آئی آر کی صورت لکھا تھا۔ اُس پر بھی ظلم یہ کہ جس وکیل رضوان ہاشمی کو لاکھوں لٹا دیئے اُس نے اپنی جان تو چھڑا لی لیکن نہ تو ہوٹل پر ریڈ کا پرچہ خارج ہوا اور نہ ہی اے سی اور ڈی ایس پی کے دفاتر پر حملے کی ایف آئی آر منسوخ ہوئی۔ اُلٹا رضوان ہاشمی جیسا پرانا تعلق دار اُسے اِس جھنجٹ سے نکالنے کی بجائے اُس لڑکی رُباب کو ہی گڑکاؤں کر گیا کہ جسے پولیس کی گرفت سے نکالنے کے لیے اتنے پاپڑ بیلے گئے تھے۔ اُسی چڑیا کو پھڑکا کر تو اُس نے علاقے کی دو بلاؤں ملک یاور بختاور اور نادر خان کو آپس میں یوں الجھائے رکھنا تھا کہ نہ صرف حکومت اور اپوزیشن دونوں سے کاروباری معاملات فٹ رہتے بلکہ اُن کے مال کو بھی کچھ اِس طرح نکہ لگا تا کہ جیسے پانی چور زمیندار نہر میں سائفن لگا کر واری کے بغیر کھیت کے کھیت سیراب کر لیتا ہے۔ لیکن یہ کیا ہوا کہ اب اللہ ڈِنو عبید جیسا بااثر شخص بھی رُباب کے لیے میدان میں آ گیا اور آیا بھی تو اِس انداز میں کہ پرانی یاری دوستی کے بھی طور طریقے اَدب آداب ایک طرف کر کے کھلی دھمکیاں دیتا ہوا ماں بہن ایک کرنے پر آ گیا۔

آخر کون ہے یہ رُباب جس کا ہونا اور نہ ہونا اتنا اہم بنتا جا رہا ہے۔ کہاں کہاں تک رسائی ہے اِس کی؟ کیا اِس کی طلب کے پس منظر میں اُس کے جنسی تعامل میں بے مثال ہنر مندی اور عملیت میں اولیت کا دخل ہے یا کچھ اور سبب ہے جو اَب تک کھلا نہیں۔ بخشن پھر سے رُباب کی اپنے پاس آمد اور اُس سے جڑے ہوئے واقعات یاد کرنے لگا۔ کچھ بھی تو خاص نہیں تھا۔ بس ایک بھڑوا اُسے لایا اور اپنے دام کھرے کر کے چلتا بنا۔ بظاہر لڑکی میں بھی کچھ خاص نہیں دکھا تھا سوا اِس کے کہ گوری چٹی، لانبی، پڑھی لکھی اور زبان کی نرم تھی۔ دوسری لڑکیوں کے برعکس نہ کسی سے تلخی اور نہ ہی لڑائی جھگڑا بس ہر وقت سجنے سنورنے میں لگی رہتی لیکن یہ الگ بات کہ بستر پر جاتے ہی اُس

کے اندر کہیں سے کوئی جن آجاتا۔ روایتی طور پر کسی بپھرے ہوئے مرد سے جڑی ہوئی ہر ممکن فعالیت کو اپنے اوپر طاری کرتے ہوئے تمام تر فریفتگی سے ایسے ایسے آسن آزماتی کہ اچھے بھلے طرم خان کو کھڑکا کر رکھ دیتی۔

نئی آمد کی کارکردگی جانچنے، اُس کی پیشہ ورانہ حیثیت اور کیٹگری کا تعین کرنے کے لیے ابھی تک بخشن اپنے علاوہ کسی پر بھروسہ نہیں کیا کرتا تھا۔ رُباب بھی اِس پرکھ سے گزری تو بخشن کو دہلا کر رکھ گئی۔ ''کاش اِس سے بیس برس پہلے پالا پڑا ہوتا تو دیکھتا کہ حرامزادی میں دم کتنا ہے۔''

بخشن کے کاروبار میں بہت کم لڑکیاں ایسی آئی تھیں جو رُباب کے پائے کی ہو سکتیں لہٰذا اُس نے آنکھیں بند کر کے اُسے ملک یاور بختاور کے بیڈروم تک پہنچا دیا کہ رئیل اسٹیٹ کا اربوں روپے کا ایک پروجیکٹ وزیراعلیٰ کی میز پر تھا جس کی منظوری کی صورت میں اُس کا کمیشن کروڑوں میں طے ہو چکا تھا۔ لیکن ملک یاور ابھی تک اُس فائل کو وزیراعلیٰ کی میز سے نہیں نکلوا سکا تھا سو اُس نے ملک یاور کی رُباب تک رسائی میں بھی کئی ایسے رخنے ڈال دیے کہ جنھیں دور کرنے کے لیے سیاست اور حکومتی عہدے دونوں بے بس تھے۔ ایسے میں حاجی بخشن نے ایک اور داؤ کھیلا اور ایک خطیر رقم کے عوض تین راتوں کے لیے رُباب کو سابقہ صوبائی وزیر اور موجودہ اپوزیشن کے ایم پی اے نادر خان کے ہمراہ کر دیا۔ ڈھلتی عمر کا نادر خان بھلا رُباب کی وحشت کیسے جھیل پاتا سو ممسک ادویات کے کثیر استعمال کے نتیجے تیسری شب اسپتال جا پہنچا۔ وہاں سے تو بچ بچا کر نکل آیا لیکن رُباب کا جادو کسی پَل بھی چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ شاطر بخشن نے رُباب کی طلب کے شعلوں کو مزید بھڑکانے کے لیے نادر خان کے راستے میں بھی کئی رکاوٹیں ڈال دیں جن کے ہوتے ہوئے اگلے انتخابات کا پھر سے وزیر محض تڑپتا رہے۔

اِدھر یہ بھی ضروری تھا کہ اِن دو بڑی ملاقاتوں کے بعد رُباب کے ممکنہ طور پر نکلتے ہوئے پروں کو تراشنے اور اُسے اپنی اوقات میں رکھنے کے لیے ٹرک ہوٹل کے سہولت خانے میں بھی ایک دو روز بٹھایا جائے جہاں گھٹیا نشہ کرنے والے کئی جانور نما ڈرائیور اپنی تھکاوٹ اُتارنے کے لیے ورکر لڑکوں کے جوڑ جوڑ ہلانے کے علاوہ گالی گلوچ اور چانٹے مکے سے بھی اضافی تواضع روا

رکھنے میں اچھے خاصے بدنام تھے۔ ٹیفو نے جب رُباب کو سہولت خانے جانے کا حکم دیا تو پریشان ہونے کی بجائے اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ سہولت خانے کی بہت سی روداد وہ دیگر ورکر لڑکیوں سے پہلے ہی سُن چکی تھی۔ ٹرک ہوٹل سے ایک فاصلے پر بنی ہوئی حاجی بخشن کی فارم ہاؤس نما رہائش گاہ کے اندرونی حصے سے رُباب کو نکال کر سہولت خانے پہنچا دیا گیا۔ وہاں موجود ورکر لڑکیوں نے اُسے حیرت، افسوس اور دلچسپی کے ملے جلے رویے سے دیکھا اور پھر اپنی اپنی باری پر کام پر جانے لگے۔ ابھی تک کوئی بھی ایسا ڈرائیور کسی لمبے روٹ کے ٹرک یا ٹینکر سے نہیں اترا تھا کہ جس کے حوالے رُباب کو کیا جاتا۔ لیکن اِس سے پہلے کوئی خاص گاہک پہنچتا، سہولت خانے پر پولیس کا ریڈ ہو گیا۔

رُباب کی آمد سے جڑے اِن واقعات کو ذہن میں دہراتے ہوئے حاجی بخشن ایک اور ابہام کا شکار ہو چلا تھا کہ آیا اُس کے لیے مصیبتوں کا آغاز رُباب کی آمد سے ہوا ہے یا رُباب کو سہولت خانے میں بٹھانے کے فیصلے سے۔ اِس عذاب کے پیچھے شہزادی اور چوہدری ضیا کا معاشقہ ہے یا کسی دیگر ناراض پولیس آفیسر کا انتقام۔ صوبائی وزیرِ اعلیٰ کے مشیر ملک یاور بختاور کی شکر رنجی کا دخل ہے یا سابق صوبائی وزیر نادر خان کی جھنجلاہٹ کا شاخسانہ کہ جو رُباب کے حصول کے لیے دل ناتوں کو بھی داؤ پر لگانے کو تیار ہو چکا تھا۔ اور اب نئی مصیبت، کنجر کا بچہ عبید بھی یکا یک تلوار لے کر رُباب کی وصولی کے لیے میدان میں اُتر آیا تھا۔ معاملہ آخر تھا کیا؟۔

معاملہ جو بھی تھا، راستے سبھی سوائے ایک کے رُباب کی جانب جا رہے تھے۔ شہزادی کے لیے چوہدری ضیا کا پاگل پن بجا مگر سینئر پولیس افسروں کی منشا کے بغیر وہ حاجی بخشن کے ہوٹل پر کس طرح چھاپہ مارنے کی ہمت کر سکتا تھا۔ رُباب کے لیے اگر اللہ ڈنو عبید اُسے الٹی میٹم دے سکتا ہے تو پھر جو بھی ہونا ہے اور جو بھی ہو چکا ہے وہ اُس لڑکی سے جڑا ہوا ہے، اُس سے الگ نہیں۔ لیکن وہ لڑکی آئے کہاں سے۔ کس طرح نکالا جائے اُسے رضوان ہاشمی کے چنگل سے جب کہ حیدر گوٹھ کے تھانے سے انتہائی اوپر تک سبھی پولیس اُس سے یوں منہ پھیر چکی تھی کہ جیسے کبھی شناسا ہی نہ رہی ہو۔ نوبت صرف منہ پھیرنے تک رہتی تو پھر بھی غیر جانبداری کا احساس ہوتا، حالت تو یہ تھی کہ اُن کا

بس نہیں چل رہا تھا کہ اُسے پکڑ کر فوراً ہی جیل میں ڈال دیں یا کسی جعلی پولیس مقابلے میں ویسے ہی پار کر دیں۔ لیکن اِن تمام تر ذہنی قلابازیوں کے باوجود معروضی سوال پھر بھی وہی تھے کہ رُباب کو کس طرح رضوان ہاشمی سے واپس لیا جائے اور اگر کل تک ایسا نہیں ہو پاتا تو اللہ ڈنو عبید سے چھٹکارا کیسے ہو۔

اِن الجھنوں اور نامساعد حالات میں پھنسے ہوئے حاجی بخشن نے مزید مشکلات سے بچ رہنے کے لیے فوری طور پر ایک اہم فیصلہ کیا اور فیض کریم کو فون پر سختی سے ہدایت کر دی کہ جب تک حالات سازگار نہ ہوں حیدر گوٹھ کے ٹرک ہوٹل کا سہولت خانہ بند کرتے ہوئے ورکروں کو تیسرے یا چوتھے سہولت خانے میں منتقل کر دیا جائے۔ فیضو کو ایک بار پھر متنبہ کر دیا کہ حیدر گوٹھ کے ٹرک اڈے پر کسی طور بھی نیٹو کے کنٹینرز سے آنے والی شراب کی سپلائی نہیں اُترنی چاہیے۔

کچھ اطمینان ہوا تو حاجی بخشن نے پاؤں سامنے رکھے موڑھے پر پسار کر آنکھیں بند کر لیں۔ معمہ بن چکی رُباب کا چہرہ بار بار اُس کے ذہن کے پردے پر اُبھر کر سامنے آ رہا تھا۔ اُسے احساس ہونے لگا تھا کہ بظاہر خاموش فطرت اور نفیس لڑکی کو کس واسطے ٹرک ہوٹل کے سہولت خانے میں بٹھانے کا حکم دیا تھا۔ اُس نے کب ایسے پر نکالے تھے کہ جنھیں اِس بے رحمانہ انداز میں کترنا ضروری ہو گیا تھا۔ کب اُس نے ملک یاور یا نادر خان سے دل لگایا تھا یا اُس کے نافذ کردہ کڑے پہرے میں اُن دونوں میں سے کس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ الٹا وہ دونوں اُس کی بعداز وصال خاموش اجنبیت کے شاکی تھے۔ وہ تو عجیب سرپھری لڑکی تھی کہ جنسی تعامل کے وقت جس کی جون ہی بدل جاتی تھی۔ سر سے پاؤں تک جنون ہی جنون، نری وحشت اور پاگل پن۔ مگر سمندر سے کنارے پر آتے ہی، بھلا چکی ہوتی کہ بادباں کب کھلا اور چند ساعتیں پہلے ناؤ کے پتوار کس کے ہاتھوں میں تھے۔ ایسی لڑکی کے بارے میں چلترپن کا مفروضہ باندھنا ظلم نہیں تو اور کیا تھا۔ یقیناً رُباب کو پرکھنے میں اُس سے کہیں غلطی ہو گئی۔ ''کہاں ہو گی رُباب اِس وقت؟'' بخشن زندگی میں پہلی بار کسی عورت کے واسطے دل مسوس کر کے رہ گیا تھا۔

رُباب کے واسطے دل پسیجا تو اُسے شہزادی کا خیال آ گیا جسے اُس نے کئی گھنٹوں سے الگ

کمرے میں بند کر رکھا تھا۔ شہزادی کی غلطی تو تھی کہ اُس نے منع کرنے کے باوجود اپنی ماں کو فون کیا تھا لیکن چوہدری ضیا کو اُس نے واقعی فون نہیں کیا تھا بلکہ اُس نے شہزادی کی ماں سے نمبر لے کر اُسے فون کر دیا تھا۔ یہ بات بھی درست تھی کہ اُس نے چوہدری ضیا کی آواز سنتے ہی فون بند کر دیا تھا۔ نجانے مروت کا کون سا لمحہ تھا کہ حاجی بخشن کو اپنے آپ سے شرم آنے لگی تھی۔ عورت ذات کے جوان جسموں کی منڈی لگا کر اُس نے ایسی دولت کے انبار لگا لیے تھے کہ جو اُس کے کسی کام آنے کی بجائے اُلٹا اُس کے لیے رنج اور کشت کا باعث ہو رہے تھے۔ یہ کیسی زندگی تھی کہ اتنا کچھ ہوتے ہوئے بھی نہ تو عزت باقی رہی تھی اور نہ ہی چین اور سکون۔ جن جن افسروں کو اُس نے زمین سے اُٹھا کر آسمان تک پہنچایا وہ کس قسم کی زندگی گزار رہے تھے اور وہ خود کس قسم کی۔ لعنت ایسی زندگی پر کہ جس میں اب تک وہ ایک عورت کو بھی اپنا نہیں بنا سکا۔ جس کسی نے بھی قریب آنے کی کوشش کی اُسے اُس کے حکم پر سہولت خانے میں اس طرح رگیدا اور پامال کیا گیا کہ وہ اپنا آپ بھی بھول گئی۔ حاجی بخشن کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخری کتنی عورتوں کے بدن سے وہ اپنی ماں کا کیا دھرا چکا تا رہے گا۔

شہزادی جب اُس کے پاس آئی تو کم عمری کے باوجود وہ اُسے اپنی اپنی سی لگی، معصوم سی کہ جو کسی بھی عیاری کے بنا اُسے ہر قسم کی تسکین پہنچانے کی پوری کوشش کرتی۔ مگر اُسے بھی اُس نے اُس کی مرضی کے خلاف ایس ایچ اُو چوہدری ضیا اور اُس کے دوستوں کے پاس پہنچا دیا۔ قصور تو اُس کا اپنا تھا مگر سزا پھر بھی وہ شہزادی کو دیئے جا رہا تھا۔ بخشن اندر ہی اندر ٹوٹنے لگا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ شہزادی اور رُباب سمیت سینکڑوں لڑکیاں اور مفعول لڑکے ایک میدان میں جمع ہیں اور آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر زار و قطار روتے ہوئے اُسے اجتماعی بددعائیں دے رہے ہیں، اُس کی بربادی کی التجائیں کر رہے ہیں۔

حاجی بخشن نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ مسمرائز انداز میں اُٹھا اور شہزادی کے کمرے کا دروازہ کھول کر اُسے باہر نکال لایا۔ وہ بھوکی پیاسی، ڈری سہمی کسی خوفزدہ بھیگی ہوئی چڑیا کی طرح دروازے کی اوٹ میں چھپی ہوئی تھی۔ اُسے خدشہ تھا کہ ایک بار پھر

اُسے بدترین جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا۔شہزادی کی متورم آنکھوں کے گوشوں پر آنسو سوکھ چکے تھے۔ زباں بھی خشک تھی اور لبوں کی قاشوں پر دراڑیں ہی دراڑیں۔ بخشن اُسے اپنے کمرے میں لے آیا اور موڑھے پر بٹھانے ہی لگا تھا کہ موبائل فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔شہزادی کو بٹھانے کے بعد اُس نے فون کی اسکرین دیکھی، رضوان ہاشمی کا فون تھا۔رُباب کا مسئلہ حل ہونے کی امید پیدا ہو گئی تھی۔رضوان ہاشمی کے خلاف اب تک کی ساری کڑواہٹ تھوک کر اُس نے فون کو کان سے لگا لیا لیکن دوسری جانب سخت طیش کے عالم میں وہ ہذیان بکے جا رہا تھا۔

''حاجی تو نے یار ہو کر میرے ساتھ دھوکا کیا ہے، میری پیٹھ میں خنجر بھونکا ہے، پہلے میری فیس کھا گیا اور اب آر پی اُو کے ذریعے مجھ سے رُباب کی برآمدگی کے لیے پریشر ڈلوایا ہے، اب کون سی رُباب حرامزادے! کتنی رُبابیں مجھ سے برآمد کرائے گا بھڑوے! وہ جو حرامزادی کچہری سے بھاگی تھی اُسے تو میرا ڈرائیور جبار اُسی روز ہی اُسے تمھارے رنڈی خانے پر پہنچا آیا تھا اب اور کون سی مانگتا ہے، آر پی اُو کی تو میں نے کل ہی وردی اُتروا دینی ہے اور اُس کے بعد تم بھی دیکھ لینا، میں تمھارا کیا حشر کرتا ہوں۔''

بخشن کو فوری طور پر کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔حالات کی یہ نئی کروٹ اُس کے لیے حیران کُن تھی۔زندگی بھر رضوان ہاشمی جیسے ٹاؤٹ بدمعاشوں کی جرات ہی نہیں ہوئی تھی کہ وہ اُس سے اِس لہجے میں بات تو کیا سانس بھی لے پاتے۔اور یہ کیا کہانی تھی کہ ریجنل پولیس آفیسر جلال گنج بھی اُس سے رُباب کا تقاضا کر رہا تھا۔

''اُس پولیس والے کو کیسے خبر کہ رُباب اب میرے پاس نہیں بلکہ رضوان ہاشمی کے پاس ہے۔یہ راز تو ہم دو کے علاوہ صرف ڈرائیور جبار کو معلوم تھا تو پھر کس نے یہ مخبری کی۔'' حاجی بخشن تو رضوان ہاشمی کی اِس ڈھٹائی پر بھی تحیر میں مبتلا تھا کہ رُباب کو اُس کے پاس واپس پہنچوایا جا چکا ہے۔

''واہ! کس انداز میں سارے قضیے پر ہی مٹی ڈال دی تھی، اُس سے رُباب کی وصولی کا دعوےدار تو میں ہوں اور وہ مجھے کہہ رہا ہے کہ وہ لڑکی میرے پاس واپس پہنچا دی گئی ہے۔''

حاجی بخشن نے اِن جھٹکوں کے بعد حواس مجتمع ہوتے ہی رضوان ہاشمی کو اُس کی اوقات یاد دلانا چاہی مگر وہ کافی دیر سے فون بند کر چکا تھا۔

۳۲

انیکسی میں گزری ہوئی پہلی شب سلطان احمد تونگر کے لیے ڈراؤنا خواب ثابت ہوئی تھی۔ حالانکہ اُس کے گرم شاور لینے اور لباس تبدیل کرنے کے بعد تک سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ انیکسی کی نگران گُل رُخ بھی شام کے لباس میں اُسے اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب رہی تھی۔ اُس کا نہایت نفاست سے اُس کی پسندیدہ شراب کا انتخاب کرتے ہوئے اُس کی مدارت کا اہتمام اور آغاز کرنا بھی باعثِ سکون ثابت ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ باقی ماندہ زندگی ایک طویل خرابیٔ بسیار کے بعد اپنی مرضی اور مزے سے گزرے گی لیکن وہ خود بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ پل بھر میں سب کچھ کیسے اُلٹ پلٹ ہو گیا۔ نجانے خرابی کہاں سے پیدا ہوئی کہ وہ یوں پاگل پن کا شکار ہو کر ہذیان بکنے لگا تھا۔ گُل رُخ سے اُلجھنا، اُس پر شاؤٹ کرنا اور پھر اپنے محسن اللہ ڈنو عبید کے خلاف ننگی گالیاں اُگلنا نہ تو اُس کا کبھی وطیرہ رہا تھا اور نہ ہی مزاج کہ جس کے پس منظر میں وہ اپنی اِس کیفیت کو سمجھ پاتا، اس کا تجزیہ کر سکتا۔ شاید عورت ذات کے خلاف لاشعور میں دبی ہوئی وہ تمام نفرت کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑی تھی۔ شاید یہ نفرت عورت ذات سے نہ رہی ہو کہ عورت ذات سے محبت اُس کی شخصیت کی اساس تھی۔ تونگر یہ بھی جانتا تھا کہ نفرت کبھی محبت کی ضد میں نہیں ہوتی اور نہ ہی محبت سے گریز میں پنپتی ہے۔ تو کیا پھر ایسے میں اُس پر طاری ہونے والا جنون ماضی ہو چکی کسی عورت کے کسی خاص عمل یا اُس کے کسی رویے کا ردِ عمل تھا، کراہت تھی جو یکساں نوعیت کا موقع ملتے ہی اُمڈ پڑی۔

تونگر پر جنون اور ہذیان طاری ہوتے ہی سہم کر دبک جانے والی گُل رُخ نے موقع ملتے ہی [illegible] سے بھاگنے میں ہی عافیت جانی۔ کچھ دیر بعد جب تونگر کا جنون اُترا تو وہ اپنے سامنے رکھی [illegible] بوتل اور شیشے کے گلاسوں کو توڑ چکا تھا۔ ٹرالی کو اُس نے شاید لات مار کر دور پھینک ہوا تھا

اور پورا کمرا قالین میں جذب ہو چکی شراب کی بو سے متعفن ہو رہا تھا۔ بیڈ روم کا ماحول اُسے نادم اور پھر ڈیپرس کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اُسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ یہ سب کچھ اُس کا کیا دھرا ہے۔ شراب کی تیز بو سے دم گھٹنے لگا تو وہ کمرے سے باہر سٹنگ روم میں نکل آیا۔ یہاں شراب کی بو اُتنی شدید نہیں تھی لیکن لگ رہا تھا کہ بیڈ روم کا دروازہ کھلنے کے بعد وہ اُس کے تعاقب میں تھی۔

تونگر نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر انیکسی میں گُل رُخ کی موجودگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ شدید ندامت کے زیرِ اثر اُس نے سوچا کہ اُسے اُس کے کچن سے ملحقہ کمرے میں جا کر دیکھے اور اُس سے اپنے رویے پر معذرت کیا بلکہ معافی کا طلب گار ہو لیکن ایسے میں اِس وقت چاہے شب کا پہلا پہر ہی سہی، اُس کے کمرے کی طرف جانا کسی طور بھی تہذیب اور اخلاقیات کے زمرے میں نہیں آتا تھا۔ شدید شرمندگی کے احساس اور بوجھل دل لیے وہ سٹنگ روم کے صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔

عجیب کیفیت تھی۔ بھوک کا احساس تھا اور نہ ہی انسانی تعیشات سے جڑے ہوئے لوازمات کی طلب تھی۔ پورے وجود پر جانبین سے کوئی بوجھ سا تھا جو محسوسات کا کچومر کیے جا رہا تھا۔ سانسیں رکیں، دل گھبرایا تو سٹنگ روم کا بیرونی دروازہ کھول کر پورچ میں آ گیا جہاں نصف شب کے بعد کے ابتدائی لمحات میں سردی اپنی حیثیت منوانے پر اُتری ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی سرد ہوا کے گداز لمس نے زندگی کا احساس دلایا تو تونگر پورچ کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ ٹھنڈے ماربل نے اُس کی سرین کو چھوا تو سردی کی شدید لہر ریڑھ کی ہڈی کو ٹھٹھراتی ہوئی پورے بدن میں دوڑ گئی۔ لیکن پھر بھی اُسے کچھ ناگوار نہ لگا کہ ذہنی تپش اب بھی اِس ٹھنڈ سے اپنے آپ کو متوازن کرنا چاہ رہی تھی۔ کتنا وقت گزر گیا، تونگر کو خود بھی کچھ خیال نہ رہا۔ احساس تب ہوا کہ جب کپکپی نے آ لیا۔ اُٹھنے کی کوشش میں خون کی نیم منجمد گردش اور ٹھٹھر چکے عضلات نے اکڑاؤ کی سی صورت کر دی تو بمشکل تمام اُٹھ کر سِٹنگ روم میں چلا آیا جہاں گرم ایئر کنڈیشنر کے پیدا کردہ ماحول نے اُسے دھیمی دھیمی سینک کا سندیسہ دیا۔

''لیکن ایئر کنڈیشنر کو آن کس نے کیا؟'' تونگر بڑبڑا گیا۔ ''شاید شام سے ہی چل رہا ہو۔'' اُس نے بے دھیانی میں سوچا۔ ''لیکن نہیں، یہ شام کو نہیں چل رہا تھا۔'' کمرے میں پھیلی ہوئی

خوشگوار حدت کی ٹکور سے اعصاب بیدار ہونا شروع ہوئے تو تونگر پورے تیقن سے کہہ سکتا تھا کہ اُس کے باہر پورچ میں جانے سے پہلے ایئر کنڈیشنر آن نہیں تھا۔ اُس نے مسکرا کر کچن سے متصل کمرے کی جانب دیکھا مگر آنکھیں پھر بھی نمناک ہو گئیں۔

اُس کی زندگی کی ایک اور منحوس رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ گل رخ کے اِس مہربان رویے نے اُسے اور بھی نادم کر دیا۔ وہ اپنے آپ کو اپنی نگاہوں سے سمیٹتا ہوا بیڈروم میں آیا تو شراب کی تیز بو کے بجائے حسِ شامہ کو گدگداتی ہوئی کسی ایئر فریشنر کی خوشبو نے اُسے مہکا دیا۔ کمرے میں سرِ شام سرزد ہونے والی وحشت کے تمام آثار مٹائے جا چکے تھے۔ حد ہو گئی تھی۔ تونگر اب گل رُخ سے نگاہیں کیا ملا پاتا وہ تو اپنے آپ سے ہی آنکھ ملانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ تونگر کے اِس قدر برے رویے کے بعد بھی گل رُخ کا یہ برتاؤ اُسے کسی طرح بھی ملازمت کا حصہ نہ لگا۔ جو کچھ بھی تھا وہ ملازمت کے تقاضوں سے ماورا تھا۔ اگر نری ملازمت ہی ہوتی تو اب تک وہ اللہ ڈنو عبید کو رپورٹ کر چکی ہوتی۔ تونگر حیران تھا کہ اُس کی زندگی میں کیسی کیسی عورتیں اپنے آپ ہی نہایت گرم جوش التفات کے ساتھ داخل ہوئیں اور پھر کوئی نہ کوئی چرکہ لگانے کے بعد خود ہی نکل گئیں۔ نجانے ٹھہراؤ اُن میں نہیں تھا یا اُس نے خود اپنے متکبرانہ رویے اور زود رنجی سے اُنھیں مجبور کر دیا کہ وہ اُس کی زندگی سے نکل جائیں۔

رات گزری مگر نکان، شرمندگی اور پچھتاوے کا ایک بارِ گراں تونگر پر لاد کر گزری۔ صبح سویرے وہ ابھی اِسی کسلمندی میں تھا کہ اللہ ڈنو عبید کی جانب سے دس بجے میٹنگ کا واٹس ایپ مسیج ملا۔ مسیج پڑھتے ہی وہ سٹپٹا گیا۔ ''یقیناً اُسے کل شام کے واقعے کی خبر ہو چکی ہے۔'' تونگر کے ذہن میں یہ خیال آتے ہی گل رُخ کے بارے میں اب تک کی تمام خوش گمانیاں پھر سے بدگمانیوں میں منقلب ہونے لگیں۔ وہ بجھ سا گیا اور اِسی حالت میں کافی دیر تک بستر میں پڑا چھت کی طرف بے دھیان گھورتا رہا۔

دس بجے کے لگ بھگ وہ ظاہری طور پر تازہ دم ہو کر اللہ ڈنو عبید کے دفتر میں تھا۔ حالانکہ اُس کے شاور لینے کے دوران گل رُخ ایک بار پھر اُس کا دفتری لباس الماری سے باہر نکال کر رکھ

گئی تھی، ٹائی، موزے، مکیشن بھی ترتیب سے رکھ دیے گئے تھے مگر لباس بدل کر تیار ہونے کے بعد بھی نہ تو وہ میز پر لگایا گیا ناشتہ کر سکا اور نہ ہی ذہن پہ بڑھتا ہوا بوجھ اُتار سکا کہ جس میں اب ایک اور عنصر بھی دخیل ہو چکا تھا۔ اللہ ڈِنو عبید سے ایک نئی شرمندگی کا بوجھ۔ اُس کی نوازشات کا صلہ گُل رُخ سے بدسلوکی کے راہیں دینے کا بوجھ۔

اللہ ڈِنو عبید کے دفتر میں وہ اُس کے کمرے میں جانے کو تھا کہ اُس کی نئی پرائیویٹ سیکریٹری نے اندر جانے سے منع کر دیا۔ اُس کا کہنا تھا کہ باس کی کسی باہر کے صاحب سے میٹنگ چل رہی ہے۔ بات بے بات بھڑک اُٹھنے والا صاحبزادہ سلطان احمد تونگر زہر کے گھونٹ بھر کر رہ گیا۔ اگر چہ یہ اُس کے مزاج کے برعکس تھا لیکن شام کے واقعات سے سراسیمہ تونگر کے لیے اِس کے علاوہ کوئی راستہ بھی نہیں رہا تھا کہ جس کے ذریعے وہ اپنی موجودی اور ہونے کی بقا کا اہتمام کر سکے۔

کوئی گھنٹہ سوا گھنٹہ کے بعد اللہ ڈنو عبید اپنے آفس کے کمرے سے نکلا تو اُس کے ساتھ سیاہ رنگ کے پینٹ کوٹ میں ملبوس ایک لمبا تڑنگا شخص بھی تھا جس نے سفید شرٹ پر آنکھوں میں چبھتی ہوئی سُرخ رنگ کی ٹائی لگا رکھی تھی۔ نجانے کیوں وہ تونگر کو دیکھا بھالا اور جانا پہچانا لگا لیکن یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون ہے اور اُسے کہاں دیکھا ہے۔ اُس شخص کے چہرے پر ناگواری آمیز رعونت تھی کہ جیسے اُسے اللہ ڈِنو عبید سمیت پورے ماحول سے بدبو آ رہی ہو۔ جب کہ اللہ ڈِنو عبید اُس کے ساتھ انتہائی خوشامدانہ انداز میں چل رہا تھا۔ تونگر کو عبید سے پہلی ملاقات یاد آ گئی کہ جب اُس کے ساتھ بھی وہ اِسی انداز میں پیش آیا تھا۔ اُن دونوں کو دیکھتے ہی نئی سیکریٹری بھی چہرے پر کارپوریٹ مسکراہٹ سجا کر اپنی کرسی سے کھڑی ہو گئی مگر اُن دونوں نے اُس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

اللہ ڈِنو عبید کی نگاہیں اُس شخص کے چہرے پر یوں مرتکز تھیں کہ جیسے اِدھر اُدھر دیکھا تو سر قلم کر دیا جائے گا۔ وہ دونوں تونگر کے قریب سے گزرے تو وہ بھی اپنی نشست سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ عبید نے تو اُس کی موجودی اور احتراماً کھڑے ہونے تک کو نظر انداز کر دیا لیکن اُس شخص نے اچانک تونگر پر ایک اُچٹتی ہوئی نظر ڈالی، ایک قدم رُکا، پھر چلتے چلتے دوبارہ سر سے پاؤں تک دیکھا مگر

اُس کے اِس طرح دیکھنے میں بھی نہ تو شناسائی تھی اور نہ ہی تجسس۔ بس یوں لگا کہ جیسے اُسے کچھ معمول سے ہٹ کر دِکھا ہو۔ اُسے دیکھتا دیکھ کر اللہ ڈِنو عبید نے بھی تونگر کو دیکھا مگر نظر انداز کیا حالانکہ اُس کی نگاہیں اُس اجنبی شخص کی نگاہوں کا مسلسل تعاقب کر رہی تھیں۔ اللہ ڈِنو عبید جو اُسے گاڑی تک چھوڑنے جا رہا تھا، نہیں چاہتا تھا کہ تونگر کا اُس سے تعارف ہو۔ تونگر کو اپنے اِس طرح کھڑے ہو کر اُن کو تعظیم دینے پر شرمندگی ہو رہی تھی۔ کہاں وہ وقت کہ اِن جیسے کئی کرپشن کی دیہاڑیاں لگانے والے اُس کے ادنیٰ ماتحتوں کے دفاتر میں بھی جھانکنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے اور کہاں یہ وقت وہ اِن رذیلوں کو تعظیم دینے کے واسطے اپنی جگہ سے کھڑا ہوا ہے اور انھوں نے اُس کی طرف ڈھنگ سے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ لیکن پے در پے رونما ہونے والے آبرو شکن واقعات نے اُس کے اندر کی انانیت کو اِس قدر شکستہ کیا کہ وہ اپنے سے کمزور پر طیش اور برتر کے روبرو محض جلنے کڑھنے تک ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ لیکن تونگر کی اَنا کا یوں اِس قسم کے دوغلے رویوں میں منقلب ہونا اُس کے بیوروکریٹ ہونے کی تربیت کا تسلسل تھا کہ جہاں کمزور کو دبانا اور طاقتور کے سامنے دب جانا ملازمت کا سنہری اصول گردانا جاتا ہے۔ عوام کو ہر قدم پر بے توقیر کرنے والے نوکر شاہی کے کارندے اپنے سے برتر عہدیدار یا مقتدر سے بے توقیر ہو کر بھی شرمندہ نہیں ہوتے بلکہ موقع ملنے پر پھر اپنے سے ادنیٰ پر چڑھ دوڑتے ہیں۔

اللہ ڈِنو عبید اجنبی کو رخصت کرنے کے بعد آفس کی لابی میں داخل ہوا تو اُس کے چہرے پر خوشامد کی جگہ رعونت لے چکی تھی۔ تونگر کو دیکھتے ہی اُس نے کسی تعظیمی سابقے یا لاحقے کے بغیر محض تونگر کہہ کر پکارا اور اپنے پیچھے کمرے میں آنے کا اشارہ کیا۔ اِس طرح کی تذلیل نے تونگر کو برانگیختہ کرنے کی کوشش کی لیکن پھر خیال آیا کہ اِس سے قبل بھی اللہ ڈِنو عبید کی زبان سے وہ اِس سے کہیں زیادہ بے عزت ہو چکا ہے تو ایسے میں اب غصہ کس واسطے۔ ویسے بھی اللہ ڈِنو عبید نے اُسے گاہے بگاہے جتنی عزت دی تھی، جتنے احسان کیے تھے، اُس کے متوازی کبھی کبھار اِس طرح سے پیش آنا کچھ معنی نہیں رکھتا کہ جس پر مشتعل ہوا جائے۔ لہٰذا وہ اللہ ڈِنو عبید کے پیچھے پیچھے اُس کے کمرے میں چلا آیا۔

اللہ ڈنو کرسی پر نہ بیٹھا تو تونگر کو بھی کھڑے رہنا پڑا۔ اللہ ڈنو ٹہلتا ہوا اپنی کرسی کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا اور اپنی نگاہیں تونگر کے چہرے پر تنقیدی انداز میں مرکوز کر لیں۔ تونگر اپنے مزاج اور سابقہ ملازمتی رویے کی عطا کردہ ہیبت کے باوجود اُس کے اِس طرح گھورتے رہنے سے گڑبڑا گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُسے کامل یقین ہو چلا تھا کہ گُل رُخ نے کل شام کی روداد واقعی اُس تک پہنچا دی ہے۔ لہٰذا وہ ہر قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنے کو تیار ہو چکا تھا جس کا منطقی نتیجہ زیادہ سے زیادہ انیکسی جیسی پناہ گاہ سے محرومی ہی ہو سکتا تھا۔

''میرا خیال تھا کہ تمھیں کچھ دن ابھی سکون سے رہنے دیا جاتا تاکہ تم اپنی چہیتی بیوی کے عطا کردہ ذہنی خلجان اور فتور سے نکل سکو لیکن کیا کیا جائے کام ہی ایسا آن پڑا ہے کہ تمھارے سوا اِسے اور کوئی نہیں کر سکتا۔'' اللہ ڈنو عبید کے انداز میں حد سے زیادہ پریشانی اور سنجیدگی تھی۔ تونگر اگرچہ اب بھی خاموش تھا مگر اُس کی پیشانی پر استفساریہ شکنیں نمودار ہو چکی تھیں۔ اللہ ڈنو عبید نے اپنی ٹیبل کی دراز کھول کر ایک پوسٹ کارڈ سائز تصویر نکالی اور تونگر کے سامنے میز پر پھینک دی۔

''اسے اُٹھاؤ اور غور سے دیکھو! رُباب نام ہے اِس کا، یہ لڑکی حیدر گوٹھ میں حاجی بخشن کے ٹرک ہوٹل پر پولیس کے چھاپے کے دوران پکڑی گئی تھی، علاقہ مجسٹریٹ کے پاس پیش بھی ہوئی مگر پھر وہاں کچہری میں ہونے والے ہنگامے میں لاپتہ ہو گئی اور اب تک لاپتہ ہے۔'' تونگر نے تصویر تو اُٹھا لی لیکن سرسری سا دیکھتے ہوئے اللہ ڈنو عبید کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ پھر میں کیا کروں۔

''تونگر! پچیس برس پہلے تم حیدر گوٹھ میں اسسٹنٹ کمشنر رہے ہو اور جن لوگوں نے اِسے لاپتہ کیا ہے تم اُن سب کو اچھی طرح جانتے ہو، بس اتنا سمجھ لو کہ یہ لڑکی میرے لیے نہایت اہم ہے، مجھے ہر صورت چاہیے اور وہ بھی بلا تاخیر۔'' آخری لفظوں تک آتے آتے اللہ ڈنو کا لہجہ غیر ضروری طور پر سفاک ہو چکا تھا۔ یہ وہ لمحہ تھا کہ جب اُس کی آنکھوں سے اچانک ہی حیوانیت ٹپکنے لگتی تھی۔

''اور ہاں، انیکسی میں کلوز سرکٹ کیمرے لگے ہوئے تھے جن کا مانیٹر میرے کنٹرول میں تھا، وہ کیمرے آج سے اُتارے جا رہے ہیں تاکہ تم وہاں آرام سے رہ سکو، من مانی کر سکو۔'' اللہ ڈنو

کی سفاکیت میں تمسخر شامل ہو چکا تھا۔ تو نگر ہاتھ میں رُباب کی تصویر تھامے اس طرح گم سُم کھڑا تھا کہ جیسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب ہو چکی ہو۔

۳۳

ریجنل پولیس آفیسر سے ملاقات کے بعد بھی رضوان ہاشمی اس قدر مضطرب نہیں ہوا تھا کہ جتنا جبار کی جانب سے تمام رابطے منقطع ہو جانے کے بعد ہو رہا تھا۔ پہلے اُس کا خیال تھا کہ وہ رُباب کا معاملہ حاجی بخشن کے سر تھوپ کر خود ایک طرف ہو جائے گا لیکن جبار کی گواہی کے نہ ہوتے ہوئے بخشن کو نیچا دکھانا ناممکن تھا، خاص طور پر اِن حالات میں کہ جب جبار کا اَتا پتا ہی معلوم نہ ہو رہا ہو۔ رضوان ہاشمی نے انٹیلی جینس کے کچھ پرانے دوستوں کے ذریعے جبار کی سِم اور فون کی لوکیشن معلوم کرنا چاہی مگر اِس سلسلے میں بھی ناکامی ہوئی۔ اُس کی مینار جیسی خود اعتمادی ریزہ ریزہ ہوتی ہوئی زمیں بوس ہونے لگی تھی۔

فوجداری مقدمات کا وکیل ہوتے ہوئے وہ بڑے سے بڑے کھڑ پینچ پولیس افسروں کو جرح میں اُڑا دینے کا فن جانتا تھا۔ اُس کے چہرے کے درشت تاثرات اور اُلجھے ہوئے سوالوں کا سامنا کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں تھا۔ ایسے میں فریق مخالف کا وکیل عدالت کے سامنے چیختا رہ جاتا کہ غیر متعلقہ سوالات کے ذریعے اُس کے گواہان کو ہراساں کیا جا رہا ہے مگر عدالتیں بھی رضوان ہاشمی کی جرح میں دخل اندازی کی ہمت کم ہی کر پاتیں۔ اپنے تھانے کی حدود میں دہشت و ہیبت کی علامت سمجھے جانے والے تفتیشی سب انسپکٹر اور ایس ایچ اُو رضوان ہاشمی کا نام سنتے ہی کوشش کرتے کہ پوری تیاری کے ساتھ گواہ کے کٹہرے میں آئیں مگر اِس کے باوجود وہ کچھ نہ کچھ ایسا ڈھونڈ لیتا جو اُن کی کی گئی تفتیش کو ناقص قرار دلوانے اور ملزم کو بری کرانے کے واسطے کافی ہوتا۔ رضوان ہاشمی یہ بھی جانتا تھا کہ یہ پولیس والے اُس وقت تک اُس سے خوف زدہ رہیں گے کہ جب تک وہ وکیل ہے، ملزم نہیں۔ لیکن جونہی اُسے وکیل یا مدعی کی بجائے ملزم ہونا پڑا تو یہ سب ایک ہو جائیں گے اور اُسے سلامت نہیں چھوڑیں گے کیونکہ اُس کی جرح کی وجہ سے کسی کی ملازمت میں

تنزلی ہو چکی تھی تو کوئی انکوائریاں بھگت رہا تھا۔ لیکن اب یہ موقع انھیں ملنے والا تھا۔ رضوان ہاشمی وکیل ہوتے ہوئے بھی ملزم بننے والا تھا۔

حاجی بخشن کو دھمکانے کے بعد اُس نے جلال گنج ڈویژن کی سیٹوں پر منتخب ہونے والے صوبائی بار کونسل کے ممبران سے رابطہ کر کے اُنھیں اگلے روز سے ریجنل پولیس آفیسر کے وکلا دشمن رویے کے خلاف ہڑتال اور ڈویژن بھر کی عدالتوں کے بائیکاٹ پر تیار کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے بتایا کہ گزشتہ ہفتے میں ہونے والے واقعات میں جس طرح اُس نے وکلا برادری کے حقوق کے تحفظ کے لیے پولیس اور ضلعی عدلیہ کے گٹھ جوڑ کے خلاف کردار ادا کیا ہے تو پولیس اور عدلیہ دونوں اُس کی دشمن ہو چکی ہیں۔ اِس سلسلے میں اُسے سبق سکھانے کے لیے سنگل آؤٹ کرتے ہوئے نہ صرف ریجنل پولیس آفیسر نے اُسے اپنے دفتر میں بلا کر انتہائی غیر مہذب برتاؤ اور بدتمیزی کی ہے بلکہ کسی فوجداری مقدمہ میں ناجائز طور پر ملوث کرنے کی دھمکی بھی دی ہے۔

رضوان ہاشمی اِس کوشش میں بھی ناکام رہا۔ وکلا رہنماؤں نے اُس کی بات سُن کر ہمدردی کا اظہار ضرور کیا لیکن ہڑتال پر وہ اِس لیے آمادہ نہیں تھے کہ ابھی چند دن پہلے تو کئی دنوں کی ہڑتال کا مسئلہ حل ہوا تھا جسے پھر سے ایک انفرادی اور کسی حد تک ذاتی تنازعہ پر شروع کر دینا کسی طور بھی مناسب نہیں تھا۔ لیکن رضوان ہاشمی کے نزدیک یہ سبھی لوگ اپنا آنے والا الیکشن متنازعہ نہیں کرنا چاہتے تھے اِس لیے اُس کی حمایت سے پیچھے ہٹ گئے ورنہ پورے ملک میں وکلا کے مسئلے پر شروع ہونے والے احتجاج اور کی جانے والی ہڑتالیں اکثر انفرادی تنازعات سے شروع ہوتی رہی ہیں۔

ڈویژنل لیول سے مایوس ہو کر رضوان ہاشمی نے اپنے ضلع شمس پور کی ضلعی بار کی قیادت سے رابطہ کیا مگر وہ محض ایک ہفتہ کے بعد ہونے والے ضلعی اور تحصیل بار ایسوسی ایشن کے انتخابات کو رضوان ہاشمی کے مفادات کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہتے تھے۔ ویسے بھی رضوان ہاشمی گروپ اِن انتخابات میں خفیہ طور پر اُن کے مخالف دھڑے کی حمایت کر رہا تھا۔ اِن حالات میں رضوان ہاشمی نے اپنے دھڑے سے بات کی تو اُنھوں نے بھی اِس مرحلے پر کسی بھی قسم کی احتجاجی سیاست کا

حصہ بننے سے انکار کر دیا۔ ضلع شمس پور کی صوبائی بار کونسل میں دو نشستیں تھیں۔ ایک رضوان ہاشمی کے پاس اور دوسری پر عبدالرب ارباب براجمان تھا۔ عبدالرب ارباب سے ہاشمی کی ہمیشہ مخالفت رہی تھی اِس لیے اُس سے بھی توقع نہیں تھی کہ وہ ماضی کا کیا دھرا سب کچھ بھلا کر ہاشمی کی مدد کو آتا۔ لے دے کر خوشحال خان ہی رہ گیا کہ جو حیدر گوٹھ کی تحصیل بار میں انہونی کو ہونی بنا سکتا تھا۔

شام ڈھلنے سے پہلے ہی اُن دونوں کی ملاقات ایک بار پھر اُسی جگہ پر ہوئی کہ جہاں خوشحال خان رضوان ہاشمی کی شرائط پر اپنی گلوخلاصی کے لیے آیا تھا۔ لیکن آج حالات مختلف تھے۔ خوشحال خان اپنے اُستاد سے کھنچا کھنچا تھا کہ اُس نے ہر شرط منوانے کے بعد بھی اُس کی کشتی کو منجھدھار میں چھوڑ دیا تھا۔ طے یہ ہوا تھا کہ خوشحال خان اور اُس کے گروپ کے وکلا کے خلاف درج ہونے والے مقدمے کی ایف آئی آر کے اخراج کے بغیر ضلعی عدلیہ اور پولیس سے کسی قسم کی مصالحت نہیں ہوگی لیکن رضوان ہاشمی اِس بنیادی شرط کو پورا کرانے میں ناکام رہا تھا۔ وہ خوشحال خان پر واضح کر چکا تھا کہ نئے تعینات ہونے والے سیشن جج نے پوری کوشش کی مگر ڈی پی اُو نے اِس مقدمے کے فوری اخراج سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اب رضوان ہاشمی اُس مقدمے کی ایف آئی آر کے سربمہر ہو کر سرد خانے میں پڑے ہونے کو اپنی کامیابی گردان رہا تھا جب کہ خوشحال خان کو خدشہ تھا کہ یہ ایف آئی آر کسی بھی وقت کھل کر اُس کی گردن کا پھندہ ثابت ہو سکتی ہے خاص طور پر اِس لیے کہ اس میں انسدادِ دہشت گردی ایکٹ کی دفعات بھی شامل تھیں کہ جن کے ہوتے ہوئے ضمانت کا امکان ہی باقی نہیں رہتا۔

رضوان ہاشمی نے خوشحال خان سے بات کرنے کی طرح ایک اور ڈھب سے ڈالی۔ اُس نے آر پی اُو جلال گنج کی طرف سے بلاوے اور اُس کی جانب سے دیئے گئے الٹی میٹم کو سرے سے ہی گول کرتے ہوئے بات یہاں سے شروع کی کہ اگر وہ سربمہر ایف آئی آر سے چھٹکارا چاہتا ہے تو کل سے ہی پولیس کے خلاف ہڑتال کی کال دے کر احتجاجی کیمپ لگا لے۔ جب کہ خوشحال خان اِس تجویز کے سرے سے ہی خلاف تھا۔ اُس کے نزدیک تحصیل بار کے انتخاب میں صرف ایک ہفتہ باقی تھا، اگر اِس دوران وہ اپنی انتخابی مہم چھوڑ کر ہڑتالی کیمپ میں بیٹھ جاتا ہے تو الیکشن میں

کامیابی کی امید دور دور تک باقی نہیں رہتی۔ دوسرا اعتراض اُسے یہ بھی تھا کہ قواعد کے مطابق ہڑتال کی کال صرف موجودہ صدر دے سکتا ہے، وہ نہیں۔ اِن حالات میں اگر صدر نے انکار کر دیا تو سارا بوجھ اُس کے دھڑے پر آ پڑے گا۔ اِس طرح بار کی تقسیم کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے پولیس اور انتظامیہ زیرِ بار آئے ہوئے فریق کے خلاف سرِ بمہر ایف آئی آر کے کھولنے کے علاوہ بھی بہت کچھ کر سکتی ہے۔ خوشحال خان نے اپنے تحفظات پر رضوان ہاشمی کی رائے جاننے کے لیے سوالیہ انداز میں اُس کی طرف دیکھا۔

''پولیس تو ویسے بھی ایف آئی آر کسی وقت کھول کر تمھیں گرفتار کر سکتی ہے، لیکن اپنی جانب سے پہلے قدم اُٹھائے جانے کی صورت میں پولیس اور انتظامیہ کو ہزار بار سوچنا ہوگا کہ جوابی قدم اُٹھائے یا صورتِ حال کو جوں کا توں رہنے دے۔'' رضوان ہاشمی کے ایک ایک لفظ سے دانش ٹپک رہی تھی۔ خوشحال خان نے مرعوب ہو جانے والے انداز میں اُس کی طرف دیکھا تو رضوان ہاشمی نے ہولے سے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''خوشی! پھر بھی سوچ لو! میں نے تو منطقی بات کی ہے کہ اِن حالات میں جو بھی پہلا قدم اُٹھائے گا وہی فائدے میں رہے گا، باقی رہا میں، میں تو دونوں صورتوں میں تمھارے ساتھ ہوں۔'' رضوان ہاشمی کی آنکھوں کی چمک جاگ اُٹھی تھی۔

''اگر صدر کل صبح ہڑتال اور عدالتی بائیکاٹ کی کال نہیں دیتا تو؟'' خدشات خوشحال خان کے چہرے پر لکھے تھے۔

''تو کیا ہو گیا، جو شخص محض ایک ہفتے کا صدر ہو، اُس کے ماننے یا نہ ماننے سے کیا فرق پڑتا ہے، تم خود کال دو صرف پولیس کے خلاف، اگر مخالف گروپ کا کوئی وکیل عدالت میں پیش ہو تو اُسے اپنے لڑکوں سے پھینٹی لگواؤ، عدالتیں بند کراؤ، تالے لگاؤ اور جو جج کورٹ نہ چھوڑے اُس کے ساتھ وہی پہلے والا فارمولا، اوپر کی فکر نہ کرو، وہ میں دیکھ لوں گا۔''

رضوان ہاشمی نے یہ سب کچھ اِس انداز میں کہا کہ خوشحال خان کے ذہن میں موجود سبھی ابہام چھٹتا چلا گیا۔ اُس نے ایک بار پھر اپنے سینئر کی آنکھوں میں دیکھا جہاں سوائے شفقت کے

اور کچھ نہ تھا۔

رضوان ہاشمی کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔خوشحال خان کو پولیس کے سامنے کھڑا کرنے کے بعد اُس کے ذہن سے آر پی اُو کی دھمکی اور الٹی میٹم دونوں زائل ہو چلے تھے۔خوشحال خان کے پیدا کردہ تلاطم کو منتشر کرنے کے لیے ضلع کا سیشن جج مجبور ہوگا کہ اُسے بلا کر پولیس اور انتظامیہ سے افہام کی کوئی راہ نکالے۔خوشحال خان کے اُس کی گاڑی سے اترنے کے بعد جتنی بھی گالیاں اُسے یاد تھیں وہ ساری کی ساری اُس نے آر پی اُو کا نام لے کر ہوا میں اِس طرح پھینکیں کہ اُن کا سواد کافی دیر تک اُس کی زبان و ذہن میں رہا۔

ذہن سے کئی دنوں کا بوجھ اُترا تو اُسے بے اختیار عتیقہ کی یاد آئی کہ جس کے پاس وہ گزشتہ چار دنوں سے نہیں گیا تھا۔اب تک ایسا بہت کم ہوا تھا کہ وہ اتنے دنوں تک عتیقہ سے نہ ملا ہو یا اُس کے ساتھ شب باشی نہ کی ہو۔لیکن آخری بار عتیقہ کے اپنائے گئے رویے کے بعد وہ اُسے ملنے سے گریزاں سا ہو گیا تھا۔اتنے سارے مسائل اور اُن سے حاصل ہونے والے سنہری مواقع رضوان ہاشمی کی کامل یکسوئی چاہ رہے تھے۔حالات نے اُسے ایسی چومکھی میں الجھا دیا تھا کہ جس میں ہوتے ہوئے اُس کا اپنے آپ کی طرف دیکھنا بھی کیے کرائے پر پانی پھیرنے کے علاوہ اُس کے لیے مشکلات کا لامتناہی عذاب نازل کر سکتا تھا۔اب اگر ایسے میں عتیقہ جیسی باشعور لڑکی بھی اُس کی پریشانیوں کا ادراک نہ کر سکے یا اُسے سکون مہیا نہ کر سکے تو اُس سے گریز فطری تقاضا بن کر رہ جاتا ہے۔

رضوان ہاشمی نے آخری بار عتیقہ کو جس کیفیت میں دیکھا تھا اُس سے عیاں تھا کہ وہ اُس سے بدظن ہو چکی ہے۔اگر معاملہ صرف وقتی غصے یا ناراضگی کا ہوتا تو الفاظ کا چناؤ وہ نہ ہوتا جو عتیقہ کی جانب سے کیا گیا۔لیکن رضوان ہاشمی کے لیے اِس مرحلے پر فیصلہ ساز انداز اپنانا بھی اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے جیسا تھا۔ جتنے جتن اور جتنے پاپڑ بیل کر رضوان ہاشمی نے عتیقہ کو اُس کے رشتے داروں کے چنگل سے نکالا تھا، اُس کے بعد اُسے یوں اُن کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا بھی حماقت سے بڑھ کر کوئی حماقت ہوتی۔رشتے دار نہ سہی کوئی اور مہم جو بھی آ سکتا تھا کہ یوں اُسے اُچکا

اور یہ گیا وہ گیا۔عتیقہ سے اُستوار تعلق گریز کی بجائے اپنایت کا متقاضی تھا وگرنہ ایک جوان عورت کو کھو دینے میں دیر کتنی لگتی ہے۔

رضوان ہاشمی نے گاڑی کا رُخ اپنے فارم ہاؤس کی طرف کر لیا۔وجود میں اچانک سے ایک ہیجان بیدار ہوا اور آتی جاتی سانس کے ساتھ اپنی پہچان کرانے لگا۔یوں لگا کہ عتیقہ کے جسم کے ہر ایک انگ کی خوشبو اُس کی حسِ شامہ میں کہیں محفوظ رکھی تھی کہ یکبار سرشاری کے احساس کے ساتھ اُس کے اطراف کو معطر کرتی چلی گئی۔لیکن ایسے میں کیا ہوا کہ وہ بلند آواز میں اپنے آپ کو گالیاں دینے کے بعد دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔آنکھوں میں پانی اُترنے اور اُس سے اُٹھنے والی بھاپ کے سبب گاڑی چلانا دشوار ہوا تو رضوان ہاشمی نے گاڑی ایک طرف سائیڈ پر روک لی اور اسٹیرنگ پر سر رکھ کر ہچکیاں لینے لگا۔اُسے رہ رہ کر عتیقہ سے روا رکھی گئی تمام بدسلوکیاں یاد آرہی تھیں۔کس قدر ناقدری کرتا رہا ہے وہ اُس نایاب عطا کی کہ جو عمر کے اِس حصے میں اُس کا مقدر ہوئی لیکن وہ اُسے محض جنسی تسکین کا ذریعہ سمجھتا رہا۔عتیقہ اپنے احتجاج میں حق بجانب تھی کہ اُس نے کبھی اُس کے ساتھ اپنے ذہن کو، اپنے آپ کو سانجھا کیا ہی نہیں۔عورت اور مرد چاہے عمر کے جس حصے میں بھی ہوں اُن کی ذہنی طمانیت اور جسمانی تشفی محض جنسی ملاپ سے نہیں ہو پاتی۔اُن کی صنفی سانجھ میں جب تک ذہنی سنجوگ نہ ہو، بدن بھی انبساط سے عاری اور بے قرار رہتا ہے۔

رضوان ہاشمی اپنی شعوری زندگی میں شاید پہلی بار رویا تھا۔اب تک اُسے محض رُلانے سے سروکار رہا تھا۔کتنے بے گناہوں کو سزائیں دلوائیں اور کتنے ہی گنہ گاروں کو سزا سے بچا کر پھر سے جرم کرنے کے مواقع دیئے۔فیس کے نام پر محض چند روپوں کی خاطر بک جانے کے بعد اُس نے کتنے گھر اُجاڑے، کتنی عورتیں بیوہ اور کتنے ہی بچے یتیم کیے۔خود دن میں کئی کئی بار بکتے ہوئے اُس نے یہی سمجھ لیا تھا کہ یہاں سماج میں بھی ہر شخص پر برائے فروخت کا ٹیگ لگا ہوا ہے۔بس خرید اور فروخت۔

اُس کے نزدیک عورت اور مرد کا باہمی اشتراک اور تعامل کسی فوجداری مقدمہ میں ٹرائل کی بجائے ضمانت کی درخواست جیسا رہا تھا۔وہی رٹی رٹائی، وہی پٹی پٹائی دو سطریں لکھیں کہ جھوٹے

واقعات پر مبنی ایف آئی آر تاخیر سے درج ہوئی ہے اور ملزم کے خلاف مقدمہ مزید انکوائری کا تقاضا رکھتا ہے، تو بس اُس کے بعد فوری عدالتی حکم۔ اِدھر یا اُدھر۔ نہ کوئی تیاری، نہ کوئی گواہ اور نہ ہی کوئی جرح۔

ہاشمی کو اب احساس ہو رہا تھا کہ ضمانت سے وقتی ریلیف تو مل جاتا ہے مگر مقدمے کے ساتھ ساتھ ملزم کا مقدر بھی معلق رہتا ہے، یہ تو ٹرائل ہے کہ جس سے وکیل اور دلیل دونوں کی پرکھ ہوتی ہے، معاملہ کسی بنے لگتا ہے۔ تو کیا عورت سے تعلق میں وہ اب تک صرف درخواست ضمانت ہی دائر کرتا رہا ہے؟ ٹرائل یا کاملیت پر اُستوار تعامل کی طرف گیا ہی نہیں؟۔ یہی سبب رہا کہ بیوی سے بچے تو پیدا کر لیے مگر شریک زندگی کبھی سمجھا ہی نہیں۔ نجانے کتنی عورتوں سے کبھی ایک بار اور کبھی دو بار کا جنسی ملاپ ہوا مگر اُن کے جوان جسموں کی حسیات کے اندر کتنے جذبات، کتنی خواہشات چھپی ہیں، کبھی محسوس ہی نہیں کیا۔ اُن کے دل اور دماغ اُس کے بارے میں کیا سوچتے تھے، کبھی جھانکا ہی نہیں۔ اور اب یہی حال عتیقہ کا کیا کہ اپنے اندر کے تلاطم کو فوری طور پر، محض چند لمحوں میں سرد کرتے ہوئے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اُس کا کیا بنا، ابھی راستے میں ہے، منزل پر پہنچ چکی یا ابھی سفر شروع ہی نہ کر پائی تھی کہ وہ چلتا بنا۔ اور اگر وہ احتجاج پر اُتر آئی تھی تو اُس کے من میں پھیلتے زہر کو پیار کے منکے کے ذریعے چوس کر باہر نکالنے کی بجائے اُلٹا خود ہی فاصلہ کر کے بیٹھ گیا اور چار دن گزار دیے۔ اب سامنا تو عتیقہ سے ہوگا، مگر کس منہ سے؟

اِن آنسوؤں نے رضوان ہاشمی کو کسی حد تک شانت کیا تو وہ پھر سے گاڑی چلانے کے قابل ہو گیا۔ چار دن کے بعد فارم ہاؤس پہنچا تو ملازم معمول کے مطابق اُس کی گاڑی کے گرد جمع ہو گئے۔ لان میں رکھی صاف ستھری کرسیوں پر احتیاطاً جھاڑ پونچھ شروع ہوئی تو اُس نے خلافِ معمول اُدھر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور سیدھا زنان خانے کی طرف چلا۔ وہاں آج بھی خاموشی تھی۔ صدر دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد پھر وہی دن میں بھی مہیب تاریکی اور سناٹا۔ رضوان ہاشمی نے کئی بار عتیقہ اور ملازمہ کو آوازیں دیں مگر آج بھی وہی حال کہ نہ کوئی جواب اور نہ ہی کسی کی موجودگی کا کوئی احساس۔ ابھی کچھ دیر پہلے کی کیفیت کے باعث اپنی جھنجلاہٹ اور غصے پر قابو

رکھتے ہوئے اُس نے سارے گھر کی لائٹس آن کر دیں۔ مگر اندھیرے اور اُجالے دونوں میں کوئی فرق ظاہر نہیں ہو پا رہا تھا۔ اُس نے عتیقہ کے بند دروازے کو زور سے تھپتھپایا لیکن خلاف توقع وہ اندر سے بند رہنے کی بجائے کھلتا چلا گیا۔ ہاشمی تیزی سے اندر گیا۔ بھائیں بھائیں کرتا ہوا کمرہ اپنے خالی ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔ کچھ دیر کی تلاش بسیار کے بعد ثابت ہو چکا کہ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ عتیقہ اور نہ ہی ملازمہ۔

آثار سے یوں لگ رہا تھا کہ عتیقہ اُسی دن گھر چھوڑ چکی تھی کہ جس روز وہ آخری بار اُس سے ملا تھا۔ پریشانی کے عالم میں سب رکھ رکھاؤ اور وضع داریاں بھول کر وہ فارم ہاؤس کی سیکورٹی پر مامور گارڈز پر برس پڑا۔ وہ سب اُتنے ہی بے خبر تھے کہ جتنا وہ خود۔ حیرت اس بات کی تھی کہ وہ گھر سے نکلے ہیں تو کہاں سے۔ چاروں طرف اونچی دیوار اور اُن پر لگی ہوئی خاردار تار حیرت اور پریشانی کو مزید بڑھاوا دے رہی تھی۔

گارڈز کو زنان خانے تک رسائی نہ دینے کے واسطے رضوان ہاشمی نے اُن کے کھانے پینے کا بندوبست باہر ہی کر رکھا تھا۔ اس طرح گارڈز کا ایریا اور زنان خانہ دو الگ حدود تھیں کہ جن کا آپس میں اتنا سا تعلق تھا کہ ہر قسم کا آنا جانا مین گیٹ سے ہی ہوتا تھا۔ مگر آج رضوان ہاشمی کی تمام تر احتیاط اور تحفظ کے سبھی اقدام اُس کا منہ چڑا رہے تھے۔ گھر چھوڑنے کی ٹھان لینے والوں کا راستہ کسی طور بھی نہیں روکا جا سکا تھا۔

۳۴

اللہ ڈنو عبید کے دیئے ہوئے الٹی میٹم کی مدت گزرتے ہی اُس کا ردِعمل سامنے آ گیا۔ حاجی بخشن کو چوہدری ضیا ایس ایچ او تھانہ صدر حیدر گوٹھ کے فون کا بار بار آنا اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ کہاں وہ دن کہ پولیس کے ڈی ایس پی عہدہ کے افسر بھی رات کی گشت کے دوران اُس کے ٹرک ہوٹل کے سامنے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اُس کی حفاظتی ڈیوٹی دیا کرتے لیکن اتنی جرات نہیں تھی کہ وہ گاڑی سے اُتر کر بخشن کے ہوٹل میں جا سکیں یا اُس سے ملنے کی خواہش کر سکیں۔ اُن کی

رسائی اگرچہ ٹرک ہوٹل کے باتھ رومز تک منع نہیں تھی مگر وہ پھر بھی احتراز کرتے کہ کہیں حاجی صاحب ناراض نہ ہوں۔ اگر حاجی بخشن ناراض ہو گیا تو سمجھا جاتا تھا کہ اُن کا آئی جی بھی اُن سے خفا ہو گیا۔ ایسے میں پیشاب کے لیے بھی اُنھیں قریبی کھیتوں کا رُخ کرنا پڑتا یا اپنے ڈالے کی اوٹ میں کارروائی ڈالنی پڑتی۔ پھر یہ ہوا کہ اُس نے اپنے دوست حمیدالرحمٰن کو آئی جی تعینات کرایا تو اُس نے حاجی بخشن کے تھانے میں چوہدری ضیا کو ایس ایچ اُو لگا دیا۔ وہ پہلا ایس ایچ اُو تھا کہ جس نے حاجی بخشن کے ٹرک ہوٹل کا باتھ روم زبردستی کھلوا کر اپنی حاجت رفع کی۔ چوہدری ضیا کی حاجت اختیاری تھی یا اجباری، اِس سے قطع نظر وہ حاجی بخشن کی ہیبت کی فصیل میں دراڑ ضرور ڈال گئی۔

چوہدری ضیا کی اِس حرکت نے حاجی بخشن کو اضطراب میں مبتلا کر دیا۔ بدلتے موسموں اور مزاجوں پر نگاہ رکھنے والا سمجھ گیا کہ کہیں کچھ ایسا ضرور ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اُس نے فوری طور پر آئی جی حمیدالرحمٰن کو فون کیا لیکن فون اٹینڈ نہ ہوا، اُس نے وائس میسج کیا جو سُن لیا گیا مگر جواب پھر بھی نہ ملا۔ اب تو یقین ہو چلا تھا کہ چوہدری ضیا نے یہ جرات، رندانہ طور پر نہیں کی تھی۔ اُس کے سر سے ہاتھ اور پاؤں تلے سے زمین سرکانے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ ایک دن اُس نے باتوں باتوں میں فون پر آر پی اُو سے ایس ایچ اُو کی عملے سے بدتمیزی اور زبردستی باتھ روم کھلوانے کا ذکر کیا تو جواباً وہ ہنس دیا۔ ''چھوڑو حاجی صاحب! اگر ایس ایچ اُو بدتمیزی بھی نہ کرے تو بتاؤ اور کیا کرے؟ ہر کسی کو اپنی شناخت اور اپنا حصہ چاہیے ہوتا ہے، کسی کو کم اور کسی کو زیادہ۔''

وہ شام بھی حاجی بخشن کو اچھی طرح سے یاد تھی کہ جب وہ دندناتا ہوا اُس کے دفتر میں چلا آیا۔ فیض کریم اور دیگر گارڈ اُسے روکتے رہ گئے مگر وہ سیدھا حاجی بخشن کے کمرے میں پہنچ گیا۔ ''حاجی صاحب! مانا کہ آپ بڑے لوگوں اور بڑے افسروں کے دوست ہیں مگر ہم بھی کسی سے کم افسر نہیں، جس طرح بڑے افسر ہگتے موتتے ہیں ہم بھی ویسے ہی اُسی جگہ سے یہ کام کرتے ہیں، باقی آپ خود سمجھدار ہیں، اُمید ہے اب آپ اوپر بات نہیں کیا کریں گے۔''

اور آج پھر وہی چوہدری ضیا اُس کو فون پر فون کیے جا رہا تھا۔ نجانے کیوں وہ اُس کا فون

اٹینڈ کرنے میں خوف کا شکار ہو گیا تھا۔ کوئی انجانی حس اُسے بار بار متنبہ کیے جا رہی تھی کہ چوہدری ضیا کا آج کا فون شہزادی کے لیے نہیں بلکہ اللہ ڈِتو عبید کے دیے گئے انتباہ کا شاخسانہ تھا۔ زندگی بھر خطرات سے کھیلتے ہوئے اپنی بقا کشید کرنے والا حاجی بخشن ایک معمولی سے ایس ایچ او سے شاید اِس لیے لرزہ براندام تھا کہ ایک جانب تو وہ اُس کے بستر کے لیے مخصوص لڑکی کو نکیل ڈال کر اُس کی ذاتی زندگی میں گھسا ہوا تھا تو دوسری جانب اُس کے ماضی کے سرپرستوں کا تعمیلی ہرکارہ بن کر اُسے ہر لحاظ سے برباد کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ اُسے چوہدری ضیا کے مکوٹھے کے پیچھے آئی جی حمید الرحمٰن اور اللہ ڈِتو عبید سمیت اُن کئی دوستوں کے چہرے دکھائی دینے لگے تھے جو صرف اِس لیے اپنے دوست یا محسن کو مٹی میں ملا دیتے ہیں کہ اُس نے کبھی اُن پر احسان کیا تھا، اُنھیں سہارا دیا تھا یا اُن کی ذاتی زندگی کے چھپے ہوئے گوشوں سے واقف رہا تھا۔

ایک بار پھر حاجی بخشن کے فون کی اسکرین روشن ہوئی اور اونچی آواز میں مخصوص گھنٹی بھی بج اُٹھی۔ اب کی بار فیض کریم نے فون کیا تھا۔ حاجی بخشن نے دوسری گھنٹی پر ہی اٹینڈ کر لیا مگر دوسری جانب فیض کریم کی بجائے چوہدری ضیا بول رہا تھا۔

''جی حاجی صاحب! جہاں سے جرائم پیشہ بھڑوؤں کی سوچنے سمجھنے کی حد ختم ہوتی ہے وہاں سے ہم پولیس والوں کی عقل کام کرنا شروع کرتی ہے، حاجی صاحب! اب اُوپر دیکھنا بھول جاؤ اور نیچے زمین پر دیکھنے کی عادت ڈالو، آج کے بعد تمھیں سارے کام اب نیچے والوں سے پڑیں گے، صبح ذرا تھانے آؤ ناں! تمھیں اڈے پر ریڈ والے پرچے میں شامل تفتیش کرنا ہے، جانتا ہوں کہ تم نے میری بلبل کو قید کر رکھا ہے، اب تمھیں میں قید میں ڈالوں گا اور بلبل تمھارا تماشہ دیکھے گی۔''

حاجی بخشن نے کچھ کہے بغیر ہی فون کو بند کر دیا اور موڑھے کی ٹیک سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ''تو کنجر کا بیج میرے دفتر تک پہنچ گیا۔'' شہزادی کے ذکر نے بھی اُسے ابہام میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ اِسی گو یڑ میں غلطاں ہو گیا کہ چوہدری ضیا کا اُبلاوا شہزادی کے ردِعمل میں ہے یا اِس کے پیچھے واقعی اللہ ڈِتو عبید کا ہاتھ ہے۔ پوری زندگی پولیس والوں کی نفسیات سے کھیلنے والا بخشن پولیس کی ذہنیت کو سمجھنے سے قاصر ہو رہا تھا۔ بار بار اُس کے ذہن میں ایک ہی خیال اِدھر اُدھر سے گھوم گھما

کر مسلسل دھکیں دیئے جا رہا تھا کہ ماضی قریب میں اُس سے کس کے ساتھ کوئی ایسی زیادتی ہوئی ہے کہ جس کے بعد اُس کے مقدر کی گھڑی کی سوئیاں اُلٹی چلنی شروع ہو گئی ہیں۔ ایسے ایسے چوتیے اُس کے سامنے شیر بن کر کاٹ کھانے کو دوڑ رہے تھے کہ جن کے پچھواڑے پر وہ تھوکتا بھی نہیں تھا۔ لیکن جو بھی ہو رہا تھا وہ سمجھ سے بالا تھا۔

اُس نے سوچا کہ اللہ ڈنو عبید کو فون کر کے ساری صورتِ حال سے آگاہ کرے لیکن اُس سے کچھ توقع نہیں تھی کہ وہ اُس کی بات کو وزن بھی دے گا یا نہیں۔

''کنجر کا بیج اپنی اوقات بھول گیا۔'' بخشن سوچ رہا تھا کہ اِس اللہ ڈنو کو شاید وہ دن بھی یاد نہ ہو کہ جب یہ چھوٹا موٹا بھڑوا اپنی موٹر سائیکل پر خود گاہکوں کے پاس لڑکیاں پہنچا کر آتا تھا، وہاں سے کمایا تو اپنا کوٹھی خانہ بنا لیا کہ جہاں کئی نگینے جمع کر کے بڑے بڑے لوگوں تک پہنچانے لگا۔ حاجی بخشن کو یاد تھا کہ اُس کے کوٹھی خانے کے لیے پہلا نگینہ نادرہ اُسی نے اُسے تحفے میں دیا تھا۔ نادرہ نے کم عمری ہی میں مردوں کو اپنی انگلیوں پر نچانا سیکھ لیا تھا۔ اُس نے وہیں سے اپنے پر پرزے نکالے اور فلمی دنیا تک جا پہنچی مگر وہاں سے جاتے جاتے بہت سی نایاب حسینائیں اللہ ڈنو کو دان کر گئی۔ لیکن اِس بھڑوے کا کام اُس وقت چمکا کہ جب اُس کے نیٹ ورک میں بڑے بڑے افسر، وزیر، مشیر، سیاست دان اور جرائم پیشہ لوگ آتے چلے گئے۔ اُس نے اپنے مالی مفادات کو مرکز میں رکھتے ہوئے اِن سب کے درمیان ایسا ربط ترتیب دیا کہ اِن سب کے وارے نیارے ہو گئے۔ جب کہ اُس کا سر تو پہلے ہی کڑاہی میں تھا۔

بخشن اچھی طرح جانتا تھا کہ اللہ ڈنو چھوٹے موٹے جرائم سے مجرموں کی گلو خلاصی کراتا ہوا وزارتوں، ترقیوں، تنزلیوں اور تقرریوں تعیناتیوں تک جا پہنچا۔ اُس کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ وہ ٹی وی پر آئے تو اُس نے اپنا پرائیویٹ ٹی وی چینل بنا لیا اور لگا حکومت سمیت سیاسی مخالفوں کی کھال ادھیڑنے۔ کیا کمال کام تھا کہ ہینگ لگی نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آنے لگا۔ ٹی وی سکرین پر جگمگانے کی خواہش رکھنے والی درجنوں لڑکیاں اسکرین ٹیسٹ کے بعد شاید ہی اسٹار بن سکی ہوں مگر اُن کی اکثریت جسم فروشی کے دھندے کا حصہ بن کر چند دنوں میں اتنا کمانے لگیں

کہ جتنا نیوز اینکر یا اینکر پرسن برسوں میں بھی نہ کما سکیں۔ اِس کے ساتھ ہی اللہ ڈنو عبید پر بھی اتنا دھن برسا کہ اُس کا سماجی درجہ ہی بدل گیا۔ اب وہ کروڑوں کو چھوڑ کر اربوں کی دیہاڑی میں اپنا حصہ بٹورنے لگا تھا۔ حکومتیں دسترس میں ہوئیں تو اُس کا دھندہ بھی تمام سرحدیں لتاڑتا ہوا نیشنل سے انٹرنیشنل ہو گیا۔

''لیکن اِس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ میرا احسان بھول جائے اور ایک دو پیسے کی لڑکی کے واسطے میرے پیچھے پولیس لگا دے۔'' مگر کچھ دیر بعد پھر اُسی ابہام نے بخشن کو اپنی گرفت میں لے لیا کہ چوہدری ضیا اُس کے پیچھے شہزادی کے سبب ہے یا اللہ ڈنو عبید کے سبب۔ اُلجھن حد سے بڑھی تو اُس نے دوسرے کمرے میں جا چکی شہزادی کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ پھر کسی اَن دیکھی مصیبت کے خوف سے ڈری سہمی سی اُس کے پاس آئی اور ہراساں انداز میں اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ شہزادی کی توقع کے برعکس بخشن نے مسکرا کر اُسے اپنے قرب بٹھا لیا۔ شہزادی کا خوف کراہت آمیز اُلجھن میں بدل گیا۔ اُسے لگا کہ وہ پھر اپنے بدبودار منہ کی کثافتوں سے اُس کے چہرے اور بدن کو لیپتا رہے گا اور یوں گندگی پھیلانے کے بعد اُسے تڑپتا چھوڑ دے گا۔ ستم تو یہ تھا کہ اِس دوران اُسے اپنے چہرے کے تاثرات بھی دلبرانہ رکھنے ہوتے تھے۔ وگرنہ پھر وہی تشدد، ذلالت اور گالی گلوچ۔

لیکن یہ سب کچھ کرنے کی بجائے بخشن نے اُس کا فون اُسے لوٹاتے ہوئے کہا وہ اُس کی بات کو غور سے سُنے اور جیسا وہ کہتا ہے ویسا ہی وہ کرتی جائے۔ متحیر شہزادی نے بخشن کی طرف متجسس انداز میں دیکھا۔

''تم ایسا کرو کہ چوہدری ضیا کو فون کر کے محبت سے بات کرو اور باتوں باتوں میں اُس سے پوچھو کہ حاجی صاحب اچانک تیاری کر کے ابھی ابھی حیدر گوٹھ کے لیے نکلا ہے، کہہ رہا تھا کہ اُسے آپ نے کسی کام کے سلسلے میں بلایا ہے، خیریت تو ہے، کیوں بلایا ہے اُسے؟''

شہزادی نے بخشن کو حیرت سے دیکھا۔ اُسے اُس کا پورا وجود متعفن کوڑے کا ڈھیر لگنے لگا تھا۔ سڑاند کے احساس سے اُسے کراہت ہوئی تو تاثرات کی یہ لہر قابو میں رکھنے کی کوشش کے

باوجود شہزادی کے چہرے پر بھی پھیل گئی۔ بخشن یہ سمجھا کہ وہ چوہدری ضیا سے بات نہیں کرنا چاہتی۔

''کیا ہو گیا، میری خاطر بات کر لو ناں، جیسا میں نے کہا ہے بالکل ویسے۔'' بخشن کے لہجے میں لجاجت سمٹ آئی تو اُس کا یہ بھڑواپن شہزادی جیسی لڑکی کے لیے بھی ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ وہ حیران تھی کہ ابھی یہ لُچا صرف اِس لیے اُس پر ذہنی اور جسمانی تشدد کرتا رہا کہ اُس کا چوہدری ضیا سے رابطہ کیوں ہے اور ابھی جب اِس نے اِس کے پچھواڑے پر گرم آلو رکھ دیا ہے تو یہ کنجر کا بچہ اُسی چوہدری ضیا کو داماد بنانے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔ شہزادی جانتی تھی کہ بخشن اول آخر بھڑوا ہے مگر پھر بھی حالتِ اضطرار میں تھی کہ کاش اتنی بھڑک کڑک دکھانے کے بعد وہ چوہدری ضیا کے معاملے میں بھڑوا گیری پر نہ اُترتا۔ تمام تر نفرت کے باوجود جب حیدر گوٹھ سے رات گئے آتے ہی اُس نے تھپڑوں سے اُس کا منہ توڑ کے رکھ دیا تھا تو شہزادی کو اچھا لگا تھا کہ کوئی تو ہے جو اُس پر اپنا بلا شرکتِ غیر حق جماتا ہے۔ وگرنہ یہ کام تو اُس کا باپ بھی اُس کی ماں کے ساتھ نہیں کر سکا تھا کہ جو اُس کی اِسی کمزوری کے سبب عوامی جلسہ گاہ بن کر رہ گئی تھی۔

شہزادی کو پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ عورت اپنی تولیدی جبلت کے لحاظ سے مردِ واحد کی دسترس میں رہنا چاہتی ہے مگر جب وہی مردِ واحد اُس کی جسمانی جبلت کے تقاضوں سے روگردانی کرے تو وہ اپنے بدن کی رسد گاہوں پر لگے ہوئے قفل اُتار کر کہیں دور کسی اندھے کنوئیں میں پھینک کر تبدیلی کے ایسے چسکے اور ایسی لت میں مبتلا ہوتی ہے کہ جس کے بعد مردوں کی تعداد اور شکل وصورت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جو لطف وقرار عورت کو زندگی کے اولین دور میں مردِ واحد سے نصیب ہوتا ہے بعد ازاں وہ دسیوں بیسیوں سے بھی نہیں مل پاتا اور یوں اُس کی زندگی اپنے آخری مرد میں بھی اُسی پہلے مرد کو ڈھونڈتے ہوئے صرف ہو جاتی ہے۔

سوچوں میں گھری شہزادی نے ایک لمبا سانس لیا اور اپنے چہرے پر گڑی، حاجی بخشن کی لجاجت بھری نگاہوں کی پروا کیے بغیر ہاتھ میں موجود موبائل فون پر چوہدری ضیا کا نمبر ملایا اور اُس کا لاؤڈر کھول کر فون اٹینڈ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ حاجی بخشن کی باچھیں اُفقی سمت میں پھیلتی چلی

گئیں اور آنکھوں میں عیاری آمیز طمانیت اُتر آئی۔ اُس نے اپنا چہرہ فون کے قریب کرلیا۔ کافی دیر تک رِنگ ہونے کے بعد کہیں جا کر اُس نے فون اٹینڈ کیا۔

''بول میری شہزادی! اب کیسے اجازت دے دی مجھ سے بات کرنے کی اُس حرامی نے۔''

تمام تر التفات کے ہوتے ہوئے بھی چوہدری ضیا کا لہجہ اُکھڑا اُکھڑا تھا۔

''کہیں مصروف ہو گیا؟'' شہزادی کے بولنے میں مٹھاس کی فراوانی دیکھ کر بخشن بھی حیران ہو رہا تھا لیکن ظاہر نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ اُسے بے اختیار شہزادی کی ماں یاد آ گئی کہ جو شروع شروع میں اُس کے ساتھ ایسے ہی کلام کیا کرتی تھی۔

''تو میری بات چھوڑ! اپنی سنا، کیوں فون کیا اب، جب میں کرتا ہوں تو اُٹھاتی نہیں ہو۔''

''لگتا ہے بہت مصروف ہو، میں پھر کرلوں گی۔'' شہزادی کے اِس جملے نے حاجی بخشن کو بھڑکا دیا۔ وہ اُسے ابھی اِسی وقت بات کرنے کے اشارے کرنے لگا۔

''نہیں بول لو تم، کیا پھر اوپر نیچے مستی چڑھی ہوئی ہے؟'' اب کے چوہدری کا لہجہ کچھ نرم تھا۔

حاجی بخشن نے اُسے جلدی جلدی بولنے کا اشارہ کیا۔ شہزادی نے بخشن کو عجیب سی نگاہوں سے دیکھا، ایک لمبی سانس لی اور جو کچھ اُسے حاجی بخشن نے بولنے کو کہا تھا وہی کچھ اُس نے چوہدری ضیا کو کہہ دیا۔ دوسری جانب مکمل خاموشی چھا گئی۔ شہزادی نے متحیر نگاہوں سے بخشن کی طرف دیکھا۔ بخشن کے چہرے پر پہلے ہی پریشانی ہویدا تھی۔ یہ سکوت محض چند ساعتوں کا تھا کہ جس کے بعد چوہدری ضیا نے باری سنبھال لی۔

''تم بکواس مت کرو اور اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے بھڑوے کو فون دو کہ جو ہمیشہ اپنے مفاد کے لیے عورت کو استعمال کرتا چلا آیا ہے۔''

شہزادی کے ساتھ ساتھ بخشن کی آنکھیں بھی پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ''میں تو اکیلی ہوں۔'' اُس کی آواز کا گلے سے باہر نکلنا مشکل ہو کر رہ گیا تھا۔

''تم پھر جھوٹ بول رہی ہو گشتی! اُس حرامی کی بدبو یہاں میرے ناک تک آ رہی ہے، اُس

کو بتادو کہ چوہدری ضیا کو حیدر گوٹھ کا ایس ایچ اُو یونہی نہیں لگا دیا گیا، اوپر والوں کی مرضی اور منشا سے لگا ہے اور یہ بھڑوا اگر کل صبح تک میرے پاس شامل تفتیش نہیں ہوتا تو پھر جہاں ہوگا وہیں سے گرفتار کر کے لاؤں گا، بس ذرا چوتڑوں کو تیل لگا کر رکھے۔''

اب کے فون اُدھر سے بند ہوا تو شہزادی نے بخشن کی طرف دیکھے بغیر موبائل کو بستر پر پھینکا اور نمناک آنکھوں سے اُٹھ کر تقریباً بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ بخشن کا چہرہ پہلے ہی اُتر چکا تھا۔

۳۵

صاحبزادہ سلطان احمد تونگر پر آج اپنی قدر و منزلت کا سربستہ راز کھل چکا تھا۔ اللہ ڈنو عبید نے محض ایک لڑکی کی تصویر اُس کے ہاتھ میں تھما کر اُس کی اوقات طے کر دی کہ اُسے کس کام کے واسطے اتنی بڑی بزنس ایمپائر کا حصہ بنایا گیا تھا۔ اِس سے پہلے تو وہ صرف سوچتا تھا کہ آخر ایک ریٹائرڈ بیوروکریٹ پر اِس قدر نوازشات کیوں مگر آج کے تفویض شدہ کام کے بعد کچھ اچنبھا نہ رہا کہ اللہ ڈنو کو اُس سے کس نوعیت کی خدمات چاہیے تھیں۔ وہ ایک بار پھر دل شکستگی کے عالم میں انیکسی میں داخل ہوا اور بیڈروم میں جانے کی بجائے سِٹنگ روم میں پڑے ہوئے صوفے پر اِس طرح دراز ہوا کہ بند آنکھوں پر دھرا ہوا دایاں بازو دکھائی نہ دینے والے منظر کو اور بھی تاریک کر رہا تھا۔

گُل رُخ آج اُس کی منتظر نہیں تھی اور نہ ہی اُس کے استقبال کو آئی لیکن جونہی وہ صوفے پر دراز ہوا وہ کچن سے نکل کر نپے تلے قدم اُٹھاتی اُس کے قریب آ کر رک گئی۔ تونگر کو یوں کسی کا قریب آ کر رُک جانا محسوس ہوا تو اُس نے بازو ہٹایا اور آنکھیں کھول دیں۔ گُل رخ آج گُل رخ ہوتے ہوئے بھی گُل رُخ نہیں لگ رہی تھی۔ کنوار گندل (ایلوویرا) کا پھول تھا کوئی بے رنگ، بے بو اور بے تاثر۔ اُس نے قالین پر اکڑوں بیٹھ کر تونگر کے جوتے اور جرابیں اتارنا چاہیں مگر اُس نے اپنے پاؤں سمیٹ لیے۔

''کیا کر رہی ہو تم! میں اُتار لوں گا ناں۔'' تونگر نے بے نام سی مسکراہٹ کے ساتھ اُسے دیکھا لیکن گل رُخ نے اُس کے چہرے پر نگاہ ڈالے بغیر اِک خاص انداز میں گھومتے ہوئے کاغذ کی ایک چھوٹی سی چٹ قالین پر اِس طرح تونگر کے پاؤں کے قریب گرا دی کہ اُسے صرف وہی دیکھ سکے۔ تونگر نے چونک کر اُسے دیکھا لیکن وہ واپس کچن کی جانب جا چکی تھی۔ تونگر کو جانان کا اِسی طریقے سے چٹ دینا یاد آ گیا جسے شاید اللہ ڈنو عبید نے اپنے خفیہ کیمروں کے ذریعے مانیٹر پر دیکھ لیا تھا تبھی تو جانان کے گھر تک پہنچ گیا وگرنہ اُسے کیا خبر کہ کیا ہونے جا رہا تھا۔ تونگر کو آج ہی اللہ ڈنو عبید کی کہی ہوئی وہ بات بھی یاد آ گئی کہ اِس انیکسی میں لگے ہوئے کیمروں کا مانیٹر بھی اُس کے کنٹرول میں ہے اور یہ کیمرے آج اُتار لیے جائیں گے۔

تونگر نے کچھ دیر تک گل رخ کی گرائی ہوئی چٹ کو یونہی پڑا رہنے دیا پھر اپنے مکیشن اُتارنے کے بہانے اِس طرح صوفے سے نیچے جھکا کہ چٹ پر لکھی ہوئی تحریر کو پڑھ سکے۔ چٹ پر لکھا تھا کہ یہاں کے کیمرے تو بظاہر اتار لیے گئے ہیں لیکن اب بھی بھروسہ نہیں کہ پوری انیکسی بگڈ ہے۔ تونگر چکرا کر رہ گیا۔ اُسے یوں لگا کہ وہ بیچ چوراہے کے ننگا کھڑا ہے اور ہر طرف، ہر زاویے اور ہر سمت سے اُسے اللہ ڈنو عبید کی آنکھیں گھورے جا رہی ہیں۔ اُسے اپنے گھر سے نکالے جانے کے بعد عبید کی جس کرم گستری کے لیے وہ رطب اللسان ہو رہا تھا اُس کی آڑ میں اُسے گوانتاناموبے جیسی جیل میں ڈال دیا گیا تھا کہ جہاں اُس کا سونا جاگنا، کھانا پینا، ہگنا موتنا سبھی کچھ دیکھا اور ریکارڈ کیا جا رہا تھا۔

تونگر کو احساس ہوا کہ اُس کا وجود کسی پوائنٹر کتے جیسا ہے کہ جس کے ہاتھ میں کسی لڑکی کی تصویر تھما کر اُسے ہر قیمت پر ڈھونڈ نکالنے کا ٹارگٹ دے دیا گیا ہے۔ لیکن اِس کے ساتھ ساتھ ایسا کیا ہے کہ اللہ ڈنو عبید کی بظاہر وفادار ترین ملازمائیں اُس سے ہمدردی کا اظہار کیوں کیے جا رہی ہیں۔ جانان کے بعد گل رخ اب اُسی راستے پر چل نکلی تھی اِس بات کی پروا کیے بغیر کہ اللہ ڈنو عبید کو خبر ہونے کی صورت میں اُس کا انجام کیا ہوگا۔ سرِدست کسی نتیجے تک پہنچنے میں تونگر کو دقت کا سامنا تھا کہ یہ دونوں لڑکیاں واقعی اُس سے اپنائیت رکھتے ہوئے اُسے کچھ بتانا چاہتی ہیں یا یہ بھی

اللہ ڈنو ہی کی کوئی متبادل چال ہے کہ نہ صرف وہ جسمانی طور پر قابو میں رہے بلکہ اُس کی سوچ اور اُس کے ارادوں تک بھی اُس کی رسائی ہو۔ بالفرض محال جانان اور گل رخ کسی سبب اُس سے خیرخواہی کرنا چاہ بھی رہی ہیں تو وہ کون سا راز یا کون سی خبر ہے کہ جسے اُس تک پہنچایا جانا اتنا ضروری ہے جس کے لیے ہر قسم کا خطرہ مول لے لیا جائے۔

سلطان تونگر کے لیے اِس ذہنی کیفیت سے نکل آنا اگرچہ محال تھا مگر پھر بھی اپنے آپ کو کنفیوژن کے عذاب سے بچا رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ بھی کوئی متوازی حکمت عملی ترتیب دے۔ لیکن ایک خاص زاویے اور ایک خاص حد تک جانے کے بعد اُسے اپنی سوچ جامد ہوتی محسوس ہونے لگتی۔ وہ خود بھی حیران تھا کہ انتظامی امور اور کڑے سے کڑے بحرانوں سے نکلنے کی تربیت اور تجربہ رکھتے ہوئے بھی اُس کی صلاحیتوں کو کس فسوں کار نے چاٹ لیا تھا۔ اُس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے بار بار پچیس برس پہلے اپنے آپ کو تلاشنا شروع کیا کہ جب بطور اسسٹنٹ کمشنر اُس کی دوسری تقرری حیدر گوٹھ میں ہوئی تھی۔ اِس سے پہلے وہ اے سی ہیڈ کوارٹرز جلال گنج تعینات تھا۔ یوں خود مختار حیثیت میں وہ پہلی بار کسی تحصیل کا انتظامی سربراہ مقرر ہوا تو ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ کے سی ایس پی افسروں کی روایات کے مطابق کچھ ایسا کرنا چاہا کہ جو صوبائی سطح تک نہیں تو کم از کم ڈویژنل سطح تک اُس کی شناخت کا باعث ہو۔

حیدر گوٹھ رقبے اور زرعی پیداوار کے لحاظ سے ایک بڑی مگر صوبائی دارالحکومت سے فاصلے کے سبب ایک ایسی دور اُفتادہ تحصیل تھی کہ جہاں صاحبزادہ سلطان احمد تونگر جیسے مہم جو انتظامی افسر کے لیے کام کرنے اور اپنی پہچان بنانے کے خاصے مواقع تھے۔ یہاں کے عوام میں وسائل کے باوجود تعلیم کا تناسب کم اور بے کاری کے مشاغل زیادہ تھے۔ نسل در نسل چلی آنے والی سیاسی قیادت ہر حکومت سے اپنا حصہ بٹورنے کے باوجود کوئی ایسا ترقیاتی منصوبہ نہیں لانا چاہتی تھی جو آگے چل کر اُن کی حاکمیت کی جڑیں کھودنے کا باعث بنے۔ کورٹ کچہری، تھانے اور زرعی پس منظر کے حامل سیاست دانوں کے گٹھ جوڑ نے ساٹھ فیصد شہری اور تقریباً سو فیصد دیہاتی علاقوں کے عوام کو اپنی مٹھی میں اِس طرح جکڑ رکھا تھا کہ اُن کی شعوری سطح کی بڑھوتری ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔

آنکھیں بند کیے اپنے ماضی میں قدم قدم اترتے تونگر کو محسوس ہوا کہ کوئی نسائی خوشبو اُس کی حسیات کا احاطہ کیے جا رہی ہے۔ اُس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ گُل رخ اُس کے سامنے کی تپائی پر شراب کے لوازمات چننے کے بعد آج بھی اُس کی پسندیدہ وِسکی ڈبل بلیک کا پیگ بنانے لگی تھی۔ وہ کچھ بھی کہے بغیر گُل رخ کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا جہاں کل کے واقعہ کے بعد کی خفیف خفگی اور خفیف لاتعلقی چھائی ہوئی تھی۔ لیکن اِس کے قطعی برعکس آنکھوں میں اُداسی اور التفات باہم گڈمڈ ہوئے کچھ اور سندیسہ دے رہے تھے مگر وہ تونگر کی جانب دیکھنے سے احتراز کر رہی تھی۔ گُل رخ نے پیگ بنانے کے بعد تونگر کے سامنے کر دیا۔

''تمھارا گلاس کدھر؟'' تونگر اپنا پیگ ہاتھ میں لیتے ہوئے ہولے سے مخاطب ہوا۔

''میں کل کی بات ابھی تک نہیں بھلا سکی۔'' وہ بدستور قالین پر ایک گھٹنا نیچے ٹکائے اور ایک کھڑا کیے بیٹھی تھی۔

''ٹھیک ہے! مجھے بھی طلب نہیں۔'' تونگر نے گلاس تپائی پر رکھ دیا۔

''آپ لیجیے، آپ کو ضرورت ہے، میں جانتی ہوں آپ کس الجھن میں ہیں۔'' گُل رخ اُٹھی اور کچن کی طرف چل دی۔ تونگر سمجھا کہ وہ اپنے لیے گلاس لینے گئی ہے لیکن کافی دیر گزرنے کے بعد بھی وہ نہیں آئی۔ تونگر نے بھی اپنا پیگ ویسے ہی پڑا رہنے دیا۔ پیگ کو دیکھ کر طبیعت میں جاگنے والی شراب کی طلب ایک دم ماند پڑ چکی تھی۔ لیکن گُل رخ جاتے جاتے اُلجھاؤ کا ایک نیا روزن اُس کے لیے وا کرتی چلی گئی تھی۔ تونگر اب اِس بارے میں سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہا تھا کہ اُسے کیا پتا ہے، کتنا پتا ہے اور کس بارے میں پتا ہے؟ کیا وہ رُباب کو جانتی ہے اور یہ بھی جانتی ہے کہ اُسے ڈھونڈنے کی ذمہ داری اُسے آج ہی سونپی گئی ہے۔ تونگر نے چاہا کہ آواز دے کر اُسے بلا لے یا خود اُس کے پاس چلا جائے مگر بلنگ کے خدشات کے پیشِ نظر جھجک ہو رہی تھی۔ بس ایک ساعت کے لیے یہ خیال بھی آیا کہ بلنگ اُس کا کیا بگاڑ لے گی۔ گُل رخ سمیت جو کچھ بھی اللہ ڈنو عبید نے اُسے یہاں مہیا کیا ہے وہ بخوبی جانتا ہے کہ اُس کا مصرف کیا ہوگا۔ غالباً وہ صرف اِس حد تک آنکھ رکھنا چاہتا ہے کہ میرے ارادے کیا ہیں، میں کہیں بھاگ تو نہیں رہا، کہیں اُس کے خلاف

کوئی سازش تو نہیں کر رہا۔ لیکن اس قدر ذہنی تشفی ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے آپ کو مائل نہ کر سکا کہ گل رخ کو بیل دے کر بلائے یا خود اُسے بلا کر لائے۔ ایسے میں وہ اُٹھ کر پیگ وہیں چھوڑتے ہوئے اپنے بیڈ روم میں چلا آیا تا کہ شراب کی بجائے گرم شاور لے کر اپنے آپ کو تر و تازہ کر سکے۔

اُس کے پسندیدہ ایئر فریشنر کی ہلکی ہلکی خوشبو سے مہکے ہوئے بیڈ روم میں آج بھی اُس کا شام کا لباس الماری سے نکال کر تیار حالت میں کونے میں رکھے چوبی اسٹینڈ پر لٹکا ہوا تھا۔ تونگر نے اپنے آپ کو دن بھر کے کپڑوں سے آزاد کیا اور واش روم میں گھس گیا۔ مناسب درجہ حرارت پر گرم پانی کی پھوار نے پھر سے جادو کا کام کیا اور تمام تر کسل مندی جاتی رہی۔ لیکن شاور چھوڑنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا سو سلطان احمد تونگر آنکھیں بند کیے کافی دیر تک کھڑا رہا۔ سکون اور خالی ذہنی کے ان لحات میں اُس کا ذہن پھر سے کہیں حیدر گوٹھ جا پہنچا۔ وہ وہاں صرف ایک برس تعینات رہا لیکن اس عرصہ تعیناتی میں وہی ایک شخص اُس کے لیے عذاب بنا رہا کہ جس کا نام اللہ ڈنو نے لیا تھا۔ اللہ بخش عرف بخشن۔ اور پھر اُسی کے سبب اُس کا حیدر گوٹھ سے تبادلہ بھی ہوا لیکن کسی نئی تعیناتی کے بغیر محض آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی کے طور پر۔ اُس وقت بھی وہ شخص ٹرک ہوٹل کی آڑ میں قحبہ گری اور منشیات کا دھندہ کرتا تھا۔ پورے ایک برس کے دوران وہ کوشش کے باوجود اُس پر ہاتھ نہ ڈال سکا کہ ضلع شمس پور تو کیا پورے ڈویژن بلال گنج کی پولیس اور سیاسی قیادت اُس کی سرپرست ہی نہیں بلکہ سہولت کار بنی ہوئی تھی۔ اور جب ہاتھ ڈالا تو اُسی بخشن نے راتوں رات اُس کے تبادلے کے ساتھ ساتھ اُسے اُو ایس ڈی بھی بنوا دیا۔ تبادلہ ہو جانے کے بعد بھی وہ تونگر سے ملا اور اچھا تعلق بنانے کی کوشش کی تھی لیکن تونگر نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اُس کی پہنچ اُس وقت کے چیف سیکریٹری تک تھی، اُسے کچھ زیادہ بھاؤ نہ دیا۔

واش روم سے باہر آ جانے کے بعد بھی بخشن اُس کے ذہن سے نہ نکل سکا اور وہ اُسی طرح تولیہ لپیٹے بیڈ پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ ایسا کچھ کیونکر ہو کہ اُسی بخشن سے رابطہ ہو جائے تو اس لڑکی کو تلاش کرنا مشکل نہیں ہو گا۔

''لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ بخشن جیسا تجربہ کار اللہ ڈنو عبید کی جان پہچان یا رسائی میں نہ ہو۔''
تونگر کی سوچ کا دھارا اَب ایک اور سمت میں بہہ نکلا۔
''تو کیا مجھے محض آزمانا مطلوب ہے یا وہ لڑکی واقعی لاپتا ہے؟''
تونگر کے لیے سب سے بڑی مشکل اللہ ڈنو کی نیت کو جاننا تھا لیکن اِس بارے میں وہ کسی کی مدد بھی نہیں لے سکتا تھا خاص طور پر اِن حالات میں کہ جب حرکات وسکنات سمیت اُس کا سبھی کچھ اُسی کی تحویل میں تھا۔

تونگر بے دلی اور مایوسی کے بھاری بوجھ تلے دبا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحے پہلے کی تازگی پژمردگی میں بدل چکی تھی۔ اُس نے بہ ہزار دقت چوبی اسٹینڈ پر لٹکا ہوا کرتا پہنا، شلوار چڑھائی اور بالوں میں برش کی بجائے بس انگلیاں پھیر کر واپس بیڈ پر بیٹھ گیا۔ سینے میں پلنے والی عجیب سی بے چینی نے شراب کی طلب جگادی۔ تونگر کمرے سے نکل کر سِٹنگ روم میں آ گیا کہ جہاں گُل رخ اُس کے لیے ڈبل بلیک اسکاچ کا پیگ بنا کر چھوڑ گئی تھی۔ لیکن سٹنگ روم کا منظر اُس کے لیے جہاں تحیر کا باعث تھا وہیں خوش کن بھی تھا کہ گُل رُخ اپنے لیے پیگ بنانے کے بعد وہیں نیچے قالین پر آلتی پالتی مارے تپائی پہ کہنی ٹکائے اُس کے انتظار میں اونگھ رہی تھی۔ تونگر کی آہٹ محسوس کرتے ہی چونک کر اُسے دیکھا اور کھڑی ہوگئی۔ تونگر ہولے سے مسکرا دیا۔ نجانے کیوں اُسے آج گُل رُخ کا یوں پیگ بنا کر اُس کا انتظار کرنا اچھا لگا تھا۔ تونگر صوفہ کرسی پر بیٹھنے لگا تو گُل رُخ پھر سے قالین پر بیٹھنے لگی۔ تونگر نے اُسے اپنے بائیں ہاتھ پر رکھی دوسری کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن وہ قالین پر ہی اُسی پہلے والے انداز میں بیٹھ گئی۔ تونگر اب کے اُسے منع کرنے کی بجائے خود بھی صوفہ چیئر سے اُٹھا اور قالین پر اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔ گُل رخ نے بھی اُسے منع نہیں کیا بس آنکھوں میں ایک چمک سی اُتری اور فوراً ہی اِدھر اُدھر ہوگئی۔

تونگر نے تپائی پر رکھے دو گلاسوں میں سے ایک گلاس اُٹھا کر گُل رخ کو دیا اور دوسرا اپنے قریب کر لیا۔ زندگی میں پہلی بار شاید وہ کسی لڑکی کے ساتھ یوں تکلف اور افسر شاہی میں مستعمل شراب نوشی کی اخلاقیات کی پروا کیے بغیر پینے کے لیے بیٹھا تھا۔ دو تین گھونٹ دونوں کے حلق سے

اترے تو کافی دیر سے تنی ہوئی خاموشی کی چادر کو گل رخ نے ہی عین درمیان میں سے چاک کر ڈالا۔

''کم از کم کل صبح تک یہ ایکسی بگنگ فری ہے۔''

''کیا مطلب؟'' تونگر نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے حیرت سے گل رخ کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں بچوں جیسی شرارت کے سبھی رنگ دمک رہے تھے۔

''یہاں سے جانے کے بعد مجھے ایک باریک سی کیبل مشکوک دکھائی دی، بس اُسے کاٹ ڈالا۔''

''تو کیا معلوم وہی بگنگ کیبل تھی؟'' تونگر شراب کا گھونٹ لینا بھول کر پھر سے تشکیک کا شکار ہو رہا تھا۔

''میں نے بچپن سے جوانی تک کا عرصہ صرف زندہ رہنے کی جستجو میں گزارا ہے، مجھ سے زیادہ کون جانتا ہوگا کہ دشمن سے کیسے بچ کر جیا جاتا ہے۔'' گل رخ نے چہرے پر آئی سفاک کڑواہٹ کو ڈبل بلیک کے ایک لمبے گھونٹ کے ذریعے تحلیل کرنے کی کوشش کی۔ اِس عمل میں تونگر کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔ اُس نے بھی نادیدہ نگرانی سے اِس وقتی نجات کو پورا پیگ گلے میں اُنڈیل کر منایا اور ایک عرصے کے بعد وجود میں رقص کرتی ہوئی گرم جوش مستی کے زیر اثر خود ہی بوتل اُٹھا کر ایک ڈبل پیگ اپنے لیے بنایا اور شراب کی اتنی ہی مقدار گل رخ کے آدھے سے زیادہ خالی ہو چکے گلاس میں ڈال دی۔ گل رخ اب بھی کچھ نہ بولی بس تونگر کا اندرونی انبساط سے بھبھوکا ہوا چہرہ دیکھ کر مسکراتی رہی۔ وہ ایسے میں اُسے منع کر کے اُس لطف سے محروم نہیں کرنا چاہتی تھی کہ جو آج اُس کا مقدر ہو رہا تھا۔ خود تونگر بھی اپنی اِس کیفیت کی روح جاننے سے قاصر تھا۔ ایک لڑکی نے جس طرح اپنے آجر کے حصار غلامی کو اُس کے لیے توڑا تھا اُسے اِس طرح توڑنے پر تو وہ خود کو بھی قادر نہیں جان پایا تھا۔ ''آخر کیا ہے مجھ میں ایسا کہ جو اِس جوان لڑکی کو دکھائی دیا ہے مگر ناہید کو دکھائی نہیں دیا تھا۔'' تونگر نے بہتیرا سوچا مگر جان نہ پایا۔ شاید عورت اور مرد کے درمیان جنس کی جمالیات معاشرتی اخلاقیات کے تابع نہیں ہوتی۔

دوسرے کے بعد تیسرا اور تیسرے کے بعد چوتھا جام اُن دونوں کو صنفی تعامل کے ایک ایسے مرحلہ میں لے آیا کہ جہاں وہ عمروں کے تفاوت کے باوجود اور قدرے فاصلے پر رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو ایک دوسرے میں اُترا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ دو گھنٹے سے زیادہ کے اس دورانیے میں وہ شاید چند لفظوں سے زیادہ کلام نہیں کر پائے تھے۔ بڑھتے ہوئے نشے کے سرور کے ساتھ ہی اُن کے زبانیں خاموش اور جسم کا چڑھتا ہوا درجہ حرارت بولنے لگا تھا۔ تونگر کو پہلی بار کسی ایسی نوجوان عورت کی صحبت میسر تھی جو اُسے کسی پارٹی میں پیش کی گئی، کسی دعوت کے دوران طشتری میں دھری ہوئی یا کوئی سرکاری کام نکلوانے کے لیے اُجرت پر آئی ہوئی عورتوں سے قطعی مختلف تھی۔ وہ اُس کے منصب یا اختیارات سے تجاوز کا حاصل نہیں بلکہ اپنی روح سے کشید ہوئے التفات کا ثمر تھی۔ تونگر کو وہ زندگی کہ جس کے خواب دیکھے جاتے ہیں سراب کی مانند بے وقعت لگی۔ کرسی پر ہوتے ہوئے کال پر بلوائی گئی بیسیوں عورتوں کے جسمانی حظ اور قالین پر چوکڑی مار کر اُس کے ساتھ بیٹھی ہوئی کسی ایک عورت کے فاصلاتی قرب میں وہی تعلق تھا جو جھوٹ اور سچ یا منافقت اور خلوص میں ہو سکتا ہے۔

''ایک بات پوچھوں؟'' تونگر سے تو رہا نہ گیا لیکن بولتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ گُل رُخ اب بھی خاموش تھی۔

''تم میرے لیے کیوں اپنے باس کو دھوکہ دے رہی ہو، کیا ہے مجھ میں ایسا؟ کیوں جوکھم میں ڈال رہی ہو اپنے آپ کو جب پوری طرح مجھے جانتی بھی نہیں۔'' تونگر ایک ہی سانس میں اپنے تجسس کا گریبان چاک کرتا چلا گیا۔ گُل رُخ نے اپنے گلابی چہرے پر آئے ہوئے بالوں کو ایک ہاتھ سے ہٹایا اور تونگر کی نمناک ہوتی ہوئی آنکھوں کی گہرائی میں اُتر گئی۔

''میں سب جانتی ہوں، دوست ہوں جانان کی۔'' تونگر کے چہرے کا رنگ اُڑا اور اُس کے ساتھ ہی شراب کا سرور بھی جاتا رہا۔ لیکن اس کی پروا کیے بغیر گُل رُخ نے کچھ آگے سرک کر اپنا سر اُس کے کندھے سے لگا لیا۔

''آپ کو کون کون، کس طرح اور کس لیے برباد کرنا چاہتا ہے، ہم دونوں جانتی ہیں۔''

تونگر نے جلدی سے گل رُخ کا چہرہ اپنی جانب کرلیا۔اُس کے رس بھرے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔

''کون کون مجھے کس طرح اور کیوں برباد کرنا چاہتا ہے!کیا یہی بتانے کے لیے مجھے جانان نے اپنے پاس بُلایا تھا؟''

''کچھ ایسا ہی تھا لیکن اُس سے غلطی ہوئی، جلدی کی اُس نے ،شاید وہ وقت ابھی نہیں آیا تھا،اَب بھی نہیں آیا۔''

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ مجھے پھر کبھی جانے کا موقع ہی نہ ملے۔'' تونگر نے اضطراری حالت میں اپنے ہونٹ گل رُخ کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔وہ تڑپ کر ایک طرف ہوئی اور تونگر کے گلے میں بانہیں ڈال کر اپنے چہرے کو اُس کی گردن کے نیچے چھپالیا۔

''بہت جلد جان جاؤ گے آپ،لیکن کیا کریں ابھی تو آپ نے رُباب کو تلاش کرنا ہے۔''

یہ سنتے ہی اب کے تونگر نے اُچھل کر پھر سے گل رُخ کا چہرہ اپنے سامنے کرلیا۔اُس کی بن کاجل کی گلابی دھاریوں والی آنکھیں نسائی مستی کے عروج پر تھیں۔

''تم رُباب کو بھی جانتی ہو! یہ کیا ہے سب،آخر ہو کیا رہا ہے میرے ساتھ؟'' تونگر پھر سے بھونچکا سا ہو رہا تھا۔گل رُخ نے آنکھیں موند کر اپنا چہرہ اُس کے سینے میں چھپالیا۔

''جانتی ہوں رُباب کو۔'' وہ اُس کے سینے کے بالوں سے اپنے گال مسل رہی تھی۔

''کون ہے وہ اور ہے کہاں؟'' تونگر نے اُس کے چہرے کو پڑھنے کی غرض سے اپنے سینے سے الگ کرنا چاہا مگر وہ اُس کے زانو میں کھسک کر سینے میں دبکی رہی۔

''صرف دیکھا ہوا ہے، اِس سے زیادہ نہیں جانتی کہ وہ کون ہے اور اِس وقت کہاں ہے۔''

۳۶

عتیقہ کا یوں اُس کے حصار سے نکل بھاگنا رضوان ہاشمی کی روح تک میں دراڑ ڈال گیا۔ اُسے یاد نہیں تھا کہ وہ گھر کیسے پہنچا مگر گھر پہنچنے کے بعد بھی رات بھر نہ سو سکا۔پہلے تو اپنے سامنے

آنے والے گھر کے ہر فرد سے بلاوجہ اُلجھتا رہا مگر جب سب اِدھر اُدھر چھپتے پھرے تو اُس کی زبان کو تالا سا لگ کے رہ گیا۔ اِس سے پہلے بھی جب کبھی وہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں غیر معمولی تناؤ کا شکار ہوتا تو اُس کے گھر والوں کو اپنے گھر کے سربراہ کی اِس قسم کی مزاجی ناہمواری کا سامنا کرنا پڑتا مگر عتیقہ کے اُس کی زندگی میں آنے کے بعد اِس نوعیت کا ذاتی یا پیشہ ورانہ تناؤ خود بخود اچھا خاصا کم ہو گیا تھا۔ لیکن آج کے اِس صدمے اور اُس سے پیدا شدہ روگ کا علاج کہاں سے ہوتا کہ اِس کا سبب وہی ''عطار کا لونڈا'' ہی تھا کہ جو اِس سے پہلے درد نہیں بلکہ دارو ہوا کرتا تھا۔

گزری حیات کی کامیابیوں اور ناکامیوں کے برعکس عجیب سا معاملہ اِن دنوں اُس کی زندگی کو درپیش تھا۔ ایک طرف روزانہ کی بنیاد پر نئے مواقع اور کامرانیاں اور دوسری جانب روزانہ ہی کی بنیاد پر ناکامیوں اور پریشانیوں کی بھرمار اور اِن دونوں انتہاؤں کے بیچ رضوان ہاشمی سانپ سیڑھی کے کھیل کا کھلاڑی بن کر رہ گیا تھا کہ جسے روزانہ کوئی نہ کوئی موقع کی سیڑھی جونہی صفر سے نناوے کے خانے تک پہنچاتی اُسے وہاں بیٹھا ہوا کوئی نہ کوئی سانپ ڈسنے کے بعد واپس صفر کے خانے میں پہنچا دیتا۔ چند دنوں کے دورانیے میں پہنچنے والے دو جھٹکوں نے اُسے دہلا کے رکھ دیا تھا۔ جبار کے معاملے کو شاید وہ کئی دن مزید سنجیدگی سے نہ لیتا اگر ریجنل پولیس آفیسر اُسے بلا کر رباب کو پیش کرنے کا حکم نہ دیتا۔ جبار سے اُسے اِس قسم کی توقع ہی نہیں تھی کہ وہ ایک چٹی چمڑی کے لیے عمر بھر کے اعتبار اور وفاداری کو یوں پل بھر میں ملیامیٹ کر کے رکھ دے گا۔ مقدمات میں پھنسی ہوئی ایسی کئی لڑکیاں تو اُسے وہ ویسے ہی دان کرتا چلا آ رہا تھا تو پھر اُسے یہ چوَل مارنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر اِس سیر سپاٹے میں اُس کا دل رُباب پر آ گیا تھا تو چاہے جتنی بار جی چاہتا، منہ کالا کر لیتا لیکن یوں نکل بھاگنے اور غائب ہونے کی کیا ضرورت تھی۔

لیکن جیسے ہی جبار کی اب تک کی وفاداریوں کا خیال آتا تو رضوان ہاشمی کے لیے اِس قیاس پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا کہ وہ ایک لڑکی کے لیے زندگی بھر کے کیے کرائے پر پانی پھیر سکتا ہے۔ ایسے میں ایک اور شبہ اُس کے ذہن میں جگہ بنانے لگتا کہ کہیں وہ دونوں یا پھر صرف جبار کسی دشمن کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہو۔ امکان یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کہیں رُباب کے کسی کھیل یا چلتر کے سبب وہ اپنی

جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھا ہو۔ لیکن عتیقہ کے ساتھ تو یہ معاملہ بھی نہیں تھا۔ وہ تو اپنے گھر میں محفوظ و مامون تھی۔ اُسے کیا ہو گیا کہ یوں چلتی بنی اور جان تک کی پروا بھی نہیں کی۔ عتیقہ کے معاملے میں بھی وہ کچھ مخمصوں کا شکار تھا اور جتنا سوچتا اِن شبہات میں دھنستا ہی چلا جا رہا تھا۔ اُس کے تئیں عتیقہ جیسی نرم و نازک لڑکی فارم ہاؤس کے رہائشی حصے کا حفاظتی حصار توڑ کر باہر جا ہی نہیں سکتی تھی کہ جب تک اُسے باہر سے کسی سہولت یا زبردستی کا سامنا نہ ہوا اور اگر وہ مین گیٹ سے باہر نکلی ہے تو سیکورٹی گارڈز کی اعانت کے بنا ایسا ہونا ممکنات میں سے نہیں تھا۔ لیکن کیا اُس کی دہشت، دبدبہ اور کروفر ایک دم اِس قدر نیچے چلے گئے کہ ڈرائیور جبار اور فارم ہاؤس کے سیکورٹی گارڈز جیسے جانثار بھی خیانت پر اتر آئے اور اُسی کی ذات تک کو داؤ پر لگا دیا۔ رضوان ہاشمی کی پریشانی اور اعصابی شکستگی کی بنیادی وجہ وہ یقین تھا کہ جس کے تحت وہ اپنے آپ کو ایک ایسی دیو مالائی شخصیت سمجھ بیٹھا تھا کہ جس کا کوئی کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔

شب بھر کے جگراتے کا مارا ہوا رضوان ہاشمی صبح سویرے دو ایک گھنٹے کے لیے سو گیا لیکن بیدار ہونے کے بعد اُس کے مزاج میں جہاں ٹھہراؤ آ چکا تھا وہاں عتیقہ اور جبار کی گمشدگی کے صدمے سے بھی اِس لیے خاصی حد تک افاقہ تھا کہ اُس کی اپنی سوچ اُن دونوں کے بارے میں بدل چکی تھی۔ رضوان ہاشمی کی نئی ذہنی کیفیت کے مطابق اُن دونوں کو کسی ایک ہی دشمن نے گھات لگا کر واردات کا نشانہ بنایا ہے۔ عتیقہ کا رویہ اور اُس سے اُس کا اپنا برتاؤ اور اغماض دونوں غیر متعلقہ ہو چکے تھے۔ ویسے بھی وہ صبح سویرے خوشحال خان کی جانب سے کسی ایسے اقدام کا منتظر تھا کہ جو اُس کی ریجنل پولیس آفیسر کے الٹی میٹم سے گلو خلاصی کرا سکتا۔

سات بجے کے لگ بھگ رضوان ہاشمی کے کلرک نے اُسے بتایا کہ حیدر گوٹھ کی کچہری میں ''وکلا ایکشن فورم'' کی جانب سے ہر طرف ہڑتالی بینر لگ چکے ہیں اور خوشی خان کی جانب سے پولیس اور انتظامیہ کے رویے خلاف عدالتی بائیکاٹ، جلوس اور دھرنا دینے کی استدعا پر مبنی ریکوزیشن صدر بار کو بھجوائی جا چکی ہے لیکن صدر یا سیکریٹری بار کی جانب سے ابھی تک کوئی نوٹس جاری نہیں کیا گیا تھا۔ جب کہ خوشی خان کا مخالف صدارتی امیدوار سر توڑ کوشش کر رہا تھا کہ ایکشن

سے محض ایک ہفتہ پہلے ایسی کوئی نوبت ہی نہ آنے پائے کہ جس سے خوشی خان کو ذرہ برابر بھی برتری کا امکان ہو۔ خوشحال خان کا یہ حربہ بھی ناکام بنانے کے لیے اُس نے بساط بچھا کر مہرے ترتیب میں رکھ دیئے۔ اب یہ اُس کی خوش قسمتی کہ وکلا کے تمام مخالف دھڑے اُس کی حمایت میں اِس لیے اکٹھے ہو گئے کہ اُن کی پشت پر عبدالرب ارباب کی سیاست تھی جو ہر قیمت پر رضوان ہاشمی کو وکلا سیاست سے بے دخل کرنے کے درپے تھا۔

اِس صورتِ حال کا ادراک تو پہلے ہی خوشی خان کے ساتھ ساتھ رضوان ہاشمی کو بھی تھا۔ تبھی تو اُس نے خوشی خان کو اکیلے ہی لڑ جانے کا مشورہ دیا تھا۔ صبح آٹھ بجے کے قریب رضوان ہاشمی کو خوشی خان کا پیغام ملا کہ وہ صدر بار اور دوسرے سینئر وکلا کو ہڑتال پر آمادہ کرنے کے لیے اُن سے بات کرے۔ رضوان ہاشمی نے ظاہری طور پر تو ایسا کرنے کی حامی بھر لی مگر وہ جانتا تھا کہ اِس مرحلے پر خوشی خان کی حمایت میں سامنے آنے کا ایک ہی نتیجہ نکلنا تھا کہ اُس کی وکلا سیاست کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ اور پولیس، انتظامیہ اور عدلیہ کے جوتے الگ سے سر پر۔ لہٰذا وہ طبیعت کی خرابی کا کہہ کر اپنے بیڈروم میں ماسوائے لینڈ لائن نمبر کے تمام موبائل فون آف اور ٹی وی آن کر کے بیٹھ گیا۔

نو بجے تک جب صدر بار نے ہڑتال اور عدالتی بائیکاٹ کا نوٹس جاری نہ کیا تو وکلا کی اکثریت اپنی اپنی پیشیاں نمٹانے منشیوں اور موکلان کے ہمراہ عدالتوں کا رخ کرنے لگی لیکن اِس کی پیش بندی کے لیے خوشی خان نے ہر کمرۂ عدالت کے مین گیٹ پر اپنے دو دو تین تین ساتھی کھڑے کر دیئے جو وہاں آنے والے وکلا کو اندر جانے سے بزور روکنے لگے۔ اِس کی خبر صدر بار کے علاوہ خوشی خان کے مخالف امیدوار رانا ارشاد احمد کی ملی تو انھوں نے عبدالرب ارباب ایڈووکیٹ کے ساتھ پہلے سے طے شدہ حکمت عملی کے تحت نہ صرف اپنے ساتھی وکلا کو خوشی خان کے ساتھیوں کو عدالتوں سے ہٹانے کے لیے بھیج دیا بلکہ سینئر ایڈیشنل سیشن سے ملاقات کرتے ہوئے اُسے بتا دیا کہ وکیلوں کی اکثریت اِس ہڑتال اور خوشی خان کے رویے کے خلاف ہے لہٰذا پولیس بلوا کر احاطہ عدالت میں امن امان قائم کیا جائے تا کہ وکلا اپنے معمول کے امور انجام دے سکیں۔

اِس سے پہلے کہ پولیس وہاں پہنچ پاتی، خوشی خان کے ساتھی وکلا کا ٹکراؤ رانا ارشاد احمد کے ساتھیوں سے ہو گیا۔ دونوں طرف سے بپھرے ہوئے نوجوان وکلا نے جہاں جہاں جیسے موقع ملا ایک دوسرے کو خوب دھویا، سر پھٹول ہوئی، کپڑے پھاڑے گئے اور عدالتوں کا ماحول ایک بار پھر غیر محفوظ ہو کر رہ گیا۔ اِس تشدد کا فائدہ براہ راست خوشی خان کا ہوا کہ سینئر وکلا اور اُن کے موکلین خوف کے مارے عدالتوں کا رخ کرنے کی بجائے اپنے اپنے چیمبرز میں دبک کر بیٹھ گئے اور یوں احاطۂ عدالت میں مکمل سناٹا چھا گیا۔

اپنے نوجوان ساتھیوں کے پھٹے ہوئے سر اور خون آلود کپڑے دیکھتے ہی خوشی خان کی جان میں جان آئی کہ اب اُس کی ہڑتال کی کال اور پولیس کے خلاف جلوس اور دھرنے کو کوئی نہیں روک سکتا۔ دوسری جانب جب خوشی خان گروپ کے ہاتھوں لہولہان وکیل رانا ارشاد کے پاس بار روم میں پہنچے تو وہاں بیٹھے ہوئے وکیل الگ سے مشتعل ہو گئے۔ اِس سے پہلے کہ وہ باہر نکل کر خوشی خان گروپ سے متصادم ہوتے وہاں پہلے سے موجود صدر بار ایسوسی ایشن نے فوری طور پر بار روم کے دروازوں کو مقفل کرانے کے بعد مقامی ڈی ایس پی کو فون کر دیا کہ کسی نہ کسی طور اِس ہنگامے کو روکا جائے۔

اپنے گھر کے کمرے میں بند رضوان ہاشمی کو پل پل کی خبر مل رہی تھی۔ جس طرح سے یہ ہنگام برپا ہوا اور جیسی صورت اُس نے اختیار کر لی، ایسا تو اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اِن لمحات کی سرشاری نے جبار، رُباب اور عتیقہ سمیت سبھی معاملات اور اُن کے خدشات کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ اُسے پورا یقین تھا کہ اب ہونے والا پولیس ایکشن دونوں گروہوں کے خلاف ہو گا اور اِس ساری واردات میں پھنسے ہوئے تمام اسٹیک ہولڈرز کو نکالنے میں اُس کی حیثیت کلیدی ہو گی۔ قسمت نے ایک بار پھر اُسے ظفریاب ہونے کے لیے چن کر اُس کے دروازے پر دستک دینا شروع کر دی تھی۔

دستکوں کے اِس امکانی ماحول میں لینڈ لائن نمبر پر ہونے والی ایک بیل نے رضوان ہاشمی کو چونکا دیا۔ کچہری سے آنے والی اچھی خبروں کے تسلسل میں وہ کسی شاندار خبر کا منتظر تھا لیکن دوسری جانب سے حاجی بخشن کی آواز سُن کر اُس کے چہرے پر اچھی خبر کے انتظار میں اُترتے سبھی رنگ

ایک دم ماند پڑ گئے۔ لینڈ لائن نمبر پر بخشن کی کال اٹینڈ کر لینے کے بعد رضوان ہاشمی کے پاس کوئی موقع نہیں رہا تھا کہ وہ اپنی رہائش گاہ کے باہر گاڑی میں موجود پھنیر ناگ ایسے منتقم شخص کو ملنے سے انکار کا متحمل ہو سکتا۔ جو شخص اُس کے موبائل فون کو بند پا کر اُس کے دروازے تک آ سکتا تھا وہ رُباب کو واپس نہ کرنے کی آگ میں بھسم ہوتے ہوئے آخری وار کے طور پر کچھ بھی کر سکتا تھا۔

خلافِ توقع حاجی بخشن کے چہرے پر درشتی یا رنجش کی بجائے افسردگی طاری تھی۔ جرح کرنے سے پہلے گواہ کا چہرہ پڑھ کر اُس کے موقف کے بخیے اُدھیڑنے والے قیافہ شناس وکیل نے جانا کہ اب رُباب کی واپسی کے مطالبے میں شاید سختی نہ رہی ہو لیکن یہ تو ممکن تھا کہ حاجی بخشن اُس سے کام نہ ہونے کے سبب پہلے سے ادا شدہ ایک بڑی رقم کا کوئی جزوی حصہ واپس کرنے کا تقاضا کرے۔ اگرچہ پہلے بھی ایسی صورتِ حال بنتی رہی تھی لیکن بخشن نے ادا شدہ فیس واپس کرنے کا مطالبہ کبھی نہیں کیا تھا۔ رضوان ہاشمی اُس کے چہرے کو غور سے پڑھنے کے بعد بھی کچھ تیقن سے طے نہیں کر پا رہا تھا کہ اگر معاملہ رُباب یا فیس کی واپسی کا نہیں تو بخشن جیسا گھمنڈی اور رعونت طبع شخص زندگی میں پہلی بار اُس کے گھر تک کیوں آن پہنچا ہے۔

''کچہری میں سر پھٹول ہو رہی ہو اور حیدر گوٹھ کا مہان وکیل اپنا فون بند کر کے گھر میں چھپا بیٹھا ہو، ایسے حالات کب سے ہو گئے؟'' رات بھر کے سفر کی تکان سے بخشن کی آواز میں کڑک کی بجائے جھنجلاہٹ صاف محسوس ہو رہی تھی۔

''یہ تو میں بھی پوچھ سکتا ہوں کہ حاجی بخشن جیسی مہان ہستی آج پہلی بار میرے گھر تک کیسے چلی آئی؟ حالات کچھ اور بگڑ گئے یا مجھ سے محبت بڑھ گئی؟''

''حیدر گوٹھ کی کچہری میں اب کس کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔'' حاجی بخشن نے رضوان ہاشمی کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک اور سوال کر دیا۔

''حاجی صاحب! یہ کچہری ہے اور تم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ یہ یہاں کون کون کیا کیا کھیل کھیلتا ہے، کل تمھارا کھیل کھیلا جا رہا تھا اور آج کسی اور کا، مجھ کو اِس سے کیا؟ رضوان ہاشمی حاجی بخشن کی نیت کا اندازہ لگانے میں ناکام ہوتے ہوئے چڑچڑا ہونے لگا تھا۔

''رُباب کہاں ہے.... مجھے آج ہی واپس چاہیے۔'' حاجی بخشن کے انتہائی سرد مگر دھمکی آمیز لہجے میں کیے گئے اچانک سوال نے رضوان ہاشمی کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔ رضوان ہاشمی کچھ دیر تک تو حاجی بخشن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اُس کے سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتا رہا مگر جب محسوس کیا کہ اُس کے ارادے اچھے نہیں تو پینترا بدل کر اپنی آواز میں اُس سے بھی زیادہ سفاکیت سمو کر بولا۔ ''حاجی! تم بچے نہیں ہو اور نہ ہی میری گزر اوقات بھوسے پر ہے تو پھر تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں تمھارے ہر بے ڈھ فانہ سوال کا جواب دیتا رہوں گا.... رُباب کو ڈھونڈنا ہے تو اپنے پچھواڑے میں ڈھونڈو، اور ہاں میرے گھر میں بیٹھ کر مجھے دھمکیاں دینے کا انجام تم سمجھتے ہو.... ہم پرانے دوست ہیں، یہ دوستی یونہی رہنے دو وگرنہ میری حیثیت سے تم باخبر ہو اور تمھاری اوقات ثبوتوں سمیت میں جانتا ہوں۔''

حاجی بخشن کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا۔ درشتی کی جگہ نرمی اور مسکراہٹ نے لے لی ''اوہ بھائی میرے تم تو میری بات دل کو لگا بیٹھے میں نے تو تم سے رُباب مانگی تھی، اگر تمھارا اُس پر دل آ گیا ہے تو رکھ لو اپنے پاس، ایک رُباب کے واسطے میں اتنی پرانی دوستی تو نہیں چھوڑ سکتا، جن کی رُباب ہے وہ جانیں یا تم جانو، تم بس اتنا کرو کہ میری ضمانت قبل از گرفتاری کرا دو پرانے حساب میں اور پرانے مقدمے میں۔''

''کیا مطلب؟ کون سے پرانے مقدمے میں؟''

''وہی مقدمہ جس میں رُباب پکڑی گئی تھی، اب اگر بہت بڑے بڑے لوگ مجھ سے رُباب کا مطالبہ کریں تو میں انھیں کہاں سے دوں رُباب.... لہٰذا ایس ایچ اُو چوہدری ضیا کو میرے پیچھے لگا دیا گیا ہے جس نے آج مجھے طلب کر رکھا ہے، اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ جو لوگ رُباب کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ لتر پولے کے بغیر کیسے مجھے وہاں سے آنے دیں گے۔'' حاجی بخشن کے چہرے کی مایوس مسکراہٹ کے پیچھے بہت سے خدشات جھانک رہے تھے۔

اسی اثناء میں رضوان ہاشمی کے پاس رکھے ہوئے کارڈلیس فون پر لینڈ لائن نمبر کی گھنٹی بجی۔ دوسری جانب اُس کا منشی تھا۔ منشی کے ذریعے ملنے والی خبر نے اُس کے چہرے کو مسرت آمیز

طمانیت سے تمتما دیا۔ نہ صرف حیدر گوٹھی کچہری میں پچھلے دنوں ہونے والے پرتشدد ہنگاموں کی سربمہر ایف آئی آر کھول دی گئی تھی بلکہ آج کے سرپھٹول اور پولیس اور عدالتوں پر بلوہ کرنے کے الزام میں خوشحال خان سمیت بائیس وکلا پر انسداد دہشت گردی ایکٹ کے تحت نئی ایف آئی آر کا اندراج کرتے ہوئے خوشحال عرف خوشی خان سمیت چار وکیلوں کو گرفتار کرنے کے بعد نامعلوم مقام پر پہنچا دیا گیا تھا۔ جب کہ خوشی خان کے ساتھی باقی وکلا روپوش ہو چکے تھے۔ سب سے اہم خبر یہ تھی کہ خوشی خان کی گرفتاری پر مقامی وکلا قیادت کی طرف سے کسی قسم کا ردعمل سامنے نہیں آیا تھا۔ عدالتوں میں بھی معمول کی سماعتیں شروع ہو چکی تھیں۔ رضوان ہاشمی نے ایک لمبی سانس لی۔ حاجی بخشن سمجھ گیا کہ کوئی اہم بات ہے لیکن رضوان ہاشمی بات کو گول کر گیا۔

''ضمانت تو تمھاری کرا دوں گا، پرانی یاری جو ہوئی لیکن ایک بات بتانا ہو گی کہ کون کون لوگ تم سے رُباب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔'' جملہ مکمل کرتے ہوئے رضوان ہاشمی کے ہونٹوں پر ایک متجسس مگر کمینگی آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

''تم میری ضمانت کراؤ، وہ جو بھی ہیں خود بخود تمھارے سامنے آ جائیں گے۔'' حاجی بخشن کا لہجہ کسی شطرنج کے کھلاڑی جیسا ہونے لگا تھا۔

رضوان ہاشمی نے نہایت غور سے تولنے کے سے انداز میں حاجی بخشن کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ بخشن کی بات کا کوئی جواب دیتا اُس کا ملازم جلدی سے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ ہاشمی نے پریشان ہو کر استفساریہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا مگر ملازم نے حاجی بخشن کی طرف دیکھ کر نگاہیں جھکا لیں۔

''کیا ہوا! کہہ دو، یہ اپنے آدمی ہیں۔'' ملازم جھجکا تو رضوان ہاشمی پریشان ہو کر کھڑا ہو گیا اور اُس کے ساتھ ڈرائینگ روم سے باہر چلا آیا۔ لیکن باہر کے منظر نے اُسے سراسیمہ کر دیا۔ مقامی پولیس کا ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اپنی یونیفارم میں ملبوس ایس ایچ اُو چوہدری ضیا اور اچھی خاصی پولیس فورس کے ساتھ موجود تھا۔ رضوان ہاشمی کا ماتھا ٹھنکا۔ شاید خوشی خان نے پولیس کو بتا دیا تھا کہ وکلا کی تمام تر متشددانہ کارروائیوں کے پیچھے اُس کا ہاتھ تھا۔

۳۷

رات کا غالباً ایک پہر باقی رہا ہوگا کہ جب تونگر کے سینے میں دبک کر بھی جذباتی طور پر اُس سے کوسوں دور گل رخ نام کی گریزاں لڑکی نے ایک ایسی بھرپور عورت کا قالب بدل لیا جو نسائیت کا اظہار وحشت کے راہیں کرنے کا ہنر جانتی تھی۔ کامل آسودگی کے لیے بنجر ہو رہے سلطان احمد تونگر کے لیے یہ عطا کے لحات تھے جو ایک عرصے سے اُس سے بیگانہ ہو چکے تھے۔ بیورو کریسی ہو یا پیشہ وری کا کوئی اور شعبہ اس میں جوں جوں عروج کی جانب مراجعت ہو، حقیقت کہیں پیندے میں بیٹھتی چلی جاتی ہے اور سطح پر صرف تصنع، دروغ اور منافقت رہ جاتے ہیں۔ جب تونگر کے پاس کوئی منصب نہیں تھا تو صنفِ مخالف کے ساتھ تعامل کے اِکا دُکا مواقع بھی گرم جوش محبتوں کے حامل تھے لیکن منصب کے آتے ہی جہاں مواقع طشتری میں رکھ کر پیش کیے جانے لگے وہاں اِن مواقعوں کے ذریعے وجود میں آنے والے سنجوگ بھی فطری رویوں کی بجائے تصنع آمیز مسکراہٹوں پر استوار ہونے لگے۔

شب کے پہلے پہر سے اُس کے ساتھ مچلتی، اٹھلاتی اور ترساتی گُل رُخ نے کچھ ایسا بھانبڑ بھڑکا دیا کہ جس میں تونگر کا کسی جھاڑی کی طرح خشک ہو چکا وجود سلگنے کی بجائے جھڑ جھڑ بھڑکنے لگا تھا۔ ڈھلوان کی سمت ڈھلکا تو سہی مگر قدم قدم گل رُخ کی جانب سے پیش قدمی میں پنہاں مزاحمت نے تونگر کو پھر سے اپنے آپ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن نجانے یکا یک اُس کے جسم کے کون سے ماس، کون سے خون میں سرمستی جاگی کہ وحشت اور جنوں میں تمیز رکھنا محال ہو گیا۔ رات کے آخری پہر کی سونامی میں تونگر نے متحرک ہونے کی اپنی سی کوشش کی مگر گل رُخ نے اُسے چت رہنے تک محدود کر دیا۔

رات کا یہ مہربان پہر ایک دم سبک خرام ہونے کے بعد اب دھیمے دھیمے سبک گام ہو کر رینگنے پر آ چکا تھا۔ ایک مدت کے بعد تونگر کو زندہ ہونے کا احساس ہوا تو غالب آ چکی سرشاری نے پلکوں کو اِس طرح بوجھل کیا کہ آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ نیند کے بہاؤ میں بہنے سے پہلے

آخری بار گُل رُخ اُسے اپنے پاؤں اور پنڈلیوں سے کسی بیل کی طرح لپٹی ہوئی دکھائی دی تھی۔

اگلی صبح دن چڑھے تونگر بیدار ہوا تو اُسی طرح برہنہ حالت میں سٹنگ روم کے قالین پر لیٹا ہوا تھا۔ نجانے کتنے عرصے کے بعد وہ ایک عام آدمی کی پرسکون نیند سویا تھا۔ تازگی اور ترنگ کے سوا کوئی بھی احساس باقی نہیں رہا تھا۔ نیند سے پہلے کے آخری لمس نے پنڈلیوں میں سرسراہٹ پیدا کی تو تونگر نے تیزی سے اپنی ٹانگیں سمیٹیں کہ اُن سے گُل رُخ لپٹی ہوئی تھی۔ لیکن اِس عمل میں ٹانگیں متوقع بوجھ کے بنا ہی اُس کے سینے سے آلگیں۔ گُل رُخ کمرے میں نہیں تھی۔ تونگر ہڑبڑایا تو نہیں مگر چونکا ضرور کہ اتنی جلدی کیا تھی اُسے چھوڑ کر اپنے کمرے میں جانے کی لیکن جب اُس نے موبائل فون پر وقت دیکھا تو دس بج چکے تھے۔ اب اُس کی ہڑبڑاہٹ فطری تھی کہ دو بار اللہ ڈنو عبید کی فون کالز اور ایک بار وانس ایپ پر بلاوے کا میسج بھی آچکا تھا۔

وہ جلدی سے اُٹھا، بیڈروم میں گیا مگر آج اُس کا لباس الماری سے باہر نکال کر نہیں رکھا گیا تھا۔ گُل رُخ شاید اپنے کمرے میں جا کر سو گئی ہو۔ ناشتے کی طلب بھی ہونے لگی تھی۔ تاخیر کے پیش نظر اُس نے خود ہی الماری سے ایک سوٹ چنا، شرٹ اور ٹائی نکالی اور جلدی سے باتھ روم میں گھس گیا۔ ایک شاندار غسل سے ہونے والی امکانی فرحت گُل رخ کی عدم موجودی اور اللہ ڈنو عبید کی جانب سے بلاوے پر بلاوے کے سبب محسوس ہی نہ ہو سکی تھی۔ یقیناً باز پرس ہوگی کہ اب تک اُس گمشدہ لڑکی کی تلاش کے لیے حیدر گوٹھ کیوں نہیں گیا۔ باتھ روم سے باہر نکلنے پر تونگر کا خیال تھا کہ گُل رُخ ناشتے لیے سٹنگ روم میں اُس کی منتظر ہوگی لیکن وہاں جھانکنے پر معلوم ہوا کہ ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ تونگر مسکرا دیا۔ ”لڑکی نے اپنے جنون میں شاید مجھے انڈراسٹیمیٹ کر لیا تھا۔ سو رہی ہوگی تھکن سے چور ہو کر۔“

اگلے پندرہ منٹوں میں وہ تیار ہو کر اللہ ڈنو عبید کے آفس میں پہنچ گیا لیکن یہاں حیرت کا ایک جھٹکا اُس کا منتظر تھا۔ اللہ ڈنو کے آفس میں جانان اُس کی سیکریٹری کی کرسی سنبھال چکی تھی لیکن تونگر کے لیے کلی طور پر اجنبی۔ چہرہ تو کیا اُس کے رویے تک میں شناسائی کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ شاید اللہ ڈنو عبید کا خوف تھا یا اُس سے کسی قسم کی کوئی کبیدگی، کچھ طے نہیں ہو پا رہا تھا۔ تونگر کو دیکھ

کر بھی اُس نے کسی قسم کا کوئی نوٹس نہ لیا بس انٹر کام اُٹھا کر شاید باس کو اُسی کے آنے کی اطلاع کی اور پھر اس سے پہلے کہ وہ کہیں بیٹھتا، اُسے اندر جانے کا اشارہ کر دیا۔

یہ جانان کے رویے کا ردِعمل تھا یا اللہ ڈنو عبید کی جانب سے رُباب کے سلسلے میں ممکنہ باز پُرس کا تاثر کہ جسے چکتا کرنے کے واسطے صاحبزادہ سلطان احمد تونگر اندر جاتے ہوئے اپنی بیوروکریٹک سج دھج میں واپس آچکا تھا۔ اللہ ڈنو عبید اپنے دفتر میں ٹہل رہا تھا مگر اضطراب چہرے سے ہویدا نہیں تھا۔ دل کی بات چھپانے میں اُسے اپنے ذہن کا بھرپور استعمال کرنا خوب آتا تھا۔ چہرے پر لکھی ہوئی تحریر بھی پلک جھپکنے میں یوں گڈمڈ کر لیتا کہ بڑے سے بڑا تحریر شناس بھی دیکھتا رہ جاتا مگر کچھ سمجھ نہ پاتا۔ تونگر کے اندر داخل ہوتے ہی اُس نے کچھ بھی بولے بنا اُسے سر سے پاؤں تلک غور سے دیکھا اور پھر ہلکا سا مسکرا دیا۔

"آپ تو آج بھی پورے چیف سیکریٹری لگ رہے ہیں تونگر صاحب! ایسا چیف سیکریٹری کہ جو ابھی ابھی وزیر اعلیٰ سے میٹنگ کر کے باہر نکلا ہو.... یہ ڈنو نام کا بندہ بھی کیسا حرامی، کیسا چوتیا ہے کہ چلے ہوئے ٹھس کارتوس میں پھر سے اعلیٰ درجے کا بارود بھر دیتا ہے اور بھڑوا کارتوس یہ سمجھ لیتا ہے کہ سب اُسی کی چالاکی، اُسی کا کمال ہے۔"

اللہ ڈنو کی اس عیاری پر صاحبزادہ تونگر بجھ سا گیا۔ دل چاہا کہ وہیں کھڑے کھڑے اُس کی ماں بہن ایک کرے اور اُس کے منہ پر تھوک کر باہر نکل آئے کہ اُس کے پاس گنوانے کو باقی کیا رہا تھا۔ لیکن نوکر شاہی کی بنیادی اور روایتی تربیت ایسے میں ہمیشہ اُس کے آڑے آتی رہی کہ جس کا پہلا سبق ہی ہر قسم کی ناخوشگوار صورتِ حال پر کسی قسم کا کوئی زبانی یا جسمانی ردِعمل نہ دینا تھا۔ لیکن یہ الگ بات کہ کاغذ اور قلم ہاتھ میں آتے ہی اِس کا ازالہ یوں کیا جاتا کہ زیادتی کرنے والوں کی نسلیں انتقام کی سیخ میں پرو کر آگ میں دھر دی جاتیں۔ پھر بھی اِس تربیت سے کسی حد تک انحراف کرتے ہوئے تونگر نے میز کے اِس طرف رکھی مہمانوں کی کرسیوں میں سے ایک اپنی طرف گھسیٹی اور اُس کے کھڑے ہونے کی پروا نہ کرتے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھ گیا۔ اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے اللہ ڈنو کے چہرے پر کئی رنگ ایک ساتھ آ کر گزر گئے لیکن فوری طور پر اُس نے بھی کوئی

ردِ عمل ظاہر نہ کیا۔

کچھ دیر اور گزری۔ اللہ ڈنو عبید کے ٹہلنے میں اب اضطراب نمایاں ہو چلا تھا۔ اچانک سے اُس نے ٹہلنا موقوف کیا اور اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے بیٹھنے کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اپنے اندر تفکر اور تدبر پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے مگر تمام تر رعونت اور بے لحاظی کے باوجود وہ چاہتے ہوئے بھی تونگر کے روبرو ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ ماضی میں رہ چکا اپنی اور تونگر کی حیثیت کا تفاوت بھی شاید اِس کا سبب تھا کہ جس کا بھلایا جانا، بھلائے جانے کے باوجود مشکل ہو چکا تھا۔

''مسٹر تونگر! آخر وجہ کیا ہے کہ تم میرے ہم پلہ ہوتے ہوئے بھی میرے ملازموں کے ہم پلہ ہونے کی کوشش میں جُتے رہتے ہو، میرے خلاف اُن کی سازشوں کا حصہ بنتے ہو، زندگی میں کتنی ہی عورتیں دیکھی اور برتی ہوں گی، بیوی سمیت کتنی ہی عورتوں نے ذلیل ہوئے ہوگے مگر ابھی تک عورت کے ہاتھوں مزید خوار ہونے کی حرص اور رسوا ہونے کی ہوس جوں کی توں موجود ہے۔''

اللہ ڈنو عبید اپنی ظاہری صورت میں رعونت کی گھٹیا سطح پر اُتر آیا تھا۔ تذلیل کی انتہائی صورت کا سامنا کرتے ہوئے غیض کے مارے تونگر کے کانوں کی لودیں تک سُرخ ہو گئیں مگر وہ منہ سے کچھ بھی نہ کہہ پایا۔ اِس عالم میں بھی ردِ عمل سے گریز نوکر شاہی کی تربیت کا نتیجہ تھا یا اللہ ڈنو عبید کے ہاتھوں بلیک میلنگ کا خوف، کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اُس کا مزاج ہی ایسا رہا ہو لیکن اُس کی آنکھوں میں اُترا ہوا غضب کسی اور عامل کی نشاندہی کرنے کے باوجود مجموعی طور پر برداشت کی صورت میں ظاہر ہو رہا تھا۔ تونگر کو خاموش پا کر اللہ ڈنو کچھ اور بھی بھڑک اُٹھا۔

''تم کیا سمجھتے ہو چوتیے کہ اتنی بڑی بزنس ایمپائر میں نے یونہی پچھواڑا کھجاتے ہوئے بنالی ہو گی، جانان نے تمھیں بُلایا اور تم فوراً پہنچ گئے کہ اللہ ڈنو تو للو ہے اُسے کون خبر کرے گا، اِس بھڑوی گُل رُخ نے سی سی ٹی وی کیمروں کی کیبل کاٹ دی تو تم نے بھی سمجھ لیا کہ انیکسی میں نگرانی کا صرف یہی ایک ہی سسٹم ہو گا، کیسے بیوروکریٹ ہو تم، کیسے صوبہ چلاتے رہے ہو، میں پھر کہتا ہوں

کہ تمھیں دیکھ کر اپنے ملک کی بیوروکریسی کی صلاحیتوں کا پول کھل جاتا ہے۔'' غصے کی شدت سے اللہ ڈنو بات کرتا کرتا کھڑا ہو گیا لیکن تونگر کچھ بھی بولے بغیر بدستور اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ فشارِ خون بڑھنے کے سبب اُس کی آنکھوں میں سُرخی اُتر آئی تھی۔ اللہ ڈنو ایک دم میز پر جھکا اور کرسی پر بیٹھے بغیر اُسی حالت میں جھک کر اپنی نگاہیں بھی تونگر کی آنکھوں پر مرکوز کر لیں۔

''مجھے کیا گھور رہے ہو! اِن عورتوں سے انجوائے کرنے پر مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا، میں نے تو خود تمھیں سونپی تھیں، مجھے تو اعتراض ہے میرے خلاف سازشیں کرنے پر، اُن سازشوں کا حصہ بننے پر۔''

''نہ تو میں نے کوئی سازش کی ہے اور نہ ہی اِس کا حصہ بنا ہوں۔'' خلاف توقع تونگر کے لہجے میں غراہٹ در آئی تھی۔ اللہ ڈنو اُس کی بات کا کوئی بھی نوٹس لیے بغیر کچھ دیر تک اُسی پوزیشن میں اُس کی طرف دیکھتا رہا پھر سیدھا ہو کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے دوبارہ نگاہیں اُسی پر مرکوز کر دیں۔

''کیا چاہتے ہو، جانان یا گل رُخ؟'' عبید کی آنکھوں میں کمینگی آلود مسکراہٹ جاگ اُٹھی تھی۔

''مجھے دونوں نہیں چاہئیں۔'' تونگر کے فوری جواب میں تیقن اور استقامت، دونوں ایک ساتھ موجود تھے۔

''چاہیے تو مجھے اب تم بھی نہیں، تم کتنے ذمہ دار ہو اور کتنے موثر ثابت ہو سکتے ہو وہ میں نے رُباب کے معاملے میں دیکھ لیا ہے کہ کل سے اب تک تم نے اُس پر کتنی پیش رفت کی ہے اور اُسے کتنا سنجیدہ لیا، بہرحال تمھیں اپنے آفس اور انیکسی سے دفع کرتے ہوئے اپنی دو باندیوں میں سے ایک باندی عطا کر سکتا ہوں، پھر سوچ لو تمھیں کون سی چاہیے۔''

''مجھے کوئی نہیں چاہیے۔'' تونگر کی آواز میں غراہٹ نہیں رہی تھی اور نہ ہی تیقن۔ بس بیزاری سی تھی کہ جو بھی ہونا ہے جلدی سے ہو جائے۔

''تم کل رات سے بھوکے ہو اور میں تمھیں خالی پیٹ ذبح نہیں کرنا چاہتا، اِدھر وینٹنگ ایریا میں بیٹھو، ناشتہ کرو، ہم کچھ دیر کے بعد دوبارہ ملتے ہیں۔'' اللہ ڈنو نے وہیں بیٹھے بیٹھے سر کے

اشارے سے اُسے باہر جانے کو کہا۔

''میں جانا چاہتا ہوں، انیکسی میں لیپ ٹاپ رکھا ہے میرا، بس وہ لینا ہے میں نے۔'' تونگر کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''اگر یونہی جانا ہے تو پھر میرے یہ کپڑے بھی اُتار کر جاؤ، نہیں تو گیٹ پر میرے ملازم اتروالیں گے۔''

اللہ ڈنو کا لہجہ بھانپ کر تونگر مزید بجھ کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ شخص جو کہتا ہے وہ کر بھی گزرتا ہے۔ وہ کچھ کہتے کہتے اور کہیں چلتے چلتے وہیں رُک گیا۔

''اور ہاں! تمھیں کچھ دنوں بعد ہونے والے ایک قتل کی خبر دے دوں، ایک سابق سرکاری افسر کسی روز کسی سنسان سڑک پر کسی تیز رفتار کار سے ٹکرا کر مارا جائے گا، اب ایسے میں کفن دفن کی زحمت کون کرے لہٰذا اُس کی لاش رات کے کے وقت ایک مصروف ترین نیشنل ہائی وے پر بین درمیان میں رکھ دی جائے گی، رات بھر اُس لاش پر سے گزرنے والی گاڑیاں اُسے سڑک پر لیپ دیں گی، یوں اگلی صبح کوئی نہیں پہچان پائے گا کہ اس لیپ میں کسی افسر کے جسم کے ریشے تھے یا کسی کتے کے۔''

تونگر کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ وہ اللہ ڈنو عبید کے چنگل میں بری طرح پھنس چکا تھا۔

''خبر میں نے سنا دی، اب جایئے بھی صاحبزادہ سلطان احمد تونگر صاحب، جان چھوڑیے، دفع ہو جایئے۔''

''میں ویٹنگ ایریا میں بیٹھتا ہوں۔'' تونگر کے حلق سے یہ الفاظ بمشکل نکل سکے اور وہ اللہ ڈنو عبید کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے باہر نکل آیا۔ باہر گہرے سبز رنگ کے شیمپین گلاس کی پارٹیشن سے بنائے گئے اوپن کیبن میں جانان لیپ ٹاپ پر کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔ تونگر نے بس ایک نظر اُسے دیکھا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا وہاں سے گزر کر ویٹنگ ایریا میں چلا آیا جہاں اُس کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی دھب سے وہ ایک صوفے پر گرنے والے انداز میں بیٹھ تو گیا مگر نچلے دھڑ میں جان نہیں رہی تھی۔ دماغ ماؤف ہوتے ہوئے بھی بس یہی

خیال بار بار چکرائے جا رہا تھا کہ اِن حالات میں وہ کیا کرے۔

اللہ ڈنو عبید نے خبر سنانے کے انداز میں اُسے واضح طور پر سکرپٹ میں لکھے انجام سے باخبر کر دیا تھا۔ اُس نے سوچا کہ اگر یہی اُس کا انجام ہے تو اِس انجام کا اسکرپٹ رائٹر کون ہے اور کس واسطے اُسے اِس انجام سے دو چار کرنا چاہتا ہے۔ وہ حیران تھا کہ پہلے تو اللہ ڈنو عبید نے اُسے چاپلوسی سے شیشے میں اتارا، پھر اُسے اور اُس کی بیوی کی ویڈیوز دکھا کر بلیک میل کیا، پھر اُسے کمپنی کا ہیڈ بنایا، جانان عطا کی مگر اُس کی جانب سے کچھ بتائے جانے کی کوشش میں اُسے چبا کر اُس سے الگ کر دیا، بعد ازاں جب اُس کی بیوی نے گھر سے نکالا تو وہ اُسے اپنے گھر لے آیا، انیکسی میں ٹھہرایا اور اُس کے لیے کی جانے والی بے تحاشہ خریداری کے بعد اُسے گُل رُخ بھی عطا کی مگر وہ محتاط رہنے کی سرتوڑ کوشش میں بھی محتاط نہ رہ سکا تو اِس میں اُس کا کیا قصور؟

رُباب نامی کسی لڑکی کو تلاش کرنے کے واسطے اگر وہ نہیں جا سکا تو اِس میں بھی سستی اُس کی نہیں، اُسے تو حیدر گوٹھ چھوڑے ایک عرصہ ہو چلا تھا تو ایسے میں وہ کس سے اور کس طرح رُباب کا پتہ پوچھتا۔ ویسے بھی رات پڑنے کے بعد اُسے اگلا دن یعنی آج کا دن چاہیے تھا کہ وہ کوئی رابطہ تلاش کر پاتا۔ لیکن اُسے تو درمیان ہی سے نکال باہر کیا گیا کہ جیسے دودھ میں سے مکھی یا کباب میں سے ہڈی اور چھیتے سار ہی ایک عبرت ناک موت کی دھمکی بھی سوا نیزے پر رکھ دی گئی۔ اللہ ڈنو عبید کے پہلے فون سے چلا آ رہا حل طلب معمہ اب بھی وہیں موجود کہ ”کون کیا چاہتا ہے مجھ سے؟“

اتنے میں ویٹنگ ایریا کا بغلی دروازہ کھلا اور گُل رخ ناشتے کی ٹرے لیے اٹھلاتی، مسکراتی مکمل تمکنت سے کمرے میں داخل ہوئی۔ سیاہ رنگ کے ٹو پیس کوٹ پتلون میں وہ بہت دلکش اور تروتازہ لگ رہی تھی۔ اُس کا یہ انداز دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گیا۔ انیکسی سے غائب یہاں حاضر۔ اور وہ کل شب کے آخری پہر کا زندگی سے بھرپور دھاوا اور اُس سے پہلے کی پیش رفت میں مزاحمت، سپردگی میں بے خودی اور بے خودی میں ہوشیاری کیا سب کچھ بے سبب تھا، فریب تھا، کوئی چال تھی یا کوئی واردات تھی کہ جس کا وہ شکار ہوا۔ اُس نے قریب آتے ہی تونگر کو نہایت ادب سے سلام کیا کہ جس میں رسمی انداز نمایاں تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ گُل رخ اُسے کل شب یا یوں کہہ لیں کہ آج صبح

ہونے سے پہلے کی روداد کو مخفی رکھنے کا سندیس دے رہی ہے۔ اگر واقعی گزری شب کی بات کسی تیسرے کے علم میں نہیں تھی تو اُس کا علم اللہ ڈنو عبید کو کیسے ہو گیا اور غالباً اُسی کی پاداش میں اُسے انیکسی سے ہٹا کر یہاں مہمانوں کی تواضع کے لیے کیوں مامور کر دیا گیا۔

گُل رخ نے کوئی بھی وضاحتی اشارہ کیے بنا تونگر کے لیے سامنے رکھی میز پر ناشتہ چُنا اور روبوٹک انداز میں اٹھلاتی، مسکراتی جس دروازے سے وہاں آئی تھی، اُسی سے واپس چلی گئی۔ ناشتہ چُنتے ہوئے بس ایک ثانیے کے لیے اُس کی آنکھیں تونگر کی آنکھوں سے ملیں تو اُن کا رنگ ہی بدل گیا۔ اُن میں رچائے گئے چلبلے پن میں تونگر کو کسی ڈار سے بچھڑی ہوئی کونج کی آنکھ کا رنگ جھانکتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ بس ایک ساعت کی کئی بار تقسیم ہو چکی سب سے مختصر کسر کے دورانیے میں جو گُل رُخ کی واپسی کے ساتھ ہی کہیں کھو چکا تھا۔

تونگر گڑبڑا کر رہ گیا۔ اُس کی بھوک، بھوک کا احساس پیدا کرنے سے قاصر ہو رہی تھی۔ بار بار ایک ہی سوال اپنی کئی جزئیات کے ساتھ ذہن میں تھرتلی برپا کیے ہوئے تھا کہ یہ سب کیا ہے! کیا ہونے والا ہے! کون ہے یہ اللہ ڈنو عبید! پہلے کیا چاہتا تھا مجھ سے اور اب مجھے کیوں مارنا چاہتا ہے؟

تونگر نے چاہا کہ اپنے کسی سابق کولیگ سے رابطہ کرے، موجودہ چیف سیکریٹری سے رابطہ کرے کہ جو کبھی اُس کا ماتحت رہا تھا، لیکن پریشانی اِس بات کی تھی اِس پورے بگڈ ماحول میں جہاں اُس کی سوچ بھی پکڑی جا سکتی ہو، وہ کیسے کسی بیرونی رابطے سے رابطے میں آ سکتا تھا۔ ایسے میں تو شاید اُسے بیرونی مداخلت سے پہلے ہی ٹھکانے لگا دیا جائے۔

۳۸

’’آپ تو ہمیں دیکھ کر پریشان ہو گئے جناب ہاشمی صاحب! آپ کا کچہری میں پتا کرایا، جب وہاں نہ ملے تو سلام کرنے گھر چلے آئے۔‘‘ ڈی ایس پی نادر سعید مسکراتے ہوئے آگے بڑھا اور رضوان ہاشمی سے بغلگیر ہو گیا۔ لیکن رضوان ہاشمی کے چہرے پہ پریشانی کے آثار جوں کے توں

موجود تھے۔

''کتنے بدقسمت لوگ ہیں ہم بھی جناب کہ جب کبھی اپنے محسنوں کی زیارت کو آئیں تو تب بھی وہ پریشان ہو جاتے ہیں۔'' نادر سعید نے رضوان ہاشمی سے الگ ہوتے ہوئے اُس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

''خیریت تو ہے! کس لیے ملنا تھا اور ملنے والے یوں اِس اہتمام کے ساتھ نہیں آتے۔'' رضوان ہاشمی نے چہرے کے تناؤ کو چھپا کر زبردستی مسکرانے کی کوشش کی مگر کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوا۔ نادر سعید کی خواہ مخواہ کی بے تکلفی اور بغل گیر ہونے نے اُسے اور بھی پریشان کر دیا تھا۔

''آپ سب کچھ یہیں پوچھیں گے! ڈرائنگ روم کی زیارت نہیں کرائیں گے؟'' نادر سعید کا بلا جواز مسکرانا رُک نہیں پا رہا تھا۔ عجیب سی ہنسی تھی کہ جو اُس کے چہرے کے کھردرے نقوش کے ساتھ قطعی میل نہیں کھا رہی تھی۔

اتنی ساری پولیس فورس کو دیکھ کر رضوان ہاشمی پہلے ہی ذہنی طور پر ہر قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو چکا تھا لیکن نادر سعید کے ڈرائنگ روم کا نام لینے سے وہ ایک بار پھر اندر سے کپکپا کر رہ گیا۔ ڈرائنگ روم میں تو حاجی بخشن بھی موجود تھا۔ اب اگر ڈی ایس پی نادر سعید کو وہ ڈرائینگ روم میں لے کر جاتا ہے تو پولیس کو مطلوب حاجی بخشن گرفتاری کی صورت یہی سمجھے گا کہ اُسے اُس نے گرفتار کرایا ہے۔ اور اگر وہ اُسے لے کر ڈرائینگ روم میں نہیں جاتا تو نادر سعید اُس کے اپنے بارے میں بھی شبہات کا شکار ہو جائے گا خاص طور پر ان حالات میں کہ جب ابھی یہ بھی واضح نہیں کہ ڈی ایس پی اتنی زیادہ پولیس فورس کے ساتھ اُس کے گھر کیوں آیا ہے۔

''ہاشمی صاحب! آپ تو سوچ میں پڑ گئے، جناب ہم جیسے چھوٹے ملازم آپ کے مہمان خانے کے لائق تو نہیں لیکن پھر بھی چائے کی ایک پیالی پر تو ہمارا حق بھی ہے۔'' نادر سعید کے لہجے میں اگر طنز نہیں بھی تھا تو رضوان ہاشمی کو وہ طنز ہی لگ رہا تھا لیکن اِس کا جواب دینے کی بجائے محض جبری سی ایک مسکراہٹ اپنے چہرے پر لاتے ہوئے وہ گھر کے اندر جانے لگا۔ نادر سعید نے اچانک ہی اُس کی بائیں کلائی کو نرم انداز میں یوں تھام لیا کہ جیسے گرفتار کرتے ہوئے اندر جانے

سے روک رہا ہو۔ رضوان ہاشمی نے غصے کے عالم میں اُسے پلٹ کر دیکھا کہ جیسے کہنا چاہ رہا ہو کہ تمھاری یہ جرات۔ لیکن اِس کے ساتھ ہی جہاں اُس کی کلائی پر نادر سعید کی گرفت مضبوط ہو گئی وہیں سامنے کھڑے ہوئے ایس ایچ اُو اور باقی پولیس فورس کے تیور بھی بدل گئے۔ رضوان ہاشمی کے ذہن میں آیا ہوا کھولاؤ بھی چھپانے کی کوششوں کے باوجود سراسیمگی میں بدلنے لگا تھا۔

"جناب! آپ کیوں زحمت کرنے لگے، آپ کا ملازم آپ کے پیچھے کھڑا ہے، اِسے حکم کریں کہ دروازہ کھول دے۔" ڈی ایس پی نادر سعید کی بات سن کر گھبرائے ہوئے رضوان ہاشمی نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اُس کا ملازم اپنے اُترے ہوئے چہرے کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ پولیس افسروں پر جرح کے دوران اُن کے چھکے چھڑا دینے کی شہرت رکھنے والے رضوان ہاشمی کی ٹانگوں میں دم نہیں رہا تھا۔ آج وہ وکیل ہوتے ہوئے بھی زبان کھولنے یا گرجنے برسنے کی سکت کھو بیٹھا تھا۔ اُسے معلوم ہو چکا تھا کہ خوشحال خان کو تنہا کر دیئے جانے کا ملبہ اب اُسی پر گرنے والا ہے۔ اب اگر اُس کی گرفتاری کی خبر وکلا تک پہنچ بھی جائے تو اُس کی حمایت میں نہ تو کوئی جلوس نکلے گا اور نہ ہی عدالتوں کا بائیکاٹ کیا جائے گا۔ وکلا اتحاد میں دراڑیں ڈالنے کے مضمرات پولیس کی وردی میں اُس کے دروازے تک آن پہنچے تھے۔ اور اِس آمد کے لیے وقت بھی کیسا چُنا گیا کہ جب پولیس کو ایک مطلوب ملزم بھی اُس کے گھر میں موجود تھا۔ خوف یہ بھی تھا کہ حاجی بخشن اگر حالات کی اِس گردش سے باہر نکل آیا تو کم از کم اُسے نہیں چھوڑے گا کہ جس نے اُس کی ضمانت قبل از گرفتاری کرانے کی بجائے اُسے گھر میں بٹھا کر گرفتار کرا دیا۔

رضوان ہاشمی نے ملازم کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہاں ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اِس مشکل لمحے میں کوئی بھی فیصلہ کرنا ممکن نہیں رہا تھا کہ اُس کی کلائی بدستور ڈی ایس پی کے ہاتھ میں تھی۔ اُس کا یہ شاطرانہ عمل رضوان ہاشمی پر اُس کا گھاگ پن واضح کر رہا تھا کہ باقاعدہ حراست کے نہ ہوتے ہوئے بھی وہ علامتی طور پر حراست میں تھا۔ پولیس سے نمٹنے کے لیے اُسے بس اِسی مرحلے سے خود کو بازیاب کرانا تھا۔ اُس کے بعد کیا ہوگا اُس کے راستے نکالنے کی ترکیبیں ایک دم سے اُس کے ذہن میں ورود کرنا شروع ہو چکی تھیں لیکن مخمصہ پھر بھی جو باقی تھا وہ حاجی بخشن سے

سامنا کرنے کا تھا۔ تفکر کے یہ لمحات طویل ہوئے تو ڈی ایس پی نے کچھ نہ کہتے ہوئے رضوان ہاشمی کی کلائی پر اپنی گرفت کو بس ایک لمحے کے لیے بڑھا کر پھر سے نرم کر دیا۔ رضوان ہاشمی نے بھی اُسی دگرگوں لمحے میں مزید کچھ بھی سوچے بغیر محض گردن کے ہلکے سے اشارے سے ملازم کو ڈرائنگ روم کا بیرونی دروازہ کھولنے کا کہا اور نادر سعید کی طرف دیکھے بنا کوٹھی کے بیرونی گیٹ کی طرف دیکھنے لگا کہ جہاں اندر آئی ہوئی پولیس فورس ٹکٹکی باندھے اُن کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

جونہی ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا، اُن دونوں کے اندر جانے سے پہلے ہی ایس ایچ اُو چوہدری ضیا اپنے کمانڈوز کے ساتھ دوڑ کر اندر داخل ہو گیا۔ رضوان ہاشمی ایک بار پھر حیرت زدہ تھا، کچھ بھی سمجھنے سے قاصر کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ اُس نے غصے سے نادر سعید کی طرف دیکھا اور ایک دم برس پڑا۔ کافی دیر سے دبکا ہوا غصہ باہر آیا تو اُس نے نادر سعید سے کلائی چھڑائی اور اُسے بے نقط کی سنا دیں۔ وہ چیخ رہا تھا ''جو بھی میرے ساتھ کرنا ہے، مجھے بتاؤ، وارنٹ دکھاؤ، گھر میں کیسے گھسے ہو، یہ کیا بدمعاشی ہے، میں تم لوگوں کو کورٹ میں گھسیٹوں گا، تمھاری وردیاں اُتروا دوں گا۔'' اِس موقع پر اچانک پھٹ پڑنے کے پس منظر میں شاید اُس کے لاشعور کا بھی دخل رہا ہو گا کہ جو اُسے حاجی بخشن کے سامنے سرخرو رکھنا چاہ رہا تھا۔ لیکن اُس کے چیخنے اور اونچی آواز میں دھمکانے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ڈی ایس پی نادر سعید نے پھرتی سے رضوان ہاشمی کو گردن سے دبوچا اور ڈرائنگ روم میں دھکیل کر دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔ رضوان ہاشمی کا دم گھٹا تو اُس کو کھانسی نے آ لیا لیکن پھر بھی اُس کی اُتری ہوئی آنکھیں حاجی بخشن کو ڈھونڈ رہی تھیں لیکن اُس کا وہاں وجود تک نہیں تھا۔ ایس ایچ اُو چوہدری ضیا نے پورا ڈرائینگ روم اُتھل پتھل کر ڈالا تھا لیکن جس کو وہ ڈھونڈ رہے تھے وہ وہاں نہیں تھا۔ چوہدری ضیا اندرونی دروازہ کھول کر گھر کے زنان خانے میں داخل ہونا چاہ رہا تھا لیکن ڈی ایس پی نے اُسے اشارے سے منع کیا اور رضوان ہاشمی کو ایک صوفے پر دھکیل کر اُس کے سامنے خود بیٹھ گیا۔ چوہدری ضیا نے بھی کمانڈوز کو باہر نکالا اور دروازہ پھر سے لاک کرنے کے بعد ڈی ایس پی کے ساتھ رکھی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''میں تم میں سے ہر ایک کو دیکھ لوں گا، اُلٹا لٹکواؤں گا تمھیں، وردی سمیت تمھاری کھال نہ

اُتر والی تو میرا نام رضوان ہاشمی نہیں۔'' ہاشمی نے جان میں جان آتے ہی ڈی ایس پی پر دوبارہ چڑھائی کر دی لیکن گردن سے دبوچے جانے کا اثر ابھی تک اُس کے گلے پر تھا کہ جس کے سبب بار بار کھانسی آئے جارہی تھی۔

''وکیل صاحب! ہم نے تو جو کرنا تھا کر لیا اب اگر تم کرو گے تو شہرت تمھاری خراب ہو گی، ہم تو ہیں پولیس والے، ہماری کہاں خراب ہو گی۔'' اب کے ڈی ایس پی نہیں بلکہ ایس ایچ اُو چوہدری ضیا بولا۔

''تم بکواس نہیں کرو دو ٹکے کے رینکر تھانیدار! میں تمھاری اصلیت جانتا ہوں، ننگا کروں گا تمھیں کورٹ کے اندر۔'' منہ پر پڑنے والے چوہدری ضیا کے کلہاڑے جیسے ہاتھ نے رضوان ہاشمی کی بات ہی نہ مکمل ہونے دی اور وہ صوفے کی دوسری سمت جا گرا۔ چوہدری ضیا اُٹھا اور رضوان ہاشمی کو سر کے بالوں سے پکڑ کر پھر سے صوفے پر بٹھا دیا۔

''یہ تمھارے باپ کی کورٹ کچہری نہیں کہ میرے کپڑے اُتار کر مجھے ننگا کرو گے، ابھی تو میں تمھارے گھر پر ہوں، اب میں تمھارے کپڑے اُتار کر تمھیں تمھارے گھر والوں کے سامنے ننگا کروں گا۔'' چوہدری ضیا ایک بار پھر رضوان ہاشمی کی طرف لپکا۔ شدت غیض سے اُس کی آنکھیں باہر کو اُبلی پڑ رہی تھیں۔

رضوان ہاشمی نے گھبرا کر ڈی ایس پی نادر سعید کی جانب دیکھا۔ نادر نے چوہدری ضیا کو ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ چوہدری وہیں رُک تو گیا لیکن بیٹھا پھر بھی نہیں۔ رضوان ہاشمی حیران تھا کہ اِن بے وقعت پولیس اہلکاروں میں اتنی جرات کہاں سے آ گئی کہ وہ اُس جیسے سینئر ترین وکیل سے اِس طرح کا سلوک کر سکیں کہ جس کے ایک اشارے پر پورے صوبے کی عدالتوں کا بائیکاٹ کیا جاتا رہا ہے۔ یقیناً انھیں کہیں بہت اوپر سے تھپکی ملی ہوئی ہے۔ کوئی بہت بڑی سازش ہے کہ جس کے تحت پہلے وکلا اتحاد میں اُس کے خلاف دراڑ ڈالی گئی، پھر ریجنل پولیس آفیسر نے رُباب کا مدعا اُس پر ڈال دیا اور اب پولیس کی اُس کے گھر پر اِس طرح سے یلغار اور بدتمیزی، یہ سب کچھ غیر معمولی تھا ورنہ پولیس، انتظامیہ اور عدلیہ کسی وکیل سے اِس نوعیت کے سلوک کا تصور بھی نہیں کر

سکتی کہ ہمیشہ لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔

''ہاں جی وکیل صاحب! مہمان کو کہاں غائب کر دیا؟'' ہنستے مسکراتے ڈی ایس پی نادر سعید نے بھی اب آنکھیں نکال کر بات کرنا شروع کر دیا تھا لیکن رضوان ہاشمی نے سُنی اَن سُنی کر دی۔

''اُس حرامزادے بخشن کو کہاں غائب کیا ہے وکیل صاحب! بتا دو گے تو ٹھیک ورنہ میرا یہ شیر چوہدری ضیا ایک بار اندر گھس گیا ناں تمھاری زنانی کے برقعے میں سے نکال لائے گا۔'' نادر سعید کے لہجے میں حد درجہ سفاکیت گھول رہی تھی۔

''بکواس بند کرو کتے کے بچے! مجھے تم بتاؤ تمھاری اِس حرامزدگی کے پیچھے تمھارا کون سا باپ چھپا ہوا ہے؟'' رضوان ہاشمی ابھی کچھ اور کہنا چاہ رہا تھا کہ چوہدری ضیا نے پھر لپک کر اس قدر زناٹے کا تھپڑ اُس کے منہ پر مارا کہ اُس کی عینک نیچے جا گری۔ اُس کے کھلے ہوئے منہ سے ایک دم باہر نکلنے والے تھوک میں خون کی باریک سی لکیر بھی تھی۔ گال اندر سے پھٹا تھا یا زبان دانتوں تلے آ گئی تھی، بہرحال کچھ نہ کچھ ہوا ضرور تھا کہ جس کے سبب آنکھوں کے کناروں سے پانی بھی بہنے لگا تھا۔ رضوان ہاشمی صدمے اور طیش کی انتہائی حالت میں چکرا کر رہ گیا کہ جو بھی اُس کے ساتھ ہو رہا تھا وہ اُس کی سمجھ سے بالا ہو رہا تھا۔ ایک بار پھر اُسے یہی مناسب لگا کہ طیش میں آنے کی بجائے کسی نہ کسی طور یہ وقت گزار لے، اُس کے بعد جو بھی ہو گا اُس میں وہ یوں چوہے کی طرح کُڑکی میں پھنسا ہوا نہیں ہو گا۔ رضوان ہاشمی اپنی عینک تلاش کرنے کے لیے نیچے قالین کی طرف دیکھنے لگا تو نادر سعید نے اپنے بوٹوں کے درمیان پڑی ہوئی عینک اُٹھا کر اُس کے ہاتھ میں دے دی۔ عینک لگانے کے بعد اُس نے میز پر رکھے ٹشو پیپر کے ڈبے میں سے دو تین ٹشو نکال کر اپنے منہ سے نکلنے والی رال کو پونچھنے لگا۔ ٹشو پر لگنے والے خون کے نشان کو دیکھ کر رضوان ہاشمی کا حوصلہ مزید پست ہو گیا۔ اُس نے پریشان ہو کر شکایت بھرے انداز میں نادر سعید کی طرف دیکھا۔

''وکیل صاحب! میں تو پہلے ہی آپ سے گزارش کر رہا ہوں کہ میرا چوہدری بڑا ہتھ چھٹ ہے، آپ تعاون کریں تو یہ نوبت ہی نہ آئے، اب آپ کسے کسے صفائیاں دیتے پھریں گے اِس

چوٹ کی، پولیس کا نام لیں گے تو رہی سہی عزت کا جنازہ نکل جائے گا کہ اتنا بڑا وکیل، کورٹ میں پولیس والوں کی پتلونیں اتروا دینے والا، ایک معمولی سے ایس ایچ اُو سے اپنی لتریشن کرا بیٹھا، خیر! بہانے گھڑنے میں تو آپ بہت ماہر ہیں، اس تھپیڑ کا بھی کوئی ناں کوئی بہانہ بنالیجئے گا۔'' رضوان ہاشمی نے کوئی ردِعمل ظاہر نہ کیا اور سر جھکا لیا۔

''ڈپٹی صاحب! جناب اس نے آپ جناب کو کچھ بھی نہیں بتانا، مجھے بس تھوڑی سی خدمت کی اجازت دے دیں، سب کچھ ایک چٹکی میں بتا دے گا۔'' چوہدری ضیا پھر سے صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ رضوان ہاشمی نے گھبرا کر ڈی ایس پی کی طرف دیکھا۔ اُس نے مسکرا کر چوہدری کو ایک بار پھر صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔

''اب بتا بھی دیں وکیل صاحب! کورٹ میں تو آپ گواہوں پر جرح کرتے ہیں، اُن سے سچ اگلواتے ہیں لیکن یہ عدالت ہے پولیس کی، یہاں آپ کو سب کچھ خود بخود ہی بتانا پڑتا ہے بلکہ جو نہیں معلوم وہ بھی بتانا پڑتا ہے۔'' بات مکمل کرنے کے بعد نادر سعید غور سے رضوان ہاشمی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

''آپ کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے بخشن میرے پاس آیا تھا ضمانت قبل از گرفتاری کروانے کے لیے، پھر آپ لوگ آ گئے، اُس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں گیا۔'' رضوان ہاشمی کے چہرے پر اب کہیں بھی غلط بیانی کے آثار نہیں تھے۔ اُن دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر رضوان ہاشمی طرف جو ابھی تک اپنے منہ سے بہنے والا خون آلود مگر جھاگ دار لعاب صاف کر رہا تھا۔

''گھر سے باہر نکلنے کے کوئی اور راستے ہیں؟''

نادر سعید کے استفسار کے جواب میں رضوان ہاشمی نے اپنی گردن سہلاتے ہوئے اُسے نیچے کی جانب ہلکی سی جنبش دی۔ چوہدری ضیا پھر سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ''کس طرف؟ کتنے راستے؟''

''ایک ہی ہے سرونٹ کوارٹر کی جانب سے۔'' رضوان ہاشمی منہ دکھنے کے سبب بمشکل جواب

دے پا رہا تھا۔ یہ سنتے ہی چوہدری ضیا نے پھرتی سے اندر کی جانب کھلنے والا دروازہ کھولا اور تقریباً دوڑتا ہوا زنان خانے میں گھس گیا۔ رضوان ہاشمی چیختا رہا کہ گھر میں سوائے ملازم کے اور کوئی نہیں ہے لیکن وہ اس کی بات سنے بنا ہی دندناتا ہوا اندر جا چکا تھا۔ رضوان ہاشمی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں چوہدری ضیا گھریلو ملازم کو سر کے بالوں سے پکڑ کر تقریباً کھینچتا ہوا ڈرائینگ روم میں لے کر آ گیا۔ تکلیف سے اُس کی آنکھیں باہر کو اُبلی پڑی تھیں۔ لگ رہا تھا کہ اُسے یہاں لانے سے پہلے چوہدری ضیا نے اُس کی دھنائی میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ''اِس بھڑدے نے اُسے اپنے کوارٹر کے راستے سے باہر نکالا ہے۔'' چوہدری ضیا اِس مشقت کے سبب مسلسل ہانپ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے! چھوڑو اِسے، جانے دو، وہ بھڑوا کہاں تک بھاگے گا۔'' نادر سعید کے کہنے پر چوہدری ضیا نے ملازم کو ایک طرف دھکا دیا اور وہاں سے بھاگ جانے کے لیے گردن پر ہاتھ بھی ٹکا دیا۔

''ہاں جی وکیل صاحب! اب ذرا اُس لڑکی کی بات بھی ہو جائے، کہاں ہے وہ؟'' ڈی ایس پی نادر سعید کا لہجہ ایک بار پھر سفاکانہ ہو چکا تھا۔

رضوان ہاشمی کے چہرے پر سراسیمگی چھا گئی۔ پولیس کے جس ریڈ کو وہ حاجی بخشن کی گرفتاری پر محمول کر رہا تھا، وہ تو کہیں رُباب کی باز پرس کا کوئی باب نکلا۔ اِس بدل چکی صورت حال میں وہ کچھ بھی کہے بغیر گردن جھکا کر منہ میں جمع ہو چکے لعاب کو ٹشو پیپر سے پونچھ کر باہر نکالنے لگا۔

''وکیل صاحب! میں رُباب کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔'' نادر سعید کا لہجہ کچھ اور بھی سخت ہو چلا تھا۔ رضوان ہاشمی کو یوں لگا کہ اب اُسے پھر سے تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا۔ رُباب کا تو اُسے اب خود بھی علم نہیں تھا کہ جبار سمیت وہ گئی تو گئی کہاں۔ زندہ ہے یا مردہ، ملک میں ہے یا بیرون ملک کچھ بھی علم میں نہیں تھا۔ اُس نے سوچا کہ ڈی ایس پی اُس کی کسی بات پر یقین نہیں کرے گا، اِس پر تو بالکل نہیں کہ وہ اور جبار دونوں لاپتہ ہیں۔ اچانک ہی اُسے اپنا وہ جواب یاد آیا جو وہ حاجی بخشن کو دے چکا تھا۔ اُس نے سر اُٹھایا اور ڈی ایس پی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پورے اعتماد کے ساتھ بولا۔

''زباب حاجی بخشن کے پاس ہے، کچہری والے واقعے کے بعد وہ اُس کے ڈرائیور کے پاس دو دن رہی ضرور تھی مگر بعد میں جبار اُسے خود حاجی بخشن کے حوالے کر آیا تھا۔''

''جناب یہ جھوٹ بول رہا ہے، لڑکی اِسی کے پاس ہے۔'' چوہدری ضیا نے ابھی جملہ مکمل ہی کیا تھا کہ اُس کے موبائل فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اُس نے نمبر دیکھا اور پھر ڈی ایس پی کی طرف دیکھتے ہوئے فون کو کان سے لگا لیا۔ دوسری جانب سے کی جانے والی گفتگو اُس کے چہرے سے ظاہر تو نہیں ہو رہی تھی لیکن اتنا تاثر ضرور تھا کہ جو کچھ بھی اُدھر سے تھا، خاص تھا۔ فون بند کرنے کے بعد چوہدری ضیا نے ڈی ایس پی کی طرف دیکھا جو اُسے سوالیہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔

''جناب! پولیس اسٹیشن سے فون تھا، کچھ لوگ ایک درخواست پر سیشن جج صاحب کا حکم لے کر آئے ہیں اِن وکیل صاحب کے خلاف قتل کے پرچے کا، اُن کی کسی عزیزہ کو اِس نے کچھ عرصہ محبوس رکھنے کے بعد قتل کر دیا ہے، اب کیا حکم ہے آپ کا؟''

۳۹

اللہ ڈتو عبید کے پیدا کردہ ماحول میں صاحبزادہ سلطان احمد تونگر کے لیے ناشتہ کرنا ناممکن ہوا تو اُس نے اپنے فکری انتشار کو یکسو کرنے کے لیے بلیک کافی کا نصف سے زیادہ کپ بھرا اور اُسے محض دو گھونٹ کرتے ہوئے اپنے حلقوم میں اُنڈیل لیا۔ کافی کی کڑواہٹ کے معدوم ہوتے ہوتے کیفین نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ کچھ لمحے پہلے کی یبوست زدہ بے چینی نے جیسے نیا چغہ پہن لیا اور بڑھتے ہوئے فشارِ خون کے باوجود اُس کے مزاج میں ٹھہراؤ آتا جا رہا تھا۔ اپنے سامنے رکھے ٹوسٹ، آملیٹ اور شہد کو ایک بار پھر نظر انداز کرتے ہوئے تونگر نے خالی کپ کو اُٹھایا اور اُسے بلیک کافی سے بھر لیا مگر اب کے دو گھونٹ کرنے کی بجائے ہلکے ہلکے سپ لینے لگا۔ اللہ ڈتو عبید سے آج کی ملاقات اپنی تفاصیل سمیت کسی فائل کی طرح اُس کے سامنے کھلی رکھی تھی کہ جس کی ایک ایک سطر سُرخ ہائی لائٹر سے نمایاں کی گئی تھی۔ صفحے کے درمیان میں ایک چوکھٹا بھی تھا کہ جس کے بیچوں بیچ اُس کے قتل کی دھمکی بھی جلی حروف میں لکھ دی گئی تھی۔

کھلی ہوئی فائل کے ساتھ دو پرچیاں بھی پیپر پن سے نتھی کی گئی تھیں۔ایک پر جانان کے تغافل اور لاتعلقی کے بارے میں نوٹ لکھا گیا تھا اور دوسری پر وہ ساعت منجمد تھی کہ جس دوران گل رُخ کی آنکھوں میں اُبھرا کسی ڈار سے بچھڑی کونج کی آنکھ کا رنگ کاجل کی طرح اپنے پورے پھیلاؤ میں تھا۔تونگر کے لیے اِس فائل کی ایک ایک سطر اگرچہ استعجاب کو معنی در معنی لیے ہوئے تھی لیکن آج اُس نے اِس فائل پر کوئی فیصلہ نہیں کرنا تھا اور نہ ہی کوئی رائے دینی تھی بلکہ اِس کی سرخی زدہ سطروں سے بچ نکلنے کا محفوظ راستہ تلاش کرنا تھا۔آج کی ملاقات سے جو نکتہ وضاحت سے منشرح تھا وہ بس ایک ہی تھا کہ اللہ ڈنو عبید اُسے واقعی قتل کرنا چاہتا ہے مگر اُسے ایک دم ایک وار سے نہیں بلکہ اُس کے اعصاب کو چٹخا چٹخا کر، اُس کے لہو سے زندگی نچوڑ کر، اُس کے عضلات کو جنبش تک کی سکت سے محروم کرتے ہوئے، اُس کے ذہن کے بَل نکال کر اُن کا ملیدہ بناتے ہوئے اِس طرح کہ اُس کا شمار زندوں میں کرنا ممکن نہ رہے۔باقی سب بہانے تھے کہ اُس سے کوئی کام لینا مطلوب ہے، اُس سے رُباب نام کی کسی لڑکی کو تلاش کرانا ہے یا تونگر کو کسی کمپنی کی قیادت سونپے بنا اُس کا بزنس نہیں چلتا۔اگر سب کچھ ایسے ہی تھا تو بنیادی سوال پھر بھی اپنی جگہ پر کہ وہ اُسے کیوں اور کس لیے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا ہے اور موت بھی ایسی اذیت ناک کہ جیسے نازی کیمپ یا گوانتاناموبے جیل میں کسی قیدی کے مسام مسام سے زندگی کو نشتر کی نوک سے نکالا گیا ہو۔آخر بگاڑا کیا ہے اُس نے اِس شخص کا کہ جو اُس کی عنایات کے سبب اتنی بڑی بزنس امپائر کا مالک بنا مگر اُس نے پوری ملازمت میں اُسے اِس طور دیکھا تک نہیں تھا۔

ایسے میں ایک بار پھر گل رُخ اُس کے پاس سے گزری کسی خوشبو کے جھونکے کی طرح جو دور جاتے قدموں کے ساتھ ہی اپنے آپ ہی معدوم ہوتا چلا گیا۔تونگر نے اِس خوشبو کو چھونا چاہا مگر صرف اُس کی آنکھوں کے رنگ ہی پہچان سکا۔وہی کسی ڈار سے بچھڑی کونج کی آنکھوں کا سا رنگ۔

تونگر نے آنکھیں موند لیں۔وہ تادیر اِس رنگ کو اپنی آنکھوں اور اپنی حیات میں محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔مگر آنکھیں بند کرتے ہی ایک اور خیال اُس کے ذہن کے کسی گوشے سے اُبھرا اور

بدن میں ارتعاش بن کر پھیلتا چلا گیا۔ ''کیا یہاں میں اپنی موت کی تلاش میں تو نہیں آیا؟'' تونگر نے اِس کا جواب اپنے اندر تلاش کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ ہم سب پیدا ہوتے ہی موت کی جانب بھاگنا شروع کر دیتے ہیں کہ جو کبھی پاس تو کبھی دور سے اپنے تمام رنگوں کے ساتھ مختلف سوانگ رچا کر اپنے پنجوں میں جکڑتی چلی جاتی ہے۔ کبھی کسی محبوب کی صورت، کبھی کسی دشمن کی جستجو کا بھیس بدل کر۔ کبھی کسی لوبھ کے چسکے میں تو کبھی اقتدار کے سنگھاسن کے خواب دکھلا کر۔ ''تو کیا اُس کا اللہ ڈنو عبید کے دکھلائے گئے خوابوں کا تعاقب کرتے ہوئے ذلت کی اِس نہج تک پہنچنا حقیقت میں اُس کے خاتمے کا بہاؤ ہے کہ جس کی آخیر تک پہنچ پانے کے واسطے جانان اور گل رخ جیسے رنگوں کا سہارا لیا گیا ہے؟'' تونگر جھرجھری لے کر رہ گیا۔ اُسے یقین ہو چلا تھا کہ اُس کی موت اللہ ڈنو کی بجائے انہی دو حسیناؤں کے ہاتھوں لکھی جا چکی ہے۔ اُس نے موت کی آنکھوں میں موجود بے رحم اُداسی کے بارے کہیں پڑھ رکھا تھا، اُسی بے رحم اُداسی کی پرچھائیاں اُسے کبھی جانان اور کبھی گل رخ کی آنکھوں میں دکھائی دینے لگی تھیں۔ اُس نے بہت پیچھے مڑ کر دیکھا مگر اِس جیسے شہادت آلود رنگوں کی اداسی کا سایہ تو اُسے اپنی سابقہ ہو چکی بیوی کی آنکھوں میں بھی کبھی دکھائی نہیں دیا تھا۔

سلطان احمد تونگر اچانک گڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ اللہ ڈنو عبید اگرچہ اُس کے سامنے اپنے مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ موجود تھا مگر عدم تحفظ کے کھلے دروازوں سے در آنے والے بھیانک خیالوں کے گرداب میں بار بار غوطے کھاتے ہوئے تونگر کے واسطے یہ منظر بھی اُسے اُس پوری اسکیم کا حصہ لگا کہ جس پر عمل کرتے ہوئے اُسے اُس کے مقتل تک لے کر جانا مطلوب تھا۔

''کچھ کھائے بغیر صرف پیو گے تو بیمار ہو جاؤ گے تونگر صاحب، اور یہ تو آپ جانتے ہو کہ اگر آپ جیسے دوست خدانخواستہ بیمار ہوں تو میں کتنا پریشان ہوتا ہوں، آیئے اب اُدھر چل کر کچھ کھاتے ہیں اور کچھ پیتے بھی ہیں۔'' آخری جملہ اللہ ڈنو عبید نے کچھ اِس معنی خیز انداز میں کہا کہ تونگر لرز کر رہ گیا۔ لیکن اُس کے اندیشوں کے برعکس وہ قہقہے لگاتا ہوا اُس کا ہاتھ تھام کر اپنے دفتر کی طرف لے گیا کہ جہاں سے کچھ دیر پہلے اُسے بے عزت کر کے نکالا گیا تھا۔ تونگر کا چلنے کا انداز

گھسٹنے جیسا تھا کہ جیسے اُسے زندگی کے آخری لمحات میں قربان گاہ کی جانب لے جایا جا رہا ہو۔
جانان کے کیبن کے سامنے سے گزرتے ہوئے اُس کی پھٹی پھٹی آنکھیں جانان پر پڑیں لیکن وہ کسی
طرف بھی دھیان دیئے بغیر بظاہر اپنے کام میں مگن تھی۔ تونگر اُسے اپنے آخری لمحات کا گواہ بنانا چاہ
رہا تھا کہ کوئی تو دیکھے اور باہر جا کر کہہ سکے کہ ماضی کے اتنے نامی بیوروکریٹ کی زندگی کے آخری
لمحات میں اُس کے ساتھ گزری تو آخر کیا گزری!

اپنے آفس میں لے جا کر اللہ ڈنو عبید نے تونگر کو زبردستی اپنی کرسی پر بٹھا کر خود اُس کے
سامنے مہمانوں کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تونگر کو جز بز ہوتا دیکھ کر اللہ ڈنو نے پھر ایک استہزائی قہقہہ لگایا۔
''میرے افسر صاحب! آپ افسروں والی کرسی پر بیٹھے اچھے لگتے ہو اور میں وہیں پر کہ جہاں آپ
کے سامنے سوالی بیٹھا کرتے تھے، لیکن تونگر صاحب! ایک بات ہے، اب آپ کو ''آپ'' کو کہنا جچتا
نہیں، آپ جیسے گھٹیا آدمی کو آپ کہوں تو کہیں ''آپ'' کا لفظ ہی مجھ سے ناراض نہ ہو جائے۔''

اُسے اپنی کرسی پر بٹھانے کے بعد اللہ ڈنو کے یوں بدلتے لہجے نے تونگر کو چکرا کر رکھ دیا۔
اُس کا نچڑا ہوا چہرہ کچھ اور زرد پڑا تو اللہ ڈنو عبید نے اُس کے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
ہذیانی انداز میں ہنسنا شروع کر دیا۔ ہنستے ہنستے بے حال ہوا تو ایک دم سنجیدہ ہو کر کرسی سے اُٹھا اور
تونگر کو بازو سے پکڑ اپنی کرسی سے اُٹھا دیا اور اُسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے جلدی سے خود بیٹھ گیا۔
تونگر کے زرد ہوئے چہرے کے نقوش اب کے حیرت سے بگڑ کر رہ گئے۔ جس اللہ ڈنو عبید کو وہ اب
تک شاطر اور سفاک سمجھتا چلا آ رہا تھا اُس کی تو ذہنی صحت مشکوک ہو چلی تھی۔ اللہ ڈنو عبید کے
بارے میں متلون مزاجی کا تاثر زائل ہوا تو اُس کی سبھی حرکتیں پاگلوں کی سی لگنے لگیں۔ تونگر کو یوں
اپنے سامنے حیران و پریشان کھڑے دیکھ کر اللہ ڈنو نے اُسے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا
اشارہ کیا۔ تونگر صورتِ حال کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گیا۔

''حیران ہو کر کیا دیکھتے ہو کہ میری یہ ساری ایمپائر تمھاری کھڑی کی ہوئی ہے؟ بھڑوے! یہ
سب تمھاری اور تمھارے جیسے کئی فائل فروش تونگروں کے سبب کھڑی ہوئی ہے، اپنی فائل فروشی
سے جتنا تو نے مجھے دیا اُتنا ہی تو نے خود کمایا مگر یہ اور بات کہ تیری کمائی ہوئی دولت تمھارے کام

نہیں آئی، سب تمھاری بیوی اور اُس کا یار لے اُڑے.... چچ! چچ! ترس آتا ہے مجھے تم پر کہ جس کے پاس ورر ہا ہے اور نہ ہی گھر۔''

''مجھ سے کیا چاہتے ہو اللہ ڈنو عبید؟'' تونگر نے اچانک سے ہی اپنا کھویا ہوا اعتماد اپنے لہجے میں مجتمع کر لیا تھا۔ اُس کے چہرے پر آئی ہوئی زردی جاتی رہی اور جبڑے بھنچ سے گئے۔

''میں کیا چاہتا ہوں! بہت ریلے وینٹ (relevant) سوال ہے، ہوں۔'' اللہ ڈنو عبید کے چہرے پر فلسفیوں جیسی گھمبیرتا چھا گئی۔ اُس نے تونگر سے کچھ کہے بغیر انٹر کام پر ایک بٹن دبایا اور چند لمحوں میں جانان کمرے میں آ چکی تھی۔

''مجھے صبوحی چاہیے، صرف مجھے نہیں اِس بھڑوے کو بھی، آج اِس کا بھی تعارف کرا دیتے ہیں میری جان صبوحی سے۔''

جانان کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ جانتی تھی کہ باس کا صبوحی کا تقاضا کرنا کیا معنی رکھتا تھا۔ اُس نے کنکھیوں سے تونگر کے تاثرات بھی بھانپ لیے تھے جو اِس تذکرے پر بھی خاموش تو تھا لیکن اُس کا چہرہ بول رہا تھا۔ جانان نے لمبا سانس لینا چاہا مگر لے نہ سکی۔ اُس کے نزدیک جو بھی آخر کار ہونا تھا، وہ آج ہونے جا رہا تھا۔ اُس نے باس کی آنکھوں میں پھر سے جھانکا اور کیٹ واک کے سے انداز میں کمرے کے تاریک گوشے کی طرف چلی گئی۔ واپسی پر اُس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں بلیو لیبل وِسکی کی میگنم سائز بوتل، کرسٹل کانچ کے دو گلاس اور آئس باکس رکھا تھا۔

''جب کوئی تم سا بھڑوا میری صبح خراب کرنے کی کوشش کرے تو میں بلیو لیبل لیتا ہوں، صبوحی کے طور پر، میں ذرا دو لگا لوں تو پھر جواب دیتا ہوں تمھارے سوال کا، عملی طور پر کہ تم جیسے گھسے ہوئے کارتوس سے میں کیا چاہتا تھا۔''

جانان نے وہیں کھڑے کھڑے دو پیگ بنائے، ایک میں بنا برف ڈالے باس کو پیش کیا اور دوسرے میں برف کی مقدار معلوم کرنے کے لیے تونگر کی طرف دیکھا۔ تونگر نے اپنے سامنے رکھا ہوا پیگ اپنے دائیں ہاتھ کی جنبش سے میز کے آخری کنارے تک سرکا دیا۔

''تو تم نہیں پینا چاہتے، کتنے بدقسمت ہو کہ صبوحی نہیں پینا چاہتے، خیر تمھارے حصے کی صبوحی ہر بار کوئی اور پی جاتا ہے اور تم دیکھتے رہ جاتے ہو۔'' اللہ ڈنو نے انتہائی لاتعلقی سے پیگ اُٹھایا اور تونگر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے ایک بڑا سا گھونٹ لیا اور گلاس کو کھٹاک سے میز پر اپنے سامنے رکھ دیا۔ تونگر ابھی تک پلک جھپکائے بغیر مسلسل اُس کی طرف دیکھے جا رہا تھا جب کہ جانان بھی وہیں کھڑی اللہ ڈنو کے اگلے حکم کی منتظر تھی۔

''جانان! میری جان پیگ اُٹھاؤ اور اُس کا پہلا گھونٹ لے کر نشے سے تر ہونٹوں سے میرے ہونٹوں کا بوسہ لو۔'' اللہ ڈنو نے نیم دراز حالت میں گردن کو کرسی سے ٹکا کر چہرہ اوپر کی جانب کرتے ہوئے اپنے ہونٹوں کو ادھ کھلا چھوڑ دیا۔ جانان نے کسی روبوٹ کی طرح اپنے لبوں کو شراب سے گیلا کیا اور آگے بڑھ کر اُنھیں باس کے نیم وا ہونٹوں پر چپکا دیا۔ تونگر نے کراہت آمیز انداز میں گردن کو ایک طرف موڑتے ہوئے نیچے کی جانب جھکا لیا۔ اُس کے چہرے پر پھیلی ہوئی بیزاری کڑواہٹ بن کر حلق تک جا پہنچی تھی۔ عجیب بات یہ بھی تھی کہ ابھی کچھ دیر پہلے تک اُس کے حواس پر سوار موت کا خوف اپنے آپ ہی کہیں جاتا رہا تھا۔

''یہاں میرے قریب ہی بیٹھ جاؤ۔'' جانان کے لب جدا ہوئے تو اللہ ڈنو پھر سے کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا جب کہ باس کے حکم کی تعمیل میں جانان بھی تونگر کے ساتھ رکھی کرسی کو اپنی جانب گھسیٹ کر اُس کے ساتھ ہو بیٹھی۔ اگرچہ اُس کے چہرے پر کچھ دیر پہلے تک کی روبوٹک یبوست جاتی رہی تھی لیکن صرف اللہ ڈنو عبید کے لیے۔ تونگر کے لیے اُس کے چہرے پر تو کیا پورے بدن سے منفی لہریں اُٹھتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

اُس وقت تک ماحول میں صرف خاموشی باتیں کرتی رہی کہ جب تک اللہ ڈنو عبید نے صبوحی کا آدھے سے زیادہ گلاس اپنے اندر نہیں اُتار لیا۔ پیگ میں ایک گھونٹ باقی بچ رہا تو اُس نے جانان کو کلائی سے پکڑا اور اپنے زانو پر بٹھا کر دوسرا بازو اُس کی کمر کے گرد حائل کر لیا۔

''یہ میرا اُفسر! یہ چوتیا مجھ سے پوچھتا ہے کہ میں اِس سے کیا چاہتا ہوں، تم نے بتایا نہیں اس کو کہ میں کیا چاہتا ہوں؟'' اللہ ڈنو عبید نے جانان کے لبوں پر اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی پھیرتے

ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آہستہ سے پوچھا۔ جملہ ختم ہوتے ہوتے جانان کی آنکھوں میں بھی دلربائی کی بجائے خوف کی ہلکی سی لہر جاگی مگر اُس نے کمال مہارت سے چہرے کے تاثرات کو یوں بدل لیا کہ جیسے وہ تمام معاملات سے لاتعلق رہی ہو۔ جانان کے چہرے کے تاثرات بدلتے ہی اللہ ڈنو نے اُسے دھکیل کر اپنے زانو سے اِس طرح اُٹھایا کہ اُس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس فرش پر جا گرا۔ جانان خود بھی بمشکل گرتے گرتے بچی مگر ردِعمل کو ظاہر نہ ہونے دیا کہ اِس کے بطن سے جنم لینے والے ردِعمل کے نتائج کو وہ اچھی طرح سے جانتی تھی۔ لیکن جانان کے ساتھ اللہ ڈنو کے رویے کا پل بھر میں اِس طرح سے وحشیانہ ہو جانا ناقابل برداشت تھا۔ وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''تم ہو کیا اور کیا سلوک کرتے ہو اپنے لوگوں سے! تم تو ذہنی مریضوں سے بھی بدتر ہو، وہ بھی اپنا گریبان پھاڑتے ہیں، دوسروں کا نہیں، کیا سمجھ رکھا ہے تم نے کہ مجھے موت کے خوف میں رکھو گے، مجھے بلیک میل کرو گے، مجھے مینٹل ٹارچر دو گے تو میں تم سے ڈر جاؤں گا، میرے سامنے دوسروں کو بےعزت کرو گے تو کیا میں تمھارے تلوے چاٹنے لگوں گا، ایک دلال ذہنیت کا شخص، افسروں کو عورتیں پیش کر کے اپنے کام نکلوانے والا بےغیرت مجھے کیا ڈرائے گا، جو کچھ اب تک ہونا تھا، ہو چکا.... نکالو ریوالور اور مارو مجھے گولی تاکہ جان چھوٹے روز کی اِس بک بک سے۔'' شدتِ طیش سے تونگر کا پورا بدن کانپنے لگا تھا جب کہ حالات کی سنگینی سے خوف زدہ جانان بھی ایک کونے میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن خلاف توقع نہ تو اللہ ڈنو عبید بھڑکا اور نہ ہی کسی قسم کے منفی ردِعمل کو ظاہر ہونے دیا۔ وہ بس ٹکٹکی باندھے تونگر کی غضب ناکی کو یوں تکے جا رہا تھا کہ جیسے اُس کا لطف لے رہا ہو۔

تونگر کی بھڑاس نکل چکی تو وہ کھانسنے کے ساتھ ساتھ بری طرح ہانپنے لگا۔ اللہ ڈنو نے اُسی لطف لینے والے انداز میں میز کی دراز کو کھولا اور بدستور تونگر پر نگاہیں جمائے ہوئے اُس سے ریوالور باہر نکال کر میز پر گھمانے لگا لیکن اُس کی توقعات کے برعکس تونگر نے اُس کا نوٹس تک نہ لیا۔ وہ شاید اِن حالات اور مسلسل ذہنی اذیتوں سے دوچار بےکیف زندگی سے تنگ آ چکا تھا۔

جانان کچھ اور سہم کر کونے میں دہری ہو گئی۔ وہ اللہ ڈنو عبید کی فطرت سے واقف تھی جو کسی لمحے کچھ بھی کر سکتا تھا۔

''کتنی تکلیف ہوئی ہے تمھیں جانان کو دھکا دینے کی، کیسی ٹیس اُٹھی ہے تمھارے دل میں، باؤلے ہو گئے ہو کہ اپنی جان کی بھی پروا نہیں رہی، سب جان چکا ہوں میں، معلوم نہیں اِس بڑھاپے میں بھی تمھارے پاس کون سا جادو ہے کہ جانان اور گل رخ جیسی جوان عورتیں اپنی زندگی کو داؤ پر لگا کر تمھاری ہمدرد بننے کی کوشش میں ہیں، میری مہربانیاں تک بھلا دی ہیں۔'' اللہ ڈنو عبید نے یہ سب کچھ بہت آسانی سے، طیش میں آئے بغیر کہہ دیا اور آنکھیں موند لیں۔

کمرے میں مکمل خاموشی تھی، جان لیوا خاموشی۔ کچھ دیر میں ہی اللہ ڈنو نے آنکھیں کھول دیں جو ضبطِ غیض کے سبب سُرخ ہو رہی تھیں اِس طرح کہ جیسے ابھی ابھی اِن میں لہو انڈیلا گیا ہو۔

''تونگر! ابھی تک قسمت تمھارا ساتھ دیتی چلی آ رہی ہے اور مجھے وہ طریقہ ہی نہیں سوجھ رہا کہ جس کے ذریعے میں تمھیں اتنی اذیت دے کر، اتنی اذیت دے کر قتل کروں کہ میرے دماغ میں کھولتا ہوا بھیجا ٹھنڈا ہو سکے، میں نے تمھیں ہر لحاظ سے بھونا ہے مگر تم اتنے ڈھیٹ ہو کہ کسی بھی ذلت، کسی بھی اذیت کا تم پر اثر ہی نہیں ہوتا، تم تڑپتے ہی نہیں، چیختے اور چلاتے ہی نہیں، اب میں تمھاری جان تمھیں بتا کر نہیں، اچانک سے نکالوں گا، اچانک سے لیکن اس قدر بھیانک طریقے سے کہ موت کو بھی تمھیں مارتے ہوئے ترس آئے گا۔'' اللہ ڈنو نے انتہائی تکلیف کے عالم میں آنکھیں موند لیں مگر بس ایک لمحے کے لیے اور پھر دوبارہ کھولتے ہوئے ریوالور کو خاموشی سے دراز میں رکھ دیا۔

''میں آج اور اِسی لمحے تمھیں اِس طرح آزاد کر رہا ہوں کہ ہر وقت، ہر لمحے تمھاری آخری سانس تک، تمھارا پیچھا کرتے ہوئے تمھیں اپنی مرضی سے قتل کر سکوں، بس مجھے وہ طریقہ سوجھنا چاہیے کہ جس سے تم ایک دم نہیں بلکہ مسلسل مرتے رہو، کئی دنوں تک، کئی مہینوں تک، میں تمھاری اِن دونوں خیر خواہوں کو بھی تمھارے حوالے کر رہا ہوں تاکہ اِن کے حصول کے بعد اِن سے بہت جلدی بچھڑ کر موت کے گھاٹ اترنے کا تصور ہی باقی ماندہ دنوں میں تمھارے لیے سوہانِ روح بنا

رہے، اور ہاں اب رہا تمھارا سوال، اُس کا جواب اگر یہ دونوں تمھیں نہ دے سکیں تو میں ضرور دوں گا مگر ابھی نہیں، تمھاری آخری ہچکی کے وقت۔"

۴۰

حاجی بخشن کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پولیس رضوان ہاشمی جیسے وکیل کے گھر کا گھیراؤ کرتے ہوئے زبردستی اندر گھسنے کی کوشش بھی کر سکتی ہے۔ اگر وہ ہاشمی کے ملازم کی مدد سے اُس کے کوارٹر کے راستے باہر نکلنے میں چند لمحوں کی تاخیر بھی کر دیتا تو شاید اِس وقت حیدر گوٹھ سے نکل کر کچے کے دریائی علاقے کی جانب سفر نہ کر رہا ہوتا بلکہ چوہدری ضیا کے کسی نجی ٹارچر سیل میں موجودہ آئی جی سمیت درجنوں مہربان پولیس افسروں پر سالہا سال سے کیے گئے اپنے احسانات کا صلہ وصول کر رہا ہوتا۔

رضوان ہاشمی کے گھر سے بحفاظت فرار میں اُس کے ڈرائیور نے جس قسم کی پھرتی کا مظاہرہ کیا، اُس کی توقع بھی کم از کم اُس سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ پولیس کو رضوان ہاشمی کے گھر کی طرف جاتا دیکھ کر نجانے کیسے اُس کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ بخشن کی گاڑی کو نہ صرف وہاں سے ہٹا کر کافی فاصلے پر مین روڈ پر لے آیا بلکہ بخشن کو بھی موبائل فون پر اپنی نئی پوزیشن کی اطلاع کر دی۔ بخشن کے نزدیک اِس ہونق ڈرائیور سے اِس قسم کی حرکت کا سرزد ہو جانا اِس بات کا اشارہ تھا کہ قدرت ابھی اُسے زندہ اور صحیح سلامت رکھنا چاہتی ہے۔ وہاں سے نکلتے ہی سب سے اہم سوال کسی محفوظ پناہ گاہ تک پہنچنے کا تھا۔ اتنا تو وہ جان چکا تھا کہ رُباب نامی لڑکی کی آڑ میں اُسے جس طرح قانون کے شکنجے میں پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے اُس سے پولیس اور انتظامیہ کے بڑوں کی نیت کی عبارت پر مزید غور کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اندیشہ یہ بھی تھا کہ اگر ایک بار وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو شاید زندگی بھر جیل سے باہر آنا اُس کے مقدر میں نہ رہے۔ اُس کا اپنا شہر حیدر گوٹھ کہ جہاں وہ دوستوں اور دشمنوں کو تھانہ کچہری سے بچانے یا پھنسانے کے لیے اپنی ٹِیہاری لگایا کرتا تھا اب اُس کے لیے کسی تھانے کی حوالات بن گیا تھا۔ حیدر گوٹھ کے بازار،

شاہراہیں، گلیاں اور مکان اُسے چوہے پکڑنے کی کُڑکی کی مانند دکھائی دینے لگے تھے کہ جہاں سے بچ نکلنا ہر لمحے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

حاجی بخشن کے اپنے اندازے کے مطابق اُس کے وہاں سے نکلنے کے دس منٹ کے اندر ہی پولیس کو اُس کے فرار کا علم ہو گیا ہو گا لہٰذا بچت اِسی میں تھی کہ وہ انہی دس منٹوں میں شہر کی حدود سے باہر نکل جائے۔ لینڈ کروزر کی جس عقبی نشست پر وہ بیٹھا ہوا تھا، وہ وہیں لیٹ گیا تاکہ باہر سے دکھائی نہ دے سکے۔ جب کہ ڈرائیور کو بس اتنا کہا کہ حیدر گوٹھ سے پچاس کلومیٹر دور دریا کے کچے اور دلدلی علاقے کی جانب لے چلو کہ جو سخت گیر جرائم پیشہ لوگوں کی محفوظ پناہ گاہ سمجھی جاتی تھی۔ وہاں پولیس تو کیا رینجرز بھی آپریشن کرنے سے کتراتی تھی۔ اب اگر مسئلہ تھا تو اِن پچاس کلومیٹروں کو طے کرنے کا۔

گاڑی کی پچھلی نشست پر یوں چوہے کی طرح دبکے پڑے ہوئے اُسے اپنے ڈرائیور سے ندامت کا سامنا تھا۔ جس ڈرائیور کو احمق گردان کر محض اُس کے اونچا سانس لینے پر بھی وہ اُسے مغلظات کا نشانہ بنا لیا کرتا تھا آج اُسی ڈرائیور کی ''حماقت'' کی بدولت وہ کم از کم اُس لمحے تک مامون تھا۔ جس ڈرائیور نے اُس کے سامنے پولیس کے پھنّے خان تھانیداروں کو کانپتے ہوئے دیکھا تھا اب اُسی پولیس کے خوف سے وہی ڈرائیور اُسے پچھلی سیٹ پر کسی ادھ مری چھپکلی کی طرح پڑا ہوا دیکھ رہا تھا۔ ''کیا سوچ رہا ہو گا میرے بارے میں وہ؟''

یہ خیال آتے ہی بخشن نے چاہا کہ اُٹھ کر اُسی طمطراق سے اپنی نشست پر براجمان ہو مگر حوصلہ جواب دے گیا۔ پولیس کے ٹارچر سیل میں لتر کھانے کی نسبت ڈرائیور سے آنکھ نہ ملانا اُسے زیادہ بہتر لگا۔ سیٹ پر لیٹے لیٹے اُس نے اپنا چہرہ بازوؤں کے اندر کر لیا۔ لیکن اُسی لمحے ڈرائیور کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

''صاحب جی! اُٹھ بیٹھیں، ہم حیدر گوٹھ سے کافی دور نکل آئے ہیں۔'' حاجی بخشن کو ڈرائیور کا یہ جملہ اپنے کانوں کی بجائے چوتڑوں پر رات بھر تیل میں بھگوئے ہوئے کسی لتر کی طرح لگا۔ اُس نے اپنے اِس جملے میں چھپی ہوئی لاشعوری تشنیع سے کئی برسوں سے سہی جانے والی گالیوں کا

حساب برابر کر لیا تھا۔ بخشن کسی اعصاب شکستہ بوتے کی طرح اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''صاحب جی! میری ایک اور گزارش ہے۔'' ڈرائیور کا اعتماد ہر آنے والے لمحے کے ساتھ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اُس نے بخشن کے جواب کا انتظار کرنا بھی مناسب نہ سمجھا۔

''صاحب جی! میرا خیال ہے کہ پولیس وہاں آپ کو پکڑنے نہیں آئی تھی، اُنھیں کیا پتہ کہ آپ وکیل صاحب کے پاس ہو، آپ تو اچانچیٹ وہاں گئے تھے، بغیر کسی اطلاع کے۔'' وہ اپنی بات کی داد پانے کے لیے بار بار عقبی آئینے میں بخشن کو دیکھے جا رہا تھا۔ ڈرائیور کی بات نے بخشن کو چونکا دیا۔ وہ حیران تھا کہ اُس نے صورتِ حال کو اِس زاویے سے کیوں نہیں دیکھا۔ رضوان ہاشمی کے گھر پولیس کے آ جانے کے بعد اُس کا وہاں سے بھاگ نکلنا تو بنتا تھا کیونکہ ایس ایچ اُو چوہدری ضیا نے اُسے آج کے لیے تھانے میں بُلا رکھا تھا۔ لیکن اُسے کیسے معلوم کہ وہ ضمانت کرانے کے واسطے ہاشمی وکیل کے پاس گیا ہوا ہے۔ ڈرائیور کے روبرو اُس کی شرمندگی اور بھی بڑھ گئی۔ گاڑی کی ونڈو سے باہر دیکھتے ہوئے بخشن نے سوچا کہ ہاشمی کے گھر سے نکلنے کے بعد اگر اُس نے چوہدری ضیا سے ملنے کے لیے ضمانت قبل از گرفتاری ہی کرا کے جانا تھا تو کسی اور وکیل کا بندوبست کر لیتا، عبدالرب ارباب ہی کو وکیل کر لیتا کہ جو نہ صرف ہاشمی کے پائے کا تھا بلکہ اُس سے دشمنی میں بھی چوکھا تھا۔ بخشن حیران تھا کہ وہ کان کو سنبھالے بنا، کتے کے تعاقب میں کیسے دوڑ رہا تھا۔ اُسے تو اپنی ذہنی صحت پر بھی شبہ ہونے لگا تھا۔ ایک معمولی سے جرم کے پرچے نے آخر اُسے اتنا خوفزدہ کیوں کر دیا تھا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کچے کا رخ کیے ہوئے تھا۔ جہاں تک رُباب کے معاملے کا تعلق تھا تو اُس سے اُس کا کیا لینا دینا۔ رُباب کو تو ہاشمی کا ڈرائیور جبار کہیں لے اُڑا تھا تو اُس کے کیے کی سزا اُسے کیسے دی جا سکتی ہے۔

بظاہر چغد دکھائی دینے والے ڈرائیور نے اُسے بوکھلاہٹ سے نکال کر عقلیت کی راہ پر ڈال دیا تھا۔ حاجی بخشن ایک دم اپنے آپ کو ہشاش بشاش محسوس کرنے لگا تھا۔ ذہنی تناؤ کا خاتمہ اُسے پھر سے اُسی مقام پر لے آیا کہ جہاں سے وہ اپنے ہوش گنوا کر ہاگم بھاگ ہوا تھا۔ اُس نے ڈرائیور کو گاڑی ایک سائیڈ پر روکنے کا کہا اور جیبیں ٹٹول کر اپنا موبائل فون تلاش کرنے لگا لیکن

فون کسی جیب میں بھی نہیں تھا۔ اِس دوران ڈرائیور گاڑی سڑک کی دائیں جانب درختوں کی چھاؤں تلے روک چکا تھا۔ حاجی بخشن نے اِدھر اُدھر سیٹ پر بھی فون کو تلاش کیا لیکن اُس کا کہیں وجود نہیں تھا۔

''صاحب جی! کیا ڈھونڈ رہے ہو؟ فون تو نہیں ڈھونڈ رہے؟'' ڈرائیور نے بخشن کو ایک بار پھر بوکھلاہٹ میں دیکھا تو اگلی سیٹ سے فون اُٹھا کر اُسے پکڑا دیا۔

''یہ آگے کیسے آیا؟'' بخشن کو فون ملنے کا یقین نہیں ہو رہا تھا۔

''صاحب جی! آپ نے خود ہی تو رکھا تھا جب وکیل صاحب کے گھر سے بھاگ کر نکلے تھے، پہلے اگلا دروازہ کھول کر آگے بیٹھ رہے تھے لیکن پھر میرے کہنے پر پیچھے بیٹھ گئے۔''

حاجی بخشن کو کچھ بھی یاد نہیں تھا لیکن پھر بھی کھسیانے انداز میں خاموش رہتے ہوئے فون پر کوئی نمبر تلاش کرنے لگا۔ حاجی بخشن کو فون ملا تا دیکھ کر ڈرائیور نیچے اُترا اور گاڑی کے پیچھے کھڑے ہو کر جلدی سے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس نکالی اور سگریٹ سلگانے کے بعد اُتنی ہی تیزی سے ناف تک گہرے کش پہ کش لینے لگا۔

اُدھر لینڈ کروزر میں حاجی بخشن بار بار فیض کریم کو فون کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ہر بار اُس کا نمبر مصروف جا رہا تھا۔ اِس دوران بخشن کو جتنی بھی گالیاں یاد تھیں اُس نے نجانے کتنی بار ضرب دے کر فیضو کو دے ڈالیں مگر اُس کا فون بدستور مصروف ہی رہا۔ تھک ہار کر ابھی اُس نے فون سیٹ پر رکھا ہی تھا کہ گھنٹی بج اُٹھی اور اسکرین پر فیض کریم کا نام چمکنے لگا۔

''اُو بھڑوے بے غیرت دلے! کس ماں کے یار سے لگا ہوا تھا، کبھی اپنی نوکری بھی پوری کر لیا کر، حالات کیا ہیں، کیسے ہیں، مجھے رپورٹ کیا تیرا باپ دیا کرے گا۔''

دوسری جانب سے بالکل خاموشی رہی۔ شاید وہ بخشن کے غصے سے گھبرا گیا تھا۔

''کچھ تو بول حرامی! کیا اب اُدھر آ کر تیرا منہ کھلوانا پڑے گا؟'' فیض کریم کی خاموشی سے بخشن اور بھی تلملا رہا تھا۔

''صاحب جی! ناراض نہ ہوا کریں، حالات ہی کچھ ایسے ہیں کہ مجھے آپ اپنی سمجھ بھی نہیں آ

رہی۔'' فیضو کی آواز منمناہٹ میں بدل چکی تھی۔

''ہوا کیا ہے حیدر گوٹھ میں بھڑوے کہ تیری آواز ہی نہیں نکل رہی۔'' بخشن اب اپنی روایتی رعونت میں آچکا تھا۔

''اپنے وکیل ہاشمی صاحب کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے کسی لڑکی کے اغوا اور قتل کے الزام میں، خوشی خان اور اُس کے گروپ کے کچھ وکیل پہلے ہی کسی نامعلوم حوالات میں ہیں جب کہ اُس کے باقی ساتھیوں کو پکڑنے کے لیے پولیس جگہ جگہ چھاپے مارتی پھرتی ہے، ہر پاسے خوف ہی خوف ہے۔''

''اپنی طرف تو کوئی پلسیا نہیں آیا؟''

''ناں جی، ادھر ہوٹل یا دفتر میں کوئی پولیس والا نہیں آیا۔''

سکون کی ایک لہر حاجی بخشن کے دماغ سے اُٹھی اور اُس کے پورے بدن سے اضطراب کو نچوڑتی ہوئی پاؤں کی انگلیوں سے باہر نکل گئی۔ نجانے ہاشمی کی گرفتاری پر کیوں اُس کے باطن کو تسکین سی مل رہی تھی۔ طویل عرصے کی دوستی اور بہت پرانے تعلق کے باوجود بھی ایک سرشاری سی تھی کہ جس نے صبح سے وارد ہونے والی تمام کلفتوں کو رفع کر دیا تھا۔ بخشن رضوان ہاشمی کے مستقبل کے بارے میں بھی کوئی اچھی خبر سننے کا روادار نہیں رہا تھا۔

''ہاشمی کی گرفتاری پر وکیلوں نے کوئی ایکشن نہیں لیا؟''

''ناں صاحب جی! کون وکیل ایکشن لے، خوشی خان گروپ پہلے اندر ہے اور ہاشمی صاحب کا مخالف گروپ خوش ہے کہ اب آنے والے سارے الیکشن اُن کی جیب میں ہوں گے، ویسے معاملے پر غور کرنے کے لیے وکیلوں کے صدر نے کل کوئی میٹنگ رکھی ہوئی ہے، بس ایویں ہی گونگلوؤں سے مٹی جھاڑنے لیکن اندر و اندری سارے ہاشمی صاحب کو پھٹے چڑھانا چاہتے ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے، کوئی نئی تازی ہو تو مجھے فوراً بتانا، میں دو چار دنوں تک چکر لگاؤں گا۔'' بخشن ہلکا سا مسکرایا اور فون بند کر دیا۔ ڈرائیور نے باہر سے جونہی فون بند ہوتے دیکھا تو فوراً اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ روانگی کی اجازت لینے کے لیے اُس نے عقبی آئینے میں بخشن کو دیکھا۔ ون

بھر میں پہلی بار اُس کے چہرے پر حقیقی خوشی کے تاثرات دیکھنے کو ملے تھے۔

''صاحب جی! سب خیریت ہے ناں!'' ڈرائیور کے دانت بھی باہر کو جھانکنے لگے تھے۔

''ووئے میں تو تمھیں احمق سمجھتا تھا، تو تو بڑی کام کی چیز ہے، چل گاڑی موڑ، واپس لاہور چلتے ہیں۔'' لاہور کا خیال آتے ہی شہزادی کا سراپا سرور کی مانند اُس کے حواس کو مخمور کرنے لگا۔ اُس کی انگلیوں کے نرم پوروں کے تصور نے بخشن کی پنڈلیوں میں ہلکی ہلکی اینٹھن پیدا کر دی کہ جسے سکون صرف شہزادی کے لمس سے ملا کرتا تھا۔ شہزادی کے لمس نے اُس کے ذہن میں چوہدری ضیا کو بھی لا کھڑا کیا کہ جس نے آج صبح اُسے تھانہ صدر حیدر گوٹھ میں بلا رکھا تھا۔ لیکن رضوان ہاشمی کی گرفتاری کے بعد بھی پولیس کا اُس کے ہوٹل تک رسائی نہ کرنا اور نہ ہی چوہدری ضیا کا اُسے دن بھر فون کرنا، صاف ظاہر کر رہا تھا کہ اُس کے لیے کہیں نہ کہیں کوئی نرم گوشہ ضرور پیدا ہوا ہے۔ حاجی بخشن نے چوہدری ضیا کے خیال کو ذہن سے جھٹکا اور آنکھیں موند لیں۔ کئی گھنٹوں سے سولی پر لٹکی ہوئی جند کو مکمل ٹھہراؤ نصیب ہوا تھا۔ ایسے میں شہزادی کہیں سے آئی اور اُس کے قدموں میں بیٹھ کر جوانی کے رس سے معمور اپنی گداز انگلیوں سے اُس کی پنڈلیوں کو ہلکا ہلکا دبانے لگی۔ چند لمحوں ہی میں بخشن کے خراٹے پوری گاڑی میں گونج رہے تھے۔

لگ بھگ آدھ پون گھنٹے کے واپسی سفر کے بعد ڈرائیور بھی اونگھنے لگا تھا۔ نیند سے پیچھا چھڑانے کے لیے اُس سگریٹ کی بے تحاشہ طلب ہو رہی تھی لیکن گاڑی میں بیٹھے ہوئے تو اِس کا تصور تک محال تھا۔ حاجی بخشن کو گہری نیند میں دیکھ کر اُس کا جی چاہا کہ گاڑی کہیں سائیڈ پر روک کر دو چار کش لے لے مگر یہ بھی ممکنات میں سے نہیں تھا۔ وہ بخشن کی نیند کو اچھی طرح جانتا تھا جو گھومتے ہوئے ٹائر کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ جونہی ٹائر کی حرکت تھمتی اُس کی آنکھ کھل جاتی۔ ایسے میں کوئی چارہ سوائے اِس کے نہیں تھا کہ وہ اپنے اعصاب کو نیند کے خلاف حالتِ جنگ میں رکھے۔

ابھی یہ کشمکش جاری تھی کہ اُس نے اپنی اُدھ کھلی آنکھوں سے پولیس کا ناکہ دیکھا۔ اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہاں، اِس مقام پر یہ ناکہ کب سے لگا۔ آتے ہوئے تو یہاں کچھ

بھی نہیں تھا۔ گزرے دن کے پس منظر میں اُس کے ماتھے کا ٹھنکنا اور نیند کا ہوا ہو جانا فطری ردِعمل تھا وگرنہ سالہا سال سے تو وہ پولیس کے ناکے سے تو سلامی لے کر گزرا کرتے تھے۔ ڈرائیور نے گاڑی کو رفتار کو دھیما کرتے ہوئے حاجی بخشن کو آوازیں دینا شروع کر دیں مگر اُس کا نیند سے بیدار ہونا مشکل تر ہو چکا تھا۔ اتنے میں گاڑی ناکے پر پہنچ چکی تو بریک لگانا ضروری ہو گیا کہ پولیس نے بیریئر لگا کر پوری سڑک کو بلاک کر رکھا تھا۔ گاڑی کو بریک لگی تو جہاں پولیس نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا وہاں حاجی بخشن کی بھی آنکھ کھل گئی۔ نیند اور بیداری کی ملی جلی کیفیت میں اُس نے گاڑی کے چاروں طرف پولیس کو گھیرا ڈالے پایا تو اُس کے اعصاب شل سے ہو گئے۔ وہ ڈرائیور سے پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ سب کیا ہے مگر اُس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ اتنے میں ایک کانسٹیبل نے گاڑی کا دروازہ کھول کر حاجی بخشن کو گردن سے دبوچا اور گھسیٹ کر نیچے اتار لیا۔ حواس باختگی کے اس دورانیے میں اچانک اُس کی نگاہ چوہدری ضیا پر پڑی جو فولڈنگ کرسی پر بیٹھا اُسے خونخوار نگاہوں سے گھورے جا رہا تھا۔ پولیس کے بڑے بڑے افسروں کا مالی سرپرست، اُن کی تنہائی کا ہمدم، ذاتی معاملات کا رازدان آج ایک معمولی سے ایس ایچ اُو کا سامنا کرتے ہوئے اندر سے لرز رہا تھا۔

''اِدھر لاؤ اِس دَلے کو! نیٹو کی شراب کے پورے کنٹینر کھا گیا، پورے علاقے کو رنڈی بازی اور لونڈے بازی کا گڑھ بنا دیا اور اب یہ چوتیا بڑا سیانا بن کر بھاگ رہا تھا، یہ نہ سمجھ سکا کہ تیرا فضلو اور اُس کا فون تو ہمارے قبضے میں ہیں، تو نے فون کر کے اپنی لوکیشن خود بتا دی اور میرا کام آسان ہو گیا، اب بتا کون سے افسر سے فون کرائے گا اور کون سی عدالت سے ضمانت! میں نے تو تیری گرفتاری ڈالے بغیر تجھے زندہ کھا جانا ہے۔''

۴۱

اَب کی بار اللہ ڈِنو عبید واقعی اپنے قول کا پکا نکلا۔ صاحبزادہ سلطان احمد تونگر کو اللہ ڈنو عبید کی خدائی سے باہر نکال دیا گیا تھا مگر اِس طرح کہ نہ تو اُس کی جیب میں پھوٹی کوڑی تھی اور نہ ہی کوئی

شناختی دستاویز۔ جانان اور گل رخ دونوں نے بھی اُس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اللہ ڈنو نے اُنھیں زبردستی نکالنا چاہا مگر وہاں اُن کا رونا دھونا اور تجدیدِ وفاداری شاید وقتی طور پر معافی کا جواز مان لی گئی۔ جب کہ تونگر کے ساتھ اتنی مہربانی ضرور کی گئی کہ اُسے ایک سوزوکی کیری میں بٹھا کر شہر کے وسطی علاقے میں چھوڑ دیا گیا۔

خالی جیب اور خالی پیٹ تونگر کے لیے سب سے پہلی ضرورت روزمرہ اخراجات کے لیے رقم کا حصول تھا۔ اِس شہر میں جہاں اُس کے سبھی کام سوچتے ہی ہو جاتے تھے، اب ایک پہاڑ بن کر اُس کے سامنے تھے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر ڈھونڈنے کے بعد اُسے ایک بینک کا اے ٹی ایم بوتھ دکھائی دے گیا۔ اے ٹی ایم کارڈ کی عدم موجودگی میں، بائیومیٹرک ٹرانزیکشن کے ذریعے وہ ایک محدود رقم ہی نکلوا سکتا تھا۔ چند لاکھ کے اِس اکاؤنٹ سے پچیس ہزار روپے اُس کے ہاتھ میں آتے ہی وہ اپنے آپ کو دنیا کا متمول ترین شخص سمجھنے لگا تھا۔ اُسی اے ٹی ایم سے اُس نے اپنے پینشن اکاؤنٹ کا بیلنس معلوم کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ اپنے زندہ ہونے کا سرٹیفکیٹ پیش نہ کرنے کے سبب اُسے بلاک کیا جا چکا تھا۔ اِس کی بحالی کو اگلے دن پر موخر کرتے ہوئے تونگر نے سب سے پہلے اپنے لیے کپڑوں کے دو مناسب سے جوڑے خریدے اور ٹیکسی کے ذریعے سول آفیسر کلب جا پہنچا کہ جہاں ریٹائرمنٹ سے کچھ عرصہ قبل وہ اِس کا انتظامی سربراہ رہا تھا۔ اگرچہ اِس حالت میں سول کلب جانا اُس کے لیے شرمندگی اور الجھن کا باعث ہو سکتا تھا لیکن اِن حالات میں سوائے یہاں ٹھہرنے کے اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔

گزشتہ کئی ہفتوں سے وہ جس قدر ذہنی اذیت سے گزرا تھا اُس نے تونگر کے اعصاب کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اللہ ڈنو عبید نے اُس کے ساتھ کسی جنگی قیدی کا سا سلوک کیا کہ جسے ہر لمحے ایسی ایسی ذہنی اور جذباتی پٹخنیاں دی جاتی رہیں کہ وہ نہ صرف قوتِ فیصلہ سے محروم ہو گیا بلکہ اپنا دفاع کرنے اور خود سے کچھ سمجھنے اور کرنے کی صلاحیت بھی کھو بیٹھا۔ ایسے میں وہ اپنے آپ کو دوبارہ یکسو کرنے کے واسطے کچھ دنوں تک کمرے میں بند رہنا چاہتا تھا، سب سے چھپ کر، سب کی آنکھوں سے دور۔ کیونکہ جان کے ساتھ چمٹی ہوئی اللہ ڈنو کی مسلسل نگرانی اور قتل کی وہ دھمکی بھی تھی کہ جس

کے وقوع پذیر ہونے کا وقت اور مقام اُسے تو کیا کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود دل میں خوف سا بیٹھ گیا تھا کہ اُس شیطان نے اگر اُس کا قتل کیا جانا طے کر لیا ہے تو اُس سے پیچھے نہیں ہٹے گا، قتل کر کے چھوڑے گا۔

سول آفیسر کلب کے نگران نے تونگر کو دیکھا تو دوڑا دوڑا اپنے کمرے سے نکل آیا۔ اُس کے چہرے پر خوشامدانہ مسرت کے ساتھ ساتھ تحیر بھی تھا کہ تونگر جیسا بڑا آفیسر شہر میں اپنے محل نما بنگلے کے ہوتے ہوئے بھی اِس حالت میں کلب کے رہائشی حصے میں چلا آیا ہے کہ ہاتھ میں کچھ شاپر بھی پکڑے ہوئے ہے۔

''زہے نصیب سر کہ آپ میرے آفس تشریف لائے۔'' نگران نے قدرے جھکتے ہوئے تونگر کو سلام کیا اور اُس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے شاپر اپنے ہاتھ میں لے کر اُسے اپنے کمرے میں لے چلا۔ تونگر نے نگران کے آفس میں جانے میں کچھ تردد کیا تو وہ کچھ اور مودب ہوتے ہوئے اُس کے سامنے بچھ سا گیا۔

''سر! جناب کو تو شاید یاد نہ ہو لیکن مجھے اِس جاب پر جناب نے ہی بھرتی کیا تھا، میں یہ احسان کیسے بھلا سکتا ہوں۔'' تونگر وہیں رُک کر نگران کو تفخر بھرے انداز میں مگر غور سے دیکھنے لگا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

''سر! بہت پرانی بات ہوگئی، اُن دنوں جناب سروسز اینڈ جنرل ایڈمنسٹریشن میں ڈپٹی سیکریٹری ہوا کرتے تھے، میں نے انٹرویو میں آپ سے کہا تھا کہ میری کوئی سفارش نہیں، میں ایک یتیم لڑکا ہوں جس کے سر پر پورے گھر کی کفالت کی ذمہ داری ہے، تو سر! اِس پر جناب نے مجھے کلرک بھرتی کر لیا تھا۔''

یہ سب کچھ نگران نے کچھ اتنی لجاجت سے کہا کہ تونگر اپنے ماضی میں چلا گیا۔ اُس کے چہرے پر وہی تمکنت اور وہی دفتری رعونت بس ذرا سی جھب دکھلا کر پھر سے ماضی کا حصہ بن گئی اور وہ ایک لمبی سانس لے کر نگران کے ساتھ اُس کے کمرے میں چلا آیا۔ اُس نے جلدی سے اپنی کرسی کو آگے گھسیٹا اور تونگر سے بیٹھنے کی درخواست کی۔

''میں بیٹھوں گا نہیں، بہت تھکا ہوا ہوں، اگر کوئی کمرہ دستیاب ہے تو دو چار دنوں کے لیے مجھے الاٹ کر دو، میرا ممبر شپ نمبر آپ کو ریکارڈ سے دیکھنا پڑے گا، اب مجھے یاد نہیں رہا۔''

''سر! جناب! گولی ماریں ممبر شپ کو، کمرہ آپ کا ہو گیا، پہلے یہ فرمائیں چائے لیں گے یا کافی!'' نگران ہر گزرنے والے لمحے کے ساتھ کچھ اور مودب ہوتا چلا جا رہا تھا۔

''آپ مجھے کمرہ دکھا دو، چائے کافی میں وہیں منگوا لوں گا، لیکن اتنی گزارش ہے کہ میرے ادھر قیام کا کسی کو غیر ضروری طور پر نہ بتایا جائے اور جب تک میں خود نہ کہوں، کوئی میرے کمرے میں نہ آئے۔''

نگران نے قدرے حیران ہو کر تونگر کی طرف دیکھا۔ وہ اُس سے آنکھیں چراتا ہوا کمرے میں لگی ہوئی پینٹنگ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ نگران جان گیا کہ صاحبزادہ صاحب کی بیگم صاحبہ سے کوئی کھٹ پٹ ہوئی ہو گی۔ کیونکہ ریٹائرمنٹ کے بعد ازدواجی جھگڑوں کی صورت میں بیوی کی بجائے شوہر ہی کو ناراض ہو کر گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔ نگران دل مسوس کر کے رہ گیا۔ اُسے صاحبزادہ صاحب کا وہ سارا جاہ و جلال اور رعب و دبدبہ یاد آ رہا تھا کہ جب اچھے بھلے آفیسر اُن کے آفس میں جاتے ہوئے گھبراتے تھے۔ جب بھی اُن کا گزر سیکریٹریٹ کی غلام گردشوں میں ہوتا تو جونیئر آفیسر تک اپنے کمروں میں دبک جاتے اور اب یہ عالم کہ انھیں اپنے ہی شہر میں قیام کے واسطے بھی سول آفیسر کلب میں آنا پڑا۔ نگران نے پھر سوچا کہ ہو سکتا ہے ناراضگی بیگم صاحبہ سے نہ ہوئی ہو، بچوں کے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہو گئی ہو تو ایسے میں بھی تونگر صاحب کے لیے گھر میں رہنا محال ہی ہو گا۔ باپ بوڑھا اور بچے جوان ہوں تو باپ ہی کو جگہ خالی کرنی پڑتی ہے۔

بہر حال جو کچھ بھی تھا، اچھا نہیں تھا۔ ایک بیوروکریٹ جس نے اہم ترین پوزیشنز پر رہتے ہوئے ملک کا نظام چلایا ہوا ہو، بچوں اور بیوی کو زندگی کے اعلیٰ ترین معیار سے روشناس کرایا ہوا ہو، اُسے ڈھلتی عمر میں یوں تنہا اور بے یار و مددگار چھوڑ دینا کسی طرح بھی جائز نہیں کہا جا سکتا تھا۔ چونکہ اس سے زیادہ سوچنا نگران کے لیے بھی مناسب نہیں تھا اس لیے ادب کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُس نے تونگر کو کلب کے سب سے آرام دہ سویٹ میں پہنچا دیا۔ چونکہ مہمان کی

اپنی خواہش تھی کہ اُسے تنہا چھوڑ دیا جائے لہٰذا حسب خواہش اُس کی تنہائی کو یقینی بنا دیا گیا۔

سول آفیسر کلب کے سویٹ میں پہنچ کر تونگر نے اِس طرح جلدی سے دروازے کو اندر سے مقفل کیا کہ جیسے اللہ ڈنو عبید اپنی پوری سپاہ کے ساتھ اُس کے تعاقب میں ہو۔ بازار میں اُتارے جانے سے لے کر کلب پہنچنے تک وہ خاصی حد تک اپنے آپ میں مجتمع تھا لیکن جونہی وہ کمرے میں داخل ہوا اُسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے یہاں بھی کلوز سرکٹ کیمروں کا نہ دکھائی دینے والا مکمل نیٹ ورک موجود ہے جس کے ذریعے اُس کی ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھی جا رہی ہے۔ خوف کی ایک لہر سر سے پاؤں تک اُسے سراسیمہ کرتے ہوئے گزر گئی۔ نجانے کب اور کس وقت اللہ ڈنو کے ذہن میں اُسے قتل کرنے کا کوئی خاص طریقہ وارد ہو اور وہ بِلا کسی وارننگ کے چوہے کی موت مارا جائے۔

تونگر نے بیڈ پر بیٹھتے ہی انٹر کام پر نگران سے پوچھ لیا کہ یہاں کلوز سرکٹ کیمرے تو نہیں لگے ہوئے۔ ''سر! کمروں میں تو نہیں مگر کاریڈور میں لگے ہوئے ہیں۔'' نگران حیران تھا کہ صاحبزادہ صاحب نے کیمروں کا کیوں پوچھا ہے۔

''باہر ریسپشن پر پلیز پھر سے بتا دو کہ میرے یہاں قیام کے بارے میں کسی کو، کسی کو بھی نہ بتایا جائے۔''

تونگر کے لہجے میں موجود ہلکی سی بوکھلاہٹ کو نگران نے بھی محسوس کیا۔ ''معاملہ گھریلو جھگڑے سے کہیں زیادہ ہے، صاحبزادہ صاحب نے کون سا ایسا کچھ کیا ہے کہ وہ یہاں سب سے چھپ کر رہنا چاہتے ہیں۔'' نگران نے دل ہی دل میں سوچا تو اُسے بھی پریشانی لاحق ہونا شروع ہو گئی۔

کمرے میں کیمروں کے نہ ہونے کا تونگر کو یقین نہیں ہو رہا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اللہ ڈنو سے آخری ملاقات کے بعد جتنے بھی وسوسوں نے اُس کے شعور یا لاشعور میں جنم لیا تھا، اُن سب نے ایک دم سے اُس پر یلغار کر دی ہے۔ اُس نے غیر یقینی انداز میں پورے سویٹ کا فرنیچر، پردے، گلدان، چھت کے کونے کھدرے اور باتھ روم تک کو ہر ممکن حد تک کھنگال ڈالا۔ وہاں کوئی

کیمرہ نہیں تھا مگر اللہ ڈنو کی انیکسی میں گل رخ کے ساتھ اُسے جس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا، اُس نے تونگر کا اعتبار اپنے آنکھوں دیکھے پر بھی متزلزل کر دیا تھا۔

تھک ہار کر وہ واپس بیڈ پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ پھر اِدھر اُدھر کچھ ڈھونڈتے ہوئے جب کچھ بھی حسب طلب نہ ملا تو اپنی قمیص کی دائیں سائیڈ جیب ٹٹولی تو اُس میں سے گولیوں کا ایک پتا نکلا۔ یہ خواب آور گولیاں تھیں۔ تونگر نے لرزتے ہاتھوں سے اُس پتے میں سے دو گولیاں نکالیں اور پھانک لیں۔ پھر کچھ خیال آیا تو سامنے سائیڈ ٹیبل پر رکھی پانی کی بوتل اُٹھائی اور دو تین گھونٹ منہ میں بھر کر گولیوں کو حلق سے نیچے اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔ یوں لگ رہا تھا کہ کئی ہفتوں سے اپنے آپ کو اکٹھا رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے آج وہ ایک دم بکھر کر رہ گیا تھا۔ تونگر کو بھی احساس ہو چکا تھا کہ وہ ذہنی اور اعصابی طور پر یکسو نہیں رہا۔ اُس نے کمرے کے اطراف میں نگاہیں دوڑائیں۔ اُسے شاید مدد درکار تھی۔ کوئی سہارا چاہیے تھا کہ جو اُسے یوں بکھرنے سے بچا کر سمیٹ لیتا۔ لیکن کمرے میں سوائے اُس کے وسوسوں کے تیسرا کوئی بھی نہیں تھا۔

تونگر کی اچٹتی ہوئی نگاہ اپنے سامنے کی دیوار پر لگے قدِ آدم آئینے پر پڑی۔ وہ اپنے آپ کو گہرے پانیوں میں ڈوب رہا ایک ایسا شخص سجھائی دے رہا تھا کہ جس کے پاس غرقابی سے بچ رہنے کا کوئی وسیلہ نہ رہا ہو۔ بستر کی ایک سائیڈ پر تکیوں سے ٹیک لگائے نیم درازی کی حالت میں کافی دیر تک رہنے کے باوجود مطلوبہ غنودگی اُس سے کوسوں دور تھی۔ اگر کوئی احساس اُس کی محسوسات میں تھا تو وہ دماغ کے ماؤف ہونے کا تھا۔ شعور کے پاتال میں ہلکے سے اُبھرتا ہوا خیال اُس کے مخمصوں کی تفہیم کے واسطے اوپر آنے کی جستجو میں تھا۔ اُسے لگا کہ اب تک اللہ ڈنو عبید کی جانب سے دیئے گئے ذہنی جھٹکوں کے خلاف مدافعت، اُس کی سرشت میں دخیل پیشہ ورانہ تربیت کا نتیجہ تھی لیکن جونہی وہ اُس کی جکڑن سے باہر آیا تو اُس مدافعانہ مرکزیت سے بھی محروم ہو گیا کہ جس کے سبب وہ مجتمع تھا، ٹوٹا نہیں تھا، بکھرا نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد تونگر کو ذہن کے ماؤف ہونے یا غنودگی چھا جانے کے درمیان تمیز کرنا مشکل ہونے لگا تھا۔ ذہن کی اوپری سطح پر ابھرنے والے سوال، مخمصے اور الجھاؤ، اوپر آنے کی بجائے

لاشعور کی بھی نچلی تہ میں بیٹھنے لگے تھے۔ اُس کے چہرے کا کھنچاؤ، پہلے قدرے ڈھیلا ہوا اور پھر مزید نرمی کی جانب مائل ہو چلا۔ ہلکے ہلکے خراٹے نتھنوں کی بجائے اب مزید جگہ گھیرنے کے لیے حلق کا رخ کرنے لگے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے کے اس عمل میں ایک عرصے کے بعد تو نگر گہری نیند میں چلا گیا۔ ایسی نیند جو کسی دلربا حسینہ سے خلوت کی بجائے شدید اعصابی تھکن اور خواب آور گولیوں کی اثر پذیری کا مشترکہ نتیجہ تھی۔ چار پانچ گھنٹے کی یہ نیند شاید اُس کے بکھرے ہوئے وجود کو پھر سے جوڑنے کا سبب ہو سکتی مگر سویٹ کے دروازے پر ہونے والی دستکوں نے اُسے پھر سے واہموں کی دنیا میں لا پھینکا۔

۴۲

رضوان ہاشمی کو توقع نہیں تھی کہ اگر کبھی اُس کا کسی مصیبت سے سامنا ہوا تو وکلا برادری اُس کا ساتھ دینے سے گریزاں رہے گی۔ وکلا سیاست سے قطع نظر حیدر گوٹھ تو کیا پورے صوبے میں جب بھی کسی وکیل کے سر پر کوئی بری گھڑی آئی تو اُس نے ہر لحاظ سے نہ صرف اُس کا ساتھ دیا بلکہ اُسے دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا ہونے میں مدد بھی کی۔ اور اب یہ حال کہ جب وہ پریشانی میں پھنسا تو صوبے کی بار کونسل سے لے کر حیدر گوٹھ کی تحصیل بار تک سب نے ہی محض مذمتی قرارداد پر اکتفا کیا اور قرارداد کا مضمون بھی کچھ اِس قسم کا جس میں اُس کی گلوخلاصی کی بجائے محض انصاف کیے جانے کی بات کی گئی تھی۔ رضوان ہاشمی کو افسوس اِس بات کا بھی تھا کہ صوبے کی وہ بار کونسل جس کا وہ چوتھی بار ممبر چلا آ رہا تھا، اگر صوبائی سطح پر ایک دن کی ہڑتال کی کال بھی دے دیتی تو پولیس کو اُس کا پے در پے جسمانی ریمانڈ لینے کی جرات نہ ہوتی اور نہ ہی ضلعی عدلیہ جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھجوانے اور اُس کی ضمانت لینے کی بجائے یوں فراخ دلی سے اُسے پولیس کی تحویل میں دیے رکھتی۔

رضوان ہاشمی کو کچھ گلہ اپنی وکلا برادری سے ہٹ کر تقدیر سے بھی تھا کہ اتنا عروج دکھانے کے بعد نہ صرف اُس کے سبھی دشمنوں کو اکٹھا کرتے ہوئے تمام حالات ایک ساتھ مخالفانہ کر دیے

بلکہ اُسے قتل ایسے جرم میں پھنسا دیا کہ جس کی ٹرائل کا وہ خود بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں اُس نے سینکڑوں ملزموں کو مجرم قرار دلوا کر تختہ دار تک پہنچایا۔ وہ جانتا تھا کہ اُن میں کتنے ہی لوگ بے گناہ تھے مگر اُس نے محض منہ مانگی فیس اور علاقے میں اپنی وکالت کی دھاک بٹھانے کی خاطر انھیں بھی پھانسی کے پھندے تک پہنچا دیا۔ کہا جاتا تھا کہ مدعی مقدمہ جس شخص کا نام ایک بار ایف آئی آر میں لکھوا دیتا، رضوان ہاشمی اپنے طور طریقوں سے اُس کا سزا سے بچ نکلنا محال بنا دیتا۔ اپنے موکل کے کسی بھی مخالف کو اُس کے من چاہے انجام تک پہنچانے کے لیے رضوان ہاشمی نہ صرف فرضی گواہ اور جعلی شہادتیں تیار کر لیتا بلکہ اکثر اوقات قتل کی واردات کے فوراً بعد کسی بھی فریق کی جانب سے وکیل کر لیے جانے کی صورت میں وہ اِس قسم کی ایف آئی آر کا مسودہ بھی پولیس کو بنا کر دیتا کہ جس کے فیصلے کے بعد مخالف فریق کے گھروں میں سوائے سناٹے کے اور کوئی آواز سنائی ہی نہ دیتی۔

توقع تو پولیس، ضلعی عدلیہ اور انتظامیہ کو بھی نہیں تھی کہ رضوان ہاشمی جیسے قد کاٹھ کے وکیل کی گرفتاری کا نوٹس خود وکلا کی جانب سے ہی نہیں لیا جائے گا۔ چھوٹے چھوٹے لایعنی معاملات پر بھڑک اُٹھنے اور تا بافلک ہنگام برپا کر دینے والے اِس طبقے نے عملی طور پر ہلکی سی چوں تک نہیں کی تھی۔ حالانکہ حفظ ماتقدم کے پیش نظر پولیس نے ردِعمل سے نمٹنے کا مکمل بندوبست کر رکھا تھا لیکن اُس وقت انھیں خوشگوار مایوسی ہوئی کہ جب نہ تو کسی وکیل کے کان پر کوئی جوں رینگی اور نہ ہی کوئی مچھر پھڑ پھڑایا۔ پولیس اور انتظامیہ کے نزدیک یہ مکافاتِ عمل تھا۔ کتنے ہی واقعات میں رضوان ہاشمی محض اپنے چھوٹے سے مفاد کی خاطر نجانے کتنے ہم پیشہ وکیلوں اور مقدمات سے جڑے لوگوں کی بلی چڑھا دیا کرتا تھا۔

پھر بھی احتیاط کے تقاضوں کے پیش نظر پولیس نے گرفتاری کے فوراً بعد ہی رضوان ہاشمی کو مقامی تھانے کی حوالات میں رکھنے کی بجائے ضلع کے کسی دور اُفتادہ تھانے کی حوالات میں منتقل کر دیا۔ قتل کے اس مقدمہ کا آن ریکارڈ تفتیشی آفیسر اگرچہ تھانہ صدر حیدر گوٹھ کا سب انسپکٹر فرید مغل تھا لیکن عملی طور پر پوچھ گچھ خود ایس ایچ اُو چوہدری ضیا ہی کر رہا تھا۔ اوپر سے ملنے والی ہدایت کی

تعمیل میں اُس نے حاجی بخشن کو حراست میں لے لیے جانے کے باوجود حسب ضابطہ گرفتار نہیں کیا تھا بلکہ اگلے احکامات تک اُسے ایک ایسی جگہ پہنچا دیا کہ جہاں سے اُس کی خبر کا آنا بھی محال تھا۔ حاجی بخشن کا ڈرائیور چونکہ اُسے چوہدری ضیا کی جانب سے حراست میں لیے جانے کا چشم دید گواہ تھا لہٰذا اُس کا وجود مٹانے کی غرض سے اُسے گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھانے کے بعد ایک ڈمپر سے کچلوا دیا گیا۔ ریکارڈ کے واسطے تھانہ صدر حیدر گوٹھ میں حادثاتی مرگ کی رپٹ بھی درج کر لی گئی کہ جس میں حاجی بخشن کو مفرور ظاہر کرتے ہوئے ڈرائیور کی کٹی پھٹی نعش اُس کے ورثا کے حوالے کر دی گئی۔ جب کہ جرم قابل ضمانت ہونے کے سبب ڈمپر کے ڈرائیور کو بیس ہزار روپے کے مچلکے داخل کیے جانے کے بعد ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔

چوہدری ضیا اِن تمام کاموں سے فارغ ہو کر رات گئے اُس دور اُفتادہ تھانے میں پہنچا کہ جہاں رضوان ہاشمی کو خفیہ طور پر رکھا گیا تھا۔ اُس کے کچھ دیر آرام کرنے کے دوران رات کے اندھیرے میں رضوان ہاشمی کو حوالات سے نکال کر ایک پرانی حویلی میں پہنچا دیا گیا۔ چوہدری ضیا کے وہاں پہنچنے تک رضوان ہاشمی کی حالت پتلی ہو چکی تھی۔ سنسان حویلی میں پولیس کے کئی سپاہی بدروحوں کی طرح اُس کے گرد جمع تھے جن میں سے دو کے پاس بندوقوں کے علاوہ ٹرک کے ٹائروں سے کاٹ کر بنائے گئے دو دو فٹ لمبے ٹکڑے بھی تھے کہ جنھیں عرف عام میں چھتر کہا جاتا ہے۔ ایک سینئر وکیل ہوتے ہوئے رضوان ہاشمی کو اتنا تو یقین تھا کہ اُسے فرضی پولیس مقابلے میں نہیں مارا جائے گا لیکن خوف اُس تشدد کا تھا جسے چوہدری ضیا کا معمول ہی کہا جاتا تھا۔ اگرچہ وہ ایک ڈھلتی عمر کا بیمار شخص تھا جسے بلڈ پریشر اور ذیابیطس جیسے امراض بھی لاحق تھے مگر چوہدری ضیا جیسے ہتھ چھٹ اور بے رحم شخص سے کسی بھی قسم کے رویے کی توقع کی جاسکتی تھی کہ جس کا ایک ٹریلر وہ اپنے گھر میں بھی دیکھ چکا تھا۔

چوہدری ضیا کے آنے کے بعد اُس کے لیے پولیس کی گاڑی سے ایک فولڈنگ کرسی نکالی گئی جب کہ رضوان ہاشمی کو اُس کے روبرو زمین پر بٹھا دیا گیا۔ رضوان ہاشمی نے زمین پر بیٹھنے سے انکار بھی کیا اور مزاحمت بھی کی۔ جب اس سے کام نہ چلا تو خوشامدانہ انداز میں اپنی بیماریوں کا جواز بھی

پیش کیا لیکن پھر بھی اُسے زمین پر ہی بیٹھنا پڑا۔ پوچھ گچھ شروع کرنے سے پہلے کچھ سوچ بچار کرتے ہوئے چوہدری نے اپنی دائیں ٹانگ کو اچانک دو تین بار اِس طرح سیدھا کیا کہ جیسے وہ رضوان ہاشمی کے منہ پر ٹھوکر مارنا چاہ رہا ہو۔ اُس کی اِس بظاہر غیر ارادی حرکت سے رضوان ہاشمی اتنا گھبرایا کہ ہر بار اپنے چہرے کو بچانے کی کوشش میں اِدھر اُدھر ہوتا رہا۔ لیکن چوہدری ضیا نے اِس طرف توجہ ہی نہ دی اور لاتعلق انداز میں اردگرد کھڑے ہوئے پولیس ملازموں کو پرے پرے رہنے کی ہدایت کرنے لگا۔ وہ جان چکا تھا کہ رضوان ہاشمی پر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ وہ نیچے بیٹھے ہوئے بھی اُس کے پاؤں کی ٹھوکر کی زد میں ہے۔

پولیس ملازمین کے دور جاتے ہی جونہی وہ رضوان ہاشمی کی طرف متوجہ ہوا، اُس نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ ''آخر مجھے بتایا کیوں نہیں جاتا کہ کون قتل ہوا ہے اور اُس کی لاش کدھر ہے؟ میں جانتا ہوں مجھے الیکشن میں ہرانے کے لیے میرے سیاسی مخالفوں نے یہ سازش کی ہے لیکن اِس کا جواب سب کو دینا پڑے گا، میں ایک ایک کو عدالت میں گھسیٹوں گا، چھوڑوں گا نہیں۔''

''وکیل صاحب! یہ ڈرامے بازی چھوڑو اور بندے کا پتر بن کر میرے سامنے بیٹھو، اِس وقت تم میری عدالت میں ہو، کہیں یہ نہ ہو کہ جو سزا تمھیں سال چھ مہینے بعد ملنی ہے وہ ابھی کے ابھی سنا دی جائے۔'' چوہدری ضیا نے ایک بار پھر اپنی دائیں ٹانگ کو پھیلا کر رضوان ہاشمی کے چہرے کے قریب زور کا جھٹکا دیا۔ چیختا چلاتا رضوان ہاشمی ایک دم خاموش ہو کر چوہدری ضیا کی جانب مبہوت انداز میں دیکھنے لگا۔

''دیکھ وکیل صاحب! میں تیرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرنے لگا، لیکن بات جو بھی ہے، سچ سچ بتا دے، تیری معشوق کی لاش مل چکی ہے، بہت بے دردی سے مارا ہے تم نے اُسے، چہرے کا تو کچومر نکال دیا ہے، اُس کے ہڈ بٹ سے شناخت کی ہے اُس کے رشتہ دار مدعیوں نے، اُوئے وکیل! بہت بے رحم آدمی ہے تو، پہلے اُس بے چاری سے شادی کا ڈراما کیا، پھر اُس کی جائیداد ہتھیائی اور جب اُسے تیرے فراڈ کا علم ہوا تو قتل کرنے کے بعد لاش فارم ہاؤس کی دیوار

کے ساتھ زمین میں دبا دی جسے کتے نکال کر گھسیٹتے رہے، اور اب تو میسنا بن کر پوچھتا ہے کہ کون قتل ہوا ہے، لاش کہاں ہے؟''

رضوان ہاشمی کے زرد ہو چکے چہرے کی رنگت ملگجے اندھیرے میں بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ''میرا یقین کریں چوہدری صاحب! میں نے عتیقہ کو قتل نہیں کیا اور کرتا بھی کیوں کہ اُس سے بڑی چاہت سے شادی کی تھی۔''

''تیرے تو اپنے فارم ہاؤس کے ملازم بھی تیرے خلاف گواہی دے رہے ہیں، جس دن تو آخری بار وہاں گیا، پوسٹ مارٹم رپورٹ میں قتل کا وقت بھی وہی آ رہا ہے۔'' چوہدری ضیا یہ بات کہتے ہوئے رضوان ہاشمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، اُس کی پلکوں کے جھپکنے تک کو بھی غور سے دیکھ رہا تھا۔ رضوان ہاشمی پھر سے چیخ پڑا۔

''عتیقہ کا قتل میں نے نہیں کیا، وہ خود ہی گھر چھوڑ کر ملازمہ کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔''

''اچھا! ملازمہ لڑکی بھی عتیقہ کے ساتھ خود ہی گھر چھوڑ کر چلی گئی! کیوں جھوٹ بولتا ہے، کیوں بکواس کرتا ہے، اُس لڑکی نے پولیس کو اپنا بیان دے دیا ہے کہ تم قتل کی شام انتہائی غصے میں فارم ہاؤس گئے، وہاں تمھارا عتیقہ سے جھگڑا ہوا اور تو نے ملازمہ لڑکی کو فارم ہاؤس سے نکل جانے کا کہہ دیا، لڑکی وہاں سے چلی گئی تو تو نے اکیلے میں عتیقہ کو قتل کر دیا۔''

''چوہدری صاحب! سچ کہتا ہوں، مجھے اپنے بچوں کی قسم! میں نے عتیقہ کا قتل نہیں کیا۔'' رضوان ہاشمی نے اپنے ہتھکڑی لگے ہاتھ چوہدری ضیا کے سامنے جوڑ لیے۔

''وکیل صاحب! تو نے بہت سے لوگوں کو تختے پر چڑھایا اب تیری باری آئی ہے تو بچوں کی قسمیں کھانے لگا، سمجھتا ہے کیا ہے تو مجھے کہ تیرے جیسے فراڈیے کی قسموں کو سچ مان کر میں تجھے بے گناہ لکھ دوں گا، بات سیدھی سی ہے وکیل صاحب! اپنی کھال اتروانی ہے یا سچ بولنا ہے، تو دو پرچوں میں نامزد ہے، ایک سرکاری املاک کو نقصان اور عدالتوں سمیت دوسری سرکاری عمارتوں پر حملے کا اور دوسرا عتیقہ کے قتل کا.... پہلے پرچے میں تو شاید میں تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن قتل کے پرچے میں تو میں تیری جان تک نکال سکتا ہوں اور یہ بات تو بھی جانتا ہے، ایسے کیسوں میں بعد

میں طے ہوتا رہتا ہے کہ تو حوالات توڑ کر بھاگا تھا یا میں نے تمھیں خود ہی خوامخواہ شوٹ کر دیا۔''

''میں جانتا تھا کہ میرے خلاف جس قسم کی سازشیں ہو رہی ہیں وہ میری جان لے کر ہی چھوڑیں گی۔'' رضوان ہاشمی نے گردن جھکا لی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا۔

''ابھی تیسرا پرچہ بھی تیار ہے تیرے خلاف رُباب کے اغوا کا، آج کٹا یا کل کٹا، بس اتنی سی دیر ہے، آر پی اُو صاحب نے تم سے کہا تھا ناں کہ لڑکی کو برآمد کرا دو مگر تم اپنی آکڑ خانی میں رہے کہ سینئر وکیل ہو، ممبر بار کونسل ہو، عدالتیں تمھاری جیب میں اور تمھیں تو سو خون معاف ہیں لیکن قسمت ہر بار ڈھیل نہیں دیتی، جب تقدیر کی کڑکی لگتی ہے تو پھر قبروں میں پڑے مردے بھی بولنے لگتے ہیں، تمھاری اُس ملازمہ لڑکی نے اپنے بیان میں سب کچھ بک دیا ہے کہ رُباب دو دن تمھارے فارم ہاؤس پر رہی اور پھر تو نے اُسے اور اُس ملازمہ لڑکی کی ماں، دونوں کو اپنے ڈرائیور جبار کے ذریعے اغوا کرانے کے بعد کسی نامعلوم مقام پر چھپا دیا، اب کیا خبر کہ تو نے اُنھیں بھی قتل کرا دیا ہو۔''

رضوان ہاشمی کو جیسے چُپ سی لگ گئی۔ گردن جھکا کر چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ کچھ دیر بعد سر اُٹھایا اور خشک ہونٹوں سے اس طرح پانی مانگا کہ دونوں لب آپس میں جڑے ہوئے محسوس ہو رہے تھے جن کا بولنے کے لیے کھلنا دوبھر ہو رہا تھا۔

''اوئے پانی پلاؤ میرے اِس وکیل صاحب کو، کل کلاں کو اندر ہو گئے تو تمھاری ضمانت اِسی نے کرانی ہے۔'' اپنی طنزیہ بات پر چوہدری ضیا ہنسا تو سبھی پولیس ملازم بھی ہنسنے لگے۔ جس سپاہی نے رضوان ہاشمی کو پانی دیا وہ خوشامد کے سے انداز میں چوہدری ضیا کے پاس آ کر زمین پہ اکڑوں بیٹھ گیا اور اُس کی پنڈلیاں دبانے لگا۔

''صاحب جی! بہت لعنتی ہے یہ، ایک کیس میں میری گواہی تھی، اِس نے جرح میں مجھے چکر دے کر میری انکوائری کرا دی تھی، تین سال کی سروس ضبط کرا لی تھی کپتان صاحب نے میری، کافی مدت سے ارمان ہے حساب چکتا کرنے کا، بس تین پانچ لگانے دیں مجھے، ہر سال کا حساب ایک پانجا! پہلے چھتر پر ہیر وارث شاہ نہ سُنا دے تو صاحب پھر مجھے اُلٹا لٹکا دینا۔''

''تو ابھی ٹھہر بھین کے بھڑوے! مجھے نمٹ لینے دے، تیرا حساب بھی آج ہی چکتا کرا دوں گا، تو بس چھتر کو تیل لگا کے رکھ چنگی طرح۔''

رضوان ہاشمی نے غور سے سپاہی کا چہرہ دیکھا۔ کالے ملیشیے کی یونیفارم پہننے کے بعد اُس کا چہرہ بھی سارے پلسیوں کی طرح ایک جیسا لگ رہا تھا۔ ویسے بھی دور رکھی ہوئی آٹو ٹارچ کی معمولی سی روشنی میں اُس کا پہچانا جانا خاصا مشکل تھا لیکن جس نگاہ سے وہ اُسے دیکھ رہا تھا، صاف لگتا تھا کہ وہ اُسے بھولا نہیں۔ رضوان ہاشمی لرز کر رہ گیا۔ پولیس کے پانچے سے وہ بخوبی واقف تھا۔ کورٹ سے احکامات لینے کے بعد اُس نے پولیس تشدد کے شکار کئی ملزموں کے میڈیکل کرا رکھے تھی کہ جن کے جوڑوں کی جلد ادھڑ چکی ہوتی تھی۔ اُس نے کئی ایسے زیرِ تفتیش ملزم بھی دیکھ رکھے تھے کہ جن کی ایڑیوں پر ڈنڈوں کی ضربات سے اُن کا ذہنی توازن بگڑ چکا تھا۔ کمر اور ٹانگوں پر رولر پھیرنے سے جہاں گردے فیل ہو جاتے وہاں کسی ضرب کے نشان کے بغیر ٹانگوں کے عضلات اس طرح ٹوٹتے کہ وہ بدقسمت پھر کبھی چلنے پھرنے کے قابل ہی نہ رہتا۔ خوف کی ایک لہر اُٹھی اور اُس کے پورے بدن کو تھرتھرا گئی۔ اُس نے رحم آلود نگاہوں سے چوہدری ضیا کی طرف دیکھا۔ چوہدری کے چوڑے ماتھے پر دو موٹی موٹی شکنیں ریل کی متوازی پٹڑیوں کی طرح اُبھر آئی تھیں۔ اُس نے رضوان ہاشمی کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ سمجھا کہ شاید چوہدری اُسے تھپڑ یا گھونسا مارنا چاہتا ہے۔ وہ اُلٹا پیچھے کو کھسک گیا۔

''اوئے میرے قریب آ، تجھ سے ایک سودا کرنا ہے۔'' چوہدری اگرچہ ہولے سے رازدارانہ انداز میں بولا تھا لیکن اُس کے متشدد رویے سے خوفزدہ رضوان ہاشمی نے اپنا چہرہ قدرے دور ہی رکھا۔ تھوڑا سا توقف ہوا تو چوہدری نے اُس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اُس کا کان اپنے منہ کے قریب کر لیا۔

''مجھے تم پہ ترس آ گیا، ورنہ بڑے صاحب نے تو تمھارے ساتھ کچھ بھی کرنے کا فری ہینڈ دیا ہوا ہے، اب بات میری غور سے سُن! ہم دونوں ایک ڈیل کرتے ہیں، عتیقہ کے قتل سے تجھے میں بچا لیتا ہوں، رُباب تو میرے حوالے کر دے۔''

۴۳

پہلے تو کچھ دیر تونگر کو سمجھ ہی نہ آئی کہ کون اُسے دستکوں کے ذریعے جھنجوڑ رہا ہے۔ وہ ہڑبڑایا ضرور مگر اُس سے اُٹھا نہیں جا رہا تھا۔ دروازے پر ہونے والی دستک مسلسل کی بجائے تھوڑے تھوڑے وقفوں سے کسی ہتھوڑے کی طرح اُس کے کانوں کے ساتھ ساتھ پورے اعصاب پر برس رہی تھی۔ خواب آور گولیاں اپنا اثر پوری طرح جما چکی تھیں اِسی واسطے ہر دو دستکوں کے درمیانی وقفوں میں اُسے پھر سے غنودگی آ لیتی کہ جس کا سلسلہ دستکوں کی نئی لہر کے ساتھ ہی ٹوٹ جاتا۔

نیند اور غنودگی کے ایک معلق لمحے میں اچانک ہی ایک خیال اُس کے تحت الشعور سے عالم شعور کی جانب لپکا کہ اللہ ڈنو عبید کے مقرر کیے ہوئے پیشہ ور قاتل اُس کے تعاقب میں ہیں اور وہ ایک بہت بڑے گودام میں رکھے ہوئے سامان کے اطراف میں خود کو چھپانے کی سعی میں مصروف ہے۔ لیکن اپنے آپ کو بچانے کی غرض سے وہ جہاں کہیں بھی چھپتا ہے، وہ لوگ اپنے بھاری بوٹوں کو دھمکاتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ یوں وہ پھر وہاں سے نکل کر بھاگتا ہے مگر جائے اماں کہیں بھی نہیں۔ دروازے پر ہونے والی دستکوں اور خواب میں ہونے والی بھاری بوٹوں کی دھم دھم نے اُسے نیند کے حصار سے باہر لا کھڑا کیا۔ کچھ دیر تک تو اُسے سمجھ نہ آئی کہ وہ دروازے پر ہونے والی دستک سے جاگا ہے یا تعاقب کرنے والے قاتلوں کے جتھے کے بوٹوں کی دھمک سے۔ لیکن اِدھر اُدھر کمرے کا ماحول دیکھنے کے بعد اُسے یقین ہو گیا کہ نہ صرف وہ سول آفیسر کلب میں ہے بلکہ محفوظ بھی ہے۔ دروازے پر اب پھر سے دستک ہوئی تو اُس نے برا سا منہ بناتے ہوئے بمشکل اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ شام کے دھندلکے میں باہر کلب کا کوئی ملازم تھا لیکن نہ تو وہ نگران آفس سے تھا اور نہ ہی ویٹر یا ریسپشن کلرک۔

اِس سے پہلے کہ تونگر اُس سے پوچھ گچھ کرتا اُس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا ایک اے فور سائز کا لفافہ اُسے تھمایا اور واپس جانے لگا۔ لیکن اِس سے پہلے کہ وہ واپس جاتا تونگر نے اُسے روک لیا۔ ''کون ہو تم اور یہ کس نے تمھیں دیا ہے؟''

''میں مالی ہوں صاحب کلب کا اور یہ ایک بڑے صاحب آئے تھے گاڑی پر، انھوں نے دیا کہ کمرہ نمبر ایک میں پہنچا کر واپس اُسے بتاؤں۔''

''اور یہ دفتر والے کہاں ہیں! نگران کہاں ہے! ریسپشن والے کدھر ہیں؟'' تونگر کو آنکھیں نکالتا دیکھ کر مالی گھبرا گیا۔

''صاحب جی! وہ نماز پڑھنے گئے ہیں مغرب کی، اِدھر کلب کی مسجد میں۔''

''سارے ایک ساتھ نماز پڑھنے چلے گئے؟'' تونگر پھر دھاڑا۔

''جی! اس وقت جماعت ہوتی ہے ناں۔'' مالی اور بھی خوف زدہ ہو چکا تھا۔

''وہ کدھر ہے جس نے تمھیں یہ لفافہ دیا؟''

''اِدھر ہے، مین گیٹ کے پاس!''

''تونگر جلدی سے مین گیٹ کی طرف بھاگا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ البتہ کچھ گاڑیاں پارکنگ ایریا میں تھیں۔ اتنے میں مالی بھی اُس کے پیچھے پہنچ گیا۔

''دیکھو! کون سی ہے وہ گاڑی؟'' تونگر نے مالی کو پارک شدہ گاڑیاں دیکھنے کا اشارہ کیا۔

''ناں صاحب! اِن میں سے کوئی بھی نہیں، وہ تو عجیب سا رنگ تھا کوئی نیا۔''

ابھی تونگر وہاں موجود ہی تھا کہ نگران اور ریسپشن کلرک بھی وہاں پہنچ گئے۔ تونگر کو یوں کمرے سے باہر غصے کی حالت میں دیکھا تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔ تونگر کی زبانی صورت حال کا علم ہوا تو معاملہ شرمندگی سے ہوتا ہوا معافی تلافی پر آ گیا۔ اِن حالات میں تونگر کے پاس سوائے درگزر کے اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ سُو اندر ہی اندر کھولتا ہوا واپس کمرے میں چلا آیا۔ دروازے کو ایک بار پھر اندر سے بند کیا اور جلدی جلدی لفافہ کھولنے کی بجائے اُس کی چھوٹی سائیڈ کو ایک کونے سے دوسرے کونے تک چیر ڈالا۔

لفافے کا منہ کھلا تو اندر سے ایک پوسٹ کارڈ سائز کی تصویر نیچے فرش پر گر گئی۔ تونگر نے حیرت سے لفافے کو اوپر نیچے کر کے دیکھا مگر وہ خالی تھا۔ اُس نے خالی لفافے کو بیڈ پر پھینکا اور نیچے جھک کر تصویر اُٹھائی۔ تصویر ایک پندرہ سولہ برس کی خوبصورت لڑکی کی تھی۔ تصویر کے ایک

کونے پر خودکار طریقے سے اُبھرنے والی تاریخ بھی درج تھی جو یقیناً تصویر بناتے وقت کیمرے سے نقش ہوئی ہوگی۔ تونگر نے غور سے اِس تاریخ کو دیکھا۔ یہ لگ بھگ دس برس پہلے کی تاریخ تھی۔ تصویر کو بہت ٹٹولا، اِدھر اُدھر اُوپر نیچے کر کے دیکھا مگر کہیں سے بھی معلوم نہیں ہو پا رہا تھا کہ یہ کس کی تصویر ہے اور اُسے کیوں بھیجی گئی ہے۔

سکون کی چند گھڑیاں جو تھوڑی سی نیند کی صورت ملی تھیں، ایک بار پھر پہلے سے زیادہ پریشانی کی نذر ہو چکی تھیں۔ نہ تو یہ معلوم تھا کہ یہ تصویر کس کی اور اُسے کیوں بھیجی گئی ہے اور نہ ہی اِس بات کی خبر کہ اسے بھیجنے والا کون اور اُس سے چاہتا کیا ہے۔ تونگر سر پکڑ کر سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔ خواب آور گولیوں سے پیدا شدہ نیند کا خمار ابھی باقی تھا کہ جس میں دماغ کی چولیں ہلا دینے والے تڑکے نے اُسے ذہنی طور پر ماؤف کر دیا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اِس حرکت کے پیچھے کون ہے۔ پہلا خیال تو لازماً اللہ ڈنو عبید کی طرف جاتا تھا کہ جس کی پیچھا کراتے ہوئے اُسے قتل کرنے کی دھمکی موجود تھی لیکن اُس نے صرف ایک لڑکی کی تصویر بھیجنے پر اکتفا کیوں کیا۔ وہ اُسے نہایت آسانی سے آج ہی کسی بھی جگہ، حتیٰ کہ اپنے فارم ہاؤس میں بھی اس طرح سے قتل کرا سکتا تھا کہ اُس کی لاش تک نہ ملتی۔ تو پھر یہ سارا بکھیڑا کیوں اور کس واسطے۔ تونگر کا فارم ہاؤس سے نکالے جانے کے بعد سے ہی یہی خیال تھا کہ اللہ ڈنو اُسے ایک ہی وار سے قتل کرنے کی بجائے کسی اَن دیکھے وار سے قتل ہونے کے خدشے کی مستقل ذہنی اذیت میں مبتلا رکھنا چاہتا ہے تا کہ وہ پل پل مرتا اور پل پل جیتا رہے۔

لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ لفافہ اور تصویر اللہ ڈنو عبید نے نہ بھجوائی ہو۔ یہ لفافہ بھیجنے پر مامور کارندہ کلب کے مالی کو سویٹ کا نمبر غلط بتا بیٹھا ہو یا اُس نے نمبر تو درست بتایا ہو لیکن یہاں تک آتے آتے مالی ہی سویٹ نمبر بھول گیا ہو۔ بہر حال وہ تمام وسوسے اور سبھی خدشے جو کچھ دیر قبل تونگر کی گہری نیند میں ڈوبنے لگے تھے پھر سے اپنے نوکیلے ناخنوں والے پنجوں اور چڑیل نما عورتوں کی شبیہوں کے ساتھ جاگ اُٹھے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ گزشتہ کل سے کچھ خاص نہ کھائے پیے ہوئے تونگر کی بھوک بھی ہلکے ہلکے جاگنے لگی تھی۔ یہ شاید اُس نیند کا اثر تھا جس نے اُس

کے کھنچے ہوئے اعصاب کو کسی حد تک نرماہٹ تو دے دی تھی لیکن ایک بار پھر اُسی تناؤ کا سامنے کرتے ہوئے اُسے نیند کی بجائے بھوک کا احساس ہونا واقعی تعجب خیز تھا۔

اُس نے انٹرکام پر کچن سے رابطہ کیا اور اپنے لیے کافی اور سنیکس کا آرڈر کیا لیکن وہاں سے بتایا گیا کہ اگر وہ اوپن ایئر میں بار بی کیو بھی پسند کرنا چاہیں تو اپنا آرڈر بدل سکتے ہیں کہ ڈنر آورز شروع ہو چکے تھے اور ٹھنڈی ہوا چلنے کے سبب موسم بھی خوشگوار ہو رہا تھا۔ تونگر نے اپنے سویٹ کے پردے ہٹا کر فرش سے چھت تک بنی ہوئی شیشے کی دیوار سے اُس پار دیکھا۔ سوڈیم لائٹس کی جگمگاہٹ سے لان کے مخملیں سبزے کا رنگ کئی کئی شیڈ بدل رہا تھا۔ لان میں کافی فیملیز بیٹھی ہوئی تھیں جنھیں بار بی کیو سرو کیا جا رہا تھا۔

باہر کا ماحول دیکھ کر تونگر کی رہی سہی بھوک بھی بیدار ہو گئی۔ اُس نے پردہ برابر کیا اور دروازہ لاک کرنے کے بعد کمرے سے باہر لان میں چلا آیا۔ اِس سے پہلے کہ وہ بیٹھنے کے لیے کہیں کوئی مناسب جگہ دیکھ پاتا، بار بی کیو لان کے کچھ پرانے ملازمین نے اُسے پہچان لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ تونگر نے اپنی چیف سیکریٹری کی تعیناتی کے دوران ان لوگوں کی مراعات اور ملازمتوں کے معاملات کو بہتر بنانے کے لیے بہت کچھ کیا تھا۔ چھوٹے درجے کے اِن ملازموں کے چہروں پر اُمڈنے والی مسرت دیکھ کر وہ روہانسا ہو گیا۔ تونگر کو اندازہ نہیں تھا کہ کچھ لوگ اب بھی ایسے ہیں کہ جو اُسے صرف زبانی کلامی احترام کے لائق ہی نہیں بلکہ دل سے اُس کی پرستش کرتے ہیں۔ ایک پرانے ویٹر نے جو دو چار بار تونگر کے گھر پر ہونے والی دعوتوں میں خدمات سرانجام دے چکا تھا، اُس کے مزاج کو بھانپتے ہوئے رش والی جگہ سے قدرے ایک طرف پرسکون گوشے میں ٹیبل لگا دی۔ تونگر بھی اِس طرح کرسی پر بیٹھا کہ اُس کی پشت لوگوں کی طرف تھی اور اُس کے سامنے دور تک وہی مخملیں گھاس بچھا ہوا تھا کہ جسے اُس کی پسند پر بیرون ملک سے درآمد کر کے یہاں لگایا گیا تھا۔

تونگر مبہوت تھا کہ وقت نے کس قدر تیزی سے کروٹ لی اور کیا سے کیا ہو گیا۔ وہ مقام جہاں سے وہ گزرا، وہ مناصب کہ جن پر وہ تعینات رہا اور وہ سسٹم کہ جس کا وہ کل پرزہ رہا، سبھی کچھ

بدستور موجود اور اگر کوئی نہیں، نفی ہو چکا تو وہ خود کہ وجود رکھتے ہوئے بھی بے نشاں اور موجود ہوتے ہوئے بھی عدم۔

ایسے میں سب سے پرانے ویٹر نے جرأت دکھلائی اور نہایت ادب سے مینو کارڈ اُسے پیش کر دیا۔ ''صاحب! یہ تو محض رسماً پیش کر رہا ہوں ورنہ جانتا ہوں کہ آپ اِس وقت کیا تناول فرمانا پسند کریں گے؟''

ڈھلتی عمر کے ویٹر کے چہرے پر تمام تر احترام کے ساتھ ساتھ ایک پراسرار سی مسکراہٹ بھی در آئی تھی۔ تونگر چونک گیا۔

''وہ کیسے! آپ کیسے جانتے ہو کہ میں اس وقت کیا کھانا چاہوں گا؟''

''صاحب! آپ بھول گئے اِس خدمت گار تفضل کو، میں کئی بار چیف سیکریٹری ہاؤس میں ہونے والی دعوتوں میں آپ کی خدمت کرتا رہا ہوں اور پھر جب بھی آپ کا ڈرائیور باربی کیو لان سے آپ کے لیے کھانا لینے آتا تھا تو آرڈر میں ہی پیک کرتا تھا۔''

نجانے کیوں تونگر سہم کر رہ گیا۔ ویٹر کی دبی دبی پراسرار مسکراہٹ اُس کے چہرے پر بچھے ہوئے احترام پر بار بار غالب آ رہی تھی۔ پھر بھی تونگر نے مدھم روشنی میں حتی المقدور ویٹر کے چہرے کو غور سے دیکھنے کی کوشش کی مگر یہ چہرہ اُس کی یادداشت میں نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے جو مناسب سمجھو لے آؤ۔'' تونگر اِس ویٹر کی موجودی سے بے اطمینانی کا شکار ہو رہا تھا۔

''آپ اکیلے ہی ہوں گے ناں صاحب؟'' ویٹر کے اِس سوال نے تونگر کو جھنجلا کر رکھ دیا۔ اِس قدر احترام اور اتنی زیادہ آؤ بھگت اُسے غیر فطری لگنے لگی تھی، خاص طور پر ان حالات میں کہ جن کا اُسے کئی ہفتوں سے سامنا تھا لیکن پھر بھی اُس نے اپنے آپ کو مجتمع رکھا۔ ''تفضل میاں! آپ دیکھ تو رہے ہو کہ میں اکیلا ہوں۔''

''جی صاحب! میرا پوچھ لینا تو بنتا تھا، آخر آپ ہی کے بدولت تو ہماری روٹی روزی چل رہی ہے۔'' ویٹر اپنی اُسی مسکراہٹ کے ساتھ مینو کارڈ اُٹھا کر چل دیا۔ تونگر کو یوں لگا کہ وہ ابھی تک

اللہ ڈنو عبید کے قید خانے میں ہے کہ جہاں ہر شخص نے اُسی کو تاک رکھا ہے۔ ہر چہرہ پراسرار، ہر رویہ غیر فطری اور ارد گرد ہونے والی تمام حرکات اور واقعات سبھی ایک ہی زنجیر کی کڑی کی مانند ایک دوسرے سے پیوستہ اور اُلجھے ہوئے۔ چند لمحے پہلے تک دلکش دکھائی دینے والا وسیع لان اُسے آسیب زدہ لگنے لگا تھا کہ جہاں گھاس کا رنگ سبز کی بجائے بنفشی ہو رہا تھا۔ تونگر اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور میز کی دوسری جانب رکھی ہوئی اُس کرسی پر بیٹھ گیا کہ جس کا رخ لان کی وسعتوں کی بجائے لوگوں کی جانب تھا۔

بار بی کیو کی انگیٹھیوں اور لان کے ملحقہ کونے میں ایک ترتیب سے رکھی ہوئی درجنوں میزوں کے گرد کئی کتنی ہی فیملیز موجود تھیں۔ کچھ کھانا کھاتے ہوئے، کچھ کھانے کے بعد گپ شپ کرتے ہوئے اور کئی کھانے کا انتظار کرتے ہوئے۔ چونکہ اِس کلب کے ممبر صرف گورنمنٹ آفیسرز ہی تھے لہٰذا کل کا چیف سیکریٹری صاحبزادہ سلطان احمد تونگر بخوبی اُن کی ذہنی کیفیت میں جھانک سکتا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ جب اُس کے دونوں بیٹے ابھی چھوٹے تھے تو وہ اپنی بیگم ناہید کے ساتھ انھیں یہیں لے کر آتا تھا اور اسی جگہ، انہی میزوں میں سے کسی میز پر وہ بھی یونہی گپ شپ کیا کرتے تھے۔ اور پھر جب اُس کے بیٹے ایچی سن کالج میں پڑھنے لگے تو اُن دنوں اُس کی پوسٹنگ بلوچستان ہوگئی۔ لیکن وہ میاں بیوی جب بھی انھیں ملنے کے لیے اِدھر آتے تو ایک شام سول آفیسرز کلب کے بار بی کیو لان کے لیے ضرور مختص رکھتے کہ یہاں کی خوشبو اُن کے ماضی کو اُن کے حال سے جدا نہیں ہونے دے رہی تھی۔

اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ اُن کے بیٹے جوان ہوئے، اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک بھی گئے اور شادیاں بھی کر لیں تو وہ دونوں میاں بیوی، تونگر اور ناہید اکیلے ہونے کی بجائے صرف تونگر ہی اکیلا رہ گیا۔ اُسے لان میں اِن بکھری ہوئی میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے افراد کی صورت اپنی زندگی کا مکمل سفر دکھائی دینے لگا تھا۔ کہیں خوش گپیاں کرتے کوئی جوان غیر شادی شدہ آفیسر، کہیں سرگوشیاں کرتا ہوا کوئی نو بیاہتا جوڑا، کہیں ایک دو بچوں کے درمیان جھگڑے چکاتا جوڑا، کہیں کوئی ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچتا سینئر بیوروکریٹ اپنے بیٹی بیٹے اور داماد بہو کے ہمراہ "جب میں ڈپٹی کمشنر

فلاں تھا، جب میں کمشنر فلاں تھا'' کی بوجھل تکرار کرتے ہوئے اور کہیں کوئی ریٹائر ہو چکا بوڑھا آفیسر اکیلا بیٹھا گزرے زمانے کے بلیک ہول میں ''ہز ماسٹرز وائس'' کے لوگو (logo) کی طرح جھانکتا ہوا۔ شاید کہیں، کسی پوسٹنگ میں وہ اُس کا سینئر رہا ہو لیکن تونگر اور اِن لوگوں کے درمیان اب کوئی تعلق اگر کہیں تھا تو محض لاتعلقی کا تھا۔ اُسے وہاں فریفتہ نگاہوں سے اپنے شوہروں کو رجھانے والی سبھی عورتیں ناہید دکھائی دے رہی تھیں کہ سرکاری افسری کی بنیاد پر ہونے والی شادیاں سرکاری افسری تک تو خوب چلتی ہیں، بلکہ دوڑتی ہیں لیکن اُس کے بعد اگر رہ جائیں تو گھسیٹنی پڑتی ہیں، آنکھیں اور زبان بند کر کے۔

تونگر نے اِس منظر کے ناسٹیلجک اثرات سے بچ رہنے کے لیے غیر ارادی طور پر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ چند ہی ساعتوں کے بعد اُسے باربی کیو کی انگیٹھیوں سے اُٹھنے والی اشتہا انگیز خوشبو پر ایک اور خوشبو غالب ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہی مخصوص مگر شامہ کی حس کو مسحور کر دینے والی جان لیوا مہک جو جانان کا خاصہ تھی۔ اُسے واہمہ سا ہوا کہ اُسی مخصوص خوشبو میں نہایا ہوا کوئی وجود اُس کے روبرو ہے۔ تونگر نے آنکھیں کھول دیں۔ جانان اپنی تمام تر دلکشی اور دل ربائی کے ساتھ اُس کے سامنے رکھی کرسی پر جلوہ افروز تھی۔ تونگر کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اگرچہ وہاں روشنی کم تھی مگر اُس کے ملکوتی حسن اور دودھیا رنگت کو کسی منبعٔ نور کی ضرورت نہیں تھی۔ اگرچہ وہ اُسے دیکھ کر ہلکا سا مسکرا اُٹھی تھی مگر ایسے میں بھی اُس کی آنکھوں میں گہرائی تک اتری ہوئی اُداسی پوری وضاحت سے عیاں تھی۔

۴۴

رضوان ہاشمی کو اپنے کانوں سُنی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے چوہدری ضیا کی طرف دیکھا کہ کیا کہیں پھر کوئی نیا نفسیاتی حربہ یا کوئی اعصاب شکن چال، ورنہ اُس کے یوں مہربان ہونے کی کوئی صورت تو نہیں تھی۔ لیکن چوہدری کے چہرے پر نہایت سفاک سنجیدگی تھی کہ جس میں دو جمع دو، چار کے علاوہ کسی فارمولے کی گنجائش نہیں تھی۔ رضوان ہاشمی نے

کچھ سوچنے کے انداز میں آنکھیں نیچے جھکائیں تو چوہدری نے اُسے گریبان سے پکڑ کر اس طرح مروڑا کہ اُس کا دم، دم آخریں کی سطح پر آ گیا۔

''میں نے کہا ہے ناں کہ سوچنے کی گنجائش نہ تمھارے پاس ہے اور نہ میرے پاس۔'' چوہدری ایک بار آہستگی سے اُس کے کان کے قریب غرایا۔

''لیکن میں رُباب کہاں سے لاؤں، میں نے تو اُس کی شکل تک نہیں دیکھی۔'' رضوان ہاشمی سانس بحال کرنے کی کوشش میں بمشکل اتنا کہہ سکا۔ اب کے چوہدری نے اُس کے گریبان کو بدستور مروڑ کے رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اُس کے گال پر زور کا جھانپڑ رسید کیا۔ ویران خاموشی میں پٹاخ کی آواز کافی دور تک سُنی گئی۔ پولیس ملازموں نے ایک دوسرے کی طرف غور سے دیکھا اور لاتعلق ہو گئے۔ تھپڑ کے نتیجے میں رضوان ہاشمی کے گلے سے گھگیانے کی آوازیں آنے لگیں تو چوہدری نے اُس کا گریبان چھوڑ کر ایک طرف دھکا دے دیا۔ رضوان ہاشمی بیٹھے بیٹھے ایک طرف لُڑھک گیا۔ اُس کی باچھوں سے رال اور بلغم ایک ساتھ رسنے لگے تھے۔

''بھاڑ میں جاؤ بھڑوے! لگتا ہے پھٹے پہ چڑھنا تمھارے نصیب میں لکھ دیا گیا ہے۔'' چوہدری ضیا فولڈنگ کرسی پر بیٹھے بیٹھے منہ ایک طرف پھیر کر بیٹھ گیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر لائٹر سے سلگانے لگا۔ سگریٹ کے دو تین لمبے کش لینے اور مقدور بھر دھواں باہر اگلتے ہوئے اچانک ہی رضوان کی طرف مڑا اور لائٹر جلا کر اُس کی شلوار کے ایک پائنچے کو آگ دکھا دی۔ پائنچے کو لگنی والی تھوڑی سی آگ سے ہی رضوان ہاشمی اُچھل اُچھل کر چیخنے چلانے اور آگ بجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ جب کہ چوہدری ضیا اُس کی اس ہذیانی حرکت پر محظوظ ہونے کی بجائے بدستور پرسکون انداز میں سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔

تھوڑی سی آگ تھی، ذرا سا پائنچہ جلا تو فوراً بجھ بھی گئی لیکن رضوان ہاشمی ابھی تک اُس کے صدمے سے نکل نہیں پایا تھا۔ وہ کبھی اپنی پنڈلی کو مسلتا اور کبھی چوہدری ضیا کو اس انداز میں تکتا کہ جس میں بیک وقت بے بسی، خوف اور غصے کی شدت زیر و زبر ہوئے جا رہی تھی۔

''بہت بڑا وکیل ہے تو فوجداری کا، ذرا یہ تو بتا کہ تیرا جسم کتنے فیصد جلا دوں تو، تو ہسپتال پہنچ

کر بھی زندہ نہیں رہ سکے گا۔" چوہدری ضیا کے لہجے کی حیوانیت بڑھتی چلی جا رہی تھی جب کہ رضوان ہاشمی لرز کر رہ گیا۔ کچھ دیر سکوت رہا۔

"تجھے نہیں معلوم تو میں بتاتا ہوں، کسی امکان کی بات کرتا ہوں، فرض کیا اگر تو شرمندگی کے مارے حوالات میں خودکشی کرنے کی کوشش کرے اور تیرے جسم کی کھال پچاس فیصد سے زیادہ جل جائے تو پھر یہاں کے ڈاکٹر تو کیا ولایت کے ڈاکٹر بھی تمھیں نہیں بچا سکیں گے، کہو کیسی رہے گی اس طرح کی موت؟" چوہدری ضیا کا ایک سگریٹ ختم ہوا تو اسی کے ٹکڑے سے اُس نے نیا سلگا لیا۔ رضوان ہاشمی نے خوف اور بے بسی کے عالم میں چوہدری کے پاؤں پکڑ لیے اور گڑگڑانے لگا۔

"چوہدری صاحب! مجھے اپنے بچوں کی قسم، مجھے نہیں پتا کہ رُباب کہاں ہے، کس کے پاس ہے، اتنا سچ ہے کہ میرا ڈرائیور اُسے کسی محفوظ جگہ پر پناہ دینے کے واسطے لے گیا تھا مگر بعد کا نہیں معلوم کہ کیا ہوا، میرا تو ڈرائیور بھی لاپتہ ہے، اُس کا فون ہی نہیں ملتا۔"

"کتنی بار یہ گھسی پٹی کہانی سنوں میں تم سے، کبھی کہتے ہو کہ تمھارے ڈرائیور نے لڑکی بخشن کے پاس پہنچادی تھی کبھی کہتے ہو ڈرائیور لڑکی سمیت لاپتہ ہے، سچ بولو وکیل صاحب! ورنہ یہ زبان اس طرح درمیان سے چیروں گا کہ جھوٹ بولنے کے قابل بھی نہ رہو گے۔" چوہدری ضیا نے رضوان ہاشمی کو قمیص کے گلے سے پکڑ کر اپنے قدموں سے اُٹھالیا۔

"دونوں باتیں سچ ہیں چوہدری صاحب! ڈرائیور جب سے لڑکی کو لے کر گیا، واپس نہیں آیا، میرا خیال ہے کہ اُس نے لڑکی کو حاجی بخشن کو واپس سونپ دیا ہوگا لیکن اُس کے بعد وہ کہاں گیا، کچھ پتہ نہیں۔" رضوان ہاشمی کا گڑگڑانا تھمنے میں نہیں آ رہا تھا۔

"پھر چکر دیتا ہے چوہدری ضیا کو، میرے ساتھ مفروضوں کی بات نہ کر بھڑوے، حقیقت کی بات کر، جو سچ ہے وہ بتا، یہ ہو گیا ہوگا، یہ نہیں ہوا ہوگا، چوہدری ضیا کی کورٹ میں نہیں چلتا۔" چوہدری ضیا نے ایک بار پھر اُسے گریبان سے پکڑ کر زور کا جھنجوڑا اور پہلے سے بھی زیادہ زناٹے دار تھپڑ اُس کے گال پر جڑ دیا۔ اب کے رضوان ہاشمی لڑھکا تو زمین پر اوندھے منہ گر گیا۔ چوہدری ضیا بھی اُسے گالیاں دیتا ہوا اپنی فولڈنگ کرسی سے اُٹھا اور وہاں سے پانچ سات قدم دور جا کر اپنی

پتلون کی زپ کھولتے ہوئے اور وہیں کھڑے کھڑے پیشاب کرنے لگا۔ پیشاب کرنے کے بعد واپس گھوما تو زمین پر لڑھکا ہوا رضوان ہاشمی بھی پھر سے اُٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔

چوہدری ضیا واپسی پر دوبارہ فولڈنگ کرسی پر بیٹھ کر ایک بار پھر سگریٹ سلگانے لگا۔ دن بھر کی مشقت نے اُسے بھی اِس قدر تھکایا کہ اپنی بدمزاجی کو قابو میں رکھنا مشکل ہی نہیں ناممکن لگ رہا تھا۔ معاملے کی حساسیت کے پیش نظر وہ رضوان ہاشمی کی تفتیش کو آج ہی نبیڑنا چاہتا تھا۔ اُس سے زیادہ کون خبر رکھتا تھا کہ آج کے سوئے ہوئے وکیل کل سے یکا یک یوں بھی جاگ سکتے ہیں کہ معاملہ اُلٹا پولیس کے گلے میں فِٹ ہو جائے۔ مسئلہ ایک ہوتا تو وہ کب کا نبیڑ چکا ہوتا لیکن یہاں دوسرا کیس رُباب کا بھی تھا کہ جسے اوپر سے آنے والے حکم کے تحت ایف آئی آر کے بغیر ہی صرف حل نہیں کرنا تھا بلکہ اُس لڑکی کو ہر صورت برآمد کرانے کے بعد بحفاظت اوپر پہنچانا بھی تھا۔

اِسی ادھیڑ بُن میں الجھے الجھے چوہدری ضیا نے دس پندرہ منٹوں میں کم و بیش تین سگریٹ راکھ کر دیے لیکن ہر زاویے سے سوچنے کے باوجود اُسے کوئی ایسا نشان نہیں مل رہا تھا کہ جس کے تعاقب میں وہ منزل تک پہنچ سکے۔ اُس کا تجربہ بار بار ایک ہی بات کہے جا رہا تھا کہ وکیل جھوٹ نہیں بول رہا۔ نہ تو اُس نے اپنی بیوی عتیقہ کو قتل کیا ہے اور نہ ہی اُسے رُباب کی کچھ خبر ہے۔ اب اگر اِس سے زیادہ وہ وکیل پر تھرڈ ڈگری لگاتا ہے تو خود اُس کی نوکری کے لالے بھی پڑ سکتے تھے۔ اگر دو تین تھپڑوں ہی میں اِس کی روح نکل گئی یا کل کلاں کو اِسی وکیل نے اُسے پولیس تشدد کے ساتھ ساتھ کئی دیگر مقدموں میں بھی پھنسوا دیا تو اوپر سے کسی بڑے افسر نے آکر اُسے نہیں بچانا بلکہ اپنی نوکری اور اپنی کھال، دونوں خود ہی بچانی پڑیں گی۔

''تو پھر کیا کیا جائے؟ اتنی بڑی آسامی ہاتھ لگی، اوپر والوں کی آشیرباد بھی تھی تو پھر ایسے میں بھی اگر نصیب نہ سنورے تو لعنت ہے چوہدری تیری تھانیداری پر۔'' کچھ سوچ کر چوہدری ضیا نے رضوان ہاشمی کی گردن میں ہاتھ ڈالا اور اُس کے کان کو اپنے منہ کے قریب کر لیا۔

''دیکھ وکیل! مجھے مجبور نہ کر کے تجھے درخت سے اُلٹا لٹکا کر تیرے پچھواڑے کی لترول سے ٹکور کراؤں، اب اِس عمر میں اتنا بڑا وکیل ٹکے ٹکے کے پلسیوں سے چوتڑوں پر چھترول کراتا

اچھا نہیں لگتا۔ میں نے سُنا ہے کہ تجھے بلڈ پریشر ہے، شوگر ہے، بواسیر بھی ہے، ایسے میں مر مرا گیا تو تیری لاش کو پھانسی لگانی پڑے گی تا کہ ثابت کر سکوں کہ تو نے خودکشی کی ہے، تو کیا یہ اچھا نہیں ہو گا کہ تو چپ چاپ سبھی کچھ مان لے، نہ خود ذلیل ہو نہ مجھے گناہ گار کر۔''

''چوہدری ضیا! اب تو میری بات سُن، میں نے اپنے بچوں کی قسم اُٹھالی ہے، اب اِس سے زیادہ میرے پاس کچھ نہیں یقین دلانے کو، اب تو چھترول کر یا مجھے پھانسی چڑھا، میں سب جھیلنے کو تیار ہوں۔'' رضوان ہاشمی نے اپنی باچھوں سے بہتے رال اور بلغم کے ملغوبے کو قمیص کے بازو سے صاف کیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

چوہدری ضیا نے بھی ہونٹوں میں دبا ہوا سگریٹ زبان کے زور سے پرے پھینکا اور سیدھا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا، مگر اِس طرح کہ اُس کی آنکھیں رضوان ہاشمی کی آنکھوں میں برمے کی شافٹ کی مانند اُتری ہوئی تھیں۔ دونوں میں سے کوئی بھی پلکیں نہیں جھپکا رہا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ رضوان ہاشمی ہر طرح کے مضمرات کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کر چکا تھا۔

''چلو میں مان بھی لوں کہ تو بے گناہ ہے تو اِس سے کیا ہو گا؟ کیا مدعی پارٹی یقین کر لے گی یا اوپر والے بھی اِسے سچ مان لیں گے؟ تیرے پاس تو اِس بات کا بھی کوئی جواز نہیں کہ اگر عتیقہ تین دنوں سے تمھارے فارم ہاؤس میں نہیں تھی تو تم نے خود کیا کیا؟ کہاں کہاں اُسے تلاش کیا اور اگر پھر بھی نہیں ملی تو پولیس کو رپورٹ کیوں نہ کی؟''

''چوہدری ضیا! اب اِن باتوں کا وقت گزر چکا، جو اِس وقت ہے وہی حقیقت ہے، تم اِس کیس میں میرا چودہ دن سے زیادہ جسمانی ریمانڈ نہیں لے سکتے لہٰذا اِس دوران جو بھی کرنا چاہو کر گزرو، بہتر ہو گا کہ مجھے قتل کر دو، ایک بار میں جوڈیشل ریمانڈ پر جیل چلا گیا تو پھر میں نے تمھارے سمیت تمھارے اوپر والوں کا اور اس جھوٹے کیس کا جو حشر کرنا ہے وہ دنیا دیکھے گی۔''

چوہدری ضیا ایک دم قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ''ہاشمی صاحب! آپ تو ناراض ہو گئے، میں تو سرکاری ڈیوٹی کر رہا ہوں، آپ بھی اِسے معمول کی کارروائی سمجھیں، اب دیکھیں ناں! فائل کا پیٹ بھی تو بھرنا ہوتا ہے۔''

رضوان ہاشمی نے چوہدری ضیا کو کبیدہ نگاہوں سے دیکھا اور سر جھکا لیا۔ چوہدری ضیا نے ترچھی آنکھوں سے اُس کے چہرے کے تاثرات دیکھے اور دور کھڑے کانسٹیبل کو ایک اور فولڈنگ کرسی لانے کو کہا اور کرسی کے آتے ہی ہاشمی کا بازو پکڑ کر اُسے کرسی پر بٹھا دیا۔

''ہاں جی! اب دونوں بھائی کام کی بات کرتے ہیں۔'' رضوان ہاشمی نے اُس کے یوٹرن کو نظرانداز کرتے ہوئے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اُس کے منہ پھیرتے ہی چوہدری ضیا کے تیور بھی بدلے مگر وہ پھر سے اپنے آپ کو نرماہٹ کی طرف لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔

''ہاں جی بھائی جی! اِدھر میری طرف دیکھو، کوئی عقل کی بات بھی کر لو، یہ وقت گزر گیا تو پھر ہاتھ نہیں آنا، ٹھیک ہے تم فوجداری کے بڑے وکیل ہو مگر میں نے بہت بڑے بڑے لوگوں کو پھٹے لگتے دیکھا ہے، برے وقت کو تکبر سے نہیں تدبیر سے ٹالتے ہیں، بھٹو کے خلاف بھی ایک معمولی سی ایف آئی آر درج ہوئی تھی کہ قتل اُس کے ایما پر ہوا ہے، وہ وزیر اعظم تھا لیکن تکبر نے عقل پر ایسا پردہ ڈالا کہ ایف آئی آر کو کوائش (quash) کرانے کی طرف توجہ ہی نہ دی اور پھر جب وقت بدلا تو اُسی ایف آئی آر نے پھانسی گھاٹ پہنچا دیا۔''

رضوان ہاشمی نے چوہدری ضیا کو اگرچہ غور سے نگاہ بھر کر دیکھا مگر اُس کی آنکھوں میں تیرتی ہوئی کدورت ملگجی روشنی میں بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

''چوہدری! تم سرکاری ڈیوٹی کرو اور قانون کے مسئلے مجھ پر چھوڑ دو، تمھیں صرف ایک قانون آتا ہے، گرفتار کرنے والا اور مجھے دونوں آتے ہیں، پھٹے چڑھانے والا بھی اور بری کرانے والا بھی، لہٰذا تم میری فکر کرنے کی بجائے اپنی نوکری بچاؤ، کل میرے مزید جسمانی ریمانڈ کے لیے علاقہ مجسٹریٹ کے پاس بھی تو پیش کرنا ہے۔''

چوہدری ضیا نے رضوان ہاشمی کی بات اَن سُنی کرتے ہوئے کھنکار کر گلا صاف کیا اور دور کھڑے کانسٹیبل کو آواز دی۔ وہ قریب پہنچا تو چوہدری نے اُسے ایک اشارہ سا کیا جس کے جواب میں اُس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور کھول کر اُس کے سامنے کر دیا۔ چوہدری نے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبائی اور کانسٹیبل نے لائٹر آن کرتے ہوئے آگے بڑھ کر اُسے آگ

دکھا دی۔ انتہائی تلخ دھوئیں کا طویل کش لے کر چوہدری ضیا نے اُسے اُس وقت تک سینے میں روکے رکھا کہ جب تک سینہ اندر سے جلنے نہ لگا۔ واپسی پر دھواں کم اور آنکھوں سے جلتا ہوا پانی زیادہ نکلا۔ جب بھی چوہدری کا دماغ ناموافق حالات میں تپ کر تندور ہونے لگتا تو اُسے ٹکیل ڈالنے کے لیے اپنے کانسٹیبل ڈرائیور کے سستے برانڈ کے سگریٹ کے کڑوے کسیلے دھوئیں کو سینے کی راہ دکھاتا۔ غصے کو ضبط کرنے کوشش میں لیے جانے والے محض تین کش اِس قدر خود کش ثابت ہوئے کہ آدھے سے زیادہ سگریٹ راکھ بن کر جھول گیا۔

"ٹھیک ہے وکیل صاحب! مجھے ایک قانون آتا ہے اور تمھیں دو لیکن اب تک تم نے پلسیوں کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر کے اُن کی پتلونیں اُتاری ہیں اور اُن کے پچھواڑے پر تھوکا ہے، اُن سے کبھی تھانے میں آمنا سامنا نہیں ہوا، خیر! تو بے گناہ ہے یا گنہ گار، میں اِس میں نہیں پڑتا، بس میری بات مان، مُک مُکا کر لے، معاملہ ابھی تک میرے ہاتھ میں ہے۔"

"رضوان ہاشمی نے استفساریہ انداز میں اُس کی طرف دیکھا۔ چوہدری ضیا نے سگریٹ کا ایک اور ہلاکت خیز کش لیا اور بری طرح کھانسنے لگا۔ کھانسی رُکی تو اپنی لال بھبھوکا آنکھیں رضوان ہاشمی کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"یہ تو تجھے خبر ہوگی ناں کہ لڑکی کی لاش کا چہرہ سوٹے کے پے در پے وار سے بری طرح مسخ کیا گیا ہے اور بغیر ڈی این اے ٹیسٹ کے شناخت ہونا ممکن نہیں رہا، لیکن مسئلہ اِس طرح حل ہو رہا ہے کہ جس سوٹے سے اُسے قتل کیا گیا وہ سوٹا بھی تمھارے فارم ہاؤس کے اندر جھاڑیوں کی اوٹ سے برآمد ہو چکا ہے، اِس سوٹے پر جہاں لڑکی کا خون اور بھیجا لگا ہوا ہے وہاں قاتل کی انگلیوں کے نشانات بھی موجود ہیں، میں نے بس اتنا کرنا ہے کہ ڈی این اے ٹیسٹ میں اِس لاش کو عتیقہ کی لاش ثابت کرنا ہے اور سوٹے پر موجود انگلیوں کے نشانات کو تمھاری انگلیوں کے نشان، پھر دیکھتا ہوں تمھاری وکالت کہاں جاتی ہے۔"

بات ادھوری چھوڑ کر چوہدری ضیا نے ایک بار پھر رضوان ہاشمی کے چہرے کو اپنی آنکھوں سے ٹٹولا۔ "اور اگر چاہتے ہو کہ لاش کا ڈی این اے ٹیسٹ بھی نیگیٹیو آئے اور قاتل کی انگلیوں کے

نشان بھی تمھاری انگلیوں کے نشانات سے نہ ملیں تو سودا ڈیڑھ کروڑ میں طے ہوگا، اب رہا رُباب کے اغوا اور ممکنہ قتل کا معاملہ تو اُس میں صافی ایک کروڑ میرا، پھر اوپر والے جانیں اور میں، تم اُس کیس میں آزاد اور پھندہ حاجی بخشن کی گردن میں فٹ، تم بھی کیا یاد کروں گے کہ چوہدری ضیا جیسے جی دار ایس ایچ اُو سے پالا پڑا تھا۔''

۴۵

تونگر کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اِس طرح اچانک بدلی ہوئی صورت حال میں وہ جانان سے کس طرح پیش آئے۔ اُس کی موجودی کا احساس ہوتے ہی وہ تمام تر خطرات، اندیشوں اور وسوسوں کے باوجود من ہی من میں جھوم اُٹھا تھا۔ وفورِ تھا مستی کا، عجیب سی سرشاری تھی کہ کسی طرف بھی دھیان دیئے بغیر، کچھ بھی سوچے اور سمجھے بنا، فزوں تر ہوئے جا رہا تھا۔ پھر اچانک ہی شعور کے پاتال میں سے ایک ملاقات کی روداد اُوپری سطح پر ابھری۔ اللہ ڈنو کے آفس میں اُس سے ہونے والی آخری ملاقات کی روداد کہ جس میں جانان لاتعلقی کی علامت کے طور پر موجود رہی تھی۔ تذلیل کی وہ سبھی ممکنہ حدود کہ جو روزِ اول سے روزِ آخر تک اُس کا مقدر رہیں، جانان اگر اُن سبھی لمحات کی چشم دید گواہ نہیں تو گواہ ضرور رہی تھی۔ اب جب کہ وہ کہنے کو آزاد تھا لیکن اچانک سے لگی بندھی موت کے دھڑکے کو اُس سے منتھی کرتے ہوئے مسلسل مانیٹرنگ پر رکھا لیا گیا تھا تو ایسے میں پھر سے جانان کا اُس کے ہاں چلے آنا کیا تھا۔ وہ خود ہی اُس کی موت بن کر آن دھمکی تھی یا محض موت کا سندیسہ بن کر جانکنی کی اَنی کو کچھ اور بھی رگِ جاں کے قریب لانا مقصود تھا۔ کون یقین کرے کہ وہ اللہ ڈنو عبید کے نگرانی کے نظام کا کل پرزہ نہیں بلکہ اُس سے الگ تھی۔

اِس سے تو صاف ظاہر تھا کہ اُس کا سول آفیسرز کلب میں قیام اللہ ڈنو عبید کے نگرانی کے نظام سے پوشیدہ نہیں تھا۔ چند لمحے پہلے لہو میں جاگنے والی سرشاری، اُس کی رگوں ہی میں منجمد ہونے لگی تھی۔

''کیا ہو گیا تونگر صاحب! آپ نے تو پہچاننے سے ہی انکار کر دیا۔'' جانان کی آواز اس قدر آہستہ تھی کہ تونگر اُسے بمشکل سن اور پہچان پایا۔ تونگر نے حیرت سے جانان کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں اُس کی معمول کی مسکان کے باوجود آواز کی فطری شوخی مفقود تھی۔ وہ خاموش رہا کہ پیہم ذہنی قلابازیوں نے ایک بار پھر اُس کے حواس کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔

''شاید آپ مجھے مشکوک گردان کر نظر انداز کر رہے ہیں کہ میں باس کے حکم کے تحت آپ کی نگرانی کر رہی ہوں۔'' جانان نے اپنی مسکراہٹ کو وسعت دینے کی کوشش کی لیکن تونگر ابھی تک اپنے آپ کو مجتمع نہیں کر پایا تھا۔ ایک سابقہ بیوروکریٹ کی نجانے کون سی حس تھی جو اُسے اپنے زندگی کے آخری پڑاؤ کا یقین دلا رہی تھی۔ اُسے لگا کہ جانان کے متوقع وار سے پہلے ہی وہ زندگی کی آخری رمق سے بھی محروم ہو چکا ہوگا۔

''آپ کے خدشات درست ہیں، مجھے صرف آپ کی مانیٹرنگ کے لیے ہی نہیں بلکہ اُس لائن آف ایکشن کو آخری موڑ دینے کے لیے بھیجا گیا ہے کہ جس کے واسطے گزشتہ کئی مہینوں سے آپ پر کام ہو رہا ہے۔'' جانان کے چہرے سے مسکراہٹ غائب اور آنکھوں میں شرمندگی اترنے لگی تھی۔ تونگر کے جسم میں بھی ایک سرد لہر سر سے پاؤں تک سنسناتی ہوئی گزر گئی۔

''مقصود کیا ہے؟'' بولتے ہوئے بلغم کی کوئی اجنبی تہ تونگر کے گلے میں پھنس گئی تھی۔

''آج ایک تصویر تو بھیجی گئی تھی آپ کو!'' جانان اب براہ راست اُس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی تھی۔

تونگر چونک گیا۔ سبھی ٹوٹی ہوئی کڑیاں باہم جڑنے لگی تھیں۔ ''کس کی تصویر تھی وہ؟ میں تو نہیں جانتا اُسے۔'' تونگر کی آواز ایک دم اونچی ہونے لگی تھی۔ جانان نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا، کچھ نزدیکی میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے لوگ اُن کی طرف متوجہ ہونے لگے تھے۔ تونگر کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ وہ کچھ اونچا بول گیا ہے۔

''اندر کمرے میں نہ چلیں! وہیں بات کرتے ہیں۔'' جانان نے اُٹھنے کے لیے کرسی کے بازوؤں پر زور ڈالا ہی تھا کہ تونگر نے اُسے منع کر دیا۔ ''جو بات بھی کرنی ہے اِدھر ہی کرتے ہیں۔''

''میں حلفاً کہتی ہوں کہ میں آج آپ سے کوئی برا سلوک نہیں کرنے آئی، مجھے کہا گیا ہے کہ میں آپ کے پاس جاؤں، کچھ وقت گزاروں اور پھر رپورٹ کروں کہ آپ کی ذہنی حالت کیا ہے؟''

''اتنے میں تفضل کھانا لے کر آ گیا۔ اُس نے پہلے تو حیران ہو کر جانان کی طرف دیکھا لیکن بس ایک ساعت کے لیے اور پھر مسکرا دیا۔ ''صاحب جی! میں احتیاطاً دو لوگوں کا کھانا بنوالایا ہوں، مجھے معلوم تھا کہ آپ کبھی بھی اکیلے کھانا نہیں کھاتے تو آج کیسے کھائیں گے۔''

تفضل میز پر کھانا چننے لگا تو تونگر نے اُسے غور سے دیکھتے ہوئے اُس کی کہی ہوئی بات کی تہ تک اترنے کی کوشش کی لیکن اُس کے چہرے پر ایک خوشامدانہ مسکراہٹ کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ کچھ یہی حال جانان کا تھا کہ جس نے ویٹر کی بات کا نوٹس تک نہیں لیا تھا اور بدستور تونگر کو تکے جا رہی تھی۔ ویٹر کھانا میز پر لگانے کے بعد چلا گیا تو جانان نے اُسی انداز میں بیٹھے بیٹھے تونگر کو کچھ اس کچھ اِس انداز میں دیکھا کہ جیسے پوچھ رہی ہو کہ کیا واقعی وہ تصویر والی لڑکی کو نہیں پہچانتا۔ تونگر سے رہا نہ گیا۔ اُس نے اپنے دائیں بائیں لوگوں کی جانب دیکھا اور پھر آگے کی طرف جھک کر آہستہ سے بولا۔

''میری بات کا یقین کرو جانان! میں نے اِس لڑکی کو آج سے پہلے کبھی، کہیں بھی نہیں دیکھا، نہ ہی تصویر میں اور نہ ہی کہیں آمنے سامنے۔''

''ایک بار ذہن پر زور ڈالیں، یہ آج سے دس برس پہلے کی تصویر ہے، شاید یہ کبھی آپ کے کسی بستر کی شکن رہی ہو۔'' جانان اپنے متفکر چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''دس برس پہلے؟'' اب کے تونگر نے متجسس انداز میں جانان کی طرف دیکھا۔

''جی! دس برس پہلے۔''

''لیکن یہ ہے کون اور اِس کی تصویر مجھے کس نے اور کیوں بھیجی؟'' تونگر کا لہجہ پھر سے اونچا ہونے لگا تھا۔

''آہستہ بولیے اور پہلے کھانا کھا لیجیے..... میں جانتی ہوں کہ اِس وقت بھوک نے آپ کی کیا

حالت بنا رکھی ہے۔'' جانان نے صورتِ حال میں سے پیدا شدہ تلخی نکالنے کی کوشش کی۔

''آپ تو یہ بھی جانتی ہوں گی کہ جس کے سامنے ہی نہیں بلکہ تعاقب میں بھی بلاوجہ موت لگا دی گئی ہو، اُس کی بھوک کہاں باقی رہتی ہے۔'' تونگر کے ہونٹ تلخی سے بھنچ سے گئے۔

''بلاوجہ! بلاوجہ تو نہیں، باس کچھ بھی بلاوجہ نہیں کرتے۔''

''صاحب! مجھے پورا یقین تھا کہ آپ نے باتوں باتوں میں کھانا نہیں کھایا ہوگا، اب دیکھیں ناں! یہ بلاوجہ ٹھنڈا ہو چکا ہے، اسے چھوڑیں، میں لے جاتا ہوں اور نیا بنوا کر لاتا ہوں۔'' تفضّل اچانک سے وہاں پہنچا اور میز پر لگا ہوا کھانا اُٹھا کر چلتا بنا۔ تونگر اُس کے کہے ہوئے لفظ ''بلا وجہ'' سے اِس قدر بھونچکا ہوا کہ اُسے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ جانان بھانپ گئی کہ تونگر کے ذہن میں کیا چل رہا ہے۔

''باس کا آدمی ہے، شاید میری نگرانی پر ہو، باقی آپ خود سمجھ دار ہیں کہ یہاں کون لوگ آتے ہیں اور باس کا اُن سے کیا تعلق ہوتا ہے؟''

''تو پھر لڑکی کی تصویر بھی اِسی نے بھیجی ہوگی۔'' تونگر اپنے تجسس کے سبب اَنت تک پہنچنے کے لیے اُتاولا ہو رہا تھا۔

''یہ تو میں نہیں جانتی کہ تصویر کون دے گیا البتہ اتنا معلوم ہے کہ تصویر آپ کو بھیجی گئی تھی، شاید کھیل کو جلد از جلد نمٹانے کے واسطے۔'' جانان کا چہرہ نجانے کیوں ہر قسم کے تاثر سے عاری ہو چلا تھا۔

''تو مجھے تم قتل کرنے کے لیے آئی ہو؟'' تونگر نے عجیب سی نظروں سے جانان کو دیکھا کہ جن میں نہ تو جارحیت تھی اور نہ ہی مزاحمت۔

''فی الحال نہیں۔'' جانان کی نگاہیں ابھی تک تونگر کی آنکھوں پر مرتکز تھیں۔

''تو کب؟ اب کیوں نہیں؟'' تونگر ہذیانی ہو چلا تھا۔

''باس کا اپنا اسٹائل ہے جس میں کوئی اور دخیل نہیں ہو سکتا۔''

''لیجیے صاحب! اب پہلے سے بھی بہتر بنوا کے لایا ہوں، بس گرم گرم تناول فرمالیں، باتیں

تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔'' تفضل پھر کہیں سے اچانک آن ٹپکا، کھانا میز پر چُنا اور اُن دونوں پر سرسری نگاہ ڈالتا ہوا چلتا بنا۔

''اب آپ کھانا کھا لیجیے، اگر گلوکوز لیول گر گیا تو باس کو بھی تردد کی ضرورت نہیں رہے گی۔''

تونگر حیران تھا کہ یہ عورت کتنی سہولت سے اُس کے ساتھ کھیل رہی ہے۔ گرم گرم باربی کیو اور انواع و اقسام کے خستہ نان کے نصف کٹے ٹکڑوں سے سینک دیتی ہوئی باسکٹ سے اُٹھتی ہوئی اشتہا کو گفتگو کی کثافت اور پراگندگی پر حاوی ہو چکی تھی۔ پھر بھی تونگر نے نوالے اُس وقت توڑنے شروع کیے جب جانان اپنی پلیٹ میں کباب اور چکن کی کچھ بوٹیاں ڈال چکی تھی۔ لیکن کچھ دیر کی خاموشی اور کھانا کھانے کے دکھاوے کے باوجود محسوس یہی ہو رہا تھا کہ دونوں میں سے کوئی بھی کھانا نہیں کھا پا رہا تھا۔ اگر حلق سے کچھ اترا بھی تو بس دو چار نوالے۔

''جانان!'' جانان کو یوں محسوس ہوا کہ تونگر نے تمام تر صورتِ حال کو نظر انداز کرتے ہوئے اُسے دل کے نہاں خانوں سے پکارا ہے۔ جانان نے کھانا کھانے کی کوشش ترک کی اور سوالیہ انداز میں تونگر کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی اُس کی طرف دیکھ رہا تھا یوں کہ جیسے پکارنے کے بعد اُس کے جواب کا منتظر رہا ہو۔ تونگر کے اِس طرح دیکھنے نے شاید اُس کے اندر کو چھو لیا تھا۔ ایک کرب تھا، یاسیت تھی، اپنے پن کے شکوے اور بے بسی تھی کہ جن کی مجتمع تاثیر اس طرح دل میں اُتری کہ ایک وجیہہ مرد کا سامنا کرنے کے لیے کٹھورتا کی بمشکل ایستادہ کی گئی دیوار قطرہ قطرہ پگھل کر اندر کہیں ٹپکتی سنائی دینے لگی۔ تونگر جیسا شخص بھلا اس کیفیت سے کس طرح بے خبر رہ سکتا تھا۔ وہ اِس نرم روی میں بھی آپ سے تم پر آ چکا تھا۔

''اتنا تو جان چکا ہوں کہ شاید میں پھر تمھیں کبھی زندہ نہ مل سکوں یا کبھی پوچھ بھی نہ پاؤں کہ تم نے مجھے اپنے گھر کیا کہنے کے لیے بلایا تھا! کیا مجھے بتا سکتی ہو کہ یہ سب عذاب کیا ہے، کیوں مارنا چاہتا ہے وہ مجھے، کیا بگاڑا ہے میں نے اللہ ڈنو عبید کا اور یہ تصویر کس کی ہے۔'' شدتِ جذبات میں آواز کو آہستہ رکھنے کی کوشش میں اُس کی سانس پھول گئی۔

تونگر کے لہجے کی یاس اور آنکھوں میں موجود ایک مستقل پیاس جانان کو دونوں سروں سے

جلنے والی موم بتی کی طرح پگھلائے چلی جا رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں وہی رنگ بیدار ہوتے ہوئے جھولنے لگے تھے کہ جس روز اُس نے تونگر کو اپنے اپارٹمنٹ میں مدعو کیا تھا۔ جانان نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اردگرد کی ٹیبلز سے کوئی بھی اُن کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ اگر ہماری تصویر نہیں تو آواز ضرور کسی نہ کسی طور باس تک پہنچ رہی ہوگی، لیکن مجھے اَب اِس کی پروا نہیں رہی۔'' جانان جذباتی انداز میں سانس لینے کے لیے رُکی۔ پانی کے دو گھونٹ اِس طرح پیے کہ جیسے منہ ہی میں بھاپ بن کر اُڑ گئے ہوں اور پھر آنکھیں اِس طرح بھینچ لیں کہ جیسے کسی فیصلے پر پہنچنے کے بعد بھی تشکیک کا شکار ہو چکی ہو۔ لیکن بس ایک دو لمحوں کے لیے اور جب کھولیں تو یوں لگا کہ وہ بہت سے فیصلے کر چکی ہے۔

''تونگر صاحب! مجھے نہیں معلوم کہ جس لڑکی کی تصویر آپ کو بھیجی گئی ہے دس برس قبل وہ واقعی آپ کی حیوانیت کا نشانہ بنی، مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ بے رحمی سے ریپ کرنے کے بعد آپ نے اُس لڑکی کا قتل خود کیا یا کسی اور سے کرایا، مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اُس لڑکی کے قتل کے بعد اُس کی لاش کو کہاں ٹھکانے لگایا گیا، لیکن اتنا جانتی ہوں کہ اِس لڑکی کے ساتھ جانوروں جیسا ریپ اور اُس کا قتل، سب آپ کے نامۂ اعمال لکھا جا چکا ہے۔ اِس کا فیصلہ تو اب آپ کا ضمیر کرے گا کہ عورتوں کی اِس قدر بہتات کے ہوتے ہوئے آخر آپ نے اُس کم عمر لڑکی کو اپنی حیوانیت کی تسکین کے لیے کیوں چنا؟ میرے یقین سے قطع نظر جرم بھی آپ پر ثابت ہو چکا اور سزا بھی سنائی جا چکی ہے، ہر آنے والے پل میں اَن دیکھی موت کی طرف قدم قدم مراجعت کی سزا کہ جو آپ اس وقت بھگت رہے ہیں۔''

شاید جانان کی آنکھیں نمناک ہو چکی تھیں اِس واسطے اپنا چہرہ ایک طرف موڑ کر وہ انھیں خشک کرنا چاہ رہی تھی۔ جب کہ تونگر کی آنکھیں ہی نہیں پورا وجود حیرت بنا ہوا تھا۔ جانان کی سنائی ہوئی کہانی اُس نے سُن تو لی لیکن یہ سب کچھ اُس کے لیے ناقابلِ یقین تھا۔

''غلط فہمی ہوئی ہے تمھارے باس کو، میں! میں تو وہ شخص کہ جس نے بنا اجازت کبھی اپنی بیوی تک کو نہیں چھوا، رضامندی کے بنا کسی عورت کے قرب کی تمنا نہیں کی، اور پھر اُسی پر الزام کہ اُس

نے ایک نابالغ لڑکی کے ساتھ وحشیانہ زنا بالجبر کرنے کے بعد اُسے قتل کر دیا، مجھے تو ویسے بھی کراہت ہوتی ہے نابالغ لڑکیوں سے جنسی ملاپ کے تصور سے، ضرور کوئی غلط فہمی ہے اللہ ڈنو کو میرے بارے میں۔''

آخری جملہ کہتے ہوئے تونگر اپنی آواز اور لہجے پر قابو نہ پا سکا۔ اردگرد کی میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ اُن کی طرف متوجہ ہونے لگے تھے۔

''اوہو صاحب! لگتا ہے آج آپ دونوں کو بھوک نہیں ہے، کھانا پھر سے جوں کا توں پڑا ہے، کیا حکم ہے اِسے سمیٹ کر آپ کے لیے آپ کی پسندیدہ فیرنی نہ لے آؤں؟'' تفضّل پھر سے اچانک آن دھمکا تھا۔ تونگر نے اضطراب کے عالم میں جانان کی طرف دیکھا تو جانان نے سر کی جنبش سے ویٹر کو منع کر دیا۔ ویٹر کچھ بھی بولے بغیر انھیں عجیب سی نگاہوں سے دیکھتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ اِس دوران جانان مسلسل تونگر کے چہرے کے تاثرات دیکھتی رہی جب کہ وہ اُس کی طرف دیکھنے یا نگاہیں ملانے سے گریز کر رہا تھا۔

''باس کبھی غلط فہمی نہیں پالتا، یقین ہو جائے تو اپنے شکار کو آکٹوپس کی طرح گھیرنا شروع کر دیتا ہے جیسا کہ اُس نے گزشتہ دس برسوں سے آپ کو گھیر رکھا ہے۔''

''کیا تم بھی سمجھتی ہو کہ میں ایسا کر سکتا ہوں؟'' تونگر کے چہرے کا اضمحلال شکست میں بدلتا جا رہا تھا۔

''میرے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔'' جانان کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''مگر یہ لڑکی کون ہے؟ کیا لگتی ہے اللہ ڈنو کی؟'' تونگر بیٹھے بٹھائے پھٹ سا پڑا۔ لہجہ سخت مگر آواز مدھم تھی۔ جانان کچھ دیر تونگر کی آنکھوں میں دیکھتی رہی، کسی حتمی نتیجے تک پہنچنے کے لیے اور شاید پہنچی بھی۔

''رُباب ہے اِس کا نام'' جانان نے آگے جھک کر تونگر سے رازداری سے کہا لیکن یہ بات الگ کہ اِس انکشاف کے بعد بھی ایک رنگ سا اُس کے چہرے پر آیا اور آ کر چلا گیا، غیر یقینی کا رنگ۔

۴۶

تحصیل بار حیدر گوٹھ کے سالانہ انتخابات ہو چکے۔ خوشحال خان نے یہ الیکشن جیل سے لڑا اور اپنے گروپ سمیت ہار گیا۔ وہ صرف الیکشن ہی نہیں ہارا تھا بلکہ پولیس، انتظامیہ اور ضلعی عدلیہ سے ٹکراؤ کے نتیجے میں مالی نقصان کے ساتھ ساتھ وکالت کو بھی داؤ پر لگا بیٹھا تھا۔ جب وکلا سیاست کرنے والوں میں سے کوئی بھی دھڑا حمایت کو نہ پھٹکا تو دو ہفتوں کی جیل نے سارے کس بل نکال دیئے۔ معافی تلافی اور آئندہ کے لیے حدود میں رہنے کی گارنٹیاں تحریری معافی ناموں کی صورت سرکاری ریکارڈ کا حصہ بنیں تو مقدمے میں سے انسداد دہشت گردی ایکٹ کی دفعات نکال دی گئیں۔ اِس کے نتیجے میں اگرچہ ضمانت تو ہو گئی لیکن نئے مقدمات آنا بند ہو گئے اور جو پہلے سے سماعتوں میں تھے، اُن کے لفافے بھی ایک ایک کر کے دوسرے وکلا کے پاس جانے لگے۔

خوشحال خان جانتا تھا کہ وکالت شو بز کی طرح کا دھندہ ہے کہ جس میں گئے دنوں میں وکیلوں کا ججوں سے خوشامدانہ رویہ اور میل ملاپ کا تاثر کام آتا تھا اور آج کل دھونس دھاندلی، رعب داب اور ہتھ چھٹ ہونا کام نکلوانے کے شافی گُر تسلیم کیے جاتے ہیں اور ان سب سے بڑھ کر لوکل بار کا صدر، سیکریٹری یا کوئی بھی عہدیدار ہونا۔ سائلین کو تاثر یہی دیا جاتا ہے کہ جس مقدمے میں صدر صاحب کا وکالت نامہ ہوگا اُس میں فیصلہ یقینی طور پر اُسی کے حق میں ہوگا۔ اِسی سبب جب بھی کوئی نیا صدر منتخب ہوتا ہے تو زیرالتوا مقدمات میں بھی نئے صدر کے وکالت نامے آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اِن حالات میں کہ جب صدر بننے کی بساط لپیٹی جا چکی ہو، جب ججوں کو ڈرانے دھمکانے اور اُن کی عدالتوں کو تالے لگا کر اپنے موکلوں کی قسمت کے تالے کھولنے والا وکیل ہی خود جیل کی ہوا کھا آئے اور کوئی بھی عدالت اُس کی ضمانت لینے پر آمادہ ہی نہ ہو کہ جب تک ناک رگڑ کر معافیاں نہ مانگنی پڑیں تو ایسے میں کون سا شخص اپنے معاملات کی دادرسی کے واسطے اُسے وکیل کرتے ہوئے منصفی کرانے کی خواہش کرے گا۔ جس عروج تک پہنچ کر اُس نے سال بھر بے اندازہ کمائی کا سوچا تھا وہ تو ویسے بھی خوفناک خواب ثابت ہو چکا تھا۔ دسترخوان کے وہ مہمان

جوڑنوالے کی آس میں جونیئر وکیل کے طور پر اُس کے چیمبر میں درجنوں کے حساب سے آن بیٹھے تھے، خود بخود ہی اڑن چھوا ہو گئے۔ منشیوں کی فوج ظفر موج کو جب دیہاڑی ملنا بند ہوئی تو وہ بھی سوائے ایک دو پرانے منشیوں کے اِدھر اُدھر ہو گئے۔ خوشحال خان کے چیمبر پر ویرانیوں کے ڈیرے اور وہ خود کسی سے آنکھ ملانے کے قابل نہ رہا۔

جیل سے رہائی کے بعد اُس کا خیال تھا کہ وکلا حقوق کے لیے کی جانے والی جدوجہد کا اتنا تو صلہ ملے گا کہ اُس کا اپنا گروپ اور وکیلوں کے کچھ ہم خیال دھڑے نہ صرف جیل کے دروازے پر اُس کے استقبال کے لیے موجود ہوں گے بلکہ اُسے کسی شاندار جلوس کی صورت کچہری میں بھی لایا جائے گا لیکن جب وہ جیل سے باہر نکلا تو سوائے اُس کے دو منشیوں کے اور کوئی بھی نہیں تھا۔ پھر بھی اتنی آس ضرور تھی کہ اِس بار نہ سہی لیکن اگلی بار وہ تحصیل بار کا صدر ہو کر ہی رہے گا۔ لیکن جب وکالت رہی اور نہ ہی سیادت تو ڈیپریشن میں جانا یقینی ہو گیا۔ پہلے پہل تو کچھ دن اپنے آپ کو اندر کی ڈھٹائی سے مضبوط کرتے ہوئے بظاہر پورے طمطراق سے کچہری میں آنا شروع کیا لیکن جب ججز سمیت، پولیس، انتظامیہ، عدلیہ اور خود وکلا برادری کی جانب سے سرد مہری کا سامنا ہوا تو اندر کی توڑ پھوڑ کے سبب کچہری میں آنا بھی کم ہوتا چلا گیا۔ اور جب صورت یہ ہوئی تو روزمرہ کے اخراجات کے واسطے جمع پونجی کو بھی گردش میں لانا ضروری ٹھہرا۔ سرپلس جو بھی تھا الیکشن اور مقدمہ بازی کی نذر ہو گیا۔ مقدمات سے گلوخلاصی کے لیے بھی اب ایک طویل مشقت درکار تھی وہ بھی صرف اُس صورت میں کہ اگر پولیس، عدلیہ اور انتظامیہ بحیثیت ادارہ اُس کے ماضی سے صرفِ نظر کرنے پر آمادہ جائیں۔ جب کہ اِس کا امکان مستقبل قریب میں نہ ہونے کے برابر تھا۔ اب تو کوئی انہونی ہی مقدر کی اِس بازی کو پلٹ سکتی تھی۔

دوسری جانب خوشحال خان کا رہبر اور اُستاد رضوان ہاشمی ایڈووکیٹ اُس سے بھی زیادہ برے حالات سے دوچار تھا۔ خوشحال خان اگر ریاستی اداروں سے متھا لگانے اور انھیں رسوا کرنے کی سزا جیل سے باہر آکر بھی بھگت رہا تھا تو رضوان ہاشمی ریاستی اداروں کا ناپسندیدہ ہونے کے علاوہ مکافاتِ عمل کی چکی کے دو پاٹوں کے بیچ آنے کے بعد لحظہ لحظہ پستا چلا جا رہا تھا۔ چوہدری ضیا کی

پیشکش ٹھکرائے جانے کے بعد نہ صرف اُس کے خلاف رُباب کے اغوا برائے زنا بالجبر اور قتل کی ایف آئی آر بھی درج ہو گئی تھی بلکہ عتیقہ کے قتل کیس میں چودہ روز کے جسمانی ریمانڈ کے بعد وہ رُباب اغوا کیس میں بھی مزید چودہ روز چوہدری ضیا کی تحویل میں رہا۔ اِس سارے معاملے میں حیرت کی بات رضوان ہاشمی ایڈووکیٹ کا رویہ ہی نہیں بلکہ رُباب اغوا کیس کا مدعی تھا جو کوئی اور نہیں بلکہ حاجی بخشن کے حیدر گوٹھ کے دھندے کا نگران فیض کریم عرف فیضو تھا۔ فیض کریم نے ایف آئی آر میں براہ راست رضوان ہاشمی اور اُس کے لاپتہ ڈرائیور جبار کو نامزد کرتے ہوئے اُسے اپنی لے پالک بیٹی رُباب کے اغوا کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔

یہ انکشاف رضوان ہاشمی کے لیے اعصاب شکن تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حاجی بخشن کا پالتو اُس کے خلاف اِس قسم کی ایف آئی آر درج کرا سکتا ہے کہ جس میں ایک کال گرل کو وہ اپنی لے پالک بیٹی تسلیم کر لے۔ اُسے اِس سازش کے پیچھے حاجی بخشن دکھائی دے رہا تھا کہ جس نے ایک عرصے کی دوستی کو مفادات کی بھینٹ چڑھا کر اُسے اُس وقت ایک اور مصیبت میں ڈال دیا کہ جب وہ پہلے ہی سے اپنی دوسری بیوی کے قتل کے الزام کا سامنا کر رہا تھا۔ لیکن وہ ابھی تک اِس معمے کو سمجھنے سے بھی قاصر تھا کہ حاجی بخشن، جس کی گاڑی حادثے کا شکار ہوئی، ڈرائیور جلا گیا مگر وہ خود منظر نامے پر کہیں بھی نہیں تھا۔ زمیں نگل گئی یا آسمان کھا گیا، کم از کم رضوان ہاشمی کو کہیں سے کوئی خبر نہیں تھی۔

دونوں مقدمات میں پولیس کے اٹھائیس دن کے جسمانی ریمانڈ کے بعد رضوان ہاشمی کو تھانے کی حوالات سے شمس پور کی ڈسٹرکٹ جیل پہنچا دیا گیا۔ چوہدری ضیا اُسے اپنی تحویل کے آخری دن تک سمجھاتا رہا کہ اُس کے خلاف اب اگرچہ رُباب کے اغوا کا مقدمہ بھی ہو چکا ہے پھر بھی اگر وہ اُس کی لائن پر آجائے تو کچھ اضافی خرچے کے بعد اُس کے لیے آسانیوں کی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔ لیکن اٹھائیس دنوں کے ناقابل برداشت جسمانی ریمانڈ کے سو جوتوں سے گزرنے کے بعد وہ کروڑوں کی رشوت کے سو پیاز کھانے کو تیار نہیں تھا۔ ایک زیرک فوجداری وکیل ہونے کے ناتے اُسے یقین تھا کہ دونوں مقدمات میں کسی بھی چشم دید گواہی یا ٹھوس واقعاتی

شہادت کے بغیر اُسے منسوب جرائم سے جوڑنا مشکل ہی نہیں، ناممکن تھا تو ایسے میں اُسے سزا کیسے ہوگی۔ اِس قسم کے فوجداری مقدمات میں سزا دینے کے واسطے ہمیشہ ٹھوس اور مربوط شہادت چاہیے ہوتی ہے کہ جس میں شک کی ذرہ برابر بھی گنجائش نہ ہو گرنہ شک کا فائدہ ہمیشہ ملزم کو دیا جاتا ہے۔

جیل میں آنے کے بعد رضوان ہاشمی کا خیال تھا کہ اب وہ نہ صرف چوہدری ضیا کی دستبرد سے محفوظ ہوگا بلکہ جوڈیشل ریمانڈ پر ہونے کے ناتے ضمانت بھی جلد ہو جانے کا امکان تھا۔ رضوان ہاشمی کے لیے اِس حد تک تو سہولت ضرور پیدا ہوگئی کہ یہاں چوہدری ضیا نہیں تھا جو اُسے جسمانی ریمانڈ کی آڑ میں نجانے کہاں کہاں لے جا کر جسمانی اذیتیں دیتا رہا لیکن یہاں ایک اور ایسی مصیبت سے سامنا ہو گیا کہ جس کے بارے میں اُس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ حالانکہ سپرنٹنڈنٹ جیل نے ایک سینئر وکیل ہونے کے ناتے اپنے طور پر اُس کے لیے بیرک کی بجائے علیحدہ کوٹھڑی کا بندوبست کر دیا تھا لیکن دن کو وہ جب بھی کوٹھڑی سے باہر آتا یا شام کو ٹہلائی کے لیے نکلتا تو کہیں نہ کہیں اُس کا سامنا اُن سزا یافتہ قیدیوں سے ہو جاتا جو اُس کی وکالت کے سبب مختلف مقدمات میں مختلف نوعیت کی سزا بھگت رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ رضوان ہاشمی کو چاروں طرف سے گھیر لیتے اور منہ بھر کر مغلظات بکتے اور ننگی گالیاں دیتے۔ کچھ تو اپنی شلواریں اور نیکریں نیچے کر کے اپنا ننگا اُگاڑا دکھا کر اُس کا رشتہ اپنے ممدوح کی ہر عمر کی خواتین سے اِس طرح جوڑتے جو اُس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو کر رہ جاتا۔

پہلے پہل اُس نے غصے میں آ کر اُن سے اُلجھنے کی کوشش کی لیکن اُن سب نے مل کر اُس کی اِس طرح دھنائی کی کہ جیل کے عملے کے آتے آتے وہ ہر طرف سے متورم ہو چکا تھا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ سے شکایت کی گئی تو وہاں سے بھی اُسے اِس قسم کی صورتِ حال کو برداشت کرنے کا مشورہ دیا گیا کہ جیل کا عملے ہر وقت، ہر جگہ پل بھر میں نہیں پہنچ سکتا۔ یوں رضوان ہاشمی جیسے وکیل نے جیل میں منتقل ہونے کے پہلے ہفتے ہی اُن قیدیوں سے ماں بہن کی توصیف میں بکی گئی گالیاں کھانے کا حوصلہ پیدا کر لیا کہ جو کورٹ روم میں اُس کی جرح کے سامنے گھگیانے لگتے تھے۔ کچھ

دن اور گزرے تو اُن قیدیوں کا غصہ بھی جاتا رہا۔ یوں کبھی کبھار آتے جاتے منہ کا ذائقہ بدلنے کی خاطر کوئی نہ کوئی چھوٹی موٹی بے ضرر سی گالی ہو ہی جاتی جس کا رضوان ہاشمی بھی برا منانا چھوڑ گیا تھا۔

لیکن جس پریشانی نے رضوان ہاشمی کو اِن مقدمات کے بعد ذہنی طور پر ادھ موا کر دیا تھا وہ اُس کے وکلا ساتھیوں کی بے رُخی سے زیادہ اُس کی پہلی بیوی اور بیٹوں کا رویہ تھا کہ جنھوں نے اُس کی عتیقہ سے دوسری شادی کا انکشاف ہوتے ہی اُس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ وکلا کے برسرِ اقتدار دھڑوں کی جانب سے اُس کے ساتھ کسی بھی قسم کی یکجہتی کا اظہار نہ ہونا تو بنتا تھا کہ اپنے اقتدار کے دنوں میں اُس کا رویہ بھی شاید اُن کی توقع پر پورا نہ اترا ہو لیکن بیوی بچوں کا اِس ناگہانی مصیبت میں اُسے یوں اپنے حال پر چھوڑ دینا اور اُس کی خبر تک نہ لینا بے رحمی اور بے حسی کا گھٹیا ترین مظاہرہ تھا۔ شاید اپنے عروج کے دنوں میں وہ بھی اُنھیں کوئی زیادہ وقت نہیں دے پایا تھا۔ رات گئے دفتر سے گھر آنا اور صبح سویرے چلے جانا ایک ایسا عمل تھا کہ بچوں سے ہفتہ بھر ملاقات ہی نہ ہو پاتی۔ رات کو جتنی دیر گھر پر قیام ہوتا تو الگ کمرہ کہ جس میں بیوی سمیت کبھی کا داخلہ آسان نہیں ہوتا تھا۔ اگرچہ روپے پیسے کی ریل پیل تھی مگر افرادِ خانہ کے مابین وہ مضبوط تعلق پیدا ہی نہ ہو سکا کہ جو گھر کے سربراہ کے اپنی خفیہ بیوی کے قتل اور ایک کال گرل کے اغواء کے مقدمات میں گرفتار ہو جانے کی سماجی شرمندگی کو کسی ڈھال کی طرح جھیل پاتا۔

لہٰذا اِس دراڑ میں جب رضوان ہاشمی کی سخت گیری کا سیمنٹ باقی نہ رہا تو سماجی ہزیمت سے بچ رہنے کے لیے اُس کے گھر والوں کو لاتعلقی کی خلیج میں پناہ لینی پڑی۔ یوں جب بیوی اور جوان بیٹوں نے فاصلہ کر لیا تو دیگر رشتہ داروں نے بھی جیل میں قید رضوان ہاشمی سے راہ و رسم ترک کرنے کو ترجیح دی۔ کوئی ایک آدھ جونیئر وکیل اور دو پرانے منشی تھے جو ملاقات کے لیے چلے آتے۔ وہ بھی بس اُتنے دنوں تک کہ جب تک سیشن کورٹ سے درخواست ضمانت منظور ہونے کی امید رہی۔ جیسے ہی سیشن کورٹ سے ضمانت کی درخواستیں خارج ہوئیں تو انھوں نے بھی ملاقات کے لیے آنے میں وقفہ کرنا شروع کر دیا جو چیمبر کی بڑھتی ہوئی ویرانی اور موکلان کے اپنے مقدمات کی فائلیں دوسرے وکیلوں کے پاس لے جانے کی رفتار کے ساتھ ہی طویل ہوتا چلا گیا۔

رضوان ہاشمی نے سیشن کورٹ میں اپنی ضمانت کی درخواستوں پر خود دلائل دیے۔ کچہری میں اپنی پیشہ ورانہ نخوت، اکڑ اور رعونت کے لیے مخصوص شہرت رکھنے والے رضوان ہاشمی ایڈووکیٹ کو جب قیدیوں کی وین میں ہتھکڑی لگا کر جیل سے لایا گیا تو ایک خلقت اُس کی بے بسی کا تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہوگئی۔ کیا وکیل، کیا منشی اور کیا عدالتوں کا عملہ۔ جاننے والے وکلا بھی عمداً دور دور رہے کہ کہیں اُس جیسے شخص سے یوں اِس موقع پر میل جول اُن کے لیے کسی حرافگی کا باعث نہ ہو۔ جرم بھی اِس نوعیت کے رضوان ہاشمی سے منسوب ہوئے کہ کم و بیش ہر شخص انھیں سچ مانتے ہوئے اُسی پر تھوتھو کر رہا تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنا بڑا وکیل عمر کے اِس حصے میں اپنی بیٹیوں کی عمر جتنی لاوارث مگر انتہائی مالدار موکلہ سے نہ صرف خفیہ شادی کرلے گا بلکہ بعد ازاں جائیداد ہڑپ کرنے کے واسطے اُسے قتل بھی کر دے گا۔ لوگوں کو یہ علم تو تھا کہ رضوان ہاشمی منشن جیسے کالے دھندے والے لوگوں کی نہ صرف وکالت کرتا رہا ہے بلکہ تگڑی فیسوں کے لالچ میں بالواسطہ شریک کار بھی رہا ہے لیکن یہ توقع نہیں کر رہے تھے کہ وہ رُباب ایسی معصوم لے پالک لڑکی کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے اغوا کرانے سے بھی باز نہیں آئے گا۔

ضمانت کی درخواستوں پر سماعت کے دوران جو حیرت رضوان ہاشمی کے حصے میں آئی وہ اُسے لرزا کر گزر گئی۔ پراسیکیوٹر کے دلائل کے دوران پہلی بار اُس کے علم میں آیا کہ عتیقہ قتل کیس میں ڈی این اے ٹیسٹ کی بنیاد پر لاش کی شناخت کر لی گئی تھی کہ جو ایک نہیں کئی حوالوں سے عتیقہ کی ہی تھی۔ لاش کی بائیں کلائی، ہتھیلی اور انگلیوں کے ایکس رے کے ذریعے عمر کا لگایا جانے والا تخمینہ بھی اُس کے عتیقہ کی لاش ہونے کی تائید کر رہا تھا۔ ملازمہ لڑکی کی گواہی کے علاوہ فارم ہاؤس کے دو گارڈ بھی گواہ کے طور سامنے آ چکے تھے کہ جن کے مطابق قتل والی شام رضوان ہاشمی کے رہائشی ایریا میں جانے کے بعد نہ صرف کافی دیر تک لڑائی جھگڑے کی آوازیں باہر آتی رہیں جو بعد میں نسوانی چیخوں میں بدل گئیں۔ اُن دونوں گواہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ خاموشی چھا جانے کے کافی دیر بعد جب وکیل صاحب باہر آیا تو پسینے پسینے اور انتہائی گھبرایا ہوا تھا۔

پراسیکیوٹر کے دلائل کے بعد رضوان ہاشمی نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کمرۂ عدالت

میں موجود چوہدری ضیا کو کبیدہ نگاہوں سے دیکھا تو وہ چتاونی دینے کے سے انداز میں ہلکا سا مسکرا دیا۔ اُس کی طرف سے دی گئی دھمکی اب دھمکی نہیں رہی تھی بلکہ بھرپور اور کاری وار میں بدل چکی تھی۔

اِسی قسم کی لرزا دینے والی حیرت کا سامنا رضوان ہاشمی کو اُس وقت بھی ہوا جب پراسیکیوٹر نے رُباب اغوا کیس میں درخواست ضمانت پر اپنے دلائل دیئے۔ حاجی بخشن کے مختیار کار فیض کریم اور اُس کے دفتر میں کام کرنے والے دیگر تین گواہوں نے نہایت جامع انداز میں ایک سی کہانی بیان کی کہ حاجی بخشن کے دفتر میں آتے جاتے رضوان ہاشمی نے فیض کریم کی لے پالک بیٹی رُباب کو کسی طور دیکھ لیا اور ناجائز تعلقات استوار کرنے کے لیے نہ صرف اپنے ڈرائیور جبار کے ذریعے اُس تک رسائی کی کوشش کی بلکہ انکار کی صورت اغوا کی دھمکیاں بھی دیں۔ اِس صورتِ حال سے گھبرا چکی رُباب نے اپنے گھر والوں کو بھی آگاہ کر دیا لیکن دھمکیاں نہ رکیں۔ معاملہ حاجی بخشن تک پہنچا تو اُس نے رضوان ہاشمی کو سخت الفاظ میں منع کرتے ہوئے اپنے دوستانہ مراسم ختم کرنے کی تنبیہ بھی کر دی۔ اگرچہ وقتی طور پر معاملہ ٹل گیا لیکن چند دنوں کے بعد ہی جبار نے اُسے گھات لگا اُس وقت زبردستی رضوان ہاشمی کی گاڑی میں ڈال لیا کہ جب وہ بازار سے خریداری کے بعد رکشے میں گھر جا رہی تھی۔ مبینہ طور پر گاڑی میں اس وقت رضوان ہاشمی خود بھی موجود تھا جسے گواہان نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

رضوان ہاشمی درخواست ضمانت پر جوابی دلائل دینے کی بجائے جذباتی انداز میں چیخنے چلانے پر آ گیا کہ رُباب کسی طور بھی فیض کریم کی لے پالک بیٹی نہیں بلکہ ایک وہ کال گرل تھی کہ جسے حاجی بخشن کے ہوٹل پر چھاپے کے دوران گرفتار کیا گیا تھا لیکن جب مجسٹریٹ کی عدالت میں ہنگامہ ہوا تو وہ بھی دوسرے ملزموں کے ساتھ بھاگ گئی تھی، اُس کے بعد وہ کہاں گئی اُسے کچھ خبر نہیں، اُسے تو وکلا تحریک کی قیادت کرنے کے جرم میں پولیس ذاتی انتقام کا نشانہ بنا رہی ہے۔ لیکن رضوان ہاشمی کی توقعات کے برعکس ضیا چوہدری نے اس طرح شہادت اکٹھی کر کے دونوں مقدمات کے چالان تیار کیے تھے کہ اُس کا بچ نکلنا محال دکھائی دینے لگا تھا۔ دونوں مقدمات میں

ضمانت کی آس لے کر جس طرح وہ خود دلائل پیش کرنے کے لیے مخصوص طنطنے کے ساتھ سیشن کورٹ میں پیش ہوا تھا، وہ درخواستیں خارج ہونے کے حکم کے ساتھ ہی ہوا ہو گیا تھا۔ جن سیشن عدالتوں کو وہ اپنے رویے کے ساتھ بے عزت کیا کرتا تھا آج ضلع شمس پور کی انہی سیشن عدالتوں میں سے سب سے جونیئر سیشن کورٹ کے جج کو وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے تکے جا رہا تھا۔ اُس نے کئی بار ایڈیشنل سیشن جج کو اپنے مخصوص انداز میں کھری کھری سنانے اور جانبداری کا الزام لگانے کا سوچا مگر زہر کے گھونٹ پی کر رہ گیا کہ آج وہ صرف ایک سرکش سینئر وکیل نہیں تھا بلکہ قتل اور اغوا کے دو مقدمات کے ملزم کے طور پر عدالت کے رحم و کرم پر تھا۔

پولیس نے اُسے کمرہ عدالت سے واپس جیل کی گاڑی میں لے جانے کے لیے اُٹھایا تو اُس نے چاروں جانب نگاہ گھمائی کہ شاید اُس کا کوئی بیٹا، کوئی دوست، رشتہ دار یا کوئی ساتھی وکیل ہی اُس سے ملنے کے لیے آیا ہو لیکن وہاں سوائے اُس کے ایک منشی کے اور کوئی نہیں تھا۔ رضوان ہاشمی نے نمناک آنکھوں سے اپنے منشی کی طرف دیکھا اور چپکے سے اُس کے کان میں سرگوشی کی۔ منشی اُس کی بات سنتے ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔ بخشی خانے کے حوالدار نے کہ جس کے ہاتھ میں اُس کے دونوں ہاتھوں میں لگی ہوئی ہتھکڑی کی مٹھی تھی، اُسے اپنی طرف کھینچا تو پولیس، عدلیہ اور انتظامیہ کے بڑے سے بڑے افسر کو جوتے کی نوک پر لکھنے والے رضوان ہاشمی نے اُس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور التجا کی کہ اُسے کچھ دیر اور کمرہ عدالت میں بیٹھنے دیا جائے۔ حوالدار نے سوالیہ انداز میں اُس کی طرف دیکھا تو رضوان ہاشمی کے خشک ہو چکے گلے سے بمشکل نکلا کہ اُسے اپنے وکیل سے ملنا ہے، اُسی کا انتظار ہے۔

۴۷

''لیکن یہ رُباب تو نہیں!'' تونگر کے لہجے میں تشکیک نہیں تیقن تھا۔

''آپ نے دیکھا ہوا ہے رُباب کو؟'' جانان کچھ گڑبڑا سی گئی۔

''آمنا سامنا نہیں ہوا، بس تصویر دیکھی تھی۔'' تونگر نے اگرچہ جانان کے استفسار کو اہمیت

نہیں دی تھی لیکن جانان کا گڑبڑانا اُسے چونکا گیا۔

''کس نے دکھائی تھی تصویر اور کب؟'' جانان اپنی حیرت اور پریشانی کو چھپانے کی کوشش کے باوجود چھپا نہیں پا رہی تھی۔

''تمھارا باس، اللہ ڈنو عبید! اور کون؟ لیکن کیوں، کیا ہوا، کچھ خاص بات؟'' تونگر بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اللہ ڈنو عبید کی جانب سے اُسے دکھائی جانے والی رُباب کی تصویر کے بارے میں جانان اِس قدر شبہات کا اظہار کیوں کر رہی ہے۔

''نہیں کوئی خاص بات نہیں، لیکن یہ کب کی بات ہے؟'' جانان اِس جھٹکے سے نکلنے کے لیے اپنے آپ کو مجتمع کرنے میں لگی تھی۔

''جس روز میں انیکسی میں منتقل ہوا۔'' تونگر کی نگاہیں جانان کے رنگ بدلتے چہرے پر جمی تھیں۔

''تصویر آپ کو کیوں دکھائی تھی؟''

''تصویر صرف دکھائی نہیں بلکہ مجھے دی تھی، لیکن تم مجھ سے اِس انداز میں کیوں پوچھ رہی ہو؟'' تونگر کا اپنے اندر کا خوف ایک دم کہیں جاتا رہا تھا۔

''میں بتاتی ہوں آپ کو، لیکن پہلے آپ یہ بتاؤ کہ باس نے وہ تصویر آپ کو کیوں دی تھی؟'' جانان غالباً اُلجھتی چلی جا رہی تھی۔

''اُس نے رُباب کو تلاش کرنے کے لیے مجھے تصویر دی تھی۔''

''رُباب کو تلاش کرنے کے لیے! مگر آپ کو کیوں؟'' جانان کی ذہنی اُلجھن اُس کے چہرے سے عیاں ہونے لگی تھی۔

''یہ تو میں نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور تھا کہ میں گزرے وقتوں میں کبھی حیدر گوٹھ کا اسسٹنٹ کمشنر رہا تھا۔''

''حیدر گوٹھ؟'' جانان نے حیرت سے تونگر کی طرف دیکھا۔

''جی! حیدر گوٹھ، اللہ ڈنو کا خیال تھا کہ رُباب حیدر گوٹھ سے ہی لاپتہ ہوئی ہے۔''

''معاف کیجیے گا تونگر صاحب! دس برس پہلے آپ کے تشدد سے قتل ہونے والی لڑکی کو دس برس کی ناکام تلاش کے بعد بھی باس آپ کو اُس کا پتہ لانے کے لیے کیوں کہنے لگے، ضرور آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، وہ تو رُباب کے ریپ اور قتل کا ذمہ دار آپ ہی کو سمجھتے ہیں، ضرور کوئی اور بات رہی ہوگی۔'' جانان قدرے پرسکون دکھائی دینے لگی تھی۔

''تمھیں یقین ہے کہ رُباب نام کی جس لڑکی کا میں نے دس سال پہلے ریپ اور قتل کیا تھا، وہ بھی ہے کہ جس کی تصویر آج مجھے یہاں میرے کمرے میں بھیجی گئی ہے؟'' تونگر نے چڑ چڑے انداز میں سر کو ایک طرف جھٹکا۔

''جی سو فیصد۔'' جانان کا لہجہ اب ڈھٹائی کی حد تک پرسکون تھا۔

''تو پھر وہ کون سی رُباب ہے جو انھی دنوں حیدر گوٹھ سے لاپتہ ہوئی ہے اور اُس کی تصویر مجھے خود اللہ ڈنو نے اپنے ہاتھوں سے دی ہے۔''

''باس نے شاید کسی اور لڑکی کو تلاش کرنے کی بات کی ہوگی جسے آپ غلطی سے رُباب سمجھ بیٹھے ہوں گے، اُس رُباب کا حیدر گوٹھ سے کیا واسطہ؟'' جانان ابھی تک اپنے کسی جواز سے خود ہی مطمئن نہیں ہو پا رہی تھی۔

''میں کیوں غلطی سے اُسے رُباب سمجھنے لگا، جو تصویر اللہ ڈنو عبید نے مجھے دی وہ رُباب کی تصویر کے طور پر ہی دی گئی۔'' جانان کی پیدا کردہ کنفیوژن سے تونگر اکتانے لگا تھا۔

''ہوں۔'' جانان نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ایک لمبی سانس لی۔ ''ہوسکتا ہے باس کو اُس کے زندہ ہونے کی کوئی خبر ملی ہو.... یا وہ آپ کو زندہ رہنے کا کوئی موقع دے رہا ہو۔''

''کیسی بات کرتی ہو جانان! تمھارے اپنے مطابق دس سال پہلے میرے ہاتھوں قتل یا لاپتہ ہونے والی لڑکی کو تلاش کرنے کی ذمہ داری وہ مجھے اب دس سال بعد کیوں دینے لگا، اور وہ بھی اِن حالات کہ جب اِس مفروضہ جرم کی پاداش میں وہ مجھے گھونٹ گھونٹ مرنے کی سزا بھی سنا چکا ہو، بات یہ نہیں، بات یقیناً کچھ اور ہے۔''

اپنی اِس بات پر جانان کا ردِعمل دیکھنے کے واسطے تونگر نے اُس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز

کر لی تھیں لیکن شپٹائی ہوئی سی جانان تونگر کی طرف دیکھنے یا اُس کی بات پر اپنے تاثرات دینے کی بجائے گردن موڑ کر بار بی کیو ٹیرس کی جانب دیکھنے لگی تھی کہ جہاں کھانے کے انتظار میں خوش گپیوں میں مصروف والدین کے کچھ بچے وقت گزاری کے لیے ایک دوسرے کے پیچھے اِدھر سے اُدھر دوڑ رہے تھے۔ کچھ دیر تک وہ یونہی سوچوں میں مگن رہی تو تونگر نے اُس سے پوچھ ہی لیا۔ ''مگر یہ لگتی کیا ہے عبید کی؟ اُسے کس بات کی تکلیف ہے؟''

''یہ تو میں بھی نہیں جانتی کہ رُباب اور باس کے درمیان رشتہ کیا ہے! لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ جو کچھ بھی ہے وہ باس کے لیے بہت اہم ہے اور آپ کے لیے انتہائی ہولناک۔''

''میرے لیے ہولناک کیوں؟ تمھاری باتوں سے تو مجھے یہی لگنے لگا ہے کہ اللہ ڈنو عبید اور میرے درمیان رُباب نام کی کوئی لڑکی وجہِ نزاع ہے ہی نہیں، بات کچھ اور ہے کہ جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔''

تونگر نے جانان کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی کہ جن میں پل بھر میں کئی رنگ ابھرے اور اپنے آپ ہی تحلیل ہوتے چلے گئے۔ شاید پہلی بار اُس نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے تونگر کا ہاتھ پکڑا اپنے ساتھ لے کر پارکنگ کی طرف چل دی۔ یہ جانان کے ہاتھ کے لمس کا کرشمہ تھا کہ چند لمحے پہلے اُس کی موجودی سے چڑا ہوا صاحبزادہ تونگر کسی عامل کے معمول کی مانند اُس کے ساتھ ہولیا۔ جانان نے ڈرائیور سے گاڑی کی چابی لی، اُسے وہیں رکنے کا کہا اور تونگر کو اگلی نشست پر بیٹھنے کا۔ تونگر کو اُس کے ساتھ بیٹھنے میں تامل تھا لیکن جانان کے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے سنبھالتے وہ بھی گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ اِس قلیل عرصے میں کئی بار اُس کا دماغ ماؤف ہوا اور کئی بار اُس نے اپنے فیصلے بدلے لیکن اللہ ڈنو کے حصار اور اُس کے پیدا کردہ خوف سے نکلنا اُس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ گاڑی میں بیٹھنا اِس لیے سہل لگا کہ جانان سے کوئی تعلق نہ ہوتے ہوئے بھی کہیں نہ کہیں کوئی تعلق موجود ضرور تھا۔

''میں نے آپ سے کچھ نہیں چھپایا، جتنا میں جانتی ہوں وہ سب کچھ آپ کو بتا دیا، باس دس برسوں سے آپ کو مانیٹر کر رہا ہے، اِس عرصے میں اُس نے سینکڑوں کام آپ سے نکلوائے اور خود کو

اتنا طاقتور کر لیا کہ اب کوئی بھی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، سیاست، حکومت، عدلیہ، بیوروکریسی، میڈیا اور ٹریڈ، سب پہ وہی حاوی، ہر جگہ وہی موجود لیکن اِن دس برسوں میں اگر باس نے کسی کے شب و روز کو ہر لحاظ سے مانیٹر کرتے ہوئے دستاویز کیا ہے تو وہ صرف آپ ہیں۔''

اِس دوران گاڑی سول آفیسر کلب کی حدود سے نکل کر باہر مین روڈ پر آ چکی تھی۔ بہت آہستگی سے رواں گاڑی میں اسٹریٹ لائٹس اور آتی جاتی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس سے پھوٹتی روشنیوں میں جانان کا چہرہ حد درجہ معصوم لگنے لگا تھا۔

''تم کب سے ہو اللہ ڈنو کے ساتھ؟''

''میں کب سے ہوں؟'' جانان چند لمحوں کے لیے خاموش رہی کہ جیسے ماضی میں زینہ زینہ اُتر رہی ہو۔ ''اچھا سوال ہے لیکن اِس کا جواب دینے سے پہلے اگر میں آپ کو ''تم'' کہوں تو برا تو نہیں لگے گا؟'' جانان نے ہلکی سی مسکراہٹ سے تونگر کی طرف دیکھا۔

''میں مقاماتِ سود زیاں بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔''

''تمھیں یہ تو معلوم ہو گا باس کی ایمپائر کی شروعات کہاں سے ہوئیں؟'' جانان نے اب کے تونگر کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔

''جتنا میں جانتا ہوں کہ یہ چھوٹا موٹا کنٹریکٹر تھا، ٹھیکے لیتا تھا افسروں کو خوش کر کے۔''

جانان طنزیہ مسکرا دی۔ ''یہ تو بہت بعد کی بات ہے، بھڑوا تھا یہ پہلے، لڑکیوں کا سپلائر، پچاس پچاس روپے لینے والا، تم نے جس حیدر گوٹھ کی بات کی ہے، اِس نے بھی اپنا دھندہ وہیں سے شروع کیا تھا بخشن نام کے پارٹنر کے ساتھ۔ لیکن یہ بہت شاطر تھا اِس لیے لاہور نکل آیا اور پھر الیاس جیسے لوگوں کے ذریعے اُس کی پہنچ تمھارے جیسے افسروں تک ہو گئی۔''

تونگر خاموش رہا۔

''تم تو شاید یہ بھی نہیں جانتے ہو گے کہ میرا باس جنسی مریض ہے، جتنا دیکھنے میں وجیہ اور خوبصورت ہے اُس سے کہیں بڑھ کر عورت کو تلذذ کی اُن بلندیوں تک لے جانے کا ہنر جانتا ہے کہ جہاں تک دوبارہ پہنچ پانے کی جستجو میں وہ عورت پھر ترستی رہ جاتی ہے، اِس جنونی کا کھیل پھر یہیں

سے شروع ہوتا ہے.... شروع شروع میں جو عورتیں اِس پر مرتی تھیں اُن کو دوبارہ اپنے بستر کا موقع دینے کے لیے باس نے انھیں کئی بستروں سے گزار کر پیسہ بنانے کا ہنر سیکھ لیا۔ پڑھا لکھا تو تھا ہی، کچھ تربیت تمھارے جیسے بہت زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت میں ہوئی تو باس نے ایک اور خطرناک چال چلنی شروع کی کہ جسے وہ اپنا ٹرمپ کارڈ کہتا ہے۔''

جانان اچانک خاموش ہو گئی اور گاڑی بھی کسی پوش ایریا کے ایک خوبصورت بنگلے کے سامنے رُک چکی تھی۔ تونگر جو پہلے ہی جانان کے انکشافات پر متحیر ہو رہا تھا اِس طرح کسی جگہ گاڑی رکنے سے تشویش میں مبتلا دکھائی دینے لگا۔ جانان نے اپنے پرس میں سے ایک ریموٹ کنٹرول طرح کی ڈیوائس نکالی، اُس کا ایک بٹن دبایا اور بنگلے کا مین گیٹ خود بخود کھلتا چلا گیا۔ جانان نے گاڑی جلدی سے اندر داخل کی اور اُسی ریموٹ کنٹرول سے گیٹ دوبارہ بند کر دیا۔ اتنے میں دو سیکورٹی گارڈ نما ملازم سامنے آ گئے اور اُسے اِس طرح ادب سے سلام کیا کہ جیسے جانان ہی اُن کی مالکن رہی ہو۔ گاڑی سے اترتے ہی یہاں بھی اُس نے تونگر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور نہایت خوبصورتی سے سجے سجائے گھر میں داخل ہو گئی۔ لابی، لاؤنج اور اُس کے بعد ایک اور لابی سے گزر کر وہ ایک ایسی نشست گاہ میں داخل ہوئے جسے دیدہ زیب فرنیچر سے آراستہ کیا گیا تھا۔

تونگر کی نگاہوں میں حیرت منجمد ہو چکی تھی۔ اُس کے لیے سمجھ پانا مشکل ہو رہا تھا کہ اُسے وہاں کیوں لایا گیا ہے۔ کیا اُس کا وقتِ آخر آن پہنچا تھا۔ اُس نے اپنا انجام اُن دو سیکورٹی گارڈز کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر پھر خیال آیا کہ کلب سے نکلنے کے بعد اب تک کے سفر میں جانان نے وہ انکشافات کیوں کیے کہ جو اُس کے باس کی نجی زندگی سے جڑے ہوئے تھے۔ کیا یہ مکاشفے جانان کی طرف سے اُس کی آخری خواہش کا احترام تو نہیں تھے کہ اُس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں؟۔ جانان نے کھنچے ہوئے چہرے کے ساتھ ہلکا سا مسکرانے کی کوشش کی اور اُسے ایک آرام دہ سنگل صوفہ پر بیٹھنے کو کہا۔ تونگر کو اُس کا دیکھنا یوں لگا کہ جیسے عید قرباں پر بچے اپنے پالتو دنبے کو ذبح کیے جانے سے پہلے دیکھتے ہیں۔ تونگر کا ذہن اِس طرح ساکت ہو چکا تھا کہ جیسے کمپیوٹر اضافی بوجھ پڑنے کے بعد پھنس کر رہ جاتا ہے۔ ذہن کو رواں کرنے اور کچھ بہتر سوچنے کے لیے

اُسے زیادہ آکسیجن چاہیے تھی۔ اس واسطے تونگر نے لمبی سانس لینا چاہی لیکن وہ سینے میں پھنس کر رہ گئی۔ آنے والے لمحات کے روح فرسا تصورات سے گھبرا کر اُس نے آنکھیں موند لیں۔ موت سے پہلے مرنے کی اذیت سے چھٹکارا پانے کا اِس سے بہتر راستہ اور کوئی نہیں تھا۔

''پوچھو گے نہیں کہ باس کا ٹرمپ کارڈ کیا تھا؟''

تونگر چونک گیا۔ جانان جو اِس دوران نشست گاہ سے باہر چلی گئی تھی ایک بار پھر اُسی طرح کی باریک نائٹی میں ملبوس نہ صرف اُس کے سامنے موجود تھی کہ جیسے اپنے اپارٹمنٹ میں اُس کے سامنے آئی تھی بلکہ چار پہیوں پر اُستوار خوبصورت شراب کی بوتلوں سے سجی ہوئی بار بھی اُس کے سامنے تھی۔ اُس کے خوبصورت چہرے کا کھنچاؤ اُس کے بدن کے کھل کھلاتے ہوئے زاویوں میں منتقل ہو چکا تھا جو گہرے نیلے رنگ کے شیفون سے اپنا آپ دکھانے کے واسطے بے چین ہو رہے تھے۔ جانان چوڑے بازوؤں والے سنگل صوفے کے ایک بازو پر تونگر کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی اور پگھلے ہوئے سونے جیسی سکاچ وسکی دو گلاسوں میں انڈیلنے لگی۔ پیگ تیار ہوئے تو اُس نے ایک اُٹھا کر تونگر کو دیا اور ایک اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اِس سے پہلے کہ اِس سرور انگیز ماحول میں وہ چیئرز کہتے ہوئے جام سے جام ٹکراتی، اپنے اندر سے مضطرب تونگر نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا اور اپنا گلاس جانان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اُس کا گلاس خود لے لیا۔

جانان پہلے تو کچھ نہ سمجھ پائی لیکن جونہی اُسے اِس حرکت کے پس منظر کا احساس ہوا تو اُس سے ہنسی کا روکنا مشکل ہو گیا۔

''بے فکر ہو کر آج کی رات گزارو، کم از کم آج کی رات تمھاری زندگی کی ضمانت میں دیتی ہوں، بڑی مشکل سے اور بہت بڑا رسک لے کر باس کی نگاہوں سے تمھارے سمیت اپنے آپ کو لاپتہ کیا ہے۔''

تونگر اگرچہ خاموش رہا لیکن اُس کے چہرے پر چھائی ہوئی پژمردگی اور غیر یقینی میں سے زندگی کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ اُس نے گلاس ہونٹوں کو لگایا تو سِپ کرنے کی بجائے ایک لمبے گھونٹ میں ایک تہائی پیگ خالی کر دیا۔

''کیسا لگا تمھیں میرا گھر؟'' جانان نے تونگر کے کندھے پر اپنا بازو رکھ دیا تھا۔ پھر وہی، اُسی سے منسوب، اُسی کی مخصوص خوشبو نے تونگر کو اپنے حصار میں لے لیا۔ جب کہ کچھ دیر قبل کلب میں دکھائی دینے والی جانان کہ جس سے وہ چڑنے اور اکتانے لگا تھا، پھر سے وہی جانان ہو چکی تھی کہ جس نے اللہ ڈنو عبید کے بندی خانہ میں اپنی دلکشی اور دل جوئی سے اُسے ایک بار پھر زندگی سے آشنا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک تعطل کے بعد آج وہ پھر سے ایک عجیب تعلق میں پیوستہ بھی تھے اور معلق بھی۔ وہی محبوب تھی اور اُسی کے ہاتھوں مرنے کا اندیشہ بھی۔ لیکن اِس وقت موت کا خوف جانان کی دلربائی سے زیر ہو چکا تھا۔

''تم میری کسی بات کا جواب نہیں دے رہے، میرا گھر تمھیں اچھا نہیں لگا۔'' یہ کہتے ہوئے جانان نے تونگر کی گردن کا بوسہ لے لیا۔

''تو وہ گھر کس کا تھا جہاں تم نے مجھے بلایا تھا۔'' تونگر جانان کے بوسے کی تمازت سے تمتما اُٹھا تھا۔

''چھوڑو گھروں کو، نجانے مجھے بھی کیوں یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ شاید ہم پھر نہ مل سکیں تو جتنا جان سکتے ہو، جان لو۔'' دوسرے پیگ پر آئی ہوئی جانان نے تونگر کو پھر ہاتھ سے پکڑا اور اُسے تین نشستوں والے صوفے پر لے گئی۔ اُس کی ایک جانب تونگر کو بٹھایا اور دوسری جانب خود ٹیک لگا کر اپنی ٹانگیں اس طرح پھیلائیں کہ اُس کے بھرے بھرے دودھیا پاؤں تونگر کی گود میں اُس مقام تک جا پہنچے کہ جہاں اُس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا جام اُس کے پاؤں کی انگلیوں کو چھو رہا تھا۔

''میرے پاؤں نہیں چومو گے؟'' جانان کی آنکھوں سے مستی چاندنی کی طرح اُس کے بدن پر اترنے لگی تھی۔ تونگر نے اُس کے پاؤں اپنے ہاتھوں میں لے لیے مگر چومنے کی بجائے محض مسکرانے کی کوشش کی۔ شاید پے در پے مصائب کی یلغار نے اُسے مسکرانا بھلا دیا تھا۔

''حسین عورتیں بدقسمتی اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتی ہیں کہ کوئی اعتبار ہی نہیں کرتا، میں تمھیں کہاں سے کہاں اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر یہاں جنت میں لائی ہوں اور تم میرے ہاتھ سے پیگ لیتے ہوئے بھی ڈر رہے تھے کہ کہیں اس میں کچھ ملا نہ دیا ہو۔'' جانان نے اپنے

پاؤں تونگر کی رانوں سے اُٹھا کر صوفے کی پشت پر رکھ لیے۔

''لگتا ہے تم ذہنی طور پر مر چکے ہو، تمھارے اندر تجسس ہی نہیں رہا کہ اپنے دشمن کے بارے میں جاننا چاہو کہ وہ تمھیں کیوں مارنا چاہتا ہے یا اُس کا ٹرمپ کارڈ کیا رہا ہے؟''

تونگر نے جانان کی بات کا جواب دینے کی بجائے شراب کے دو تین گھونٹ ایک ساتھ لے لیے اور خاموشی سے سامنے کی دیوار کو تکنے لگا۔ جانان جان گئی کہ وہ واقعی ذہنی طور پر مر چکا ہے۔ ایک طویل حاکیت کے بعد مسلسل دھتکارے جانے کی ذلت، بے بسی اور اِس دوران اُس پر مسلط کر دیئے گئے موت کے خوف نے اُسے طبعی طور پر مرنے سے پہلے ہی جذباتی اور اعصابی طور پر مردہ کر دیا ہے۔ اگر کہیں کسی وقت زندگی کی کونپل پھوٹنے لگتی بھی ہے تو پھر سے کچلی جاتی ہے۔ جانان کو ایسا لگا کہ اب نہ تو وہ کچھ جاننا چاہتا ہے اور نہ ہی اُس میں زندگی کی طرف لوٹنے کی کوئی خواہش باقی رہی ہے۔

جانان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرائی۔ اُس نے اپنے پاؤں پھر سے تونگر کی رانوں پر رکھے اور اِس طرح اُسے پرے دھکیلا کہ جس میں تغافل کا شکوہ، مفتوح ہونے کی خواہش نسائی سپردگی اور عشوہ طرازی سبھی کچھ کاک ٹیل ہو گئے تھے۔ شراب کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے تونگر کے ہاتھ سے گلاس اُچھلا تو گھونٹ دہن میں جانے کی بجائے اُس کی قمیص کے دامن پر پھیل گیا۔ اِس سے پہلے کہ تونگر کچھ سمجھ پاتا، نیم دراز جانان صوفے پر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے ساتھ رکھی تپائی سے سامنے دیوار پر لگی ایل ای ڈی کا ریموٹ کنٹرول اُٹھایا اور اُسے آن کر دیا۔ اِس سے پہلے کہ وہ اُس پر کچھ ڈسپلے کرتی، دو پیگ اور بنائے اور اُن میں سے ایک مسکراتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اپنے ہاتھ پر رکھا اور پیش کرنے کے سے انداز میں تونگر کے سامنے کر دیا۔

''میلپ کر و یار! تمھیں کچھ خاص دکھانا ہے لیکن اُس سے پہلے ایک لیول تک آؤ ناں! پھر تمھیں باتوں کی سمجھ آنے لگے گی۔'' جانان نے جس ادا سے تونگر کو کہا اُسے رد کرنا مشکل لگنے لگا تھا۔ شاید پھر سے کہیں زندگی کی کونپل پھوٹنے کو تھی۔ لہٰذا نئے پیگ کا نصف ایک گھونٹ ہوا مگر تونگر نے اب کے بھی جانان کی طرف دیکھا تک نہیں۔

جانان کچھ دیر تک اپنے اسمارٹ ٹی وی پر کچھ تلاش کرتی رہی۔ جونہی مطلوبہ ویڈیو سامنے آئی وہ اُسے پلے کرنے لگی تھی کہ رک گئی۔ ''ویسے تو میں باس کے روبرو تمھارا حوصلہ دیکھ چکی ہوں لیکن اِس ویڈیو کو دیکھتے ہوئے تمھیں کچھ حوصلہ پلس کرنا ہوگا، پھر تم جان پاؤ گے کہ باس کیا ہے اور اُس کے کرشماتی دھندے کیا ہیں۔''

۴۸

خوشحال خان حیران تھا کہ اُس کے اُستاد رضوان ہاشمی نے باہمی تعلقات کے تمام تر اُتار چڑھاؤ کے باوجود اُسے اپنے خلاف بنائے گئے ایسے فوجداری مقدمات میں اپنا وکیل کرلیا تھا کہ جن سے اُس کا بچ نکلنا بظاہر مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں اُستاد شاگرد اپنی معاصرانہ رقابت کے باوجود ایک ایسی سازش کا شکار ہو چکے تھے کہ جو پیشہ ورانہ وکلا سیاست سے زیادہ اُن کی مہم جوئی پر اُستوار تھی۔ دونوں جانتے تھے کہ اُنھوں نے کئی بار ایک دوسرے کو خوامخواہ نیچا دکھانے کی کوشش کی اور جب کبھی ایک دوسرے کے قریب بھی آنا پڑا تو نیت کا فتور کسی کے ہاں کم اور کسی کے ہاں زیادہ رہا۔ لیکن جس بے بسی اور لاچاری سے رضوان ہاشمی نے اپنی ضمانت کی درخواستوں کے خارج ہونے کے بعد خوشی خان کو اپنے منشی کے ذریعے کمرۂ عدالت میں بلوا کر اپنا وکیل مقرر کرنے کی منت کی تو اُس کا دل پسیج گیا۔ حالانکہ وہ بھی اپنی وکالت کے ابتر دور سے گزر رہا تھا لیکن اُستاد کی نمناک آنکھوں اور چہرے پر چھائی ہوئی شکستگی نے اُسے پگھلا دیا۔

رضوان ہاشمی کے ساتھ ساتھ خوشحال خان بھی اُن شہادتوں پر حیران تھا جو چوہدری ضیا نے اپنے ماتحت تفتیشی آفیسر کے ذریعے چالان کا حصہ بنا کر مقدمات کو رائی سے پہاڑ بنا دیا تھا۔ خوشی خان نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ وہ رضوان ہاشمی کی ٹرائل میں وہ سارے داؤ پیچ آزمائے گا جو اُس نے کبھی ہاشمی سے ہی سیکھے مگر وقت کے ساتھ ساتھ خود بھی اُنھیں اور کاٹ دار کرتا چلا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُس نے کئی مقدمات کا فیصلہ اپنے حق میں اُستاد کے دانتوں سے چھین لیا اور اُستاد محض ہاتھ ملتا رہ گیا۔

رضوان ہاشمی نے اُس روز اپنا دل کھول کر خوشحال خان کے سامنے رکھ دیا کہ کس طرح اُس کی بیوی اور اولاد نے یکسر بے اعتنائی برتتے ہوئے اُسے پولیس اور عدالتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ دکھ اِس بات کا بھی تھا کہ اُس کے مخالف وکلا کے دھڑے تو اُس کی حالتِ زار دیکھ کر ایک طرف ہو گئے تھے لیکن پراسیکیوشن کی جانب سے جو دو وکلا اُس کے مخالفت میں پیش پیش چلے آ رہے تھے وہ کئی مواقعوں پر اُس کے احسان مند بھی رہے تھے۔ رضوان ہاشمی کی سرپرستی کے سبب نہ صرف وہ ایک سے زائد بار حیدر گوٹھ کی تحصیل بار ایسوسی ایشن کے صدر منتخب ہوئے بلکہ وہ اُنھیں ایسے مقدمات بھی دلواتا رہا تھا کہ جن میں وہ بوجوہ وکالت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ضمانت کی درخواستوں پر دلائل کے دوران اُنھوں نے جس بے لحاظی اور طوطا چشمی سے بڑھ چڑھ کر اُنھیں خارج کرنے اور اُسے مقدمات کے فیصلوں تک جیل میں رکھنے کی استدعا کی وہ رضوان ہاشمی کے لیے حیران کُن تھا۔ اُن دونوں کی آنکھوں میں اُسے اپنا چہرہ ہی دکھائی دے رہا تھا کہ وہ بھی بسا اوقات محض فیس کی خاطر اپنے جاننے والوں کے خلاف جانتے ہوئے کہ وہ بے گناہ ہیں، اِسی قسم کی بدلحاظی اور بے شرمی سے دلائل دیا کرتا اور اُسے ڈھٹائی سے پروفیشنلزم کا نام دیا کرتا۔ اُس روز اُسے پہلی بار احساس ہوا کہ انصاف کی راہ میں اپنے پیٹ کو حائل کر لینا وکیل کا پروفیشنلزم نہیں بلکہ دستِ قاتل کو تحفظ دینے جیسا عمل ہے۔

سیشن کورٹ سے ضمانتیں تو خارج ہو چکیں اور چالان بھی عدالت میں آ چکے تھے لیکن ابھی فردِ جرم لگنا باقی تھی۔ رضوان ہاشمی نے خوشحال خان کو پیغام بھجوانے شروع کر دیے کہ اُس کی ضمانت کے لیے ہائی کورٹ میں درخواستیں دائر کرے لیکن خوشحال خان کا اصرار تھا کہ فردِ جرم لگنے کے بعد ٹرائل شروع ہو جائے، کچھ پیشیاں استغاثہ کی شہادت کی بھی گزریں لیکن شہادت نہ لگنے دی جائے تو پھر ہائی کورٹ سے ضمانت ملنے کا جواز بنایا جا سکتا تھا۔ لیکن جب رضوان ہاشمی بہت اُتاولا ہوا تو خوشحال خان نے ایک پیشی پر اُسے یہ کہہ کر جھڑک دیا کہ اُستاد حوصلہ کر یہ تیرے بتائے ہوئے اصول ہیں، اگر ہائی کورٹ سے بھی ضمانت خارج کرانی ہے تو پھر ابھی دائر کیے دیتے ہیں۔ رضوان ہاشمی نے بے بسی سے خوشحال خان کی طرف دیکھا اور چپ چاپ گردن جھکا لی۔ واقعی عدالتی

روایت کم و بیش یہی چلی آ رہی تھی کہ سیشن کورٹ سے درخواست ضمانت خارج ہو جانے کے بعد ہائی کورٹ سے فوری طور پر ضمانت ہونے کے امکانات کم ہی ہوتے ہیں، خاص طور پر جب چالان عدالت میں آ چکے ہوں اور سماعت شروع ہونے والی ہو۔

اُنہی دنوں ایک اور واقعہ ہوا۔ جیل حکام کی طرف سے رضوان ہاشمی کو بتایا گیا کہ رُباب نام کی کوئی خاتون اُس سے ملاقات کے لیے آئی ہے۔ اِس اچانک اطلاع نے اُس پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری کر دی۔ وہ عورت کہ جس کے اغواء، زنا بالجبر اور ممکنہ قتل کے مقدمے کا اُس کو سامنا تھا، وہ خود بخود اُس کے پاس چلی آئی تھی۔ یوں ایک مصیبت تو اُس کے سر سے ٹلنے والی تھی۔ لیکن ایک دم اُس کے ذہن میں کئی سوال ایک ساتھ کلبلانے لگے۔

"اب تک کہاں رہی ہے یہ منحوس عورت؟ کیا جبار اسے اپنے ساتھ لے کر آیا ہوگا؟ تو کیا جبار بھی ملاقات کے لیے موجود ہوگا؟ کیا یہ عورت مجسٹریٹ کے پاس اپنا اقبالی بیان قلم بند کرانے کو تیار ہو جائے گی؟ اگر رُباب نے اپنا اقبالی بیان نہ دیا اور نہ ہی کورٹ میں پیش ہوئی تو وہ کیسے اُس کی موجودی ثابت کر پائے گا؟"

لیکن رضوان ہاشمی کے واسطے ذہنی تشفی بس اِسی امر میں پنہاں تھی کہ ملاقات کرنے کے لیے آنے والوں کا جیل میں مکمل ریکارڈ رکھا جاتا ہے، اصل شناختی کارڈ دیکھنے کے علاوہ اُس کی فوٹو کاپی اور نشان انگوٹھا بھی محفوظ کیا جاتا ہے تو ایسے میں رُباب کا اغوا اُس کے خلاف کیسے ثابت کیا جا سکے گا۔ جلد از جلد قید سے آزاد ہونے اور پھر سے ایک کامیاب زندگی گزارنے کی امید کے ساتھ وہ جیسے ہی ملاقاتیوں کی بیرک میں پہنچا تو حیرت کا ایک شدید جھٹکا اُس کا منتظر تھا۔ قیدیوں اور ملاقاتیوں کے درمیان لگی ہوئی سلاخوں پر منڈھی ہوئی چھوٹے سوراخوں والی آہنی جالی کے عقب سے عتیقہ کا چہرہ جھانک رہا تھا۔ اُس پر نگاہ پڑتے ہی رضوان ہاشمی اِس طرح چکرایا کہ گرتے گرتے بچا۔ اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ جس حرافہ کے قتل کے الزام میں وہ برباد ہو کر جیل میں پہنچ چکا ہے وہ زندہ سلامت اُس کے روبرو موج مستی میں ہے۔

کچھ دیر تک تو اُسے سمجھ ہی نہ آئی کہ وہ بات کرے تو کیا کرے۔ بس پھٹی پھٹی آنکھوں اور

ماؤف ذہن کے ساتھ اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ عتیقہ نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں آہنی جالی کے سوراخوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ رضوان ہاشمی نے عین انہی سوراخوں پر اپنی انگلیوں کے پورے رکھ کر اُسے محسوس کرنا چاہا مگر عتیقہ نے اُس کے چھونے سے پہلے ہی اپنی انگلیاں وہاں سے ہٹالیں۔ رضوان ہاشمی کا تو دماغ اُلٹ گیا۔ جتنی بھی ننگی گالیاں اُسے یاد تھیں، وہ کسی کا لحاظ کیے بغیر پہلے دبی زبان میں مگر پھر اونچی آواز میں بکنے لگا۔

یوں واویلے پر اندر موجود جیل اہلکار اُس کی طرف لپکا کہ اُسے وہاں سے اُٹھادے لیکن عتیقہ نے مسکراتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اُسے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ باوردی جیل اہلکار اُن دونوں کو حیرت سے دیکھتا ہوا واپس پلٹ گیا۔ ہاشمی اُسے کچھ دیر اور اُتنی ہی اونچی آواز میں اُسی قسم کی گالیاں دیتا رہا مگر آہستہ آہستہ اُس کی آواز مدھم ہوتی ہوئی بڑبڑاہٹ میں بدلتی چلی گئی۔

''میں نے تم جیسا لعنتی شخص اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔'' عتیقہ نے زہر بھرے لہجے میں اُس کی طرف دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا مگر سننے کے باوجود اُس کے چہرے پر کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا۔

''میں نے رشتہ داروں سے اپنی جان اور جائیداد بچانے کے لیے تمھارے پاس پناہ ڈھونڈی، تمھاری عمر اور خصلت تک کی پروا نہ کی کہ شاید میرا وجود اور میری جائیداد تمھیں میرا بنا کر رکھ سکے، لیکن تم نے میرے ساتھ کیا کیا؟ میری طرف سے جعلی مختارنامہ بنا کر میری جائیداد کے ہی درپے ہو گئے، میں شاید جائیداد کی قیمت پر بھی تمھیں قبول کیے رہتی لیکن اگر تم مجھے پاگل ہونے کے لیے تنہائی کی نذر نہ کر دیتے، نہ تو تم نے مجھے سمجھا اور نہ ہی تم نے جانا کہ اچانک ہی اپنے سبھی پیاروں سے محروم ہونے والی ایک پڑھی لکھی کی ضرورت کیا ہو سکتی ہے، تم نے مجھے اپنا پن اور سماجی تحفظ دینے کی بجائے ایک ایسے قید خانے میں ڈال دیا کہ جہاں جب تم چاہو، میں تمھیں تمھاری عیاشی کے لیے دستیاب رہوں، میں اِس پر بھی شاید گزراہ کر لیتی اگر تم اپنی جنسی تسکین سے بڑھ کر میری ذہنی اور جسمانی تسکین کا تصور بھی کر سکتے لیکن ایک حریص شخص اپنی ذات سے باہر نکل کر کیسے کسی اور کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔''

عتیقہ نے غصے سے اُس کے منہ پر تھوک دیا۔ آہنی جالی کے سوراخوں سے تھوک کے چھوٹے چھوٹے بلبلے نما قطرے نکل کر رضوان کے چہرے پر پھیل گئے مگر وہ جامد آنکھوں والے کسی مجسمے کی مانند خاموش رہا۔

''بظاہر تم نے میرے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا لیکن اتنے بڑے نامی گرامی وکیل ہو کر بھی نہ سوچ سکے کہ عورت اگر چاہے تو زمین کیا وہ آسمان میں بھی دراڑیں ڈال کر اپنا راستہ نکال سکتی ہے، تم نہیں جانتے کہ ایک جوان لڑکی کی مسکراہٹ اور اُس کے قرب کا لالچ بادشاہوں کو بھی تخت سے اتار کر بھکاری بنا دیتا ہے، ایسے میں تمھارے وفادار اور جانثار سیکورٹی گارڈ کس کھیت کی مولی تھے، مجھے تو اُن میں سے بس ایک چاہیے تھا۔''

''تم نے مجھ سے طلاق کیوں نہ لی؟ مجھے کہا تو ہوتا، اظہار تو کیا ہوتا، میں تمھیں طلاق دے دیتا۔'' کافی دیر کے بعد رضوان ہاشمی کے ساکت ہونٹوں میں جنبش پیدا ہوئی۔ عتیقہ کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

''اتنی بڑی جائیداد کی مالک لڑکی کو ذہنی طور پر پاگل اور مالی طور پر قلاش کیے بغیر تم کہاں چھوڑنے والے تھے، فرض کرو تم چھوڑ بھی دیتے تو میرے رشتہ داروں نے مجھے کہاں چھوڑنا تھا، قتل کیے بنا کہاں رکنا تھا انھوں نے، سو میں نے اپنی جان بھی بچالی اور جائیداد بھی۔ میں شاید تمھارے سامنے کبھی نہ آتی لیکن جس طرح تو نے مجھے زندگی کے اوائل ہی میں قطرہ قطرہ مرنے کے لیے چھوڑ رکھا تھا، میں بھی تمھیں زندگی کے آخر میں لحہ لحہ مرنے کے لیے چھوڑے جا رہی ہوں ، اور ہاں جیل کا ریکارڈ کورٹ میں طلب کرا کر میرا زندہ ہونا ثابت کرنے کی کوشش نہ کرنا، جیل کا ریکارڈ تمھیں صاف ملے گا۔''

رضوان ہاشمی نے چونک کر عتیقہ کی طرف دیکھا اور چاہا کہ شور مچا کر اُسے گرفتار کرانے کی کوشش کرے لیکن اُس سے کچھ بھی نہ بولا گیا کہ عتیقہ ابھی کچھ کہہ رہی تھی۔

''رضوان! تم انتہائی گھٹیا کیٹگری کے حریص ہو، میں اپنی جائیداد کا صرف ایک فیصد خرچ کر کے سبھی عذابوں سے نجات حاصل کرتے ہوئے بیرون ملک نئی زندگی شروع کرنے جا رہی

ہوں اور تم اپنی کمائی کا ایک فیصد بھی خرچ نہ کرتے ہوئے موت کی طرف جا رہے ہو کہ جس کے بعد یہ سب کچھ اُن کا ہو گا جو تمھیں جیل میں ملنے کے لیے بھی نہیں آئے، مجھے یقین ہے کہ تمھیں پھانسی کی سزا نہ بھی ہوئی تو عمر قید سے نہیں بچ سکتے اور پھر اپنی آخری سانس تک یہیں جیل میں ایڑیاں رگڑتے رہنا کہ کوئی تمھاری لاش پر تھوکنے بھی نہیں آئے گا۔''

یہ کہتے ہوئے عتیقہ اُٹھی اور رضوان ہاشمی کی طرف حقارت سے دیکھتی ہوئی ملاقاتی لاؤنج سے باہر نکل گئی۔ عتیقہ کے جاتے ہی رضوان ہاشمی نے ایک جھرجھری سی لی کہ جیسے خواب کی سی کیفیت سے باہر نکلا ہو اور پھر سے چیخنا چلانا شروع کر دیا کہ پکڑو اُسے، جانے نہ پائے کہ جس عورت کے قتل کا کیس اُس پر چل رہا ہے وہ ابھی زندہ ہے، اُس سے ملنے کے لیے آئی تھی۔

ملاقاتی بیرک میں موجود باوردی اہلکار نے رضوان ہاشمی کے چیخنے چلانے پر اُسے بازو سے پکڑ کر اوپر اُٹھایا اور دو تین جھانپڑ اُس کی گردن پر عقبی سمت سے رسید کیے اور اُسے زبردستی اندر لے جانے لگے لیکن وہ مزاحمت کرتے ہوئے بدستور چیخ رہا تھا کہ یہ عتیقہ تھی، یہ مری نہیں زندہ ہے، اسے پکڑو، جانے نہ دو، مجھ پر اس کے قتل کا جھوٹ الزام لگایا گیا ہے، میں بے گناہ ہوں، میں بے گناہ ہوں، عتیقہ کو پکڑو، اسے جانے نہ دو۔ لیکن دو تین باوردی اہلکار اُسے گھسیٹتے ہوئے جیل کی ڈسپنسری میں لے گئے۔ وہاں بھی وہ مسلسل چیخنا چلاتا اور عتیقہ کو پکڑنے کی آوازیں لگاتا رہا۔ ڈسپنسری کے ڈاکٹر نے زبردستی خواب آور انجکشن لگا کر اب کے اُسے کوٹھڑی کی بجائے بیرک میں بھجوا دیا۔

اگلے دو دن وہ بالکل خاموش رہا۔ تیسرے دن اُسے عدالت میں مقدمات کی ٹرائل کے سلسلے میں پیش ہونا تھا۔ پیشی سے پہلے جونہی جیل کی گاڑی عدالت کے احاطے میں پہنچی اور جملہ حراستیوں کو بخشی خانے لے جایا جانے لگا تو رضوان ہاشمی نے اپنے منشی کو دیکھتے ہی پھر سے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ منشی بمشکل تمام بخشی خانے کے انچارج اے ایس آئی کو اپنے پلے سے چائے پانی کے پیسے دے دلا کر اُس کھڑکی تک جا پہنچا کہ جہاں آہنی سریوں کی باڑ کے عقب میں سے رضوان ہاشمی انتہائی بے تابی کے عالم میں اسے بلا رہا تھا۔ رضوان ہاشمی نے جلدی جلدی اُسے تمام

روداد سنائی کہ کس طرح عتیقہ، رُباب بن کر جیل میں اُس سے ملاقات کے لیے آئی تھی لہٰذا وہ مری نہیں بلکہ زندہ ہے اور اُسے خوامخواہ اُس کے قتل کے الزام میں جیل میں ڈال دیا گیا ہے۔ وہ منشی سے تقاضا کر رہا تھا کہ کوئی بھی وقت ضائع کیے بغیر خوشحال خان کو بلا لائے تاکہ عدالت میں اِس بارے میں درخواست دی جا سکے۔

منشی کو لگا کہ مسلسل صدمے اور تذلیل کی کیفیت میں رہنے کے سبب رضوان ہاشمی کا دماغ چل گیا ہے۔ اُسے تاسف تو ہوا لیکن پھر بھی وہ خوشحال خان کے چیمبر تک پہنچا اور جیسے اُسے کہا گیا تھا، ویسے ہی گوش گزار کر دیا۔ خوشحال خان نے بھی کم وبیش اُسی رائے کا اظہار کیا کہ جو منشی پہلے ہی قائم کر چکا تھا۔ اُسے استاد کے اِس انجام کا افسوس تو ہوا لیکن اس کے باوجود اُسے بخشی خانے جا کر ایک ملزم سے ملاقات کرنے میں تحفظات تھے۔ اُن دونوں کی ملاقات اُس وقت ہوئی جب آواز پڑنے کے بعد رضوان ہاشمی کو ایڈیشنل سیشن جج کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ خوشحال خان کے بار بار کہنے کے باوجود کہ وہ ساری بات منشی سے سُن چکا ہے رضوان ہاشمی نے انتہائی جذباتی انداز میں ساری روداد ایک بار پھر اُسے سننے پر مجبور کر دیا۔ خوشحال خان نے لاکھ کہا کہ یہ اُس کا وہم ہو سکتا ہے کیونکہ اس بارے میں مقدمہ کے چالان کی فائل ڈی این اے رپورٹ اور دیگر شواہد کی بنیاد پر صاف صاف کہہ رہی ہے کہ جس لڑکی کا قتل ہوا وہ عتیقہ ہی تھی۔ لیکن رضوان ہاشمی مصر تھا کہ فردِ جرم عائد کرنے کی کارروائی موخر کرتے ہوئے پہلے جیل کا ریکارڈ طلب کرایا جائے کہ تین دن پہلے اُس سے ملاقات کے لیے کون عورت آئی تھی۔

خوشحال خان نے طوعاً و کرہاً درخواست عدالت میں پیش کر دی۔ اُس پر خوشحال خان کے دلائل کے دوران رضوان ہاشمی نے مداخلت کرتے ہوئے نہ صرف پوری کہانی پھر سے سُنا دی بلکہ قانونی معاملات سے ہٹ کر اپنی سچائی کے بارے میں قسمیں کھانی شروع کر دیں۔ حیدر گوٹھ بار کے سینئر وکیل ہونے کے ناتے عدالت نے نہ صرف رضوان ہاشمی کو تحمل سے سنا بلکہ اُس کی ذہنی صحت کے بارے میں پیدا ہونے والے شبہات کے باوجود اُس کی درخواست منظور کرتے ہوئے اگلی تاریخ کے لیے گزشتہ ہفتے کے ملاقاتیوں کا اصل ریکارڈ جیل سے طلب کر لیا۔

اگلی پیشی پر سپرنٹنڈنٹ جیل خود ریکارڈ لے کر پیش ہوا۔ لیکن اِس میں کہیں بھی رضوان ہاشمی سے ملاقات کا کوئی اندراج نہیں تھا۔ ایڈیشنل سیشن جج نے نہ صرف خود ریکارڈ ملاحظہ کیا بلکہ فریقین کے وکلا کے علاوہ رضوان ہاشمی کو بھی اُس کے مطالبے پر دکھایا گیا۔ نہ تو کہیں کوئی کٹنگ تھی اور نہ ہی اوور رائٹنگ۔ بلکہ اُس روز مختلف قیدیوں سے ہونے والی پچپن ملاقاتوں کی تفصیل نہایت تفصیل سے درج تھی۔

اب کے رضوان ہاشمی نے کمرۂ عدالت ہی میں واویلا شروع کر دیا۔ اُس نے نہ صرف جیل حکام پر رشوت اور مدعی فریق سے ملی بھگت کا الزام لگا دیا بلکہ عدالت کو بھی مطعون کرنا شروع کر دیا کہ اُس کے تساہل اور درست انداز میں مفصل حکم صادر نہ کرنے کے سبب جیل حکام اصل ریکارڈ میں ردوبدل کرتے ہوئے جعلی اور فرضی ریکارڈ پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ وہ بار بار قسمیں کھاتا، چیختا اور عدالت کو دھمکاتا کہ اُس کے خلاف فیصلہ آنے کے بعد اگر عتیقہ زندہ سلامت ظاہر ہو گئی تو اُس کو دی گئی سزا کی کیا قانونی حیثیت رہ جائے گی۔

اس قسم کی ناپسندیدہ صورت حال میں خوشحال خان نے رضوان ہاشمی کی وکالت کے لیے دیا ہوا اپنا وکالت نامہ واپس لے لیا تو ضابطہ فوجداری کے تحت عدالت نے سرکاری خرچے پر اُس کا نیا وکیل مقرر کرنے کے بعد مقدمہ کی کارروائی آگے بڑھانا چاہی مگر رضوان ہاشمی نے عدالت کے مقرر کردہ وکیل کو نامنظور کرتے ہوئے اپنی وکالت خود کرنے کی استدعا کر دی۔ عدالت نے اُس کی اس درخواست کو بھی قبول کر لیا اور اُس پر فردِ جرم عائد کرنا چاہی لیکن اِس دوران رضوان ہاشمی نے ایک اور پینترہ بدلا اور عدالت سے کچھ دیر کی مہلت اس لیے چاہی کہ وہ درخواست دے کر ملک کے تمام ایئرپورٹس کا ایگزٹ ریکارڈ طلب کرنا چاہتا ہے کہ اپنی کہی ہوئی بات کے مطابق عتیقہ اِن دنوں کہیں ملک سے باہر تو نہیں چلی گئی۔

ایڈیشنل سیشن جج کے لیے اب مزید تحمل کا مظاہرہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ عدالت میں موجود سبھی لوگوں پر عیاں تھا کہ رضوان ہاشمی جیسا زیرک وکیل اپنا ذہنی توازن کھو چکا ہے۔ لوگوں کی اکثریت اسے مکافاتِ عمل قرار دے رہی تھی جب کہ کچھ کے نزدیک جو بھی تھا وہ افسوس ناک تھا۔

ایک دو لوگوں نے یہ تبصرہ کیا کہ وہ سزا سے بچنے کے لیے پاگل پن کا ڈراما کر رہا ہے۔ لیکن اِن سب باتوں سے قطع نظر عدالت نے حکم صادر کیا کہ آج ہی رضوان ہاشمی کا دماغی معائینہ کرانے کے بعد رپورٹ اگلی تاریخ پر عدالت میں پیش کی جائے اور اِس دوران اُسے جیل میں صحت مند قیدیوں کے ہمراہ رکھنے کی بجائے کسی علیحدہ کوٹھڑی میں اِس طرح رکھا جائے کہ بوقت ضرورت اُسے طبی سہولت دی جا سکے۔

۴۹

تونگر گلاس میں بچی باقی ماندہ شراب بھی حلق میں انڈیلنے کو تھا ایکدم رک گیا اور حیرت سے کبھی جانان اور کبھی ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھنے لگا جو ریموٹ پر پلے کا بٹن دبا چکی تھی۔ ویڈیو کیا تھی ایک دھما کہ تھا جس میں اللہ ڈنو عبید، تونگر کی سابقہ ہو چکی بیوی ناہید سے خلوت کے مراحل جس انداز میں طے کر رہا تھا اُس کے بعد کوئی بھی عورت اپنے شوہر سے تو کیا دنیا کے کسی اور مرد سے تشفی یاب نہیں ہو سکتی تھی۔ تونگر حیرت کے سبب سکتے جیسی کیفیت میں تھا۔ اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اِس پر تاسف کا اظہار کرے یا ملامت کا۔ جانان نے تونگر کی ذہنی حالت بھانپتے ہوئے ویڈیو کو ساکت کر دیا اور اُس کی طرف عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگی کہ جو نہ داد طلب تھیں اور نہ ہی اُن سے کسی نوعیت کی دلجوئی جھلکتی تھی۔ اگر کچھ قریں تھا تو صرف بے حسی۔

"یہ آٹھ نو برس پرانی ویڈیو ہے، شاید تمھیں یاد ہو کہ تمھاری بیوی نے بھی لگ بھگ آٹھ نو برس قبل تم سے جسمانی دوری اختیار کر لی تھی، باس کے بعد بھلا تم کہاں اُس کی نگاہ میں جچتے تھے، الیاس کو بھی ناہید نے اُس وقت اپنے بستر کی راہ دکھائی کہ جب باس نے اُسے ٹھنڈی کرا دی، لیکن جب بھی باس کی فائلز تمھاری ٹیبل پر جمع ہونے لگتیں تو وہ کبھی کبھار تمھاری بیوی پر مہربان ہو ہی جاتا اور پھر اِس کے بدلے میں اُس کی سبھی فائلز جو کئی دنوں سے تمھاری ٹیبل پر پینڈنگ رکھی ہوتیں، اگلے دن ہی اُس کے دفتر واپس پہنچ جاتیں، یہ ایک تکون تھی جس نے تم سے ہر وہ کام کرایا جس کے پس منظر میں لاکھوں کی نہیں بلکہ کروڑوں کی دیہاڑیاں ہوا کرتیں۔"

''لیکن اللہ ڈنو کی ویڈیو تمھارے پاس کیسے؟'' تونگر کے خشک گلے سے آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ پیگ ہاتھ میں ہوتے ہوئے بھی وہ اُسے ہونٹوں تک لانا بھول چکا تھا۔

''مرد چاہے جتنا بھی شاطر ہو، مرتا عورت کے ہاتھوں ہے اور عورت چاہے جتنی چلتر، جتنی بھی خوبصورت ہو، اُس کی بربادی، اُس کا انجام کسی چوتیا سے مرد کے ماتھے پر لکھا ہوتا ہے، تو پھر سمجھ لو کہ باس کی خود اپنی ویڈیوز مجھ تک کیسے پہنچی ہوں گی۔''

جانان زہر خند تو پہلے ہی ہو رہی تھی لیکن اسکاچ وہسکی کے ایک نیٹ (neat) گھونٹ نے اُس کے اندر کی ساری کڑواہٹ اُس کے چہرے پر مَل دی تھی۔ حلق کی تلخی سے لذت کشید کرنے کے لیے جانان نے نیٹ وہسکی کا ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا اور اُسے زبان پر روک کر آنکھیں موند لیں۔ آن دی راک اسکاچ کی بوندوں نے زبان کے خلیوں کے ذریعے براہِ راست خون کے بہاؤ میں شامل ہو کر اُسے کیف و انبساط کے ارفع درجے تک پہنچا دیا تھا کہ جہاں تمام جسمانی صلاحیتیں چوکس و مستعد ہوئی رہتی ہیں۔

''جانِ من! تمھاری بیوی تو باس کے لیے بس ایک نوالہ تھی ورنہ اُس کے دسترخوان پر تو بڑے بڑے افسروں اور بڑے لوگوں کی بیویاں کسی رکابی کی طرح چُنی رہتی تھیں۔ جس محکمے، جس وزارت سے کام پڑا اُسی رکابی میں منہ مار لیا۔ یہ حرامی آج کے عہد کا راسپوٹین ہے۔ وہ بھی زار روس کی ملکہ کے بستر میں گھس کر روس کے حکومتی معاملات میں دخیل ہوا کرتا تھا اور یہ شیطان بھی افسروں اور سیاستدانوں کی بیویوں کو ترسا، تڑپا کر اپنا کوئی کام رکنے ہی نہیں دیتا، یہ دیکھو تین سو سے زیادہ ویڈیوز ہیں اِس اللہ ڈنو کی بہت نامور لوگوں کی بیویوں کے ساتھ۔''

تونگر اُسے ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھ گیا۔

جانان اپنا پیگ ہاتھ میں لیے صوفہ پر کھسک کر اُس کے قریب آئی اور اُس کے کندھے پر سر ٹکا لیا۔ تونگر نے جانان کے اِس طرح جڑ کر بیٹھنے کا کوئی اثر نہ لیا تو اُس نے اپنا گداز ہاتھ تونگر کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے اپنی انگلیاں اُس کے ہاتھ کی انگلیوں کے درمیانی خلا میں ڈال کر ہلکے ہلکے دبانے لگی۔

''جانتے ہو اِس کے مختلف دھندوں کا نیٹ ورک کتنا بڑا ہے؟'' جانان تونگر کو صوفے کی پشت سے لگا کر خود اُس کے سامنے صوفے پر ہی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اگرچہ تونگر اُس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا لیکن اُن آنکھوں میں نور نہیں تھا۔ ذہنی طور پر شاید وہ ابھی تک اُسی منظر میں اُلجھ کر رہ گیا تھا کہ جو اُس کی آنکھوں کے سامنے سمارٹ ٹی وی کی اسکرین پر ساکت حالت میں اب بھی موجود تھا۔ ناہید اور اللہ ڈنو عبید کی پر وحشت جسمانی سانجھ کا منظر۔ تونگر ابھی تک اِسی تاسف میں تھا کہ ناہید نے تو کبھی اپنا آپ اُس پر اِس شدت سے ظاہر نہیں کیا تھا۔ تو کیا کبھی بیویاں اپنے شوہروں پر اپنا آپ اِس طرح ظاہر نہیں کرتیں اور عمر بھر کسی راسپوٹین کی منتظر رہتی ہیں کہ جو اُن کے مسام مسام کو اپنا مطیع بنا سکے۔

''دنیا بھر کے عیاشی کے اڈوں پر کم سن لڑکے اور جوان لڑکیوں کی سپلائی کا سب سے بڑا ڈیلر ہے یہ، مڈل ایسٹ کے کچھ ممالک میں سکیورٹی ایجنسی میں ملازمت کے نام پر لڑکیاں بھی یہی دلال سپلائی کرتا ہے۔''

تونگر اب بھی خاموش رہا۔ اُس کی آنکھیں ویسی کی ویسی بے جان جن میں حیرت یا تجسس نام کی کسی کیفیت کا گزر تک نہیں تھا۔ جانان نے اپنے لبوں کو وسکی میں ڈبویا اور اُسی تر بتر حالت میں عجیب سی وارفتگی کے ساتھ انھیں تونگر کے لبوں پر رکھ دیا۔ جانان کے لبوں کی گداز تا کی حدت خیزی تھی یا اسکاچ وسکی کی بوندوں کی سحر کاری، تمازت کی ایک لہر نجانے سرد مہری کی کون سی پرتوں کو ادھیڑتی ہوئی تونگر کے جسم میں اُٹھی اور اعصاب کو مہمیز کرتی چلی گئی۔ لیکن جونہی تونگر کے لبوں میں زندگی کا احساس سجھائی دینے لگا، جانان اُس سے الگ ہوگئی۔ وہ تونگر کی آنکھوں میں حیرت اور تجسس جگانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

''لگتا ہے تمھیں باس کے دھندوں سے کوئی غرض نہیں لیکن شاید تمھیں یاد ہی نہ ہو کہ اُسے امارات سمیت مڈل ایسٹ اور تھائی لینڈ میں فی میل سکیورٹی گارڈز سپلائی کرنے کی اجازت پہلی بار تم نے دی تھی۔''

''میں نے کب دی تھی؟'' تونگر جانان سے الگ ہونے کے بعد اُس کے روبرو ہو کر بیٹھ گیا۔

"جی! تم نے دی تھی صاحبزادہ سلطان احمد تونگر صاحب! دس برس قبل کہ جب تم وزارتِ داخلہ میں ایڈیشنل سیکریٹری تھے۔ اِس حرامی کو نیشنل سے انٹرنیشنل بھڑوا بنانے کے ذمہ دار تم ہو۔ شاید تمھیں یاد آجائے کہ اِس کے بدلے میں تم نے کیا کچھ وصول کیا تھا۔"

"مجھے ایسا کچھ بھی یاد نہیں اور نہ ہی مجھے اِن چیزوں سے کبھی دلچسپی رہی ہے۔" تونگر ہذیانی انداز میں چیخا اور جانان کو ایک طرف کرتے ہوئے سامنے رکھی بار سے وسکی کی بوتل اُٹھائی اور بدحواسی میں پیگ بناتے ہوئے شراب کو صوفے پر گرانے لگا۔ جانان نے اُس کی اِس حرکت کو اطمینان سے دیکھا، مسکرائی اور بوتل اُس کے ہاتھ سے لے کر خود پیگ بنانے لگی۔ صوفہ کا وہ حصہ کہ جہاں تونگر بیٹھا تھا اچھا خاصا گیلا ہو چکا تھا۔ تونگر اُٹھا اور واپس اُسی سنگل صوفہ پر جا کر بیٹھ گیا کہ جہاں آتے ہوئے بیٹھا تھا۔

"چلیں! اُس کے بدلے میں جو کچھ تو نے لیا وہی سب کچھ تمھیں یاد دلانے یہاں لائی ہوں، ابھی تم اتنے بوڑھے نہیں ہوئے کہ تمھارے دماغ کے میموری سیل مردہ ہو چکے ہوں، اگر ہو بھی گئے تو مجھے تم جیسے مُردوں کو زندہ کرنا آتا ہے۔"

تونگر پھر سے سُنی ان سُنی کرنے لگا تھا لیکن جانان کے بنائے ہوئے نئے پیگ سے وسکی کو ہولے ہولے سِپ کرتے ہوئے وہ دیکھ مسلسل اُسی کی طرف رہا تھا۔ اب اُس کی آنکھوں میں بھی مردنی کی جگہ تجسس نے لے لی تھی لیکن وہ اِسے جانان پر ظاہر کرنے کے معاملے میں گریز کا شکار تھا۔

"تمھیں یہ تو خبر ہوگی کہ باس کے اِن دھندوں میں کون کون اُس کے سرپرست اور کون کون پارٹنر ہیں اور رہے ہیں؟"

"جانان! تم کرنا کیا چاہتی ہو میرے ساتھ اور یہ کیا بکواس باتیں ہیں جو مجھ سے مسلسل کیے جا رہی ہو، اتنی اچھی وسکی اور اتنے اچھے ماحول میں اتنی بے ہودہ گفتگو، میں کہہ چکا ہوں کہ جو کچھ تم مجھے دکھانا اور سنانا چاہتی ہو میرے لیے وہ سب کچھ اِرریلے وینٹ (irrelevant) ہو چکا ہے، مجھے اِس میں کوئی دلچسپی نہیں۔"

''تمھیں کسی نے بتایا کہ باس اپنی بیوی کا قتل کر چکا ہے۔'' جانان کی نگاہ بدستور اُس کی آنکھوں کے بدلتے رنگوں پر تھی۔

''تو میرا اُس سے کیا تعلق، وہ بیوی کو قتل کرے یا سالی کو۔'' تونگر واپس ہذیان کی طرف لوٹ رہا تھا۔

''تعلق ہے ناں! تم جلال آباد میں پہلے ڈپٹی کمشنر اور پھر کمشنر رہے ہو ناں یہی کوئی بائیس چوبیس برس پہلے۔''

تونگر نے چونک کر جانان کی طرف دیکھا۔

''وہاں ایک ضلع کونسل کا ممبر ہوا کرتا تھا، جسے تمھاری سرپرستی نے پہلے ایم پی اے اور بعد میں صوبائی وزیر بنوا دیا اور یہ تو تم جانتے ہو گے کہ وہ وزیر آج کل کہاں ہے؟'' جانان کی آنکھوں میں شطرنج کی بازی بچھ چکی تھی۔

''جانتا ہوں، وزیر اعلیٰ ہے صوبے کا۔'' تونگر نے رعونت سے گلاس کی باقی ماندہ وسکی کو ایک گھونٹ کیا اور گلاس جانان کی جانب صوفے پر اُچھال دیا۔

''تو پھر اُس سے تعلق کیوں جاتا رہا؟'' جانان کے لبوں پر عیارانہ مسکراہٹ تھی۔

''میں تمھیں ہر بات بتانے کا پابند نہیں۔'' تونگر نے چہرہ ٹی وی اسکرین کی طرف کر لیا کہ جہاں ابھی تک اسکرین پر اللہ ڈنو اور ناہید کی برہنہ ویڈیو ساکت حالت میں موجود تھی۔

''ہاں واقعی تم ہر بات بتانے کے پابند نہیں ہو، مجھے یقین ہے ہماری ملاقات شاید پھر کبھی نہ ہو اِس لیے میں ہی بتائے چلی جا رہی ہوں کہ مرنے کے بعد تمھاری روح کہیں یہ نہ پکارتی پھرے کہ مجھے کیوں مارا گیا! مجھے کیوں قتل کیا گیا؟''

تونگر کے چہرے پر رعونت کی جگہ پھر سے خوف، بے بسی اور بے یقینی کی پرچھائیوں نے لے لی تھی۔

''ہر چھوٹے موٹے سیاست دان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ افسروں کی نگاہ اور سرپرستی میں رہے، یہی کوشش تھی رئیس جمال بخش کی اور تمھاری نگاہ تھی اُس کی خوبصورت مست اندام اور

صوبے کے سب سے معروف وومن کالج کی گریجوایٹ بیوی سامرہ پر۔''

''یہ جھوٹ ہے، تم بکواس کرتی ہو۔'' تونگر اچانک سے پھٹ پڑا تھا لیکن اب کے جانان نے سُنی ان سُنی کر دی اور اُس کے ردِعمل کی پروا کیے بغیر اپنے انداز میں بولتی رہی۔

''پہلے ایم پی اے اور پھر صوبائی وزیر بننے کی خواہش نے رئیس جمال بخش کو مجبور کر دیا کہ وہ سامرہ سے تمھاری خلوت کی ملاقاتوں کو نہ صرف نظر انداز کرے بلکہ زیادہ سے زیادہ مواقع اور سہولتیں مہیا کرے۔''

''یہ سب جھوٹ ہے۔'' تونگر کا ہذیان اُس کے گلے میں پھنس کر رہ گیا۔ پھٹی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اب اُس سے بولنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

''لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی، جونہی تمھاری کوششوں سے رئیس جمال بخش پہلے ایم پی اے اور پھر صوبے کا ہوم منسٹر ہو گیا تو اُس نے تمھیں اپنے محکمے میں ایڈیشنل سیکریٹری لگوا لیا لیکن اب اُس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا کہ وہ سامرہ اور تمھیں کھل کھیلنے کا موقع دے، لہٰذا اُس نے تم سے قطع تعلق کرتے ہوئے تمھیں محکمہ زراعت میں تبدیل کرا دیا لیکن مسئلہ اُس وقت بنا کہ جب تمھارے نطفے سے حاملہ ہو چکی سامرہ نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔''

''مجھے نہیں معلوم، یہ سب جھوٹ، سب بکواس ہے۔'' تونگر کے لیے سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔

''جب تم ہوم ڈیپارٹمنٹ کے ایڈیشنل سیکریٹری نہ رہے تو میرے باس نے براہ راست رئیس جمال بخش سے تعلق بنا لیا.... ایک نئی پراڈو کا تحفہ اُسے منسٹر صاحب کے گھر تک لے گیا اور اُس کی بیگم کو باس کے بستر پر، باس کے بستر پر جانے کے بعد بھلا اب کہاں وہ منسٹر کے ساتھ رہنے والی تھی لہٰذا طلاق ہوئی اور پھر سامرہ اپنے سبھی رشتے حتیٰ کہ والدین تک کو تیاگ کر اپنی بیٹی سمیت بیگم اللہ ڈنو عبید بن گئی، یہ سب کچھ اتنے خفیہ طریقے سے ہوا کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔''

''سامرہ اللہ ڈنو کی بیوی؟ یہ سب کیسے ہو گیا؟'' تونگر سکتے کی سی کیفیت میں تھا۔

''سامرہ نے اپنے اوپر لگائی گئی تمام پابندیوں کو تو قبول کر لیا لیکن یہ گوارا نہ کر سکی کہ اُس

کے بعد اُس کی بیٹی بھی سوتیلے باپ کی وحشت کا نشانہ بنے لیکن جب سامرہ کے لیے زیادہ دیر تک بیٹی کو بچا پانا ممکن نہ رہا تو وہ بیٹی کو بچاتے بچاتے اللہ ڈنو عبید کے ہاتھوں قتل ہوگئی لیکن مر کر بھی بیٹی کو نہ بچا سکی۔"

"تو کیا ہوا سامرہ کی بیٹی کا؟" تونگر بدستور سکتے کی سی کیفیت میں تھا۔

"حشر کے سوا کیا ہونا تھا، کچھ دن گھر پر ہی انتہائی کڑے پہرے میں زیر علاج رہی اور جب چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تو میں نے اُسے کسی نہ کسی طور اُس وحشی کی قید سے فرار کرا دیا لیکن جو کچھ دس سال پیشتر میری بہن کے ساتھ ہوا اُس کے ذمہ دار تم ہو۔"

"تمھاری بہن؟" تونگر نے حیران ہو کر جانان کو دیکھا۔

"جی میری بہن! جس کی تصویر آج تمھیں سول آفیسر کلب میں بھجوائی گئی تھی، میں نہیں جانتی تم نے باس سے فی میل سیکورٹی گارڈز باہر بھجوانے کے اجازت نامے کے بدلے کتنی رشوت لی، میں نہیں جانتی کہ تم نے میری بہن کو کہاں اور کس طرح دیکھا کہ اجازت نامے کی ڈیل میں اُس سے ہوس کاری کی خواہش بھی باس تک پہنچا دی لیکن اتنا جانتی ہوں کہ میری بہن بھی اُس اجازت نامے کی بھینٹ چڑھ گئی کہ جس پر تمھارے دستخط ہیں۔"

کافی دیر سے ساکت ہوئے تونگر نے اچانک جانان کے سامنے ترلے کرنا شروع کر دیئے۔

"جانان! پلیز میرا یقین کرو کہ میں نے زندگی بھر کسی کم سن، کسی ٹین ایجر لڑکی کے ساتھ بھی خلوت نہیں کی، یہ واردات کسی اور نے کی ہے، تم حقیقت تو معلوم کرو، ہو سکتا ہے یہ کام بھی اللہ ڈنو کا ہو جسے میری آڑ میں کیا گیا ہو۔"

"بکواس نہیں کرو تونگر! یہ سب تمھارا کیا دھرا ہے، تم اس کی سزا سے بچ نہیں سکتے۔" جانان کا لہجہ اجنبی ہی نہیں بلکہ سفاک ہو گیا تھا۔ اپنے اندر کے کھولاؤ اور طیش کو برداشت کرنے کی کوشش میں وہ پھر سے صوفے کے دیوار سے ملحقہ بازو پر سر ٹکا کر اس طرح نیم دراز ہوئی کہ اُس کے پاؤں تونگر کی جانب اور نگاہیں چھت پر مرکوز تھیں۔ اس بے دھیانی نے اُسے نصف سے زیادہ

برہنہ کر رکھا تھا۔ چند لمحے پہلے تک شیفون کی باریک نائٹی سے اُس کا جھانکتا ہوا بدن جہاں تونگر کے لیے حرزِ جاں تھا، تو اب وہی جسم آدھے سے بھی زیادہ برہنہ ہو کر بھی بے وقعت ہو چکا تھا۔ محسوسات سے دلکشی مفقود ہوئی تو جذبات میں بھی لاتعلقی در آئی۔ تونگر کو اپنی موت کا یقین ہو چکا تو خوف کے سائے اُس کے چہرے سے چھٹنے لگے۔

''اگر میں تمھارا مجرم ہوں، تم نے مجھے سزا دینی ہے تو اللہ ڈنو عبید کیوں میرے پیچھے پڑا رہا۔ محض چند دنوں میں مجھے وہ ذہنی پٹخنیاں دی گئیں کہ میں اپنے حواس کھو کر محض ایک لاش بن کر رہ گیا ہوں۔''

جانان کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر اُٹھی اور صرف اپنے لیے ڈبل پیگ بنا کر آن دی راک سِپ کرنے لگی۔ کچھ دیر مزید دونوں جانب سے خاموشی رہی۔ تونگر استفساریہ انداز میں جانان کی طرف دیکھتا رہا اور وہ اُس سے لاتعلق محض گلاس میں اُس سنہرے پانی کو دیکھتی اور ہولے ہولے سِپ کرتی رہی کہ جسے شراب کہا جاتا ہے۔

''تم مجھے کیوں نظر انداز کر دیتے ہو مائی ڈیئر بیوروکریٹ! کیا اِس سارے کھیل کے پیچھے میں نہیں ہو سکتی؟ ہو سکتا ہے کہ میں نے اُسے کہا ہو کہ اُس کی سختیوں سے تنگ آئی ہوئی اُس کی بیوی سامرہ تونگر سے رابطے میں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں نے باس کو یقین دلایا ہو کہ وہ اپنی بیٹی کو بھی اُس کے باپ صاحبزادہ سلطان احمد تونگر کے سپرد کرنا چاہتی ہے اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ باس کی توجہ تمھاری بیٹی کی جوانی کی طرف بھی میں نے دلائی ہو یہ یاد دلاتے ہوئے کہ اُس کی بیوی کبھی تمھارے بستر کی زینت بھی رہی ہے۔''

''کس قدر غلیظ ہو تم! کس قدر گھٹیا! کتنے رنگ بدلتی ہو، کتنے جھوٹ بولتی ہو، مجھے بتاؤ حرامزادی کہ کیا واقعی سامرہ کو اللہ ڈنو نے قتل کر دیا ہے؟'' جانان کی بات سنتے ہی تونگر غم و غصے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کا پورا بدن تھر تھرانے لگا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ جانان نے اِس کے ردِعمل میں نہ تو غصہ کیا اور نہ ہی اُسے سنجیدہ لیا بلکہ دھیرے سے ہنس دی۔

''بیٹھ جاؤ تونگر، اتنا غصہ کرو گے تو میرے مارنے سے پہلے مر جاؤ گے۔''

''بکواس نہیں کرو! مجھے بتاؤ کہ سامرہ کے قتل کی کس کس کو خبر ہے اور وہ سامرہ کی بیٹی! کہاں ہے وہ.... کیا واقعی وہ میری بیٹی ہے؟''

''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی کہ وہ تمھاری بیٹی ہے یا رئیس جمال بخش کی! لیکن ہے تم دونوں میں سے کسی ایک کی، باقی رہی سامرہ کے قتل کی بات تو جو عورتیں کسی راسپوٹین کے لیے اپنے تمام رشتے، تمام تعلق تیاگ کر گھر سے نکلتی ہیں تو اُن کے مرنے کی خبر کسی کو نہیں دی جاتی، بہر حال سامرہ کے قتل کے بارے میں اگر کسی چوتھے شخص کو خبر ہے تو وہ رئیس جمال بخش ہے لیکن حیرت ہے کہ اُس نے وزیر اعلیٰ ہوتے ہوئے بھی نہ تو باس کے خلاف کوئی ایف آئی آر درج کرائی اور نہ ہی سامرہ کے والدین کو اِس کی خبر کی، حیرت ناک تو یہ بھی ہے کہ صوبے کا وزیر اعلیٰ ہوتے ہوئے بھی اُسے یہ پتہ نہیں کہ اُس کی بیٹی یا تمھاری بیٹی کا باس نے حشر کیا کیا ہے اور وہ کس حال میں ہے۔ ہو سکتا ہے رئیس جمال جانتا ہو مگر اِس لیے چپ ہو کہ وہ اُسے اپنی نہیں بلکہ تمھاری بیٹی سمجھتا ہو۔''

''بہت ذلیل عورت ہو تم! مجھے بتا تو دو کہ تم نے میری بیٹی کو کدھر بھیجا ہے، کہاں کیا ہے؟''
تونگر نڈھال ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''تصویر تم لیے پھرتے ہو، پوچھتے مجھ سے ہو۔'' عیاری در آنے سے جانان کا خوبصورت چہرہ مکروہ لگنے لگا تھا۔

''کون سی تصویر؟ تم تو کہتی ہو کہ وہ تمھاری بہن کی ہے۔''

''وہ تصویر جو تمھیں باس نے دی تھی، رُباب کی تصویر۔'' اب کے جانان کھل کھلا کر ہنس دی اور استہزائیہ انداز میں تونگر کے سُتے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے صوفے سے اُٹھی اور اُٹھ کر اپنی بانہیں اُس کے گلے میں ڈال دیں۔

تونگر نے اپنا جھکا ہوا چہرہ اُوپر کو اُٹھایا اور نمناک آنکھوں سے جانان کی طرف دیکھا تو آنسو ٹھوڑی تک اتر آئے۔ تونگر کا وجود اندر سے کئی دراڑوں میں منقسم ہو چکا تھا اور اُس میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ جانان کو اُس کے بدن سے اُٹھنے والی دلکش مہک سمیت اپنے سے پرے دھکیل سکتا۔

۵۰

نیم تاریک کمرے میں وہ دونوں نوے کے زاویے پر رکھی دو آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ کمرے میں فرنیچر کم اور سناٹا زیادہ تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ کافی دیر سے ایک ساتھ ہیں اور اب اُن کے پاس گفتگو کے لیے کوئی موضوع نہیں رہا۔ کمرے میں سگار کا دھواں اور اُس کی بو اس طرح پھیلے ہوئے تھے کہ ماحول کا ملگجا پن کچھ اور بھی کثیف ہو رہا تھا۔ اگرچہ اُن کے ساتھ رکھی تپائیوں پر اسکاچ وسکی کے پیگ بنے ہوئے رکھے تھے لیکن اُن کا بہت آہستگی سے سِپ کرنا ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اُس کی خاصی مقدار پہلے ہی اپنے معدوں میں اُنڈیل چکے ہیں اور اب محض محفل کے آداب کی بجا آوری کی غرض سے انھیں اِس واسطے ساتھ رکھا ہوا تھا کہ وقتاً فوقتاً خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں کو تر کرنے کا اہتمام رہے۔

یہ کمرہ اللہ ڈنو عبید کے فارم ہاؤس کے عقبی رہائشی حصے میں اُس کا خاص کمرہ تھا کہ جہاں اُس کے سوا صرف وہی آسکتا تھا کہ جس سے اُس کی بہت زیادہ قربت رہی ہو اور صوبے کا انسپکٹر جنرل پولیس حمید الرحمٰن اُس کے بہت زیادہ قربت کے دوستوں میں سے ایک تھا۔ حمید الرحمٰن نے سگار کا ایک لمبا کش لیا اور اللہ ڈنو عبید کی طرف گھور کر دیکھا۔

''عبید! تم نے بہت زیادتی کی، کم از کم صاحبزادہ تونگر جیسے ذہین بیوروکریٹ سے یہ سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا، اگر قتل کرنا ہی تھا تو اُسے قتل ہو کر بھی باوقار رہنا چاہیے تھا، یہ کیا کہ اُس کی لاش کو آدھی رات کے بعد موٹروے کی ہیوی ٹریفک کے سامنے پھینکوا کر ایک اچھے بھلے انسان کو اس طرح روڈ سے چپکی ہوئی کھال بنا دیا کہ شناخت کا سوال ہی باقی نہ رہے۔''

''میرے پیارے آئی جی! تم پولیس والوں میں یہی خرابی ہے کہ تم اُلٹا سوچتے ہو، یہ کیوں نہیں سوچتے کہ سسٹم کا ایک گلا سڑا، زنگ آلود پرزہ جسے خود سسٹم باہر نکال کر پھینک چکا تھا، بیوی چھوڑ گئی، بچے چھوڑ گئے، میں نے بھی کوشش کی کہ اُس کے احسانات کا بدلہ چکاؤں مگر وہ بھڑوا ہمیشہ مجھے ہی زک پہنچانے کی سوچتا، ایسے میں مر مرا گیا تو بھلا اُس کا کفن دفن کون کرتا، لاوارثوں

کے قبرستان میں بھنگیوں کے دفنانے سے تو بہتر تھا کہ خس کم جہاں پاک کر دیا جائے، بھئی آخر کو اتنا بڑا قومی بیوروکریٹ تھا، کم از کم ایک ایک بوٹی تو ایک ٹرک کے حصے میں آنی چاہیے تھی سلامی کے لیے، لہٰذا چار پانچ سوٹرکوں کی سلامی تو ہو گئی ہو گی، اور کیا چاہیے بہشتی کو۔''

حمید الرحمٰن نیم تاریکی کے باوجود اللہ ڈنو کے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا۔ ''کیوں جھوٹ بولتے ہو عبید! میں تمھیں تیس برس سے جانتا ہوں، اگرچہ تم سے میرا تعارف بخشن کے ذریعے ہوا لیکن اِس دوران بخشن کہیں پیچھے رہ گیا اور تم آگے نکل آئے، ایک معمولی بوٹ لیگر اور کال گرل سپلائیر سے یہاں تک کا سفر سلطان تونگر جیسے افسروں کی مہربانیوں کی بدولت طے ہوا لیکن تم صرف شیزوفرینیا کے مریض ہی نہیں بلکہ جھوٹے اور متکبر شخص ہو کہ جو خود ہی کوئی مفروضہ گھڑتا ہے اور پھر اُس پر اتنا سوچتا ہے، اتنا سوچتا ہے کہ خود ہی اُسے سچ مان لیتا ہے، تو نے آج تک کوئی ایسا شخص نہیں چھوڑا کہ جس نے تجھ پر احسان کیا اور تو نے اُسے عبرت کی مثال نہ بنایا ہو۔ تونگر کو بھی تو نے کسی مہربانی کے لیے اپنے پاس نہیں بلایا تھا بلکہ قدم قدم پر ذلیل کرنے اور اُن خجالتوں کا بدلہ لینے کے لیے جو تجھے اُس سے کام کرانے کے لیے الیاس کے ذریعے سہنی پڑتی تھیں۔''

اللہ ڈنو عبید نے زوردار قہقہہ لگایا اور وسکی کا گلاس ہاتھ میں لے کر کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور حمید الرحمٰن کے سامنے آ کر جھومنے لگا۔ ''تو بہت حرامی ہے آئی جی! ہمیشہ میرے گھر آ کر مجھے بے عزت کرتا رہتا ہے اور میں سہتا رہتا ہوں، نہ تو، تو بدلا اور نہ ہی میں! دیکھ تو بھی تو میرا محسن ہے پھر تجھے کیوں کچھ نہیں کہا اب تک، بلکہ تیری تو پرموشن پہ پرموشن کرائی ہے اور وہ بھڑوا بخشن سمجھتا ہے کہ تجھے یہاں تک لانے میں اُس کا کمال ہے، تو بتا تا کیوں نہیں اُسے کہ یہ سب کچھ میں نے کیا ہے، اللہ ڈنو عبید نے۔''

''اللہ ڈنو! میرا خیال ہے کہ جب دنیا بھر کے شیطان کوئی میٹنگ کرتے ہوں گے تو صدارت کی کرسی پر تجھے بٹھاتے ہوں گے، بخشن کو چوہدری ضیا کے ہاتھوں پولیس انکاؤنٹر میں مروانے کے بعد بھی تو مجھ سے کہتا ہے کہ میں اُسے اپنی پرموشنز کے بارے میں صفائیاں دوں؟''

حمید الرحمٰن بھڑکنے لگا تو وسکی کا گلاس ہونٹوں کو لگا کر دو تین لمبے گھونٹ لیے اور اُن کی تلخی کو سگار

کے تمبا کو کی کڑواہٹ سے زیر زبر کرنے لگا۔

"ناراض نہ ہونا میرے دوست! تم پولیس والے پیدائشی گھامڑ ہوتے ہو، کہاں مرا ہے بخشن! بس ایک وہ لڑکی جوڑکوں پر چلتی تھی اور ایک پیٹی نوٹوں کی، پولیس مقابلے کی جعلی رپورٹ تیار اور بخشن انڈر گراؤنڈ، بس آج کل میں کہیں فلائی کر چکا ہوگا، چوہدری ضیا! بھاڑے ٹٹو! چھوٹا افسر ہو کر بھی بڑے بڑوں کی مار گیا۔"

حمید الرحمٰن کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اُس نے اللہ ڈنو کی طرف دیکھا مگر وہ اُس کی طرف پشت کیے دیوار کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ کچھ دیر کمرے میں خلا کی سی خاموشی رہی۔ شاید دونوں مزید کچھ کہنے میں پہل کرنا چاہ رہے تھے لیکن کوئی بھی پہل کر نہیں پا رہا تھا۔ حمید الرحمٰن کا پیگ ختم ہوتے ہوتے اُس کا سگار بھی بجھ چکا تھا۔ اپنا پیگ بنانے کے لیے وہ اُٹھ کر کمرے کے ایک کونے میں بنی ہوئی بار کی طرف جانے لگا تو اللہ ڈنو چوکنا ہو کر اُس کی طرف مڑا مگر اُسے پیگ بناتا دیکھ کر قدرے پرسکون ہو گیا۔

"تم مجھے شیزوفرینیا کا مریض ہونے کے طعنے دیتے ہو، یہاں اس ملک میں کون ہے جو دہری شخصیت کے عذاب میں گرفتار نہیں، ہر کوئی اپنے آپ کو حق پر اور دوسرے کو گمراہ سمجھتا ہے، بائیس کروڑ کی آبادی بائیس کروڑ ذہنی مریضوں میں بدل چکی ہے، پولیس کہتی ہے مجرموں کو سزا دینا عدالتوں کا نہیں بلکہ اُن کا کام ہے، عدالتیں کہتی ہیں ہمارا کام انصاف نہیں سیاست کرنا ہے، سیاست دان کہتے ہیں کہ اُن کا کام سیاست نہیں بلکہ کاروبار کرنا ہے تو پھر اگر ایک اللہ ڈنو اپنی زندگی اپنے ڈھب سے جینا چاہتا ہے تو بقول بخشن کسی کنجر کے بچے کو کیا تکلیف؟"

آئی جی حمید الرحمٰن نے اللہ ڈنو کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور واپس اپنی کرسی پر بیٹھ کر سگار کو پھر سے سلگانے لگا۔ اللہ ڈنو بھی اُس کے سامنے آ کر کسی میوزک کے بغیر اپنے اندر بجنے والی کسی دھن کے زیر اثر ہو کر پھر سے جھومنے لگا۔

"تم مجھ سے نہیں پوچھو گے کہ میں نے جانان کی جان کیوں لی؟ تم ہی نے تو متعارف کرایا تھا اُسے، سچ بتاؤں بہت مشکل فیصلہ تھا اُسے مارنے کا لیکن خوشی اس بات کی ہے کہ اُسے پل بھر

میں، کسی اذیت، کسی تکلیف کے بغیر ہی ٹشن ٹاٹ کیا گیا ہے۔''

جھومتے ہوئے اللہ ڈنو پر کچھ عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ حمید الرحمٰن کے چہرے پر اگرچہ کڑواہٹ تھی لیکن اذیت یا غصے کے آثار نہیں تھے۔ وہ اُسے دیکھ بھی رہا تھا، نظر انداز بھی کیے جا رہا تھا۔

''اُس نے بہت خدمت کی میری، ساتھ بھی بہت دیا اور بستر پر لطف کے تو کیا کہنے، کیسے کیسے ہنر میں یکتا تھی۔ اُفوہ! دماغ چل گیا ہے میرا، بتا کسے رہا ہوں کہ جس نے مجھے ملوایا تھا۔ میں اُسے ہرگز قتل نہ کراگر وہ مجھ سے چالبازی پر نہ اتر آتی۔ جو کچھ میں تونگر سے کرنا چاہتا تھا وہ اُس سے واقف تھی مگر تھی تو عورت ناں! نجانے کیسے اُس پر مہربان ہوگئی لیکن جب میں نے اُسے بتایا کہ تمھاری بہن کا ریپ تونگر نے کیا ہے تو پھر میرے لیے تونگر کو مسلسل عذاب میں مبتلا رکھنا آسان ہوگیا۔ لیکن جہاں سے اُس کے واسطے زندگی کا دروازہ بند ہوا، وہ رُباب کو یہاں سے فرار کرانا اور کچھ میری ذاتی ویڈیوز کا چرانا تھا۔ مجھے پہلے دن سے ہی علم تھا کہ یہ خباثت جانان کی ہے لیکن جب گل رخ بھی تونگر پر مہربان ہوگئی تو میں نے اُسے تونگر کے اَنت تک فری ہینڈ دے دیا۔ کیوں کیسا رہا دوست؟'' اللہ ڈنو نے اب کے ایک استہزائیہ قہقہہ لگایا، دو تین بار ابرو مٹکائے اور پھر پیگ میں سے آخری گھونٹ لے کر عجیب سے انداز میں حمید الرحمٰن کو دیکھا اور زیر لب مسکرا دیا۔

''آئی جی صاحب! ہماری معشوقہ رُباب کو تو واپس کردو!''

حمید الرحمٰن نے حیران ہو کر اللہ ڈنو کی طرف دیکھا اور اُس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر گڑبڑا سا گیا۔ ''ملے گی تو واپس کریں گے بھڑوے۔''

اللہ ڈنو نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ ''کیوں جھوٹ بولتے ہو دلبر جانی! رُباب تو کئی دنوں سے تمھارے پاس ہے، واپس کردو ناں یار! دیکھ لو! یاری میں غداری نہیں چلے گی اُستاد۔''

اللہ ڈنو کی بات سُن کر حمید الرحمٰن مسکرا دیا اور اپنا بجھ چکا سگار سلگانے کے لیے تپائی سے لائٹر ڈھونڈنے لگا۔ لائٹر نہ ملا تو گلاس اُٹھایا اور اُسے گیلپ کرلیا۔

''مانا کہ تو وہاں تک پہنچ چکا ہے کہ جہاں تک دیکھنے میں گردنیں ٹوٹ جاتی ہیں لیکن تو میرے لیے وہی پچاس روپے والا دلال ہے، چھوڑ اب اِن ضد بازیوں کو، کیوں اپنا نام نشان مٹانے کے چکروں میں ہے۔''

''نام نشان کی تو فکر نہ کر دوست! کون سا افسر کون سیاست دان ایسا ہے کہ جس کی کھیتی میں، میں نے اپنا بیج نہیں پھینکا، اگر سینکڑوں نہیں پھوٹے تو درجنوں تو ضرور جنمے ہوں گے، گھر گھر کا ڈی این اے کراؤ تو گھر گھر میں تمھیں اللہ ڈنو عبید ملے گا، اپنا گھر ہی دیکھ لو، اپنے اکلوتے بیٹے کا ڈی این اے کرا لو تو مجھ سے ملاقات کی ضرورت ہی نہیں رہے گی، میرا نام نشان مٹانے کی بات کرتا ہے دو ٹکے کا پلسیا۔'' اللہ ڈنو کی آواز میں در آئی کڑواہٹ، غراہٹ میں بدل چکی تھی۔

اللہ ڈنو کا آخری جملہ سُن کر حمید الرحمٰن کا جسم سُن ہو کر رہ گیا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس طرح اپنے غصے کا اظہار کرے۔ اُس نے کرسی سے اُٹھنے کی کوشش کی تو جسم میں اُٹھنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ اُدھر اللہ ڈنو کے چہرے پر بھی طیش متشرح تھا۔ کچھ دیر خاموشی رہی تو اللہ ڈنو خاصی حد تک نارمل ہو چلا تھا۔ اب وہ بار بار تمسخرانہ انداز میں حمید الرحمٰن کی طرف دیکھ رہا تھا کہ جس کی گردن جھکی ہوئی اور آنکھیں فرش پر ٹکی تھیں۔

چند لمحے یونہی گزرے تو اللہ ڈنو نے تپائی پر رکھی ریموٹ بیل کو پریس کیا تو کمرے میں گل رخ داخل ہوئی۔ اللہ ڈنو نے ہاتھ لہرا کر کہا کہ جاؤ اور صاحب کو اُس کی گاڑی تک چھوڑ کر آؤ۔ لیکن گل رخ کو دی گئی ہدایت کے باوجود حمید الرحمٰن سے اُٹھا نہیں جا رہا تھا۔ اللہ ڈنو نے پھر سے گل رخ سے کہا کہ بہت پی گیا ہے لہٰذا اُسے اُٹھا کر گاڑی تک چھوڑ آئے اور خود اُٹھ کر کمرے سے باہر جانے لگا۔ اِس سے پہلے کہ گل رخ آگے بڑھ کر حمید الرحمٰن کو اُٹھا پاتی، اللہ ڈنو قدرے لڑکھڑاتا ہوا اُس کے قریب سے گزرا۔ بس وہی ایک لمحہ تھا کہ جب اُس کی پشت گل رخ کی طرف ہوئی، اُس نے تیندوے کی سی پھرتی سے تپائی پر رکھی پلیٹ میں سے کانٹا اُٹھایا اور پیچھے سے لپک کر اللہ ڈنو کی گردن میں شہ رگ کے عین اوپر پیوست کرتے ہوئے نرخرے تک گھما دیا۔

۵۱

رات کے دو بجے صوبے کا آئی جی وزیر اعلیٰ ہاؤس کے کانفرنس روم میں وزیر اعلیٰ رئیس جمال بخش کی آمد کا منتظر تھا۔ آپریشن ترتیب دیئے جانے سے قبل اُسے حکم دیا گیا تھا کہ صورتِ حال جو بھی ہو، گاہ بے گاہ وقت کا دھیان کیے بغیر اُسے نتائج سے آگاہ کرنا ہے۔ کچھ دیر بعد کانفرنس روم کا بغلی دروازہ کھلا اور رئیس جمال بخش متفکر صورت لیے اندر داخل ہوا، حمید الرحمٰن کو دیکھا اور اُسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے دوسرے دروازے سے باہر گرین ایریا میں نکل آیا۔ سامنے رکھی آؤٹ ڈور چیئرز پر بیٹھنے کی بجائے وہ کافی دور تک چلتا ہوا ایک ایسی جگہ آکر رُک گیا کہ جہاں قریب قریب کوئی ایسی جھاڑی یا درخت نہیں تھا کہ جس پر کوئی بگنگ ڈیوائس لگائی جاسکتی ہو۔

رئیس جمال بخش نے استفساریہ انداز میں حمید الرحمٰن کی جانب دیکھا تو وہ ہلکا سا مسکرا دیا۔

''سر! تمام گندگی آپ کی خواہش کے مطابق صاف ہو چکی ہے۔ آپ کی وزارت عظمیٰ کی راہ میں حائل ہونے والا آپ کا ماضی اور ماضی سے جڑے ہوئے سبھی کردار اپنے انجام کو پہنچ چکے۔''

''کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟'' رئیس کے چہرے پر اب بھی فکر مندی تھی۔

''نو سر! ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔'' حمید الرحمٰن ماتحتی کے دائرے سے نکلنے کے لیے اپنے آپ سے آزاد ہونے کی کوشش کا آغاز کرنے لگا تھا لیکن رئیس جمال بخش کے چہرے پر بدستور گہری سنجیدگی تھی۔

''میری بیٹی رُباب کا کچھ پتہ چلا؟''

''نہیں سر! اِس کا مجھے بہت افسوس ہے، کہیں سے کوئی خبر نہیں مل رہی۔ اُس خبیث ڈنو کی آخری گفتگو سے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے خدانخواستہ وہ اِس دنیا میں نہیں رہیں۔''

رئیس جمال بخش نے نمناک آنکھوں سے حمید الرحمٰن کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔

''آپ تو مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ ہر عروج قربانیوں کا تقاضا رکھتا ہے خاص طور پر جب

یہ عروج سیاست میں چاہیے ہو، اب آپ پیچھے نہ دیکھیں، آگے دیکھیں کہ جہاں سب راستے آپ کی وزارت عظمیٰ کے لیے کھلے ہیں۔"

رئیس جمال بخش تشکر کے سے انداز میں آئی جی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر واپس جانے لگا تو حمید الرحمٰن نے اُس کی طرف یوں دیکھا کہ جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ رئیس جمال بخش وہیں رک گیا۔

"سر! ایک ریکوئسٹ تھی کہ ایک ہفتے بعد میری ریٹائرمنٹ میں صرف ایک سال باقی رہ جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اتنی طویل سروس کے بعد اب کچھ ریسٹ کروں۔"

"تو کرو ناں ریسٹ! کتنے دنوں کا پروگرام ہے؟"

"سر! دنوں کی نہیں، مجھے باقی پورے سال کی چھٹی چاہیے، ایل پی آر، ریٹائرمنٹ سے قبل ریٹائرمنٹ کی تیاری کی رخصت۔"

"نہ کرو یار! چھ مہینے کے بعد الیکشن ہیں، میرے الیکشن کون کرائے گا؟" رئیس جمال بخش پریشان ہو گیا۔

"اُس کی آپ فکر نہ کریں، میں آپ کو بہترین آفیسر دے کر جاؤں گا، مجھ سے بھی بہتر۔"

۵۲

دس دن بعد دوبئی کے انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر ایک فلائٹ اتری۔ جہاز سے باہر آنے والے مسافروں میں حمید الرحمٰن بھی تھا۔ جینز پر آدھے بازوؤں کی پولو شرٹ اور سیاہ رنگ کا قیمتی چشمہ لگائے اپنی قامت، وضع قطع اور چال ڈھال سے نہایت مہذب اور وجیہ مگر پینتالیس پچاس برس سے زیادہ کا نہیں لگ رہا تھا۔

امیگریشن اور سامان کی وصولی سے فارغ ہو کر وہ باہر آیا تو منتظرین میں سے ایک شخص نے آگے بڑھ کر اُس کا اس طرح استقبال کیا کہ جیسے وہ ایک عرصے کے بعد مل رہے ہوں۔ یہ حیدر گوٹھ کا حاجی بخشن تھا۔ حاجی بخشن اُس کا ہاتھ تھام کر رش سے باہر آیا تو بلیو جینز اور سی گرین کلر کے شیفون کی سلیولیس شرٹ پہنے ہوئے ایک دلکش وطرح دار لڑکی بھی پورے وجود سے اُس کی منتظر

تھی۔حمید الرحمٰن نے آگے بڑھ کر اُسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ بے تابی میں اس کے لب حسینہ کے کان تک پہنچے۔

''آج تو اپنے نام کی طرح لگ رہی ہو، اپنے سروں سے مست کر دینے والی رُباب۔''

پھر وہ بخشن کی طرف مڑا۔

''تھینک یو بخشن! میرے دوست، میرے یار!''

بخشن نے مسکراتے ہوئے اُسے دو علیحدہ کی رنگز میں دو چابیاں بھی پیش کیں، ایک نئی گاڑی اور دوسری نئے فرنشڈ اپارٹمنٹ کی۔ دونوں نے ایک بار پھر گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور مخالف سمتوں میں اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف چل دیئے۔ سیاہ معیشت کی متوازی دنیا میں ایک نئے دن کا آغاز ہو چلا تھا۔
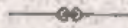
اُسی چڑیا کو پھڑکا کر تو اُس نے علاقے کی دو بلاؤں ملک یاور بختاور اور نادر خان کو آپس میں یوں الجھائے رکھنا تھا کہ نہ صرف حکومت اور اپوزیشن دونوں سے کاروباری معاملات فِٹ رہتے بلکہ اُن کے مال کو بھی کچھ اِس طرح نک لگا تا کہ جیسے پانی چور زمیندار نہر میں سائفن لگا کر واری کے بغیر کھیت کے کھیت سیراب کر لیتا ہے۔ لیکن یہ کیا ہوا کہ اب اللہ ڈنو عبید جیسا بااثر شخص بھی رُباب کے لیے میدان میں آ گیا اور آیا بھی تو اِس انداز میں کہ پرانی یاری دوستی کے سبھی طور طریقے اُدب آداب ایک طرف کر کے کھلی دھمکیاں دیتا ہوا ماں بہن ایک کرنے پر آ گیا۔ آخر کون ہے یہ رُباب جس کا ہونا اور نہ ہونا اتنا اہم بنتا جا رہا ہے۔ کہاں کہاں تک رسائی ہے اِس کی؟ کیا اس کی طلب کے پس منظر میں اُس کے جنسی تعامل میں بے مثال ہنرمندی اور عملیت میں اولیت کا دخل ہے یا کچھ اور سبب ہے جو اَب تک کھلا نہیں۔

Haider Goth Ka Bakhshan
ISBN: 978-969-662-457-8
Rs.1250.00